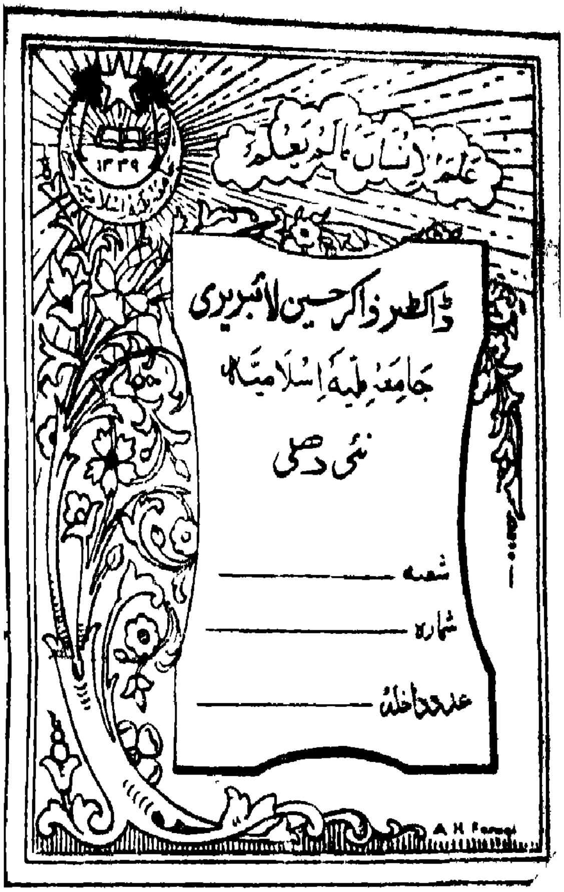
علم الانسان ما لم یعلم
۱۳۳۹
A H Farooqi

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی

شعبہ ________
شمارہ ________
عدد داخلہ ________

For Reference

NOT TO BE TAKEN FROM THIS ROOM

Acc. No.

Call No.

Date of release

A sum of 5 **Paise** on general books and **25 P.** on text-books per day, shall be **charged** for books not returned on the date last stamped.

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

قومی زبان

جلد ۳۳ شمارہ ۱

جولائی ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

سنسکرت ادب کا شاہکار

کندمالا

پہلی مرتبہ اُردو کے قالب میں پیش کیا جا رہا ہے

چوتھی صدی عیسوی کے مصنف دن نگا آچاریہ کا یہ ڈراما ایک طویل عرصے تک زمانے کی نگاہوں سے اوجھل رہا، اس کا سنسکرت متن پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ صمدانی نقوی نے اس ڈرامے کو اُردو میں اس انداز سے منتقل کیا ہے کہ اصل ڈرامے کی فضا مجروح نہیں ہوئی۔

مترجم نے ترجمے سے پہلے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں ڈراما نگار کے حالاتِ زندگی اور ڈرامے کی فنی خصوصیات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ تعارف جناب ممتاز حسن کے قلم سے ہے۔

ٹائپ میں سفید کاغذ پر شائع کیا گیا ہے۔

قیمت: دو روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اُردو۔ بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

فہرست

زیر تعمیر اُردو کالج کے لئے عطیات		۴
غالب نام آور	سید قدرت نقوی	۵
اردو میں تدوین (۲) دستور الفصاحت	ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر	۱۳
شبلی کی ذوق آفرینی	محمد مرتضیٰ فاضل	۲۱
سرشار کی شخصیت (لطائف وحقائق کی روشنی میں)	پریم پال اشک	۲۹
چنچل نار — ایک ناول، ایک بحث	تحسین سروری	۳۴
کتب خانۂ خاص کی بیاضیں (۲)	افسر صدیقی امروہوی	۴۵
سس یشش ـ ص (۱)	سید وصی احمد بلگرامی	۵۶
عبدالمجید زیبا کوٹی	پروفیسر محمد عبدالغنی نیازی	۶۹
شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	ڈاکٹر محمد علی قادری	۸۵
بزم اقبال (۳)		۸۹
نئے خزانے	ابو سلمان شاہجہانپوری	۹۵

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ تین لاکھ چھبیس ہزار آٹھ سو پندرہ روپے (۳,۲۶۸۱۵ر۰۰) جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ماہ جو رقوم موصول ہوئیں، ان کی تفصیل یہ ہے ۔

عطیہ

جناب رافع الزماں صاحب ۔ کراچی	مبلغ دو سو روپے

بذریعہ فروخت رسائل

جناب ایم مظفر احمد صاحب ایڈیشنل ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کراچی	مبلغ ایک ہزار سات سو روپے

سید قدرت نقوی

غالب نام آور

فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف اداروں کی طرف سے اس تقریب کو غالب کے شایانِ شان طریقے سے منانے کے اعلانات کئے گئے ہیں۔ بہت سے اداروں اور افراد کی طرف سے غالب کے مختصر حالاتِ زندگی طلب کئے گئے ہیں۔ ان سب کو فرداً فرداً یہ حالات فراہم کرنا ممکن نہیں۔ ذیل میں غالب کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ شائع کیا جا رہا ہے۔ جسے ادارۂ قومی زبان کی فرمائش پر جناب سید قدرت نقوی نے سپردِ قلم کیا ہے۔

غالب ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے، خدا نے انھیں ذوقِ سلیم اور فہمِ رسا کی نعمت عطا کی تھی۔ کسی نابغۂ دہر میں جن صفات کا ہونا ضروری ہے وہ سب کی سب غالب میں موجود تھیں۔ غالب کے ہاں تخیل کی بلند پروازی، فہم کی دراکی، عقل کی تیزی، ذہنی رسائی، زبردست قوتِ اجتہاد ہے۔ معاملہ فہمی، زمانہ شناسی، فنی لطافت و پاکیزگی، حق پرستی و حقیقت پسندی ہر مرحلے پر نظر آتی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے:۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

غالب ہمارے ادب میں جس عظمت کے مینار پر کھڑے نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس بہت کچھ تھا۔ اعلیٰ فکر، ایک علمی و ادبی نقطۂ نظر، ایک تخلیقی جوہر، ایک خاص تہذیب و ثقافت کی نمائندگی، ایک متوازن اسلوبِ حیات کا عکس، ایک اعلیٰ و ارفع فنی اسلوب، زندگی اور اس کی نفسیاتی کیفیات کا اظہار۔ اسی وجہ سے اپنے دیوان کے متعلق کہا تھا۔

گر ذوقِ سخن بدہر آئین بودے دیوانِ مرا شہرتِ پروین بودے
غالب اگر این فنِ سخن دین بودے آن دین را ایزدی کتاب این بودے

غالب نے اردو فارسی نظم و نثر کو نرالا اسلوب عطا کیا۔ خیال و فکر کی دولت سے مالا مال کیا۔ فکر و جذبے کو ہم آہنگ کرنے کا ڈھنگ بتایا۔ مباحثِ حیات کو پیش کرنے کا گر سکھایا۔ اردو شاعری کو عروج و اوج کی اس منزل پر پہنچایا، جہاں اب

تک اور کوئی نہ پہنچا سکا۔ اردو نثر میں وہ اسلوب پیدا کیا جس کی پیروی بعد والے نہ کر سکے، مگر اسی کی روشنی سے کسبِ نور کر کے آج کی اردو نثر نے جلا حاصل کی۔ ادب کی اس شمع فروزاں کے عکس ہائے گوناگوں کے نظارہ ہائے دل کش قابل دید ہیں۔

غالب ۸ ر رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو سرزمین اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں نے اسد اللہ بیگ خاں نام رکھا۔ والد کا عرف مرزا دولها تھا۔ انھیں مرزا نوشہ کہا گیا۔ باپ مرزا عبداللہ بیگ خاں اور چچا نصر اللہ بیگ خاں تھے۔ غالب کے دادا قوقان بیگ خاں اپنے والد ترسم خاں سے ناراض ہو کر سمرقند سے وارد ہندوستان ہوئے۔ ہندوستان میں پہلے لاہور گئے اور نواب معین الملک کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے اور نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ شاہ عالم کی سرکار میں نجف خاں کے توسل سے پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوئے۔ ایک سیر حاصل پرگنہ پہاسو ان کی ذات اور رسالہ کی تنخواہ میں بطور جاگیر ملا۔ غالب کے دادا کے انتقال کے وقت سلطنت مغلیہ طوائف الملوکی کا شکار تھی۔ جاگیر جاتی رہی تو غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کے ملازم ہوئے۔ کچھ مدت کے بعد حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کے ہاں تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازمت کی۔ ایک مدت کے بعد وہ ملازمت خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ حیدرآباد سے الور پہنچے اور راجہ راؤ بختاور سنگھ کی نوکری کی۔ وہیں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ غالب نے والئ الور کے قصیدے میں لکھا ہے:

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست　　در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

میرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے وقت غالب کی عمر پانچ سال تھی۔ چچا نصر اللہ بیگ خاں نے یتیم بھتیجے کی سرپرستی کی۔ ننھیال نے سہارا دیا۔ غالب کی والدہ غلام حسین خاں کمیدان رئیس آگرہ کی لڑکی تھیں، پڑھنا لکھنا جانتی تھیں، اور اپنے والد کے گھر آگرہ میں رہتی تھیں، غلام حسین خاں میرٹھ سرکار میں ایک فوجی افسر تھے۔ غالب کو ننھیال میں ہر طرح کا آرام حاصل تھا۔ کیونکہ ان کے نانا کی معقول جائداد تھی۔

غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خاں انگریزی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار رہے۔ ان کی شادی نواب احمد بخش خاں بہادر والئ لوہارو کی بہن سے ہوئی تھی۔ جب آگرہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے سفارش کر کے انھیں چار سو سواروں کے ایک دستہ کا رسالدار مقرر کرا دیا۔ سونک اور سونسا حین حیات جاگیر میں ملے۔ ابھی سال ہی گزرا ہوگا کہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں بھی ایک لڑائی میں ہاتھی سے گر کر وفات پا گئے۔ غالب کا اب جدی سرپرست کوئی نہ رہا۔ چچا جب تک زندہ رہے غالب اور ان کے بھائی بہنوں کی پرورش اس طرح کرتے رہے کہ انھیں یتیمی کا احساس بھی نہ ہوا۔ اب صرف ننھیال ہی کا ایک سہارا تھا۔ یا غالب کی دادی اور پھوپھیوں نے ناز برداری کی۔ نواب احمد بخش خاں نے بہن کے رشتہ کی وجہ سے کچھ خیال رکھا۔ چچا کی جاگیر کے عوض پنشن مقرر ہوئی۔ جو بقول غالب دس ہزار

روپے مقرر ہوئے تھے۔ بعد میں نواب احمد بخش خاں نے پانچ ہزار کر دیئے اور ان میں سے بھی دو ہزار کا حصہ دار خواجہ حاجی کو بنا دیا۔ غالب کے حصے میں ساڑھے سات روپے سالانہ آئے جو ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ تادم آخر ملتے رہے۔

غالب کی تعلیم و تربیت کا بار پہلے چچا کے ذمے تھا ان کی وفات ہوئی تو غالب نو سال کے تھے، یہ فرض ننھیال والوں نے ادا کیا لیکن کوئی خاص سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے اور عیش و آرام کی بدولت تعلیم مکمل نہ ہوئی۔ ابھی تیرہ ہی برس کے تھے کہ ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی نواب احمد بخش خاں کی بھتیجی سے ہوگئی۔ کچھ دن تو غالب آگرہ ہی رہے لیکن پھر مستقل طور پر دہلی میں آرہے۔

آگرے میں غالب نے شیخ معظم سے تعلیم حاصل کی مگر بہت جلد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا اور یہ تعلیم شرح مأتہ عامل تک ہی رہی بعد کو غالب نے ذاتی مطالعہ سے علوم متداولہ میں کافی دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ اور فارسی میں وہ ایک مستند عالم و استاد کی حیثیت رکھتے تھے فارسی تعلیم کے متعلق ایک پارسی نژاد نو مسلم ہرمزد ثم عبدالصمد کا نام خود غالب نے لیا ہے۔ لیکن یہ ابھی تک معمہ ہے۔ کوئی اس کے وجود کو فرضی کہتا ہے اور کوئی واقعی۔ اساتذہ میں مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی کا نام بھی لیا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ نظیر مکتب دار ضرور تھے، مگر ان کا حلقۂ درس جن طبقات تک تھا وہاں غالب کے سرپرستوں نے بھیجنا گوارا نہ کیا ہوگا۔ غالب کا تعلق جس طبقہ سے تھا وہاں تک نظیر اکبرآبادی کا گذر نہیں تھا۔

غالب نے آٹھ نو سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ابتداء میں روش عام پر گامزن ہوئے مگر پھر طرز بیدل میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

لیکن غالب اس قیامت کے مرحلے طے کر گئے اور ایک زمانہ کو مخالف بنا لیا۔ "مہمل گوئی" کا الزام لگایا گیا، مشکل پسندی ان کا شیوہ قرار دیا اور ہر طرف سے مخالفت کی جانے لگی۔ دہلی پہنچے تو وہاں بھی انہی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ ان تمام باتوں اور طبعی مناسبت سے فارسی گوئی کی طرف مائل ہوئے۔

آگرے کا زمانہ نہایت عیش و آرام میں بسر ہوا، دہلی آئے تو یہاں بھی زیادہ تکلیفات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ ناز بردار موجود تھے، مگر تابکے یہ ناز برداریاں کفالت کرتیں۔ بچپن سے عیش کے عادی، جوانی میں رنگ رلیاں منانے لگے۔ خاندانی نواب تھے اگر جاگیر نہ تھی، ادھار لینے لگے۔ قرضخواہوں نے تقاضا کیا تو آنکھیں کھلیں پنشن کی طرف توجہ کی، وہ نواب احمد بخش خاں کی ریاست سے ملا کرتی تھی جس میں باقاعدگی نہ تھی۔ غالب نواب سے ملے انہوں نے بلطائف الحیل ٹال دیا۔ کاغذات دیکھے تو پتہ چلا کہ پنشن میں جعلسازی کی گئی ہے۔ دس ہزار کی جگہ پانچ ہزار کا تعین کیا گیا ہے اور اسی کے مطابق پنشن دی جاتی ہے اب غالب نے چارہ جوئی کا ارادہ کیا اور انگریزی دارالحکومت کلکتے جا کر مقدمہ پیش کرنے کی سوچی۔ اگست ۱۸۲۶ء سے پہلے وہ دہلی سے روانہ ہوئے، لکھنؤ پہنچے وہاں اچھی خاصی عزت اور آؤ بھگت ہوئی۔ لکھنؤ سے کانپور ہوتے ہوئے باندہ پہنچے، باندہ سے بنارس اور بنارس سے کلکتہ ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو پہنچے۔

کلکتہ پہنچکر غالب نے انگریزی حکام تک رسائی کے ذرائع پیدا کئے۔ درخواست پیش کی تو حکم ہوا کہ دہلی میں مقدمہ دائر ہو، وہاں سے یہاں آئے۔ دہلی میں وکیل کی معرفت کاغذات پیش کئے گئے اور خود کلکتہ میں مقیم رہے۔ دہلی سے کاغذات آنے میں دیر لگی، کاغذات پر مسٹر ایڈورڈ کولبروک نے مناسب رپورٹ کی تھی، مگر فرانسس ہاکنس جب کولبروک کی جگہ ریزیڈنٹ دہلی بنا تو اس نے غالب کے خلاف رپورٹ کی۔ اسی رپورٹ کی خاطر غالب کلکتہ سے دلی آئے تاکہ مناسب رپورٹ کرائیں۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۲۹ء کو دہلی پہنچے

کلکتہ کے سفر میں غالب کو مالی منفعت تو نہ ہوئی لیکن اس سفر سے انھیں ذہنی بصیرت کے بیش بہا خزانے ہاتھ آئے۔ کلکتہ میں اہل ایران کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی، وہاں کے علماء و فضلا ماہانہ مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے۔ غالب کے ورود پر بھی ایک مشاعرہ ہوا۔ اہل ایران نے بہت تعریف کی۔ کلکتہ کے اصحاب علم کو حسد ہوا، اور غالب کے کلام پر اعتراضات کر دیئے۔ غالب اور ان کے احباب اور صاحب علم ایرانیوں نے ان کے جوابات دیئے۔ مخالفین نے کہا کہ یہ مرزا قتیل کا اجتہاد ہے۔ غالب کو ناگوار گزرا اور انھوں نے قتیل کی فارسی دانی سے انکار کر دیا۔ نزاع طول پکڑا، آخر کار مفاہمت ہو گئی۔

غالب سولہ سال تک پنشن کا مقدمہ لڑتے رہے جس کا فیصلہ ان کے حق میں نہ ہوا مالی مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو گیا ایک مرتبہ قرضخواہوں نے ان پر نالش کر کے ڈگری کرا دی تو یہ خانہ نشین ہو گئے۔ دہلی کالج میں فارسی مدرس کی جگہ خالی ہوئی مسٹر ٹامسن نے غالب کو بلایا۔ یہ پہنچے جب دستور استقبال نہ کیا گیا تو واپس چلے آئے۔

بہادر شاہ ظفر گو برائے نام شہنشاہ تھے، مگر ان کا توسل بہت بڑا اعزاز تھا۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں حکیم احسن اللہ خاں اور میاں کالے صاحب کے وسیلہ و سفارش سے غالب کو تاریخ نویسی پر ملازم رکھ لیا گیا۔ پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، خطاب اور چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت عنایت ہوا، ذوق کی وفات کے بعد استاد شاہ بھی مقرر ہوئے۔ یہ رابطہ غدر تک قائم رہا۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان والوں نے انگریزوں کے تسلط سے چھٹکارا پانے کے لئے جدوجہد کی۔ انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا۔ یہ جدوجہد ناکام رہی۔ اس کی ابتدا ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی فوج نے کی۔ یہ فوجی ۱۱ر مئی کو دہلی پہنچے اور بادشاہ کو برسر اقتدار لانے کے لئے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ انگریزوں اور ان کے مددگاروں کا قتل شروع کر دیا۔ علاقہ پنجاب و بنگال کے علاوہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع ہو گئی۔ دہلی بہت بڑا مرکز تھا۔ غالب نے بظاہر کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا۔ غالب بچ گئے۔ لیکن سرکاری پنشن بند ہو گئی۔

نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور غدر سے پہلے غالب کے شاگرد ہوئے تھے، کبھی کبھی کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ پنشن بند ہوئی تو انھوں نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا جو غالب کی وفات تک ملتا رہا۔ مئی ۱۸۶۳ء سے بند پنشن

جاری ہو گئی، اور بقایا بھی مل گیا۔ دربار اور خلعت بھی بند ہو گیا تھا وہ بھی مارچ ۱۸۶۰ء میں بحال ہو گیا۔ اور دسمبر ۱۸۶۳ء ایک خاص خلعت ملا تھا

سفر کلکتہ کے بعد غالب دو مرتبہ رامپور اور ایک مرتبہ میرٹھ گئے اور کسی سفر کا ذکر نہیں ملتا۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں نواب طفیٰ خاں قید فرنگ سے رہا ہوئے تو غالب ان سے ملنے گئے۔ مقدمے کے دوران میں بھی انھوں نے کئی سفارشیں کرائی تھیں — دی ۱۸۶۰ء میں نواب یوسف علی خاں ناظم کی دعوت پر رامپور گئے دو تین مہینے رہ کر چلے آئے ۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں رامپور کی تخت نشینی کے جشن میں شرکت کے لئے رامپور گئے۔

غالب نے فارسی کے مشہور لغت برہان قاطع پر کچھ اعتراضات قاطع برہان کے نام سے چھپوائے تھے، اس کی مخالفت بڑے شد و مد سے کی گئی، جوابی کتابوں میں غالب کو برا بھلا کہا گیا۔ مولوی امین الدین مدرس پٹیالہ نے قاطع القاطع لکھی جس میں غالب کو لیاں دی گئی تھیں۔ مرزا غالب نے اس کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا۔ لیکن اہل علم گواہوں نے بے انصافی سے کام ا اور امین الدین کا ساتھ دیا۔ آخرکار باہمی تصفیہ کرا یا گیا اور مقدمہ داخل دفتر ہوا۔

آخر عمر میں غالب مختلف بیماریوں کا شکار رہے۔ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ خوراک بہت کم رہ گئی تھی، بہرا پن ایسا تھا کہ کوئی بات نہ سن سکتے تھے۔ جو کوئی ملنے آتا لکھ کر باتیں کرتا۔ ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے، اور احباب کے خطوط کے جوابات دیتے رہے۔ آخرکار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء دوشنبہ کو یہ ادب کی شمع فروزاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی۔ مگر اپنی روشنی رہتی دنیا تک کے لئے چھوڑ گئی: "آہ غالب بمرد" تاریخ وفات نکالی گئی۔

غالب کی ادبی کاوشوں کے نتیجے میں چند کتابیں وجود میں آئیں۔ فارسی نظم و نثر میں یہ کتابیں ہیں۔ (۱) کلیات نظم فارسی — (۲) سبد چین (۳) سبد باغ دو در (۴) دعائے صباح، نظم میں (۵) مثنوی ابر گہر بار کلیات میں شامل ہے مگر الگ بھی شائع ہوئی فارسی نثر میں پنج آہنگ (۲) مہر نیمروز (۳) دستنبو (یہ کلیات نثر فارسی میں شامل ہیں) (۴) قاطع برہان بعد اضافہ درفش کاویانی ماثر غالب لکھی گئی تھیں۔ کچھ خطوط متفرقات و سبد باغ دو در میں بھی شامل ہیں۔ اردو نظم میں ایک دیوان جس کے مختلف نسخے ہیں۔ حمیدیہ نسخے میں متروک کلام شامل ہے۔ سب سے زیادہ جامع اب تک مولانا عرشی کا مرتبہ نسخہ ہے۔ اردو نثر میں۔ عود ہندی، اردوئے معلیٰ — مکاتیب غالب، نادرات غالب، نکات و رقعات غالب، نامۂ غالب، تیغ تیز، لطائف غیبی، اردو مصنفات ہیں۔ بچوں کی فارسی تعلیم کے لئے خالق باری کی طرز پر قادر نامہ و اسمائے فارسی لکھا۔

غالب کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ ان کے کلام نظم و نثر کی قدر و منزلت جیسی ہونی چاہیئے تھی نہیں ہوئی۔ حقیقت ہے کہ وہ فارسی میں نہایت بلند مرتبہ شاعر و ادیب تھے۔ ان کے کلام کا فارسی کے مشہور شاعروں اور انشا پردازوں سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نظم فارسی میں ان کے کلام میں تمام وہ فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان سے پہلے کے شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں تخیل کی بلند پروازی میں وہ فارسی کے دیگر شعرا سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ جدت اور لطافت میں ان کا مقابل بحیثیت مجموعی شاید ہی کوئی ہو۔ قطعہ، مثنوی،

قصیدہ، غزل، رباعی، ہر صنفِ سخن اپنے عروج کی منزل میں ان کے ہاں موجود ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان کو کوتاہ بینی کے حصور سے نکال کر نئے دور کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت ملتی ہے۔ فلسفۂ حیات و کائنات اور تصوف کے رموز و نکات سے کلام معمور ہے۔ انسانی جذبات و واردات کو نہایت عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ چند شعر دیکھئے :-

سحر دمیدہ و گل در دمیدنست مخسپ　　جہاں جہاں گلِ نظارہ چیدنست مخسپ !
نشانِ زندگیٔ دل دویدنست مایست　　جلائے آئینۂ چشم، دیدنست مخسپ !

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم　　آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

درد سودائے تو تن بست آسماں نامیدمش　　دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نامیدمش
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم　　کعبہ دیدم نقشِ پائے رہرواں نامیدمش

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم　　در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم
بجنگ باج ستانانِ شاخسارے را　　تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود　　گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد　　ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا !

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر　　بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

اردو نظم میں بھی انہی خصوصیات کو پیش کیا ہے۔ چند شعر دیکھئے :-

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم‌کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

* * *

نیا ادب — آن جہانی پنڈت کول نے ۱۹۴۷ء کے بعد اردو ادب کے بارے میں جو مضامین وقتاً فوقتاً لکھے تھے انھیں پنڈت کشن پرشاد کول اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے جدید ادب کی نمایاں خصوصیات اور جدید دور کے ذہنی رجحانات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

- ——— نیا ادب (تفصیلی جائزہ)
- ——— نیا افسانہ
- ——— نئے ادب کے افسانہ نگار
- ——— نئی شاعری

پانچ روپے

[illegible]

گلشن ہمیشہ بہار

نصر اللہ خاں خویشگی نے یہ تذکرہ نواب مصطفیٰ شیفتہ کے تذکرہ "گلشنِ بے خار" کے جواب میں لکھا تھا۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں یہ پہلی بار شائع ہوا تھا۔ پہلی اشاعت کے بہت کم نسخے اب دستیاب ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی (استاد شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی) نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں ۴۱۹ شاعروں کے حالات ہیں۔ مرتب نے جابجا حواشی لکھ کر اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ آفسٹ کی طباعت۔ صفحات ۳۴۳ - قیمت: آٹھ روپے

انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ کراچی

اردو میں تدوین (۲)

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر

دستور الفصاحت

کچھ شک نہیں کہ جدید طرز تدوین کی بنیاد پر بنیاد پروفیسر محمد حسین آزاد نے رکھی تھی لیکن اہل علم کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس کا مذاق عام کر دینا بابائے اردو مولوی عبدالحق کا کارنامہ ہے۔ مولوی صاحب نے جن اہل علم سے تحقیق و تدوین کا کام لیا ان کی فہرست طویل ہے البتہ ان میں مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی وغیرہ خصوصیت سے مشہور ہوئے۔

مولوی صاحب میں تحقیق و تدوین کی صلاحیتیں موجود تھیں یا نہیں میں فی الوقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا البتہ یہ امر مسلّم ہے کہ ہمارے قریب العہد بزرگوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مخطوطات کی دریافت کے لیے مشقت اٹھائی اور ان کی تلاش و جستجو میں دلچسپی لی۔ جتنی کثیر تعداد میں نادر اور کمیاب تصانیف انھوں نے دریافت کیں شاید کسی دوسرے نے نہیں کیں سید مبارز الدین رفعت نے صحیح لکھا ہے کہ

> "اردو کے قدیم ادب پارے شایع کرنے سے ان بزرگوں کا اولین مقصد اردو زبان اور اردو ادب کے مورخوں کے لئے ابتدائی مواد کے زیادہ سے زیادہ نمونے مہیا کرنا تھا" (قدیم اردو پر ایک تنقیدی نظر، ص ۲۷ مشمولہ نوائے ادب بمبئی شمارہ ۲)

مولوی صاحب نے عموماً طابع یا ناشر کے فرائض انجام دیئے ہیں وہ اس بات کو بھی گوارا کر لیتے ہیں کہ ایک ہی مقدمہ ایک سے زائد کتابوں کے ساتھ شامل کر دیں مثلاً مصحفی کے تینوں تذکروں عقد ثریا، تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا کے ساتھ بجنسہٖ ایک ہی مقدمہ شامل ہے۔ دراصل مولوی صاحب نے خود نہ تو تدوین کا کوئی اعلیٰ نمونہ پیش کرنے کی کبھی فکر کی اور نہ شاید اس کام کے لیے ان کے پاس فرصت ہی تھی۔ دراصل اس ابتدائی دور میں جب بنیادی کتب مثلاً تذکرے اور دواوین بہت دریافت ہو سکے تھے جو بھی تحقیق کی جاتی ناقص اور قیاسی ہی ہو سکتی تھی، مولوی عبدالحق نے اچھا ہی کیا کہ اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں اس ناقص اور محض قیاسی "تحقیق" پر صرف نہیں کیں اور ایک مفید تر اور اہم تر کام کر ڈالا، وقت کے تقاضے ذاتی معاملات اور ماحول کے علاوہ اپنی صلاحیتوں

کے پیش نظر اپنے لیے مناسب تر میدان عمل کے انتخاب کا مولوی صاحب نے اچھا نمونہ پیش کیا ہے مولوی صاحب نے جو کتابیں مدون کی ہیں ان کے متن میں بھی غلطیاں مل سکتی ہیں حواشی تو عموماً ہیں ہی نہیں یا اگر ہیں تو نہایت سرسری۔ اس لیے ان کو تدوین کا کامیاب نمونہ کہنا مناسب نہیں اس سلسلے میں تفصیلی بحث انشاء اللہ آئندہ کبھی کروں گا۔ بہرحال مولوی صاحب نے تحقیق و تدوین کے کام کی اہمیت کو نہ صرف بہت پہلے محسوس کیا بلکہ اس کے لیے خام مواد بھی فراہم کر دیا۔ ان کا یہ کارنامہ وہ ہے جسے کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مولوی صاحب اور ان کی انجمن ترقی اردو کی خدمات کے اعتراف کے بغیر تحقیق و تدوین کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی تو شاید کچھ مبالغہ نہ ہو۔

مولوی عبدالحق کے بعد مولانا امتیاز علی خاں عرشی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے تحقیق ہی نہیں تدوین کے فن کو بہت ترقی دی۔ مولوی عبدالحق کے برخلاف مولانا عرشی نے تدوین کے سلسلے میں کئی قابل ذکر کام کیے۔ فی الوقت ان کی مدون کی ہوئی کتاب خاتمہ دستور الفصاحت کا ذکر کیا جائے گا جو سنہ ۱۹۴۳ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔

یہ واقعہ کہ اصل کتاب کے صرف "خاتمہ" کو مولانا نے مدون کیا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بات مدون کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ وہ کسی کتاب کو تمام و کمال مدون کرے یا اس کے کسی ایک جزو کی تدوین کرے۔

کتاب کی اصل ترتیب کو مولانا نے برقرار رکھا ہے۔ تصحیح متن کے سلسلے میں اپنے منصب کو بخوبی جانتے اور پہچانتے ہیں چنانچہ خود کو "مصحح" کہتے ہیں۔ تدوین کا کام کرنے والوں میں کم نے اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ مصحح دستور الفصاحت نے اپنے طریقہ کار کا خاص وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے، اصل الفاظ یہ ہیں:

۱۔ اصل نسخے میں کتابت کی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں نیز املا بھی قدیم انداز کا ہے حقیر مصحح نے ان دونوں کی اصلاح کر کے بعض جگہ اس طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔

۲۔ متن میں جا بجا جو الفاظ رہ گئے تھے انھیں اپنی طرف سے پورا کیا ہے جہاں کہیں کوئی لفظ بڑھانا پڑا ہے وہاں اضافے کو بریکٹ میں لکھا ہے۔

۳۔ کتاب کا دوسرا نسخہ دستیاب نہ ہونے کی بنا پر فارسی متن کی تصحیح خاطر خواہ نہیں ہو سکی ہے۔

۴۔ اشعار کی صحت میں دواوین یا دوسرے تذکروں سے کہیں کہیں مدد لی ہے۔

تصحیح متن کے لیے یہ طریقہ کار نہایت واضح ہے۔ اس سے چند باتیں جو دریافت ہوتی ہیں یہ ہیں۔

۱۔ مصحح کی ذمہ داری ہے کہ وہ کتابت کی صریحی اغلاط کو درست کرے۔

۲۔ یہ بات مصحح کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ وہ کتاب کو مفید تر بنانے کے لیے اگر ضروری سمجھے تو املا کو اپنے زمانے کے رواج کے مطابق بنا سکتا ہے لیکن چونکہ تحقیق کے سلسلے میں املا کی اہمیت بھی مسلم ہے مصحح کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ ایسی ہر تبدیلی کی نشاندہی بھی کر دے۔

ہے۔ متن کی تصحیح کے لیے دوسرے ضروری مآخذ سے رجوع بھی کیا جا سکتا ہے بظاہر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصحح کو تمام مآخذ سے اور ہر لفظ کی تصحیح کے لیے مدد لینا ضروری ہے لیکن کسی متن کی تصحیح کے لیے مآخذ اتنے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان سب کی دریافت اور ان سب کا حصول بھی مصحح کے لیے ممکن نہ ہو، پھر تمام مقامات کی تصحیح کرتے ہوئے بعض کا سہواً رہ جانا بھی ممکنات میں سے ہے ایسی صورت میں اگر مصحح نیک نیتی سے کوئی قطعی دعویٰ نہیں کرتا، یہی اس کا منصب بھی ہے لیکن یہ بات مآخذ کو نظر انداز کر دینے اور سہل پسندی کے لیے جواز نہیں ہو سکتی۔

تصحیح متن کے سلسلے میں بلاشبہ ایک سے زاید نسخوں سے کافی مدد مل جاتی ہے لیکن ایسی صورت میں مصحح کی ذمہ داریاں بہت، بڑھ جاتی ہیں۔ اس کی تفصیل کسی اور موقع پر عرض کروں گا اس موقع پر یہ کہنا مناسب ہے کہ تصحیح متن کی بھی دو منزلیں ہوتی ہیں۔ پہلی منزل یہ ہے کہ کاتب کے صریحی سہو کو درست کر دیا جائے چونکہ اس سے بالعموم متن پر براہ راست اثر نہیں پڑتا ایسی ہر تصحیح کی نشاندہی ضروری نہیں لیکن اس سلسلے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اس لئے کہ اس کا امکان بھی ہے کہ ہم اپنی ناواقفیت کے سبب جسے سہو کاتب سمجھ رہے ہوں وہ اس کے برعکس ہو اور ہم غیر شعوری طور پر متن کو صحیح کرنے کے بجائے اس میں تصرف بے جا اور غلطی کے مرتکب ہو جائیں۔

دوسری منزل اغلاط کاتب کی درستی کی ہے یہیں دراصل مصحح کی صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سہواً بعض الفاظ کتابت میں چھوٹ جاتے ہیں ایسے محذوفات کی نشاندہی اور (اگر مصحح کے لیے ممکن ہو تو) ان کو اپنی طرف سے متن میں اس طرح داخل کرنا کہ قاری پر یہ بات واضح بھی رہے کہ یہ اضافہ مصحح کا ہے ضروری ہے لیکن یہ کام بھی کچھ کم مشکل نہیں۔ مثال کے طور پر دستور الفصاحت میں ایک جملہ تھا۔

"بزرگانش اہل خطہ بودند" (ص ۱۱۷)

مصحح نے لفظ "کشمیر" کا اضافہ کر کے جملے کی تصحیح اس طرح کی ہے کہ

"بزرگانش اہل خطہ (کشمیر) بودند"

یہ اضافہ نامناسب تھا۔ دستور الفصاحت کے زمانۂ تصنیف میں عموماً اہل کشمیر کو "اہل خطہ" کہتے تھے بلکہ بہت بعد تک یہی رواج رہا (دیکھو سراپا سخن وغیرہ) چنانچہ مصنف دستور الفصاحت نے بھی وہی لکھا تھا۔ مصحح کتاب نے لفظ کشمیر کا اضافہ کر کے غلط فہمی کا امکان پیدا کر دیا۔ اہل خطہ کی جگہ "اہل کشمیر" کی ترکیب بعد میں رائج ہوئی چنانچہ موجودہ صورت میں دستور الفصاحت کے زمانۂ تصنیف پر بھی شک کیا جا سکتا ہے، اس مثال سے مقصد یہ ہے کہ ایسے مقامات پر مصحح کو نہایت غور و فکر کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصحیح متن کا کام کسی مشکل سے مشکل تحقیقی کام کے مقابلے میں بھی آسان نہیں، اس سلسلے میں نہ صرف متعلق کتاب کے مختلف نسخوں سے مدد مل سکتی ہے بلکہ اس کے موضوع سے متعلق براہ راست اور بالواسطہ ضروری کتب کا مطالعہ بھی ناگزیر ہوتا ہے یعنی مصحح کے لیے وسیع مطالعہ اور دقائق و نکات تک زود رس طبیعت بھی شرط ہے۔

مدون دستور الفصاحت نے تنقید متن کے سلسلے میں کوئی بات مقدمہ میں نہیں لکھی ہے۔ متن کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلو کی طرف کما حقہ، توجہ نہیں دی گئی، اس کی صرف ایک مثال ملتی ہے۔ میر سوز کا ایک مطلع متن میں اس طرح لکھا ہے:

یوں تو نکلی نہ مرے دل کی اماہے گاہے
اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے

مصرع اولی سے متعلق مدون نے لکھا ہے:

« در دیوان مطبوعہ نیز ہمیں طور واقع شدہ اما در آب حیات نوشتہ
نہیں نکلے ہے مرے دل کی اپاہے گاہے
اپاہو، در ہندی بمعنی امنگ و اپاہے بمعنی تدبیر و فکر وغیرہ می آید

اس موقع پر ایک بار پھر تصحیح متن اور تنقید متن اور تحشیہ کے فرق کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ متن میں کوئی عبارت مصنف نے کس طرح لکھی ہے اس کا تعین "تصحیح متن" کی حدود میں ہے۔ وہ عبارت فی الواقع کیا ہونی چاہیے؟ مختلف قرائن اور شواہد سے اس امر کا طے کر دینا تنقید متن ہے اور وہ تمام باتیں جو متن کی تفہیم میں ممد و معاون ہوں تحشیہ کی ذیل میں ہیں۔ مدون دستور الفصاحت نے غالباً تنقید متن کو بھی تحشیہ ہی کا جز قرار دے لیا ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس پہلو پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی جا سکی ہے البتہ حواشی لکھنے پر کافی محنت کی ہے، مدون موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

> « حواشی میں کوشش کی گئی ہے کہ ہر شاعر کے متعلق یہ بتا دیا جائے کہ اور کون کون سی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے اگرچہ اس بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حالات شعرا سے متعلق جملہ حوالے دے دیئے گئے ہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ اہم پرانے تذکرے اور تاریخ کی کتابیں نظر انداز نہیں ہونے پائی ہیں، ان کتابوں میں سے جو طبع ہو چکی تھیں ان کے صفحوں کا حوالہ دے دیا گیا ہے اور جو چھپی نہیں اور نہ ہر جگہ دستیاب ہوتی ہیں ان کی پوری پوری عبارتیں نقل کر دی گئی ہیں تاکہ آئندہ تحقیقی کام کرنے والوں کو زحمت اٹھانا نہ پڑے۔»

حواشی کا مقصد بنیادی طور پر متن کی توضیح ہوا کرتا ہے، متن کے کسی خاص فقرے سے کوئی ضروری بات دریافت ہوتی ہو یا اس سے کوئی غیر معمولی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہوں ان کا بیان بھی تحشیہ کے تحت آتا ہے۔ اصولی طور پر تحشیہ سے اتنا کچھ تو لازماً متوقع ہوتا ہے لیکن اس کا دائرہ غیر محدود ہے۔ حواشی نگار کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے دائرۂ عمل کو جتنا اور جس طرح چاہے وسیع کرے، کچھ شک نہیں کہ مدون دستور الفصاحت نے حاشیہ نگاری کا ایک نہایت اہم پہلو نکالا ہے اور اس طرح کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی ہے لیکن ان حواشی کی حیثیت اضافی ہے۔ بنیادی طور پر جو کچھ تحشیہ سے متوقع ہوتا ہے ان سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان کا براہ راست

متن سے تعلق نہیں اور ان سے نہ اس کی توضیح ہوتی ہے نہ تفہیم میں مدد ملتی ہے اور نہ اس کی صحت کا اندازہ ہوتا بجز چند مقامات کے۔

کتاب کے شروع میں تعارف یا مقدمہ لکھنے کا رواج نیا نہیں ہے۔ مدون دستور الفصاحت نے بھی کافی محنت و کاوش کے ساتھ مقدمہ لکھا ہے اس کا مقصد انھوں نے یہ بتایا ہے۔

> " اصل کتاب سے پہلے مصنف کا حال، نسخہ رامپور کی کیفیت، اور زمانۂ تالیف وغیرہ چند مباحث درج کیے گئے ہیں تاکہ اس کتاب کا مالہٗ وما علیہ واضح ہو جائے "

کچھ شک نہیں کہ اس مقدمے کے لکھنے میں بہت کاوش کی گئی ہے لیکن اس کے مطالعے سے ذہن میں جو خیال پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں پہلے سے کچھ خیالات موجود تھے، انھیں کی توثیق و تائید کے لیے بڑی محنت و کوشش سے دلائل فراہم کر دیے گئے ہیں۔ تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے اس لیے محض دو نکات کی طرف توجہ دلانے پر اکتفا کرتا ہوں۔
مصنف کے حالات میں ہے۔

> " دیباچے کے منقبتی فقرے، امام صاحب الزماں کی تعریف کے اشعار، نیز خاتمۂ کتاب میں ہر طبقے کے اندر بارہ بارہ شاعروں کا تذکرہ، یہ قرائن بتاتے ہیں کہ یکتا کا مذہب اثنا عشری تھا۔"

منقبتی فقرے، امام صاحب الزماں کی تعریف کے اشعار، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر بارہ کا التزام بعض ان مصنفین کے یہاں بھی مل سکتا ہے جن کا مذہب اثنا عشری نہیں تھا۔ عبارت کے خاتمہ پر بارہ کا عدد لکھنا بھی عام تھا، اکثر راسخ العقیدہ سنی مسلمان بھی ایسا لکھتے رہے ہیں، یکتا کے عقیدے کے متعلق قطعی حکم لگانے کے لیے ہمیں بہتر دلائل اور شواہد تلاش کرنے ہوں گے۔ مدون دستور الفصاحت نے محض اپنے اس قیاس سے کتاب کی نوعیت اور ماہیت کے متعلق ایک اہم نتیجہ بھی استخراج کر لیا ہے۔

> " چونکہ مصنف اثنا عشری مذہب تھا اس لیے غالباً دوازدہ امام کے شمار کے مطابق ہر طبقے میں بارہ شاعروں کا ذکر ہوگا، ہمارے نسخے میں طبقہ اول کا ایک نام سہواً چھوٹ گیا "

یعنی بارہ کی تعداد کا التزام جو محض قیاس ہے مصنف کے عقیدے کے لیے مستحکم دلیل سمجھ لیا گیا حالانکہ تعداد کے متعلق یہ مفروضہ بھی خلاف واقعہ ہے۔ خود فاضل مدون کے خیال کے مطابق کتاب ۱۲۱۳ھ سے پہلے تالیف ہوئی تھی، اس وقت اس میں یقینی طور پر مرزا حاجی قمر کا ذکر نہیں تھا، میر اور انشا وغیرہ کے حالات بھی اس میں شامل نہیں تھے۔ یہ سب بہت بعد کو لکھے گئے۔

کتاب کے زمانۂ تالیف کے متعلق تفصیلی بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ:

> " کتاب ۱۲۱۰ھ سے پہلے تالیف ہو چکی تھی ..... اس کی تالیف کا کام انشا کی دریائے لطافت سے پہلے انجام

> پاچکا تھا جس کا سال اختتام ۱۲۲۲ھ ہے ..... مصنف کی نظر میں دریائے لطافت کا نہ ہونا اس بنا پر تھا کہ یہ ابھی معرض وجود ہی میں نہیں آئی تھی۔“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دستور الفصاحت کے انشا کی دریائے لطافت پر تقدم زمانی ثابت کرنے کے جذبے سے یہ ساری بحث کی گئی ہے ورنہ بعض باتیں سامنے کی تھیں جن کا اس بحث میں اشارہ نہیں۔

مصحفی نے ریاض الفصحا (۱۲۲۱ھ تا ۱۲۳۶ھ) میں مرزا حاجی قمر کی عمر ”از چہل متجاوز“ بتائی ہے۔ ان کے نام کے ساتھ کوئی خطاب بھی نہیں لکھا ہے اس کے برخلاف دستور الفصاحت میں ان کی عمر ۴۵ سال لکھی ہے اور ان کا نام ان کے القاب و آداب کے ساتھ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ ریاض الفصحا میں قمر کے حالات لکھے جانے کے قریب پانچ سال بعد ہی ممکن تھا۔

میر حسن علی تجلی کے حال میں مصنف نے میر کے نام کے ساتھ ”رحمۃ اللہ تعالیٰ“ لکھا ہے، خود میر کے سلسلۂ حالات میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے جس سے یہ بات بخوبی متحقق ہو جاتی ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا ان کے حال میں خصوصیت سے یہ جملہ اہم ہے۔

> ”سہ چہار سال شدہ کہ در لکھنؤ وفات یافت“

یقیناً یہ ۱۲۲۹ھ کے قریب لکھا گیا ہوگا۔ اسی طرح تجلی کے وہ حالات بھی ۱۲۲۵ھ کے بعد ہی لکھے جا سکتے تھے۔
انشا کے حال میں نواب سعادت علی خاں بہادر کو ”مغفور و مرحوم“ لکھا ہے جن کا انتقال ۱۲۲۹ھ میں ہوا۔
منتظر کے حال میں ہے کہ ”درعین جوانی ..... از دنیا نامراد رفت“، منتظر کا انتقال ۱۲۱۷ھ کا واقعہ ہے۔
میر شیر علی افسوس کے مرنے کا قطعۂ تاریخ خود مصنف نے کہا جس سے ان کا سال انتقال ۱۲۲۴ھ معلوم ہوتا ہے۔
مصحفی کے حال میں جرأت متوفی ۱۲۲۴ھ کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا یہ ماضی کی بات ہو۔

ان چند کے علاوہ شاہ نصیر کے متعلق خود مدون دستور الفصاحت کو اعتراف ہے کہ وہ ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۰ھ میں تحریر کیے گئے۔ ایسے اندراجات جن کو ۱۲۱۳ھ کا کہا جا سکے موصوف کو صرف دو مل سکے ہیں۔ اول خواجہ بیان متوفی ۱۲۱۳ھ کی بابت مصنف کا یہ جملہ:

> ”می گویند کہ تا حال زندہ است“

اس جملہ میں ”می گویند“ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مصنف حقیقت حال سے واقف نہیں ہے صرف سنی سنائی بات لکھ رہا ہے۔ اس جملہ کی بنا پر کوئی فیصلہ کر لینا صحیح نہیں۔

[illegible] جرأت کے متعلق لکھا ہے کہ ”خدایش سلامت دارد“

دوسرا جملہ قائم کے حال میں ہے ۔

"چند سال شدہ ..... مدفون گشت"

خود مدون دستور الفصاحت کے قول کے مطابق "لفظ چند عربی کے لفظ 'بضع' کی طرح تین سے نو تک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے" لیکن روزمرہ میں تین اور نو کا التزام نہ ہوتا ہے اور نہ عملاً ممکن ہے۔ پھر بھی اگر یہاں چند سے نو مراد لیں تو اس کا زمانہ تحریر ۱۲۱۷ یا ۱۲۱۹ھ ہو سکتا ہے۔ لیکن محض اس ایک اقتباس کی بنیاد پر پوری کتاب کے زمانہ تالیف کا تعین کرنا کسی طرح مناسب نہیں خصوصاً اس وقت جب کہ اکثر تحریریں یقینی طور پر اس سے بہت کافی بعد کی ہیں۔ اکثر شعرا کے حالات ۱۲۲۹ھ کے قریب یا اس کے بعد لکھے گئے ہیں اور اسی کو کتاب کا زمانہ تالیف سمجھا جانا چاہیئے اضافہ و ترمیم کا سلسلہ بعد تک جاری رہا۔ اس طرح یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کو انشا کی دریائے لطافت پر تقدم زمانی حاصل نہیں ہے ۔

کتاب کے تعارف کے بعد مدوّن دستور الفصاحت نے اپنے مآخذ کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مدون کے لیے بہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے مآخذ سے بھی قاری کو مطلع کر دے اور اس سلسلے میں دستور الفصاحت کے مدون نے قابل قدر نمونہ پیش کیا ہے۔ لیکن تحقیق کا انداز یہاں بھی وہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کتاب کی تدوین پر اس کے فاضل مدوّن نے بہت محنت کی ہے لیکن اصولی حیثیت سے اس میں بہت کچھ اضافے کی گنجائش ہے اور تحقیقی حصہ پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے البتہ مقدمہ اور حواشی کے سلسلے میں جو اضافے کیے ہیں وہ بہر طور قابل قدر ہیں ۔

(بقیہ صفحہ ماسبق) اور گردیزی کے الفاظ ان کے متعلق یہ ہیں "ودیعت حیات را بمقتضائے اجل سپرد" دونوں تذکروں کے زمانہ تکمیل میں ربع صدی سے زیادہ کا فصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک ہی کو صحیح اطلاع ملی، دوسرے تک جو غلط خبر پہنچی اس کی بنا پر اس کے تذکرہ کے زمانہ تالیف کا قیاس کرنا اور بھی غلط ہوگا ۔

غالب ۔ فکر و فن
ڈاکٹر شوکت سبزواری ۔

مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی شخصیت اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں وہ اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہ مقالات حسب ذیل ہیں

- غالب محقق کی حیثیت سے
- میر و غالب
- غالب کے اردو کلام کی اشاعت
- غالب خطوط کے آئینے میں
- ذال معجمہ فارسی میں
- غالب اور میرٹھ
- غالب کی شخصیت

قیمت : پانچ روپے

انجمن ترقی اردو ۔ بابائے اردو روڈ ۔ کراچی ۱

مخطوطات انجمن ترقی اردو

(فارسی۔ عربی)

انجمن میں فارسی اور عربی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے ان مخطوطات کی اجمالی فہرست سید سرفراز رضوی مہتمم کتب خانہ خاص انجمن ترقی اُردو نے مرتب کی ہے جس میں ہر مخطوطے کے بارے میں ضروری اور بنیادی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ طباعت بذریعہ آفسٹ

قیمت : تین روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

مرتضیٰ حسین فاضل

شبلی کی ذوق آفرینی

شبلی ہماری پیاری زبان کے نامور ادیب، عالم، فلسفی، مفکر اور مصلح ہیں، ان کی شخصیت میں تنوع اور ان کے تخلیقات میں ہیئت اور مواد کے لحاظ سے رنگارنگی ہے، علم کلام، سیرت، تاریخ، تعلیم و ادب پر شبلی کے تصانیف کا جائزہ لیجئے تو وزنی مواد، اہم مسائل اور عالمانہ بحثیں ملیں گی۔ جس کے بیان کا طریقہ سادہ مگر عالمانہ، دلکش مگر ادیبانہ ہے۔ ہر موضوع سے انھیں دلچسپی ہے، اور گہرا تاثر، پھر یہ تاثر اور دلچسپی سراسر تاثر ہی نہیں، فقط دلچسپی ہی تک محدود نہیں، بلکہ اس میں تاثیر آفرینی ہے۔

تاثیر آفرینی، ادراک و فکر سے تعلق رکھتی ہے اور ادراک یا اس کے نتائج دو قسم کے وسائل سے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھنے سننے یعنی محسوسات و حواس کے ذریعہ۔ یا براہ راست وجدان و فکر کی راہوں سے۔ حواس کے ذریعہ حاصل شدہ ادراک۔ خالص فکری اور وجدانی ادراک سے مختلف ہوتا ہے۔ حسی ادراک میں لذت و الم کی شدت ہوتی ہے، اور وجدانی ادراک سے حاصل شدہ قبض و بسط، نشاط و انفعال نفسیاتی اور ذہنی کیفیت ہوتی ہے، ایک کا اثر مسکراہٹ، قہقہہ، چہرے کا دمکنا یا آنسو اور آہ، دوسرے کا اثر نشاط و سرور، پژمردگی اور سکوت ہے۔ حسی ادراکات کا ظہور دوسروں کو جلدی متاثر کرتا ہے، اور فکری تاثر کا دائرہ وسیع ہونے کے باوجود دوسروں کو زیر اثر لینے میں کسی امداد کا محتاج ہوتا ہے۔ یہیں سے ادیب اور فلسفی کی حد بندی شروع ہوتی ہے۔ اور اسی مقام سے مصنفوں کی گروہ بندی کی جاتی ہے۔ ایک گروہ صاحبان فکر کہلاتا ہے دوسرا گروہ صاحبان فن سے عبارت ہوتا ہے۔ مگر یہ دوئی راستوں کی دوئی ہے، مسافروں کی دوئی ہے، منزل آغاز اور منزل آخر ایک ہی ہے۔

ہر شخص حسن مقصد، لذت جستجو، آسودگی حصول تمنا میں کام کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اس میں شریک کرے۔ مفکرین فلسفی حقیقت کو حقیقتوں کے لیے سمجھتا اور اسی مقصد سے سمجھاتا ہے اور ادیب حقیقت کو مجاز کے ذریعے بھی سمجھانے کا قائل ہے۔ ایک نزدیک حقیقت اتنی بلند چیز ہے کہ اسے براہ راست حاصل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ایک

قدس کام ہے یہ شخص اصول، قاعدوں، منطقی حدوں میں محدود رہ کر بات کرتا ہے ۔۔ دوسرا کہتا ہے ۔

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم   اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

اس کے خیال میں سب سے بڑی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کے لیۓ بھاری اصطلاحوں اور وزنی تقریروں کا حیرت ہے اگر ادراک حقیقت کو عام کرنا ہے تو لہجہ نرم، تقریر دل پذیر، اور بیان میں کیف ہو۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہاں سے ذوق کی بات شروع ہوتی ہے، یعنی فکر و فہم کا لطیف امتزاج، معلومات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ ذہن کا پھیلاؤ ہو، زبان و بیان پر قدرت ہو، بات سمجھنے سمجھانے کا ڈھنگ آتا ہو، ایک بات کو کئی طرح کہنا آتا ہو، اس کے بغیر فکر و فن کو خالص ادب کا پیرایہ نہیں ملتا ۔

ڈاکٹر عبداللہ نے کہا ہے:

> " شبلی کی بات سرسید کی بات سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی، مضمون کا فرق کم ہے لب و لہجہ کا فرق زیادہ ہے، شبلی کی نظر اور طرز بیان عالمانہ اور ادیبانہ ہے، وہی بات سرسید کی زبان سے ادا ہو کر مخاطبوں کو متوحش کر دیتی ہے، جب شبلی کے منہ سے نکلتی ہے تو نہایت مانوس معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا ذمہ دار زیادہ تر شبلی کا طرز تحریر اور لب و لہجہ ہے۔"

(میر امن سے عبدالحق تک، طبع مجلس ترقی ادب لاہور صفحہ ۶۹)

ڈاکٹر صاحب، سرسید اور دبستان سرسید کے بہترین نقاد اور عالم ہیں، موصوف نے سرسید کو بار بار موضوع بحث و انتقاد قرار دیا ہے اور بہت سے وقیع فیصلے کۓ ہیں ۔ ان کے نزدیک سرسید صاحب اسلوب بھی ہیں اور داعی اصلاح و تجدد بھی، دوسرے لفظوں میں سرسید ایک فلسفی مبلغ ہیں اور شبلی ادیب اور مبلغ ۔ سید عبداللہ ہی نے ایک اور موقع پر لکھا ہے:

> " سرسید کے نزدیک یقین یا ایمان حاصل کرنے کا وسیلہ بھی عقل ہی ہے اور ورائے عقل کوئی اور طریقہ نہیں جس سے صورت یا کیفیت روح کی تبدیل ہو جائے"

(مذکور ص ۱۰۵)

پھر ڈاکٹر اقبال کی نثر پر گفتگو کے ذیل میں فرماتے ہیں:

> " شبلی کی فلسفیانہ نثر اور اقبال کی حکیمانہ نثر میں یہ فرق ہے کہ شبلی کی تحریروں کا جھکاؤ کسی حد تک سرسید کے دبستان نثر کی خصوصیات کی طرف ہے، یعنی

وہ عبارتوں کی علمی شان کو قائم رکھتے ہوئے بھی یہ دیکھتے ہیں کہ محاورے کی بے تکلفی قائم رہے۔"
(میرامن سے عبدالحق تک ص ۲۵۲)

اسی لب و لہجہ کی مانوسیت اور محاورے کی بے تکلفی کا دوسرا نام "کامیاب ابلاغ" ہے۔ ابلاغ کی کامیابی کا نتیجہ اور اظہار کا اثر "ذوق آفرینی" ہے

شبلی نے اظہار و ابلاغ کے بہت کامیاب تجربے کیے ہیں، ان کی ایک منزل "علم الکلام"، "الکلام"، "الغزالی" اور "سوانح مولانا روم" ہے۔ اور دوسرا سفر یا تجربہ "شعرالعجم" اور "سیرت النبیؐ" ہے۔ اس کے اردگرد بے شمار مضامین و مقالات، کتابیں، خط اور شعر پھیلے ہوئے ہیں۔ الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی اور سیرت النبیؐ کا مؤلف 'شعرالعجم' اور 'موازنۂ انیس و دبیر' بھی لکھتا ہے، اسے علم الکلام کے ساتھ تصوف کے مباحث سے بھی دلچسپی ہے۔ گویا شبلی کو احساسات اور افکار سے یکساں تعلق ہے دونوں پر ایک جیسی قدرت ہے۔ ان کے نفسیات میں تاثر کی قوت توانا ہے۔ شعر و عقیدہ، فلسفہ و تاریخ، فقہ و مناظرہ جیسے مختلف مباحث سے اثر لینے میں کوئی ٹکراؤ محسوس نہیں کرتے۔ وہ ہر بات کو اپنے امکان بھر پوری طرح سمجھتے ہیں۔ اس کو "تاثر" یا "انفعال" کہا جاتا ہے۔ شبلی ہوں یا کوئی اور جب اس کیفیت سے لگاتار متصف ہوتا رہے، ایک ذہن اتنے رنگارنگ تاثرات سے وزنی ہو جائے تو اسے پڑھنے میں لطف اور سوچنے میں لذت حاصل ہونے لگتی ہے، وہ خود تو سمجھتا ہے مگر دوسروں کو سمجھانے کی قوت کھو بیٹھتا ہے، یہ شخص عالم ہے اس کا دماغ روشن اور اس کا ذوق علمی ہے اس کی فکر فلسفی ہے اس کی جستجو خوب سے خوب تر کی ہے وہ کوشش تو کر سکتا ہے مگر اچھی بات کہہ نہیں سکتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو علمی بحثوں سے دماغی قوتوں کو فقط روشنی ہی نہیں بخشتا بلکہ حرارت اور حرکت بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی حرارت و حرکت اس کے اندر ایک قوت پیدا کرتی ہے۔ جو "ابلاغ" کہلاتی ہے۔ یعنی فقط "فہم" سے ذوق ۔ اور "متحرک فہم و تاثر سے "ابلاغ" ابھرتا ہے۔ جو ذہن فقط فہم اور سمجھ کی قوت سے مالا مال ہے وہ "صاحب ذوق" ہے اور جو شخص فکر و فہم کے ساتھ "ابلاغ" بھی کمال رکھتا ہے وہ "ذوق آفرینی" ہے۔

ذوق، عربی لفظ ہے، اور لغت میں اس کے معنی ہیں: "قُوَّۃٌ تُدْرَکُ بِھَا الطُّعُوْمُ" جس قوت سے کھانوں کا مزہ معلوم کیا جائے اسے "ذوق" کہتے ہیں۔ اصطلاح میں، اس کی مختصر سی تعریف میں یوں کرتا ہوں۔

"ذوق: فکر و فن کی جمالیاتی حس"

ذوق کی بنیاد فکر و فہم، معلومات اور ماحول پر قائم ہوتی ہے۔ اس کی ایک انتہا لذت اندوزی اور طلب کا پورا ہونا ہے۔ دوسری انتہا لذت آفرینی اور خود نمائی ہے، دوسروں کو اپنے تاثرات دینا دوسروں کو لذت آشنا کرنا ہے۔

ہر زندہ انسان اور فعال آدمی خوبصورت چیز، خوشنما باغ، دل کش شعر، سننا چاہتا اور دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ جنت نگاہ مناظر اور فردوس گوش نغمے، مہکتے چمن اور جھومتے جنگل، لہریں مارتا سمندر اور دوڑتی ندیاں، نرم اور ملائم لمس، اگر وجدان کی پیاس اور جمالیاتی حس کو آسودگی اور لذت بخشیں تو آدمی آرام محسوس کرتا ہے، ورنہ تکلیف۔ ایک کا نام لذت و سرور ہے دوسرے کو کرب اور نفرت کہتے ہیں۔ پھر اس کیفیت یعنی مسرت اور نفرت محسوس کرنے والا اگر خاموش ہو جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ قوت "ابلاغ" سے خالی ہے۔ اگر بار بار اظہار کرے اور اپنے تاثرات کو مجسم کرے تو "فن کار" یا ذوق آفریں۔ اس کی مثال جگنو اور شمع ہے۔ جگنو خود چمکتا ہے دوسرے کو نہیں چمکا سکتا شمع خود روشن ہوتی ہے اور دوسرے کو حرارت بھی دیتی ہے روشنی بھی۔ جگنو سے چراغ نہیں روشن ہوتے، شمع سے محفل بھی روشن ہوتی ہے اور شمع بھی جلائی جا سکتی ہے۔

شبلی یہ باتیں شعوری طور پر جانتے تھے اسی لیے شعرالعجم میں لکھا ہے:

> "جب حقیقت پرستی کا "ذوق" دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو ہر چیز میں حقیقت کی تلاش ہوتی ہے اور وہی چیزیں محبوب معلوم ہوتی ہیں جو حقیقی ہیں، مثلاً حسن، لذت اور مسرت انسان کے اصلی مطلوب ہیں، انسان جن چیزوں پر جان دیتا ہے، جن چیزوں کے لیے جد و جہد کرتا ہے۔ جن چیزوں کا شیفتہ ہوتا ہے اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ ان میں حسن، لذت یا مسرت ہے۔ لیکن ان چیزوں میں بھی حقیقت اور مجاز کے مراتب ہیں۔ بچہ، کھیل تماشا، جھوٹی اور مصنوعی چیزوں کو پسند کرتا ہے جب ذرا بڑا ہوتا ہے اور اس کا مذاق کسی قدر صحیح ہونے لگتا ہے تو پسند کا معیار بھی ترقی کر جاتا ہے" (شعرالعجم ج ۵، الہ آباد ص ۱۶۷)

حقیقت، مجاز، استعارہ، کنایہ اور زمان و مکان، عمر اور شعور کے مسائل سے لے کر نفسیاتی اور ادب کے باریک مسائل تک شبلی کی رسائی ہے۔ شبلی کے معلومات اور ہمارے دوسرے ادیبوں کے معلومات ہو سکتا ہے کہ یکساں ہوں، ذوق کی پختگی بھی بہت سے ادیبوں میں اپنے اپنے اعتبار سے کامل ہوتی ہے لیکن اسے کیا کیجیے کہ اظہار و ابلاغ کا جو پیرایہ شبلی کو ملا ہے وہ بہت کم لوگوں کو مل سکا ہے، جن لوگوں کو یہ ملکہ حاصل بھی ہوا۔ انھیں پیش کرنے کا موقع نہ ملا۔ شبلی کا عالم سب سے جدا ہے وہ اپنے تاثرات یا ذوق کی حالت چھپا ہی نہیں سکتے، وہ بسا اوقات ایک ایک شعر پر دو دو صفحے لکھ جاتے ہیں، اور فکر و فن کے گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں، اعلیٰ درجہ کا پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ شاعر کا ذہن زیادہ شفاف ہے یا شبلی کی نظر زیادہ گہری ہے۔ یہی حال تاریخ و سوانح کا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ شبلی نے بعض چیزیں فقط اپنے ذوق کی آسودگی کے لیے لکھی ہیں۔ جیسے شعرالعجم اور موازنۂ انیس و دبیر۔ اسی وجہ سے

یہ دونوں کتابیں فارسی اور اردو کے شعری ذخیرے کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ مشرقی ادب کا مطالعہ ناممکن ہے جب تک یہ کتابیں پڑھی نہ جائیں۔ طالب علم کو یہ کتابیں پڑھنے کے بعد ہی بات سمجھنے اور شعر پرکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ان کتابوں سے آگہی اور نشاط حاصل ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ شبلی روایت کے زبردست حامی ہیں، ان کی تنقید ماضی بعید کے تصورات سے عبارت ہے۔ وہ طبعاً مدح خوان و قصیدہ گو ہیں، تعریف کرنا اور خوبیاں بیان کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں گویا وہ حالی کی ضد ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شبلی مشرقی دبستانِ تنقید کے اصولوں میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ مغربی اصول انھوں نے نہیں برتے۔ ظاہر ہے شبلی مشرق کے رہنے والے تھے۔ شبلی ایک دبستان کے عالم اور مفکر تھے، وہ ایک مزاج کے ترجمان تھے، وہ مزاج مشرقی ہے، وہ علوم مشرقی ہیں۔ آخر ہم اور آپ بھی مغرب میں تو نہیں رہتے، اگر مغرب کو مشرق نہیں کیا جا سکتا تو مشرق کو مغرب کیوں کر بنایا جا سکتا ہے۔ ہمارا تاریخی پس منظر، ہمارا ورثہ، ہمارا فن کسی سے کم نہیں۔ شبلی نے ہمیں ذوق گفتار دیا، انھوں نے مستشرقین کو ہنسنے سے روکا اور کہا ہمارا فن، ہمارا علم، ہماری قوت تم سے کم نہیں، ہمیں اپنے لہجے میں بات کرتے شرم نہیں آتی، بات سنو اور خیالات سے آگاہی حاصل کرو تو معلوم ہوگا کہ ہم کون ہیں، کیا ہیں۔ مغرب کی کتابیں پڑھ کر مشرق کو نہ دیکھو۔ مشرق کی کتابیں سمجھ کر مغرب سے پوچھو اور اسے سمجھو۔

شبلی نے کلام و مناظرہ کی طرح ادب کو نئے زاویے سے دیکھا، شاعری کو اس کے سیاق و سباق میں پرکھا، اس کے نتائج لکھے اور پوری محنت سے شعوری طور پر باضابطہ ان مشاہیر پر کام کیا جن کی شہرت شبلی کے زمانے میں مسلم تھی۔ بحث و جرح کے بعد بتایا کہ ہمارے ذوق اور ان مشاہیر کے فن میں جو مماثلت ہے وہ کیا ہے۔ فردوسی پر ان کا طویل کام اس بات کی دلیل ہے کہ شبلی کا ذہن بہت کشادہ اور ان کے معلومات بے انتہا حیرت خیز ہیں، اسی طرح انیس پر ان کی گفتگو بڑی خیال انگیز ہے فنی تجزیہ و تحلیل میں انھوں نے خشک منطق، خشک اصول اور بے نمک تحریر نہیں لکھی، شبلی نے فن اور فن کار، ماحول اور زمان و مکان کی روشنی میں تصورات اور خیالات کو دیکھا، خود اثر لیا، اپنے اثرات دوسروں کو دیے، اظہار اسی کرشمہ خیزی کا نام ہے۔

مضمون آفرینی، جدت ادا، خیال بندی، روزمرہ، محاورہ، پیرایہ، تشبیہ، استعارہ، حسن تعلیل، واردات اخلاق، خوش نوائی، شوخی و ظرافت، معاشرت و سیاست[1] غرض بے شمار زاویوں سے شعر کو پرکھا اور اس کے نیک و بد جانچنے کے عملی نمونے پیش کئے۔ طالب علم کو سمجھایا اور تجربہ کار ادیبوں کو روشنی دی۔

شبلی حسن دوست، لذت پسند اور مسرت کے متلاشی انسان ہیں، ان کے ذوق کو جہاں نشاط و آسودگی ملی

---

[1] شبلی نے ان اصطلاحوں کی تشریح کی ہے۔ اور عموماً شعرا کو انھیں اصطلاحوں کے ذریعے پرکھا ہے۔

دلاتے اس مقام سے دوسروں کو آگہی بخشی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو چیز خود حسین ہو گی وہ موثر بھی ہو گی۔

> "راگ کے دل کش اور موثر ہونے کا گر یہی ہے کہ جن سروں سے اس کی ترکیب ہو۔ ان میں نہایت تناسب و توازن ہو، الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صورت اور سر ہیں اس لیے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب گرد وپیش کے الفاظ بھی، جو ان کے مناسب ہوں۔"
>
> (موازنۂ انیس و دبیر طبع مجلس ترقی ادب لاہور ص ۴۵)

اسی بات کو سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے: میر انیس، حضرت علی اکبرؑ کے اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہیں:

تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں:

بلبل چہک رہا تھا ریاض رسولؐ میں

وہی مضمون ہے، وہی الفاظ ہیں، لیکن ترتیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا۔"

شعر العجم میں ظاہر سے باطن، معنوں سے مطلب، اشاروں سے نکتے، نکتوں سے ذوق آفرینی اور وجد کی حالت باکرتے ہوئے، خاص و عام ذہن کو متوجہ کرتے ہیں:

ہر زبان میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں، لیکن جب غور سے دیکھا جائے تو ان ماظ میں بھی باہم فرق ہوتا ہے، یعنی ہر لفظ کے مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے میں نہیں ئی جاتی مثلاً خدا کو فارسی میں خدا، پروردگار، داور، ایزد، آفریدگار سب کہتے ہیں بظاہر ان سب الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں، لیکن درحقیقت ہر لفظ میں ایک خاص بات اور ایک خاص اثر ہے ..... اس لیے شاعری کی نکتہ دانی یہ ہے کہ جس مضمون کے ادا کرنے کے لیے خاص جو لفظ موزوں اور موثر ہے وہی استعمال کیا جائے، ورنہ شعر میں وہ اثر پیدا نہ ہوگا۔ یہ ایک دقیق نکتہ ہے۔ اور بغیر اس کے کہ ایک خاص مثال میں ایک ایک لفظ پر بحث کر کے نہ سمجھایا جائے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ فیضی کا شعر ہے:

بانگ قلم دریں شب تار　　　بس معنی خفتہ کرد بیدار

ش کا اصل مضمون یہ ہے کہ "شاعری میں میں نے بہت سے نئے مضمون پیدا کیے" اس کو استعارے کے پیرایے

میں یوں ادا کیا ہے کہ "میرے قلم کی آواز نے بہت سے سوتے ہوئے معنوں کو جگا دیا" اب اس کے ایک ایک لفظ پر خیال کرو۔ بانگ، خاص اس آواز کو کہتے ہیں جس میں بلندی اور فخامت ہو، جو جگانے کے لیے موزوں ہے بانگ اور آواز اور صریر ہم معنی ہیں ۔ اس لیے "بانگ قلم" کے بجائے "آواز قلم" اور "صریر قلم" بھی کہہ سکتے ہیں، اس موقع کے لیے صرف "بانگ" موزوں ہے۔

قلم، کو فارسی میں خامہ اور کلک بھی کہتے ہیں، لیکن قلم کے لفظ میں جو فخامت اور رعب ہے اور لفظوں میں نہیں متکلم کے میم نے مل کر اس فخامت کو اور بڑھا دیا ہے، بانگ اور قلم کی ترکیب نے لفظ کو اور زیادہ پُر وزن کر دیا ہے۔ تار، کو تیرہ اور تاریک بھی کہتے ہیں، لیکن اس مصرع میں حسن صوت کے لحاظ سے تار ہی موزوں ہے "بس"، کے ہم معنی بہت سے الفاظ ہیں، مثلاً بسیار، لختے، خیلے، وغیرہ لیکن "بس" کے لفظ میں کثرت کی جو توسیع ہے اور لفظوں میں نہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کرو، تب یہ نکتہ حل ہوگا کہ اس شعر میں جو اثر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مضمون کی ایک ایک خصوصیت ظاہر کرنے کے لیے جو الفاظ درکار تھے اور جن کے بغیر وہ خصوصیت ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ سب شاعر نے جمع کر دیئے ہیں ۔ اور ان باتوں کے ساتھ اصل مضمون کی اصلیت اور طرز ادا میں جدت اور ندرت پیدا کی ہے۔"

(شعر العجم جلد چہارم طبع لکھنؤ ص ۴۴)

اسی انداز میں شبلی فن پارے، شعر یا کسی علمی نکتے سے بحث کرتے ہوئے اس کی لطافتوں سے فکر و نظر، ذوق و وجدان کو مسرت اور معنی رسی تک پہنچاتے ہیں، سلیقہ اور اسلوب کا یہ طریقہ اور اس کے نتائج کو میں "شبلی کی ذوق آفرینی" کہتا ہوں۔

خیالات عزیز

یہ مولوی عزیز مرزا (سابق معتمد آل انڈیا مسلم لیگ و انجمن ترقی اردو ہند) کے علمی، ادبی، لسانی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے بعض مضامین یہ ہیں:۔

- اکبر اعظم
- دربار بغداد کی ایک جھلک
- سکے کی ابتدا اسلام میں
- کاغذ کا رواج اسلام میں
- ایشیائی شاعری کا موضوع کیا ہے
- خطبۂ صدارت اردو کانفرنس بدایوں

اس مجموعے کو آنجہانی پنڈت دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" نے مرتب کیا تھا۔ اور اس پر نواب وقار الملک مرحوم کا دیباچہ ہے

قیمت:۔ چار روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

ہفت مقالہ

(فارسی زبان و ادب)

یہ رسالہ "اردو" کے ایسے مضامین کا انتخاب ہے جو فارسی زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ یہ انتخاب ممتاز ماہر ایرانیات سید حسام الدین راشدی نے کیا ہے۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں۔

تصنیفات شیخ فریدالدین عطار	حافظ محمود شیرانی
شاہ نامے کا دیباچۂ قدیم	حکیم شمس الله قادری
فردوسی کا مذہب	پروفیسر شیخ محمد اقبال
رباعیات عمر خیام	عبدالباری آسی لکھنوی
فارسی زبان کے زیر سایہ زبان اردو کی تدریجی ترقی	ڈاکٹر سید عبداللہ
نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں (مصنف مآثر الامراء)	محمد حسین محوی صدیقی

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ
کراچی نمبر ۱

پریم پال اشک

سرشار کی شخصیت

لطائف و حقائق کی روشنی میں

(۱)

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار مرحوم نے اپنے احباب کو گھر پر مدعو کیا۔ اور خود وہاں سے غائب ہو گئے۔ دعوتیوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نظر کی مگر بجز ایک فقرہ کے جو کہ دروازے پر لکھا تھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ وہ فقرہ یہ تھا "آج اپریل فول ہے! آپ اس کا فائدہ اٹھائیں"۔

اس پر سب کے سب ہنس دیئے اور ہوا خوری کرتے ہوئے گھروں کو واپس ہو گئے۔

(۲)

پنڈت برج کشن گگو فرماتے ہیں۔ کہ ایک روز پنڈت رتن ناتھ سرشار صبح صبح تشریف لائے۔ گگو صاحب کے بھائی گھر پر نہیں تھے۔ لہٰذا انھوں نے کہا "بھائی صاحب کہیں تشریف لے گئے ہیں" سرشار نے فرمایا "مگر تو اپنے ساتھ نہیں لے گئے" انھوں نے شرما کر کہا۔ "چلئے تشریف رکھئے، آتے ہی ہوں گے"۔

کمرے میں پہنچتے ہی الماری سے بوتل نکالی اور گلاس میں انڈیلنے گئے۔ پنڈت برج کشن گگو نے کہا "سوڈا لے آؤں!" سرشار نے جواب دیا "ارے ہم شراب پیتے ہیں۔ ہولا کر شیدوں میں داخل نہیں ہوتے۔ جاؤ بھابی صاحب سے پان بنوا لاؤ" انھوں نے پھر دریافت کیا "کچھ کھانے کو بھی لاؤں!" سرشار فرمانے لگے۔ "بچے ہو۔ پینے والا کھانا اُس وقت کھاتے ہیں، جب پینے کو نہ ملے۔ آج پینے آئے ہیں، کھانے کی ضرورت نہیں"۔

پنڈت برج کشن گگو پان لینے چلے گئے۔ جب پان لے کر آئے تو کیا دیکھا کہ خالی بوتل فرش پر لڑھکی پڑی ہے۔ اور خالی گلاس تپائی پر رکھا ہے۔ فرش پر لیٹ گئے۔ گگو صاحب کے بھائی صاحب بھی تشریف لائے۔ مرزا احمد علی بیگ اور ایک اور پنڈت ان کے ساتھ آ گئے۔ رات بھر میں شراب کی بارہ بوتلیں خالی ہو گئیں۔

(۳)

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنؤ میں امین آباد کے مقام پر اس جگہ قیام پذیر تھے جہاں آج کل ترکاری منڈی ہے۔ اس زمانے میں کشمیری محلے سے امین آباد آنا قیامت کا سامنا کرنے کے مصداق تھا، نہ سڑکیں اچھی تھیں نہ سواریاں ہی مہیا تھیں۔ بہت کہنے اور تقاضوں پر آپ نے اپنے دوست احباب کی دعوت کی۔ یارانِ طریقت امین آباد کا سفر طے کر کے جمع ہو گئے۔ آپ گھر سے غائب۔ نوکر سے معلوم ہوا، مچھلی آگئی ہے اور حکم دے گئے ہیں کہ پوری بنا لینا۔

لوگ انتظار کرتے رہے کہ اب آئیں کہ اب آئیں جب حضرت دن کے ۱۱ بجے تک نہ آئے۔ تو ایک صاحب مچھلی بنانے کو تیار ہوئے۔ دگھر میں تیل تھا نہ لکڑی!

غرض یاروں نے پیسے نکالے۔ مچھلی بنی۔ بازار سے پوری آئی۔ اور سب کھانے بیٹھے ہی تھے کہ آپ بھی آ دھمکے اور کھانے میں شریک ہو گئے۔

(۴)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سرشار الہ آباد ہائی کورٹ میں ملازم تھے تنخواہ میں ترقی ہوئی۔ ساتھیوں نے کہا: "یار سب کے ہاں کھاتے ہو۔ خود نہیں کھلاتے!" سرشار نے فرمایا: "بھائی، دن اور تاریخ مقرر کر لو۔ جو نہ کھلائے اس پر لعنت ہے"، تاریخ اور وقت مقرر ہو گیا۔

دعوت سے ایک روز قبل سرشار ایک صاحب کے ہاں پہنچے۔ فرمایا "مجھے یاد ہے کل کی دعوت ہے۔ دیکھو میاں، سب انتظام تو کر لیا ہے۔ کباب کا انتظام نہ ہو سکا تمھارے گھر کے سامنے جو یہ کباب بناتا ہے بھائی، لاجواب بناتا ہے۔ کل جب آنا تو اس سے کباب لیتے آنا۔ میں نے اس کو آرڈر دے دیا ہے"

دوسرے صاحب سے فرمایا "تمھارے پڑوس میں کیسی لذیذ بالائی بنتی ہے۔ میرے پاس آدمی نہیں ہے۔ کل ذرا تکلیف کر کے بالائی لیتے آنا!"

اس طرح آٹھ اشخاص سے آٹھ فرمائشیں کر دیں اور اطمینان سے گھر میں بیٹھے رہے۔

دوسرے دن ہر مہمان ایک ڈولچی لیے چلا آرہا ہے، اور لذیذ کھانے اڑا رہا ہے، ظاہر ہے دام تو دکاندار نے انھی سے لیے جو اس کے یہاں سے سودا لے گیا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے!

(۵)

بابو گنگا پرشاد ورما لکھنؤ کی ایک اعلیٰ شخصیت ہو گزرے ہیں۔ ان کی یاد میں امین آباد پارک کے سامنے ایک کتب خانہ چل رہا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، وہ سرشار سے بہت خفا ہوئے اور کہا "کہ اب تمھیں کبھی نہ کھلائیں گے" بابو صاحب کے یہاں کی پوریاں آپ کو بہت پسند تھیں، آپ کو یہ ضد کہ ہم کھا کے رہیں گے۔

غرض ایک روز آٹھ بجے رات کو حال پریشان، صورت ہراساں، سرشار بابو گنگا پرشاد ورما کے گھر پر پہنچ گئے۔ اور کہا: "غضب ہوگیا، اس ناوقت چچا صاحب آگئے۔ آپ جانیں میرے ہاں مسلمانی کارخانہ ہے۔ وہ دھرم کے پابند ہیں۔ نوکر چلا گیا۔ مہربانی کرکے آپ اپنا نوکر ساتھ کر دیجیے۔ ایک گلاس پانی لے چلے، میں بازار سے پوری دلوا دوں گا۔"

بابو صاحب چکمے میں آگئے۔ کہا "ہم نے تمھیں کھلانے کی قسم کھائی ہے۔ چچا صاحب سے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ تم گھر چلو، چچا صاحب کی خاطر کرو۔ ہم سب سامان بھجوا دیتے ہیں۔"

غرض سرشار نے اس دن ورما صاحب کے پکوان کی خوب داد دی۔ اور نوکر کے ہاتھ شکریہ کا خط بھیجا، جس میں تحریر تھا کہ چچا صاحب کدھر آئے اور چلے گئے، کچھ پتہ نہ چلا۔ کھانا خراب ہوتا۔ مجبوراً مجھے کھانا پڑا۔"

بابو صاحب کو معلوم ہوا تو بہت ہنسے اور سرشار سے کہا کہ بھائی میں نے توبہ توڑ دی۔ جب جی چاہے بلا تکلف آکر کھا جایا کرو۔

(۶)

سرشار بے حد گھگھڑ تھے۔ ان کی رہائش امین آباد میں ایک سرخ رنگ کی عمارت میں تھی۔ اس وقت اسے امام بخش کی کوٹھی کہتے تھے وہاں آج کل ترکاری منڈی ہے۔ پنڈت بشن نرائن در بھی وہیں رہائش پذیر اور ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی پنڈت اودت نرائن در بھی رہتے تھے۔ سرشار ان کے پڑوسی تھے وہ دونوں پچیس روپے ماہانہ کرایہ دیتے تھے۔ بقول پنڈت اودت نرائن در مرحوم ایک بار سرشار بہت بیمار ہوئے۔ گھر والوں نے آپ کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ بہت پریشان ہوئے۔ ایک روز ان کے ہاں چند مسلمان خواتین آئیں جب جانے لگیں تو سرشار بھی برقعہ اوڑھ کر تیار ہوگئے جب نوکر نے آواز لگائی کہ پردے میں ہو جائیے زنانہ ہے۔ تو آپ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اور باہر آتے ہی برقعہ پھینک یہ جا، وہ جا!

جب گھر والوں کو معلوم ہوا تو خوب ہنسے۔ اس کے بعد آپ پر سے پابندی اٹھا دی گئی۔

(۷)

ایک بار سرشار محفلِ احباب میں بیٹھے تھے کہ کسی نے دستک دی سرشار قدرے گھبرا کر کہنے لگے۔

"آگیا.... آگیا... آگیا!"

احباب نے پوچھا "میاں کون آگیا؟

"ملک الموت! بخدا مجھے بچاؤ" جواب ملا۔

سب حیران پریشان کہ ملک الموت ہے کہاں؟ آخر جب چاروں طرف نظر دوڑائی گئی تو دیکھا کہ ایک کالا بھجنگ شخص کھڑا ہے۔ یہ نول کشور پریس کا چپراسی تھا۔ سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے مگر وہاں کاغذ تھا نہ قلم نہ دوات نہ روشنائی۔ آخر حیلے وسیلے نکالے گئے۔ یہیں سے کاغذ کا چیتھڑا ڈھونڈا گیا۔ چق کا سرکنڈہ نکال کر قلم بنایا گیا اور اسی وقت کوئلہ پیس کر روشنائی

بنا لی گئی۔ پھر حضرت سرشار نے فسانۂ آزاد کی قسط قلم برداشتہ لکھ کر دیتے ہوئے کہا "جا بھائی جا! میرا پیچھا چھوڑ!"

(۸)

پنڈت لچھمی نارائن صاحب در مرحوم کی لکھنؤ والی کوٹھی میں رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ سرشار تھوڑی دیر بیٹھ کر ایک کمرے میں تشریف لے گئے۔ گھنٹے آدھ گھنٹے بعد اپنے دوست پنڈت مادھو پرشاد صاحب مشرا کے ساتھ اقبال کرشن در اس کمرے میں آگئے۔ دیکھا کہ سرشار اپنے شغل میں مشغول ہیں۔ انھوں نے ہمیں بلا کر دریافت کیا کہ کسی کے پاس کاغذ اور پنسل ہے!"

صاحب نے کہا "میں ابھی لاتا ہوں"

اور پھر چند منٹ بعد وہ دونوں چیزیں لے کر آگئے۔ سرشار فرمانے لگے "اچھا لکھو۔۔۔!"
ایک شخص سے مذاق ہوتا رہا اور ساتھ ہی مضمون بھی لکھواتے جاتے تھے مگر مضمون کے تسلسل میں کوئی کمی نہیں آئی۔
تھوڑی دیر بعد کہا "کاغذ رکھ دو اور جاؤ!"
مضمون مکمل ہو گیا تھا۔

مقامات ناصری

میر ناصر علی کے نادر مضامین کا مجموعہ آئندہ ماہ شائع ہو رہا ہے

اس انتخاب میں میر ناصر علی کے شہرۂ آفاق رسالے "صلائے عام" کے علاوہ تیرھویں صدی' زمانہ' افسانہ' ایام' اور ناصری' وغیرہ قدیم رسائل کے نادر اور بیش بہا ادبی و تنقیدی مضامین اور انشائیے شامل ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم' علامہ نیاز فتحپوری مرحوم اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تقاریظ کے علاوہ میر ناصر علی کا بسیط تذکرہ بھی ہے اور بعض مشاہیر کے ایسے کمیاب خطوط بھی ہیں جو اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوئے۔

انجمن ترقی اردو باباۓ اردو روڈ۔ کراچی نمبر۱

تحسین سروری

چنچل نار

ایک ناول ـــ ایک بحث

میرے پاس ہماری زبان کے جو متفرق شمارے ہیں ان میں [illegible] شماروں میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر مرحوم کے ناول [illegible] تصنیف ہے اور دوسرے فریق کا خیال ہے کہ یہ دراصل پنڈت رتن [illegible] ہماری زبان میں یہ بحث کب تک چلی اور فیصلہ کن بات کیا ٹھیری، [illegible] اس کے علاوہ [illegible] میں [illegible] یہ ہے کہ "چنچل نار" کے اصل مصنف کا مسئلہ [illegible] ہماری زبان میں شامل مضامین کی روشنی [illegible]

۵ اردسمبر کے ہماری زبان [illegible] اکتوبر [illegible] کی اشاعت میں ڈاکٹر قمر رئیس کا ایک مراسلہ شائع ہوا تھا جس کے ذریعہ [illegible] کشن پرشاد کی تصنیف ہونے میں [illegible] ماحول کا جائزہ لیا ہے اور داخلی شہادتوں [illegible] کا سلیقہ، لکھنؤ کی محاوراتی و بیگماتی زبان، انداز بیان کی شوخی وغیرہ سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے مصنف [illegible] پنڈت سرشار ایک [illegible] شامل سے اس

[illegible] پر حکم چند نیر صاحب قمر رئیس صاحب کی دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں -

"شاگردوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ان کے کلام و دیگر نثری تخلیقات
میں ان کے استاد کا رنگ پایا جانا چاہیئے اور استاد کی استادی کا کمال اس میں
ہوتا تھا کہ اس کے تلامذہ کی تمام تخلیقات از سر تا پا اس کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوں"

پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ قمر رئیس صاحب نے اپنے مقالے میں اشک صاحب کے مقالے کا حوالہ دیا تھا، اس پر نیر صاحب لکھتے ہیں -

"اشک صاحب بھی نیر صاحب کی طرح شک کے شکار ہیں"

اشک صاحب کے نزدیک "چنچل نار" کے تصنیف سرشار ہونے کے جو دلائل ہیں ان کی وضاحت نیر صاحب یوں کرتے ہیں -

(۱) اس میں سرشار کا [illegible] کے ساتھ نمایاں ہے [illegible]

(۲) [illegible] جو سرشار اپنی تصانیف میں لکھا کرتے تھے [illegible]

(۳) اس میں [illegible] ہونے کے باوجود [illegible] زبان ہے [illegible]

(۴) [illegible] میں حیدرآباد کے بجائے اودھ کا ماحول ہے وغیرہ وغیرہ [illegible]

ایک دلچسپ بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اشک صاحب نے شاد اور سرشار کی کشیدگی کا ذکر کیا ہے [illegible] کا [illegible] شاد نے "چنچل نار" کو اپنے نام سے چھپوانا چاہا تو سرشار [illegible] کے [illegible] کے نام سے شائع ہوا [illegible] نیر صاحب نے اشک صاحب سے [illegible] چکبست کی جن تین سطروں کا حوالہ دیا ہے انھیں نیر صاحب نے نقل کر دیا ہے بالفاظ [illegible]

"افسوس کہ اس باکمال نے اپنی قدر آپ نہ کی [illegible] دل میں جگہ [illegible] سنتے ہیں کہ آخر زمانے میں حیدرآباد میں بھی مہاراجہ شاد نے [illegible] شفقت کھینچ لیا"

[illegible] چکبست کی اس تحریری شہادت میں مہاراجہ شاد کا "چنچل نار" کو اپنے نام سے چھپوانے کی کوشش کرنا [illegible] سرشار [illegible] واضح ہو جاتا ہے [illegible] ان دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے [illegible] ذہن کی [illegible] کی تحقیقی صلاحیتوں کا [illegible]

[illegible] شمارہ ہماری زبان [illegible] اشک صاحب کا مضمون نیر صاحب کے جواب میں شائع ہوا ہے [illegible]

[illegible] تحقیق اور تنقید [illegible]

[illegible]

[illegible]

اس ناول کے صفحہ ۲ پر حضرت شاد [illegible]

[illegible]

آئی تو اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا لیا ہو۔"

[illegible] مہاراجہ شاد کی بعض تصانیف کے کئی کئی ایڈیشن نکلے ہیں [illegible] ہوں گے۔
چنانچہ پریم پال اشک نے جو نسخہ دیکھا ہے وہ ۱۳۲۲ھ کا مطبوعہ ہے [illegible]
[illegible] قارئین کو مغالطے
[illegible]

[illegible]

نام ہوتا تھا، اس کا ثبوت مہاراجہ کی عبارت سے بھی ملتا ہے جو آگے چل کر [illegible]

[illegible] پریم پال اشک [illegible]

[illegible]

اس موقع پر یہی [illegible] اور ماہر انشا پرداز ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ وہ اپنے کو زبان دانی [illegible] ۔ اور کوشش کرتے تھے [illegible] استعمال سے کام لیتے تھے۔ اس پر بھی بیشتر جگہ مقامی بول چال [illegible] سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں [illegible] ہو جاتے تھے۔ نقوش کے مذکورہ خطوط میں ایک جگہ حضرت شاد نے [illegible] باتیں مشہور ہیں۔ لکھا ہے۔ اشک صاحب کو "اہلِ وطنوں" میں "ں" کی اضافت پر اعتراض ہے [illegible] اتنی ہی باتیں شمالی [illegible]

پہلے اعتراض کا یہ جواب ہے کہ مہاراجہ شاد کا جس نسل یا [illegible] پر کیا موقوف ہے اُن کے [illegible] ترکیبیں استعمال کرتے تھے اس سے زیادہ سند کیا پیش کی جائے [illegible] آثار الصنادید یا مضامین سرسید اٹھا کر دیکھ لیجئے تصدیق ہو جائے گی ۔

[illegible]

[illegible] دوسرا اعتراض [illegible] محاوروں میں [illegible] طرح لفظوں کی الٹ پھیر [illegible] جس پر وہ الزام عائد کر رہے ہیں اُس کی شخصیت کو [illegible] حاصل [illegible] اس لحاظ سے جدید نسل کے لیے [illegible] کو چھوڑ کر [illegible] اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ سرشار کے انتقال [illegible]

جیسے معمولی درجے [illegible] مند امیر کا کام تھا۔
کشن پرشاد جیسے [illegible] صاحب چیلنج کرتے
ہیں کہ۔ [illegible]

[illegible] ور اگر

[illegible]

[illegible]

اِس غیر علمی سوال کا [illegible] مولف ہیں۔ جن میں
(۲۷) کتابیں زیور [illegible] ہے۔ یہ الگ بات کہ ان
کے ناولوں کو وہ مقبولیت [illegible]

سرشار [illegible] میں فوت ہوئے۔
مہاراجہ شاد پنڈت [illegible] اور سرشار کے مرنے
کے بعد [illegible] تک [illegible]

ذیل میں [illegible] یقین ہے کہ [illegible]
مزید بحث کی گنجائش [illegible]

شاد نے [illegible] اور رسالہ "دبدبۂ آصفی"
جاری کیا تھا۔ [illegible] مضامین شائع ہوتے
تھے۔ ان دو مجلوں [illegible]

دبدبۂ آصفی [illegible] جس میں (۱۲) خطبات
الہ (۲۱) علمی، ادبی [illegible] آئے تھے۔ غالباً اِسی
مناسبت سے اس [illegible] ہے جو پنڈت رتن ناتھ
سرشار کے انتقال کے چار سال بعد [illegible] میں مطبع اختر دکن، حیدر آباد میں چھپا۔ کتاب کے شروع میں حضرت شاد کا (۷) صفحہ کا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] نکل نکل کر پھیل گئیں اور قدر دانوں کے نخلِ تمنا کو نہال کر دیا۔

[illegible] پنڈت جی نے فسانۂ آزاد کو تمام کر کے [illegible] نثر نگاری کی [illegible] تمام عالم میں [illegible] جا بجا کتابیں اور رسالے تیار ہونے لگے۔ مرآۃ العروس، توبۃ النصوح اور [illegible] حیات وغیرہ نے لطف بڑھا دیا۔ [illegible] ریاض الاخبار، اودھ پنچ، اودھ اخبار وغیرہ اخبار [illegible] نے بڑی قابلیت کے ساتھ [illegible] کے ساتھ ترجمہ ہو کر شائع ہوئے جیسے [illegible] سرشار [illegible] لکھنؤ کا احسان اردو لٹریچر پر [illegible] یہی کہتا ہوں کہ مجھے جو نثر نگاری کی طرف میلان ہوا اس کا باعث فسانۂ آزاد کی تحریر ہے [illegible] طرزِ تحریر [illegible] وہ ہر ہر فقرے میں محاوروں، مثلوں، مقولوں کا برسنا۔ وہ گرما گرمی [illegible] میں [illegible] جب میری نظر سے حضرت غالب اور حضرت آزاد کی تصنیفات گزریں۔ میں نے انھیں کے طرز کو ترجیح دی اور ساعی ہوں کہ [illegible] میں کامیابی حاصل کروں [illegible] نثر نگاری کا شوق [illegible] بچپن [illegible] اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دوسری زبان سے ترجمہ کر کے [illegible] شائع کر چکا تھا [illegible]

[illegible]

[illegible] سطروں میں سرشار کی تعریف میں ایک جملہ ہے "بے نیاز اتنے تھے کہ کبھی کسی رئیس کے ہاں نہیں گئے" سرشار [illegible] اور ادب میں ان کی [illegible] لکھنے والے سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سرشار جیسے [illegible] پرشاد کے [illegible]

(باقی اگلے صفحہ پر)

[illegible]

ناول کے پیرایے میں میں نے لکھی تھی اور "فسانۂ شیدا" نام تھا ناتمام ہونے کی وجہ سے

شائع نہیں ہو سکی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مہاراجہ سرکشن پرشاد [illegible] کے انتقال کے بعد ان کی ہمہ گیر شخصیت کی یاد تازہ رکھنے [illegible] علمی، ادبی اور سماجی کارناموں کو زندہ رکھنے کے خیال سے [illegible] قائم کرنے کی تجویزیں پیش کیں۔ ان میں ایک تجویز یہ تھی کہ حضرت شاد کی حیات [illegible] اس سلسلے میں مرزا [illegible] بیگ صاحب مرحوم اور نواب [illegible] جنگ [illegible] کام جاری ہوا اور حافظ محمد مظہر صاحب نے تالیف کتاب کا کام شروع کر دیا۔ کتاب تو تیار ہو گئی لیکن [illegible] حذف و اضافہ میں کئی سال لگ گئے۔ تاہم [illegible] نواب مہدی نواز جنگ کے دیباچہ کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں مہاراجہ کشن پرشاد [illegible] کے نام سے چھپ گئی۔ یہ کتاب [illegible] تقطیع کے (۲۴۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں مہاراجہ شاد کی حیات [illegible] حالات کا بعض معتدبہ حصہ نقل کیا گیا [illegible] میں ان طویل

[illegible]

(بقیہ صفحہ سابق) میں [illegible] پر حرف آتا ہے۔

[illegible]

[illegible] کی عبارت

اقتباسات کے لیے [illegible]

[illegible]

ملاحظہ ہو۔

[illegible]

> بازار حسن [illegible] ادنیٰ سے

[illegible]

طبع ہوئی تھی [illegible] میں پنڈت رتن ناتھ سرشار [illegible] کے بادہ خوار دکن میں

[illegible]

ہوئیں اور ان کے خیر مقدم کی تقریب میں شاعروں کے جلسے منعقد ہوتے [illegible]

کی آؤ بھگت کی۔ اہلِ کمال بھی اُن کے قلم کو مانتے تھے اور داد دے کر قدر دانی فرماتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھ تک بھی اُن کے آنے کی خبر پہنچی۔ اور راجہ بنسی لال کی بدولت سرشار ذی وقار سے تعارف ہوا...... حق تو یہ ہے کہ یہ بھی ایک عجیب اور نایاب فرد تھے۔ اردو کے میدان میں تو اس کی نثر کا لوہا ہندوستان نے مان لیا تھا، مگر انگریزی نشاری بھی اس شخص کی نئی ادا کے ساتھ تھی۔ ظرافت تو گویا گھٹی میں پڑی تھی مشرب آزادانہ۔ مزاج کی شوخی طبیعت کی تیزی خدا داد تھی۔ یارِ شاطر نہ بارِ خاطر۔ مگر افسوس ہے کہ بقول ذوق ؎

اے ذوقؔ دخترِ رز کو نہ ہرگز تو منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

دخترِ رز اُن کے عقد میں آگئی تھی۔ اس کے ساتھ ان کا عشق کوہکن کے رتبہ تک پہنچ گیا تھا، جس کی بدولت مفت میں اپنی جانِ شیریں گنوائی۔ الغرض ان کی صحبت میں میں نے نظم و نثر میں بہت کچھ حاصل کیا۔ میرے یہ دوست جاں نثار دوست اور سچے رفیق اور شفیق بھی تھے۔ میں نے انہی کی بدولت اردو نویسی میں مہارت حاصل کی اور اہلِ زبان تحسین کے تحائف سے مجھے یاد و شاد فرماتے ہیں۔ ۱۳۱۰ھ میں انھیں کی ترغیب سے میں نے "مطلع خورشید" کے نام سے ایک ناول لکھا اور سرشار کی نظرِ ثانی کے بعد طبع اور شائع کرایا گیا۔ فسانۂ شیدا ابھی نامکمل تھا اور ابھی اُن کی نظرِ اصلاح کے منظور نہیں ہوا تھا، لہٰذا اس کے طبع کا موقع نہیں آیا۔ ۱۳۱۳ھ میں بتقریب یادگار سالگرہ حضرت مہاراجہ ظل اللہ دو رسالے "محبوب الکلام" اور "دبدبۂ آصفی" نظم و نثر میں نکالے گئے۔ ان میں جس قدر مضامین میں نے لکھے وہ سب اُن کے دیکھے اور پڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ دبدبۂ آصفی میں ایک اردو ناول چھپنا شروع کیا جو "چنچل نار" کے نام سے موسوم ہے۔ ابھی یہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ بعض احباب نے اصرار کیا کہ بصورت کتاب ایک ہی وقت یہ طبع اور شائع ہو جائے تو مناسب ہے۔ میں نے اس درخواست کو بدل منظور کیا اور فوراً اس کا طبع ہونا موقوف کر دیا۔ جہاں تک کتاب چھپی تھی وہاں تک سرشار کی نظروں سے گزر چکی تھی، باقی جو حصہ رہ گیا تھا وہ ۱۳۲۲ھ میں لطیف احمد اختر مینائی (فرزند حضرت امیر مینائی) کی مدد سے پورا ہوا۔ چونکہ سرشار

> اور اختر صاحب دونوں ہم وطن اور باعتبار علم و زبان و کلام ایک ہی خاندان کے دو مہرے تھے، میں نے مناسب خیال کیا، بقیہ حصہ انھیں کے مشورے سے چھپایا جائے۔"

ان اقتباسات کے بعد ڈاکٹر قمر رئیس اور جناب پریم پال اشک کے دعوے بے دلیل اور ان کے تحقیقی کارنامے بیکار محض ہو کر رہ جاتے ہیں۔ "چنچل نار" میں ہندو ماحول ہونے کے باوجود لکھنؤ کی بیگماتی زبان کا ہونا، اودھ کا پس منظر اور سرشار کا رنگ، یہ سب کچھ کیوں تھا، اس کا جواب مہاراجہ شاد کی مندرجہ بالا تحریروں میں موجود ہے۔ اور جیسا کہ حضرت شاد کی تحریر سے واضح ہے، یہ پورا ناول دبدبۂ آصفی میں چھپا بھی نہیں۔ چند قسطوں کے بعد رسالے میں اس کی شمولیت موقوف ہو گئی۔ اور کتاب کی صورت میں شائع ہونے سے قبل سرشار فوت ہو گئے۔ بعد کو اس کی تکمیل اختر مینائی کی مدد (یعنی تصحیح) سے ہوئی۔ اگر اب بھی کسی نے یہ اصرار کیا کہ چنچل نار مہاراجہ شاد کی تصنیف نہیں ہے تو، پھر یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ یہ ناول سرشار کا ہے یا اختر مینائی کا۔ اس لیے کہ دونوں لکھنؤ کے ہیں اور دونوں نے اس کی تصحیح کی ہے۔

اشک صاحب نے چنچل نار سے عورتوں کے چند مکالمے سرشار کی تصنیف ثابت کرنے کے لیے نقل کئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خاص لکھنؤ کے انشا پردازوں کی زبان ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی زبان شہر حیدرآباد کے اردو بولنے والے ہندو مسلمان گھرانوں کی عورتیں بولتی ہیں۔ سرشار اور حضرت اختر مینائی کی نظر ثانی کے بعد مزید اس میں لطف پیدا ہو گیا ہو تو تعجب نہیں۔

قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کس قدر منکسر المزاج، حق پرست اور صاف گو انسان تھے۔ شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کا انھیں بچپن سے شوق تھا لیکن آخر وقت تک بھی اپنے کو وہ طالب علم ہی سمجھتے رہے۔ جب تک کہ اپنی تحریر کسی ماہر فن کو نہ دکھا لیتے مطمئن نہ ہوتے۔ چنانچہ چنچل نار کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت لکھ رہے ہیں جب کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار راہیٔ ملکِ عدم ہو چکے ہیں۔ آخر میں حضرت شاد کا ایک مکتوب نقل کرتا ہوں جس سے ان کے مذاقِ سلیم اور زبان و محاورے کے نکتوں سے بہرہ مندی کا ثبوت ملتا ہے۔ اتفاق سے یہ مکتوب پنڈت رتن ناتھ سرشار کے نام ہے۔ اور اس کی اشاعت سرشار کی زندگی ہی میں ہوئی۔

سرشار ذی وقار پنڈت رتن صاحب!

> مجھے آپ کی اس رائے سے کہ طرز کا لفظ مونث ہے ضرور اختلاف ہوتا اور میں تعجب کرتا کہ اتنا بڑا طبیعت دار آدمی اور طرز کی جمع طرزیں لکھے۔ سنا تو یوں ہی ہے کہ ان کی روش، ان کا رنگ، آپ کا طرز، آپ کا رویّہ، مگر جب آپ نے اپنے استاد گراں مایہ تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی اور جہاں استاد فصیح الملک بہادر داغ دہلوی

اور منشی امیر احمد صاحب مینائی لکھنوی کی مثالیں دیں کہ وہ طرز کو مونث باندھتے ہیں تو پھر اب گنجائش اعتراض یعنے چہ ؟ - لیکن پنڈت جی اچھی طرز کہنا کانوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا - اور اس کے تو آپ خود قائل ہیں کہ اہلِ لکھنؤ آج کل طرز کو بالاتفاق مذکر بولتے ہیں ہاں، صاحب خوب یاد آیا - آپ نے کچھ کچھ بند جو بطرز مراثی تصنیف کئے ہیں، مجھے روضۂ شریف میں دکھلائے تھے - ان میں سے ٹیپ کا شعر مجھے یاد ہے - آپ کہتے ہیں ؎

ہو سب کو عشق میرے کلامِ نفیس کا
ہر شعر میں ہو طرزِ دبیر و انیس کا

بندگی، پنڈت جی! اب کہئے آپ نے طرز کو مذکر باندھا ہے یا نہیں - اور آپ اس کو کیا کیجئے، پبلک کا میلانِ طبع ہی آج کل یہ ہے - اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں - میں نے ٹیپ کے مصرعِ ثانی میں ایک لفظ بدل دیا - آپ نے لکھا ہے ع

ہر شعر میں ہو طرزِ دبیر و انیس کا

میں نے یوں بدل دیا -

ہر شعر میں ہو رنگ دبیر و انیس کا

میرا خدا اور میں کہ یہ بطریقِ اصلاح نہیں ہے - ایک بات ذہن میں آئی، لکھ دی - اس وقت ایک شعر یاد آیا، کان دھر کر سنئے ؎

الٰہی نرم گرداں از کرم دلہائے خوباں را
وگرنہ عشق را ناپید کن یا عشق بازاں را

بارک اللہ - اس کا لطف روکھے پھیکے آدمیوں کو نہ آئے گا - ہائے اس کا لطف کوئی چوٹ کھائے ہوئے دلوں سے پوچھے - خدا جانے کس عاشق تن کا شعر ہے - تشنہ دہلوی کا بھی ایک شعر یاد آیا - اللہ میاں کی طرف مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

کیوں بتوں کو حسن بخشا تھا جو ہم بھولے تجھے
منصفی اے داورِ روزِ قیامت چاہئے

خدا حافظ - شاد عفی عنہ

(رقعات شاد - طبع محبوب پریس حیدرآباد سنہ ۱۹۰۱ء)

ایک عظیم الشّان علمی کارنامہ

قامُوسُ الکُتُب

کتابوں سے متعلق یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلی جلد جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے۔ شائع ہو چکی ہے۔ یہ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مکمل فہرست ہے جس میں تقریبًا بارہ ہزار کتابوں کے متعلق بنیادی معلومات دی گئی ہیں۔

یہ کتاب $\frac{۳۰\times۲۰}{۸}$ تقطیع کے چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

قیمت: چالیس روپے

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ

کراچی ۱

افسر صدیقی

کتب خانہ خاص کی بیاضیں

(۲)

اس بیاض کی تقطیع ۱۰½" × ۵¾" اور کتب خانہ خاص کا نمبر ۳/۶۵۹ ہے۔ کاتب کا نام سید عبدالوہاب بیجاپوری ہے، جس نے ابتدا کی چار نظمیں لکھنے کے بعد اپنے دستخط کر دیے ہیں۔ اس حصہ کی تاریخ کتابت ۲۸ ذی قعدہ سنہ ۱۲۵۶ھ ہے۔ باقی بیاض کسی اور شخص نے لکھی ہے۔ دوسرا کاتب کسی قدر بدخط بھی ہے اور غلط نویس بھی۔ متعدد مصرعوں کو وزن سے خارج نقل کیا گیا ہے اس کے علاوہ ماجرا کو ما بجرا، اکسیر کو اکثیر اور "ہوا" کو "حوا" تحریر کیا ہے۔ اگرچہ بیاض زیر بحث میں ایسے شعرا کا کلام ہے، جن کا نام زیادہ مشہور نہیں۔ تاہم ایک صدی پہلے کی بیاض کی اہمیت ظاہر ہے۔ کلام کیسا ہی قدیم اور شاعر کتنا بھی غیر مشہور ہو، تاریخ زبان اردو اس کی افادیت سے پہلوتہی نہیں کر سکتی اس لئے اس کی اشاعت یقیناً مفید ہوگی۔

بیاض میں (۲۰) نظمیں ہیں، ان میں سے ایک نظم ہندوستان کے مشہور نعت گو کافی مرادآبادی کی ہے۔ بلہارد کنی، نظیم، خیال دکنی، بہبود، عزیز، دوست اور غفار کی ایک ایک نظم ہے۔ لعل محمد حافظ، لطف بریلوی کی دو دو اور دستگیر ی چار نظمیں ہیں۔ چار نظمیں ایسی ہیں جن کے مصنفین کا علم نہ ہو سکا۔ یہ تمام شعرا بظاہر تیرھویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے یں، اور ان میں اکثریت باشندگان دکن کی ہے۔

(۱) غزل نعتیہ۔ یہ غزل کافی کی ہے۔ کافی مرادآباد کے باشندے تھے۔ مولوی کفایت علی نام تھا۔ شاعری میں شیخ ہدی علی زکی مرادآبادی سے تلمذ رکھتے تھے۔ بہار خلد اُن کی خاص تصنیف ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت بغاوت کے الزام میں پھانسی پائی۔ ان کی غزل یہ ہے ؎

عاصیو! جرم کی دوا ہے درود کیا دوا عین کیمیا ہے درود
سب عبادت میں ہے شمول ریا پر عبادت میں بے ریا ہے درود
ایک ساعت میں عمر بھر کے گناہ کرتا معدوم اور فنا ہے درود
حشر کی تیرگی سیاہی میں نور ہے شمع پُرضیا ہے درود

چھوڑیو مت درود کو کاتی   راہ جنت کا رہنما ہے درود

چوتھے شعر میں غالباً سہو کتابت ہے۔ اس کے پہلے مصرع میں "تیرگی" کی جگہ "قبر کی" ہوگا۔ اس طرح صنعت جمع و تفریق صحیح ہو سکے گی۔ دوسرے مصرع میں درود کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ اس لئے پہلے مصرع میں دو وقتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک وقت حشر موجود ہے، دوسرا وقت "قبر" ہونا چاہئے۔

(۲) کرامتِ غوث الاعظمؒ: اس روایت کے مصنف کا تخلص بلہار ہے۔ بلہار کی اس نظم کے دو مخطوطے ادارۂ ادبیات میں ہیں۔ پہلے مخطوطے کا ذکر تذکرۂ مخطوطات جلد دوم ص ۱۲۹ میں ہے۔ اس کا نام ترکیب بند کرامت لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ مربع کی صورت میں ہے،

دوسرے نسخے کا ذکر جلد چہارم کے ص ۲۲۵ میں ہے۔ یہاں زورؔ قادری مرحوم نے اس کا نام کرامت غوث اعظم لکھا ہے اور اس کے ۲۴ بند بتائے ہیں۔ مخطوطہ زیر اشاعت میں ۲۰½ بند ہیں۔ ایک بند کے ابتدائی دونوں مصرعے نقل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ زورؔ مرحوم نے بلہار کے ایک منقبتی مسدس کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ لکھا ہے کہ شاعر کی نسبت معلومات حاصل نہ ہو سکیں (تذکرۂ مخطوطات اول ص ۲۹۷)۔ ہمیں جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا حاصل یہ ہے کہ ان کا نام میر دلاور علی اور وطن حیدرآباد دکن تھا۔ صاحب عروس الاذکار لکھتے ہیں:

"قریب عمر طبعی رسیدہ و شیوۂ مناقب گوئی دارد۔ گاہے فکر غزل ہم می کند"

اس تذکرے میں بلہار کے چار شعر دیئے گئے ہیں:

بلہار نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ (وفات ۱۴ر ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ) نظام دکن کے دورِ حکومت میں تھے ایک نظم میں ان کی خوشی و خرمی کی دعا کرتے ہیں ؎

جو ہے افضل الدولہ سلطاں دکن کا   رکھو شاد و خرم محب آپ کا ہے

یہ شعر کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو کراچی کی ایک بیاض میں لکھا ہے

آغاز و اختتام یہ ہے،

آغاز ؎
ہے یہ روایت سنو محباں   بحر کرامت ہے غوث صمداں
اک مرد و عورت در شہر گیلاں   رہتے تھے باہم خرم و شاداں

اختتام ؎
مرشد پر اپنے بلہار بلہار   ہے وہ نہایت ان دنوں بیکار
توہی ہو یکبار حضرت پہ بلہار   تجھ پہ مدد ہیں محبوب سبحاں

ادارۂ ادبیات کے ترکیب بند کرامت میں آخری بند اس طرح ہے ؎

مرشد پہ اپنے بلہار بلہار   تھے وہ نہایت دونوں نکوکار

تو بھی ہو بلہار حضرت پہ ہر بار   تجھ پہ مہرباں ہیں محبوبِ سبحان

(۳) مناجات ۔ صرف پانچ شعر ہیں، مصنف نے اپنا تخلص عظیم نظم کیا ہے۔ عظیم بہت ہی غیر معروف شاعر ہیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے مجموعۂ مناقب [illegible] کے سلسلے میں جن شعرا کے نام دیئے ہیں ان میں عظیم تخلص کا ایک شاعر بھی ہے۔ (تذکرہ مخطوطات چہارم ص ۲۵۱) لیکن اس کی نظم درج نہیں کی گئی۔ اس لئے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مناجات اسی عظیم کی یا کسی دوسرے شاعر کی۔ کلام بھی معمولی سا ہے ؎

یارب یہ التجا مری اتنی قبول ہو   نذرِ حسین فاتحہ ہو
پہنچی یہ فاتحہ مری ان کے جناب میں   جنکے کے . . . پاک
دن رات یہ دعا ہے کہ دامانِ پاک کا   محشر میں ہم کو سایۂ حضرت بتول ہو
جس کو کہ ہوئے الفت سلطان کربلا   کیونکر نہ ان پہ رحمتِ حق کا نزول ہو
ہے التجا جناب میں یا حضرت حسین   دارین میں عظیم کا مقصد حصول ہو

(۴) مناجات ۔ اس مناجات میں (۹) شعر ہیں، شاعر کا تخلص خیال ہے۔ مقطع میں خیال نے خود کو دکن کا باشندہ بتایا ہے۔ یہ وہی خیال ہیں جن کا ذکر زور قادری مرحوم نے تذکرۂ مخطوطات سوم ص ۱۶۱ میں کیا ہے۔ خیال کی ایک منقبت ادارۂ ادبیات آباد کی بیاض [illegible] میں بھی ہے۔ (تذکرۂ مخطوطات چہارم ص ۲۴۴) زور مرحوم نے اس منقبت کا آغاز و اختتام نہیں لکھا۔ ہو سکتا ہے نظم یہی ہو ؎

ز ۔   تا کوئے محمد کوئی لے جائے خدا یا   ایسا کوئی کامل کہیں مل جائے خدا یا
ام،   مرجائے خیال آہ اگر ملک دکن میں   اس کوچہ میں کوئی اسے دفنائے خدا یا

(۵) نعتیہ غزل ۔ اس غزل کا انداز بہت والہانہ ہے۔ مقطع موجود نہیں۔ یہ غزل حافظ الاسلام میں طبع ہو چکی ہے (ص ۳۱)
ع یہ ہے ؎

کوئی کوچہ نبی کا بتا دو رے قربان ہوں گا   مجھے کوئی نبی سے ملا دو رے قربان ہوں گا

(۶) نظم ۔ اس نظم کے مصنف لطف ہیں۔ اور یہ وہی لطف ہیں جن کا دیوان متعدد بار مطبع نول کشور لکھنؤ سے طبع ہو ہے۔ اور جس کے کئی نسخے کتب خانہ خاص میں موجود ہیں۔

لطف کا نام لطف علی خاں تھا۔ وہ بریلی کے محلہ سوداگران میں رہتے تھے۔ ان کا دیوان [illegible]ھ میں مکمل ہوا ہے۔ یہ مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ طباعتِ دیوان کے بعد لکھی گئی ہو۔ نظم یہ ہے ؎

ہم نے جاناں تم کو جانا پردے کے اندر تھی تو ہو   ظاہر باطن تم ہی تو ہو اوّل آخر تم ہی تو ہو
فتویٰ دے کر کفر کا تم نے قتل کیا ہے عاشق کو   لفظ انا الحق بول کے بیٹھ زوار کے اوپر تم ہی تو ہو

احمد سے احمد پیدا بن کرامت کا سالار ہوا　　صلِ علیٰ محبوب خدا یا شافع محشر تمہی تو ہو
رب ارنی کہہ کر صاحب پڑھتے ہیں تم خوب مجھے　　اب تو ہم پہچان گئے ہیں جانی دلبر تمہی تو ہو
عاشق شیدا جلوہ کو اپنے کلّی موسیٰ تکلیما　　رب ارنی کہہ کر نالاں طور کے اوپر تمہی تو ہو
اول عاشق آپ ہوئے ہو نورِ نبی یہ ذات خدا　　آخر کیا کیا رنگ دکھائے اے ساقیِ کوثر تمہی تو ہو
جب سے عاشق تم پہ ہوا ہے خادمِ مسکین حضرت کے　　میرے قبلہ میرے کعبہ میرے منظر تمہی تو ہو

(۷) منقبت غوث الاعظم۔ اس سات اشعار کی منقبت کے مصنف نے اپنا تخلص بہبود نظم کیا ہے۔ غالباً اس کا نام بہبود علی ہوگا۔ بہبود تخلص کے ایک شاعر کا حوالہ زور قادری مرحوم نے دیا ہے جس کی دو نظمیں ادارہ ادبیات کی بیاض ۱۱[۲] میں ہیں ممکن ہے یہ منقبت اسی بہبود کی ہو۔

مطلع ؎　تقصیر میری عفو کرو پیر دستگیر　　مجھ کو تم اپنا کر کے رکھو پیر دستگیر
مقطع ؎　امید تیری ذات سے دونوں جہاں میں ہے　　بہبود کی تو لاج رکھو پیر دستگیر

(۸) نظم معراج۔ یہ نظم بھی لطف بریلوی کی ہے جن کی ایک نظم کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہ مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔ لیکن صرف (۹) شعر ہیں۔ بیاض میں ایک شعر زائد لکھا گیا ہے۔ اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لطف بریلوی کا نہیں ہے، ممکن ہے کہ اسی زمین کی کسی اور غزل سے لے کر شامل کر دیا گیا ہو۔ شعر یہ ہے ؎

کہتے ہیں شفاعت اسے اللہ سے ماہر　　تھا بخششِ اُمت کا تقاضا شبِ معراج

لطف کا مطلع یہ ہے ؎

محبوبِ خدا عرش پہ پہنچا شبِ معراج　　کیا کھُل گیا امت کا نصیبا شبِ معراج

(۹) کلام دستگیر۔ اس بیاض میں دستگیر کی ۳ غزلیں اور ایک نظم ہے۔ یہ غیر مسلسل لکھی گئی ہیں۔ دستگیر کا نام انیا غلام دستگیر تھا جیسا کہ ایک غزل کے مقطع سے ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

کیا بیاں وصف کرے بندۂ ادنا تیرا　　نہ ہوا حال فرشتوں پہ ہویدا تیرا

یہ غزل حافظ الاسلام مطبوعہ کے صفحہ ۲۳ میں چھپ چکی ہے اور ادارۂ ادبیات کے مجموعہ میلاد شریف میں بھی شامل ہے

(۱۰) دوسری غزل کا مطلع یہ ہے ؎

خیالِ مصطفوی میں جو آئینہ دل ہے　　خدا کی دید یہ عالم میں مجھ کو حاصل ہے

اس کا مقطع یہ ہے ؎

کبھی (تو) چشمِ ترحم ہو دستگیر پہ بھی　　عیاں ہے آپ کو جو اس کا مطلبِ دل ہے

۲۔ (تذکرہ مخطوطات اول ص ۳۲۱)

(۱۱) دستگیر کی تیسری غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:

مطلع ؎ میری آنکھوں میں رسول اللہ کی تصویر ہو ‏ ‏ نہ ہوس منصب کی ہے نے خواہشِ اکسیر ہو
مقطع ؎ تیری پیشانی ہو اور سنگِ درِ شبیر ہو ‏ ‏ خاتمہ سجدے میں بہتر ہے غلامِ دستگیر

(۱۲) دستگیر کی نظم سردارِ دو جہاںؐ کے اس واقعہ سے متعلق ہے کہ حضور نے ایک روز ایک یہودی کے یہاں پانی کے ڈول کھینچے تھے اور ہر ڈول کے بدلے ایک کھجور حاصل کی تھی۔ رسی ٹوٹ کر ڈول کے پانی میں گرنا، یہودی کی بدتمیزی، خدا کے حکم سے کنوئیں کے پانی کا اُبل کر اوپر آنا۔ یہودی کا ڈول پانا اور یہودی کا انجام (۸۰) اشعار میں یہ تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔ مصنف نے نظم کرنے میں جس قدر بے پروائی کا مظاہرہ کیا ہے کاتب نے اس سے بڑھ کر بے ہوشی سے کام لیا ہے۔ یہ نظم پوری نقل کی جاتی ہے ؎

روئے انور یا نبی بدر الدجےٰ ہے آپ کا ‏ ‏ خود جنابِ کبریا شیدا بنا ہے آپ کا
گوشِ دل سے اے مسلمانو سنو یہ معجزا ‏ ‏ سرورِ عالم کو تھا کس طرح کا صبر و رضا
اے محبو! راویوں سے یہ بیاں تحریر ہے ‏ ‏ [1]یک وقت احمد پہ گزرے تین فاقے بے انتہا
عائشہ سے ہے روایت یاں تلک فاقے رہے ‏ ‏ تین پتھر پیٹ پر باندھے ہیں اکثر برملا
دست بستہ عرض کی میں نے کہ یا شاہِ ہُدا ‏ ‏ آپ کو مختار خالق نے خدائی کا کیا
چاند کے دو ٹکڑے انگشتِ مبارک سے ہوئے ‏ ‏ ایک ذرہ حکم سے باہر نہیں ہے آپ کا
مانگو رزاقِ دو عالم سے دعا اب یا نبی ‏ ‏ بھوک کی برداشت کچھ مجھ میں نہیں باقی رہا
مسکرا کر عائشہ سے اس طرح تقریر کی ‏ ‏ بھوکے رہنا، صبر کرنا کام اپنا ہے بجا
یہ مصیبت آج سہ لیں گے جو ہم اے عائشہ ‏ ‏ امتِ عاصی کا کل کے روز ہوئے گا بھلا
گھر میں جا زہرا سے فرمانے لگے شاہِ انام ‏ ‏ [2]بولے زہرا سے جو کچھ طعام ہے لئے نزدیک لا
تیسرا فاقہ ہے ہم کو، آج کے دن دلربا ‏ ‏ تین دن گزرے کہ کچھ کھائے نہیں ہے، عائشا
فاطمہ نے عرض کی اے بادشاہِ بحر و بر ‏ ‏ جو تھا فاقہ آج گزرا ہے مرے حسنین کا
شاہزادوں کی خبر سنتے ہی ہو اندوہگیں ‏ ‏ [3]واں ہی صحرا ہوئے محبوبِ ربِ العلا
بن میں خرمے کے یہودی ایک تھا بیٹھا ہوا ‏ ‏ پاس جا کر اس یہودی سے یہ حضرت نے کہا
اے یہودی آج کے دن بے سر و ساماں ہیں ‏ ‏ کوئی محنت مجھ سے لے مزدوری کے خواہاں ہوا[4]

---

[1] مصرع موزوں نہیں۔ [2] وزن قائم نہیں۔ [3] یہاں وزن برقرار نہیں [4] کذا

ڈول رسی دے کے بولا وہ یہودی بے خبر
آپ اونٹوں کو مرے پانی پلا دو تم ذرا

ڈول جتنے کھینچو گے دوں گا اتنے خرمے با مزہ
ہو گئے راضی مگر باندھی بعہد صبر و رضا

ڈول جتنے شاہ والا نے کہ کھینچے چاہ سے
اتنے مزدوری کے خرمے اس یہودی سے لیا

قدرت حق کا اب آ گئے دیکھو یارو ماجرا
باؤلی میں ڈول رسی ٹوٹ کر جاتا رہا

جس رخ پر نور پر قربان تھے شمس و قمر
آ کے غصے میں طمانچہ مارا اس رخسار پر بیجیا[1]

عرش کو لرزا ہوا، تھرا گئے سب آسماں
حور و غلماں سر پٹک کر کرتے تھے آہ و بکا

بے ادب نے کر دیا بس وہ رخ پر نور لال
جن کے نعلینوں کا تھا مشتاق عرش کبریا

کچھ نہ فرمایا کیا حضرت نے شکر کبریا
اس دم بتاریک میں سر کو جھکا بیٹھے[2] ہیں کیا

جوش پانی کو ہوا اور ڈول اوپر آ گیا
کر یہودی کے حوالے پیشوائے انبیا

فاطمہ کے گھر پہ جا حسنین کو زانو پہ لے
بیٹھے تھے دونوں کو بس خرمے کھلاتے پیار سا

اے محبو! اس یہودی کا سنو پھر معجزا
خود بخود حیران تھا یک حال وحشی سا بنا

اتنے میں پوچھا کسی نے اس سے اے مرد غریب
کیا سبب حالت بنی ہے اس گھڑی تیری یہ کیا

سانحہ[3] سارا یہودی نے بیاں اس سے کیا
اور کہا سمجھا نہ میں نے وہ عرب سا کون تھا؟

سنتے ہی یہ ماجرا کہنے لگا وہ نیک ذات
جس کو تو مارا وہ بے شک ہے رسول کبریا

نام سنتے ہی محمد کا بس اس نے رو دیا
لے چھری ہاتھ اپنا کاٹا اور مدینے کو چلا

در پہ زہرا کے پکارا با ادب جب وہ جواں
آئے دروازے کے باہر سرور آل عبا

دیکھتے ہی وہ یہودی پاؤں پر سر رکھ دیا
رو کے بولا عفو ہو تقصیر یا شاہ ہدا

جانتا تھا میں نہ آپ اللہ کے معشوق ہو
اب خدا کے واسطے میری خطا کو بخش دا

لب لگا کر ہاتھ جوڑے اس کا محبوب خدا
صدق دل سے وہ یہودی بس مسلماں ہو گیا

اے محبو! غور کر انصاف سے سوچو ذرا
کس مصیبت سے پلے تھے فاطمہ کے دلربا

انبیا کا بادشاہ مزدوری کر جنکو کھلائے
ہم گنہگاروں کی خاطر اپنے پیارے سر کٹا

دید یا خنجر کے نیچے ایسے رشک ماہ کو
عاصیوں کی کیسی خاطر ہے رسول مصطفیٰ

رات دن یکسو درود اس سید کونین پر
اور غم حسنین میں ہر دم رکھو آنکھوں کو برملا[4]

---

[1] یہ مصرع ناموزوں ہے [2] دوسرا مصرع بے معنی ہے۔ [3] یہ مصرع بھی صحیح نہیں ہے۔ [4] مصرع ناموزوں ہے

آپ کا عاشق خاص ہے غلام دستگیر   کیجیے مقبول شعر اس کے مری روشن ضیا (کذا)
سب کا مالک ہے تو بیشک اے خدائے ذوالمنن   مومنوں کی آرزو بر لا ہر ایک کے مدعا

(۱۴۳) غزل عزیز۔ (۱۲) اشعار کی غزل ہے جسے قصیدہ لکھا گیا ہے۔ زبان سادہ اور بندش شگفتہ ہے۔ عزیز کے نام اور حالات نا معلوم ہیں۔ سالم غزل پیش کی جاتی ہے ۔

کام ایسا چمن میں کر جانا   داغ لالے کے دل پہ دھر جانا
مزرعِ آخرت کے معنی یہ   باغِ ہستی سے با ثمر جانا
مرد کامل اسی کو کہتے ہیں   اپنے مرنے کے آگے مر جانا
حق میں بندے کے سخت مشکل ہے   اپنے خالق سے بے خبر جانا
ورنہ امرِ قضا سے بھاگے اگر   کون سی جائے ہے کدھر جانا
ہر جگہ پر ہے پشۂ نمرود   کام اس کا ہے مغز چر جانا
جو کہ پیدا کئے ہیں مال و منال   آخر اک دن ہے اس کو دھر جانا
چشم انصاف میں ہے عاشق کو   یار کے گھر بہ چشم تر جانا
عمر تو ہے حباب کے مانند   یہ صدا ہے بھلا گزر جانا
بات روز ازل سے ثابت ہے   اپنے آخر قدیم گھر جانا
مثل پروانہ کیوں نہ اب ای دل   دے جلا اپنے بال و پر جانا
بات سیدھی ہے مت خفا ہو عزیز   نہ دوانوں کی بات پر جانا

---

(۱۴۴) منقبت غوث الاعظم۔ (۹) اشعار کی منقبت ہے۔ اسے بھی قصیدے کا نام دے دیا ہے۔ لکھنے والے کا تخلص دوست ہے۔ نام دوست محمد یا دوست علی ہو گا۔ دکن میں دوست تخلص دو شاعروں کا تھا، ایک میر دوست علی جن کا ذکر تذکرہ عروس الاذکار میں ہے دوسرے سید خواجہ میاں دوست جن کا دیوان موسومہ گلزار خیالات ۱۳۰۳ھ میں مطبع محبوب شاہی سے شائع ہو چکا ہے۔ ممکن ہے یہ منقبت میر دوست علی دوست کی ہو جو گذشتہ صدی ہجری کے نصف ثانی کے شاعر ہیں۔

مرحبا کیا غوث اعظم پیر ہے   سب ولی اللہ میں وہ میر ہے
ہیں نواسے وہ رسول اللہ کے   سچ کہو تم کس کی یہ توقیر ہے
مارتے ہی مردے زندہ ہو گئے   ان کی ٹھوکر میں عجب تاثیر ہے
جس نے کھینچا تھا وہی عاشق ہوا   کیا محی الدین کی تصویر ہے

کیمیا سے کون رکھتا ہے غرض خاک اس در کی لئے اکسیر ہے
وعدہ ہوں افسوس میرے پیر سے آہ رے الٹی مری تقدیر ہے
کافروں کا کفر غارت ہو گیا چمکی جب محبوب کی شمشیر ہے
بغض جو دل میں رکھا محبوب سے وہ بڑا مردود بے پیر ہے
خوف کیا ہے دوست تجھ کو حشر کا تیرا حامی غوث اعظم پیر ہے

(۱۵) نعت شریف۔ یہ طویل بحر کی نعت شریف خارؔ تخلص کے ایک شاعر کی ہے۔ خارؔ غیر معروف شاعر ہے۔ اس کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ یاسین خاں فوج کے ایک نائک خارؔ تخلص کرتے تھے، ممکن ہے کہ وہ اس نعت کے مصنف ہوں۔

نور ذات منزہ حبیب خدا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ [1] کوئی تم سا ہوا ہے نہ بہر ہوئے گا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
ذرا پردۂ غیب کو رخ سے اٹھا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ ہمیں اپنا جمال دکھائیے گا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
سر عرش سے زیر زمین تلک سارے حور و ملک سارے جن و بشر دل میں رکھتے ہیں آپ کا شوق لقا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
سارے انبیا اولیا اتقیا کیا جتنی پیدا جہاں میں ہے خلق خدا شاہ تم ہو تمہارے ہیں سارے گدا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
پہلے آپ کی جلوہ نمائی ہوئی پیچھے پیدا یہ ساری خدائی ہوئی پیدا آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ تھا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
پہلے پیدا وہ آپ کا نور ہوا اسی نور سے سارا ظہور ہوا شکل شمس و قمر اور ارض و سما یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
رتبہ سمجھے تمہارا تو سمجھے کیا وصف کیجئے تمہارا تو کیجئے کیا نہیں آپ خدا نہ خدا سے جدا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
جو غضب ہے تمہارا خدا کا غضب جو کرم ہے تمہارا خدا کا کرم جو تمہاری رضا وہ خدا کی رضا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
ہوئے آپ تو پیدا بشکل عرب نکلے ہیں عرب سے تو ہیں عرب شان جل و علا شان جل و علا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
جی میں آتا ہی چیر گریباں کو میں جاؤں چھوڑ کے بستی بیاباں کو میں مرے سر میں مدینے کا سودا ہوا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
جلد ملک عرب میں بلا لیجئے مجھے شہر مدینہ دکھا دیجئے یہاں کے شہر سے وہاں کا ہے صحرا بھلا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
حد سے بجد ہو گئی زشتی مری، بہر عصیاں میں ڈوبی ہے کشتی مری اپنے فضل سے پار اتار دو ذرا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ
پوچھیں آکے فرشتے حساب ہمیں جبکہ قبر میں ہوگا عذاب ہمیں کرنا آپ عذاب سے ہمکو رہا یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ

سارے امتی گل سے ہیں تازہ و تر اک خاموش ہے خارؔ خستہ جگر
اسے گل جو بنا دو تو تعجب ہے کیا، یا نبی مصطفیٰ یا نبی مصطفیٰ

(۱۶) قصۂ دختر قاضی۔ یہ (۵۲) ابیات کی ایک مثنوی ہے جس میں کسی شہر کے قاضی کی لڑکی کا قصہ بیان

---

[1] بحر کی جگہ بہر لکھا گیا ہے

گیا ہے جس نے اپنی قیمتی چولی فقیر کو دے دی تھی اور باپ کی زجر و توبیخ سے بچانے کے لئے قدرت کی طرف سے
چولی ڈال گئی تھی۔ مصنف مثنوی کا تخلص کسی بیت میں نظم نہیں ہوا۔ پوری مثنوی نقل کی جا رہی ہے ؎

یارو سخاوت کا سنو یہ بیاں   اوسکو کہا ادنی شیریں زباں
اس کو سنو ہو صواب کان دھر   ہے یہ سخاوت کا بیاں مختصر
جو کہ سخاوت کو کرے اختیار   دونوں جہاں میں ہو وہ نامدار
یارو سخاوت ہے عجب کیمیا   دین میں دنیا میں ہے پشت و پناہ
کہتے ہیں کوئی شہر میں اک قاضی تھا   اس کو تھی اک بیٹی عجب مہ لقا
اس کو دیا حسن تھا ایسا خدا   چہرہ چمکتا تھا گویا چاند سا
تھی عجب وہ لڑکی پڑھی اور گنی   دل میں بھرا اس کے تھا حب نبی
یعنی محبت میں نبی کی وہ   کہتی محمد ہی محمد ہی وہ
باپ جو اس لڑکی کا قاضی وہ تھا   ایک دن وہ قاضی نے ایسا کہا
لڑکی ہے یک مجھ کو عجب رشک حور   سر سے وہ لے پاؤں تلک بیکا نور
واسطے نسبت کے میں اب صبح و شام   چاہتا ہوں لڑکی کا اپنی پیام
ایک تھا سائل وہاں بیٹھا ہوا   قاضی کی ان باتوں کو وہ بھی سنا
سن کے یہ سائل جو وہاں سے اٹھا   قاضی کے دروازے پہ جاکے کہا
جبکہ یہ سائل نے پکارا وہاں   قاضی کی بیٹی نے سنی ناگہاں
آیا ہوں دروازے پہ میں اب ترے   واسطے احمد مجھے خیرات دے
ذکر ہے اس روز کا یارو سنو   قاضی کی بیٹی نے نہا، دھو
اس نے اسی روز ہی چوٹی گندھائی   بالوں میں چوٹی کے وہ موتی پرائی
جبکہ یہ سائل نے کیا ہے سوال،   دل میں وہ لڑکی کے یہ آیا خیال
اب تو مرے پاس نہیں کوئی شے   پاس جو موتی ہے وہ چوٹی میں ہے
سمجھی یہ اب کھولنے موتی کے گھیر   دینے میں سائل کے جو ہوئیگی دیر
کرکے خیال اتنا وہ صاحب ہنر   دیدی وہ چوٹی کے تئیں کاٹ کر
لے کے وہ سائل نے وہاں سے چلا   آ سر بازار وہ یک جا کھڑا
کہنے کو اس طرح لگا وہ گدا   قاضی کی بیٹی تھی مری آشنا

اس نے کہا مجھ سے کچھ ایسا سبب　　کاٹ کے چوٹی کو میں لایا ہوں اب
شہرہ یہ بازار میں جبکہ ہوا　　قاضی کی بیٹی کا یہ ہے آشنا
جبکہ یہ احوال سبھوں نے سنا　　آکے یہ قاضی سے سبھوں نے کہا
جبکہ یہ قاضی نے سنا ماجرا　　طیش غضب میں وہ بس ایسا ہوا
کھینچ کے تلوار وہ گھر میں گیا　　یعنی کرے ذبح وہ بیٹی کو جا
حجرے میں یکبارگی اس نے گئی　　سجدۂ معبود میں سر کو رکھی
جبکہ سنی لڑکی نے یہ حال سب　　کانپ گئی ہلا گئی یکبار سب
رو رو کے اس طرح سے کہنے لگی　　میں تو تیرے دوست کی رہ میں دئی
میں تو سخاوت کا کیا کام ہے　　مجھ پہ یہ کیسا ہوا بدنام ہے
مجھ کو محمد کے طفیل اے خدا　　تہمت ناحق سے مجھے کر رہا
اتنے میں بس لگ گئی جو اس کی نیند　　خواب میں آئے وہیں سالار دیں
ایسا کہے لڑکی کو حضرت رسول　　اپنے تو دل میں نہ ہو ذرا ملول
تو جو میرے نام پہ چوٹی دی　　نور کی چوٹی تجھے حق سے ملی
بدلے میں اس کے تجھے رب العلا　　نور کی چوٹی کے تئیں کی عطا
دین میں دنیا میں ترا ساتھ ہو　　تجھ پہ ہماری تو عنایات ہے
حجرے میں تو مشک کی آتی تھی بو　　نور کی چوٹی پڑی پیٹھ پہ ہو
اتنے میں بس آنکھ لگی ایک بار　　دیکھی وہ لڑکی نے عجائب بہار
اتنے میں قاضی نے جو آیا وہاں　　ہاتھ میں شمشیر لے کے بے گماں
تو نے برا کام یہ کیسا کیا　　تیری طرف سے مجھے بٹہ لگا
بولا بیٹی سے کہ اے رشک حور　　تو نے بڑا آج کیا ہے قصور
ویسے میں قاضی کی نظر در گذر　　ہو گئی بیٹی کی وہیں پیٹھ پر
دیکھا ہے بیٹی کی وہیں پیٹھ پر　　نور کی چوٹی اسے آئی نظر
ٹیک دی شمشیر کو بس ہاتھ سے　　گر پڑا قدموں پہ وہیں بیٹی کے
سن لو بس اب تو منو یہ ماجرا　　کیسا مراتب ہے اللہ دیا

اس بیت میں قافیہ غلط ہے۔ یہ مصرع ناموزوں ہے۔ کہ بیاض میں ماجرا تحریر ہے

تم بھی محمد کا کرو ورد نام   حشر میں بس پاؤ گے اعلیٰ مقام
ہو گئی سخاوت کی حکایت تمام   بھیجو محمد پہ درود اور سلام
ہوئے نجیبوں کو یہ دولت نصیب   ان کے نصیبوں میں ہو ذلت نصیب
ایسا نصیبا وہ کہاں پائیں گے   ان کو کہاں مرتبے یہ آئیں گے
ہو گئی سخاوت کی حکایت تمام   بھیجو محمدؐ پہ درود و سلامؐ

(۱۷) طوطا اور پنجرا۔ یہ ایک نصیحت آمیز نظم ہے جس میں تمثیلاً روح کو طوطا، جسم کو پنجرا اور موت کو بلی قرار دے کر انسان کو اس کی زندگی کے انجام سے باخبر کیا گیا ہے اس کے مصنف حافظ فضل محمد حافظ ہیں۔ جن کے کلام نظم و نثر کا مجموعہ جدید حافظ الاسلام کے نام سے مع مجمع القصائد شائع ہو چکا ہے۔ یہ نظم بھی مجموعہ مذکورہ کے صفحہ ۱۵۶ پر درج ہے۔

آغاز ؎
پنجرا خدا نے قدرت سے   کیا بنایا حکمت سے
پنجرا بنا میرا مولا   طوطے کو اس میں ڈالا

اختتام ؎
وہ گل کہ پنجرا ہوئے دھول   اوسے چڑھاویں ہر دم پھول
کیا ختم حافظؔ نے اب   پڑھو صلوٰۃ و سلام سب

مطبوعہ نظم میں آخری بیت اس طرح ہے ؎
جو خرچے پنجرے پر تیرے دام   وہ ہو گئے آخر ناکام

(۱۸) مناجات۔ حسب معمول اس مناجات کو بھی قصیدہ کا نام دیا گیا ہے جس ورق پر یہ مناجات تھی وہ نصف کے قریب پھٹ گیا ہے۔ اس لئے نہ تو یہ معلوم ہو سکا کہ مناجات کا مصنف کون ہے اور نہ یہ پتا چل سکا کہ مناجات کے اشعار کی تعداد کیا تھی جو اشعار سالم ہیں انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے ؎

مدت سے ہے التجا خدایا   حاصل ہو یہ مدعا خدایا
مل کی کہیں آرزو برآئے   ملتے کہیں مصطفیٰ خدایا
دم بھر نہ رہے جدا خدایا   ل کر رہے مصطفیٰ خدایا
صدقے سے جناب پنجتن کے   مقبول ہو یہ دعا خدایا

(۱۹) نعتیہ غزل۔ کسی شاعر کی ایک نعتیہ غزل ہے جس کے تین شعر پڑھے جا سکتے ہیں۔ [illegible] سے ہیں۔ ورق کے پھٹ جانے کی وجہ سے باقی اشعار ضائع ہو گئے ہیں۔

پانہیں اس کا عشق پائے مسیح   ان کے بندے کو انتہا سے صحیح

٭ یہ بیت مکرر لکھی گئی ہے

کوئے احمد تلک رسائی تو ہو ...... کہ وہ ہو لئے صبح
اس موذن کی وہ صدا تو سنو اس کی اتنی سی وہ صدائے صبح

---

(۲۰) ماں باپ کی خدمت۔ یہ نظم حافظ کی ہے جن کی دو نظموں کا بیان اس سے قبل ہو چکا ہے۔ ابتداء کے پانچ شعر ضائع ہو چکے ہیں۔ چھٹا شعر یہ ہے ؎

جو ماں باپ کو دے گالی، قبر اس کی بنے کالی
عذابوں سے نہ ہو خالی، بہشت ماں کے قدم نیچے

اس نظم کا چودھواں اور آخری شعر یہ ہے

نہ دل حافظ دکھا ... رکھو دل سدا ماں کا
جو حق ہے کر ادا ماں کا، بہشت ماں کے قدم نیچے

یہ پوری نظم بھی حافظ اسلام مذکرۂ بالا کے ص ۲۹۲ میں چھپ چکی ہے۔

روایت کی اہمیت
ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

یہ کتاب اردو ادب کی عظیم روایات کی آئینہ دار ہے۔ اس میں ایسے پُرمغز اور خیال افروز مقالات شامل ہیں جن سے اردو ادب کے تاریخی مدوجزر کی صحیح تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل اہم موضوعات پر مقالات شامل ہیں۔

- روایت کی اہمیت
- دلّی کا دبستان شاعری
- غالب کی عشقیہ شاعری
- داغ کا تغزل اور اس کے سماجی محرکات
- اردو شاعری میں حب وطن کی روایت
- اردو شاعری میں گل و بلبل کے اشارے
- آب حیات اور آزاد
- منظومات حالی
- حسرت
- اردو تنقید میں روایت اور تجربے

قیمت:
سات روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

سیّد وصی احمد بلگرامی

سس یش ص

سید وصی احمد بلگرامی اُردو کے اُن ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے بہت کم لکھا لیکن جو کچھ بھی لکھا وہ اردو ادب میں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتا ہے آج سے پینتیس چالیس برس پہلے اُن کے متعدد مقالات مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے، جنھیں ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا تھا۔ جناب بلگرامی کی تحریروں میں جو شگفتگی اور شگفتہ بیانی ملتی ہے اُس کی بنا پر اُنھیں اردو کے صاحب طرز ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ادارۂ "قومی زبان" نے فیصلہ کیا ہے کہ بلگرامی صاحب کے مضامین گاہے گاہے "قومی زبان" میں شائع کیے جائیں ممکن ہے یہ "بازیافت" ہماری نئی نسل کے کسی کام آسکے۔

تمہید آب سوہن کی بھی کیا بات ہے۔ یہ بات قند میں نہیں، مصری میں نہیں۔ پھر نیل و جیحون و فرات کو کون پوچھے؟ ہندوستان سچ پوچھو تو کجلی بن ہے۔ ظلمات ہے۔ اس ظلمات میں آب حیات کون کہ آب سوہن ؎

خوشتر بود آب سوہن از قند نبات   بادے چہ سخن ز نیل و جیحون و فرات
اے پارۂ عالمے کہ ہندش نامند   گوئی ظلمات و سوہن است آب حیات   (غالب)۔

سکندر کی نادانی دیکھو کہ اس آب حیات کے لیے وہ کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہا۔ اُس بے وقوف کو چاہیے تھا کہ آنکھ بند کیے ہوئے ارہ شاہ آباد چلا آتا۔ یہاں سوہن کا پانی اس کو سرتاپا روح کر دیتا۔ یعنی زندۂ جاوید ؎

چو اسکندر زنادانی ہلاک آب حیوانی   خوشا سوہن کہ ہر کس غوطہ زد در وے تنش جاں شد   (غالب)

ایک دن کا ذکر ہے کہ غالب کے ہاتھ میں پیالہ تھا اور ساقی کون کہ خود حضرت جبریلؑ۔ ساقی نے پیالہ میں شراب ڈھالی، شراب رگوں میں دوڑنے لگی۔ بادہ نوش بہکنے لگا۔ نشہ میں ہاتھ بڑھا کر بے محابا جبریلؑ کا دامن پکڑ لیا۔ کہا کہ "اے یار غمگسار! ذرا یہ تو بتلاتا جا:

۱۔ نہیں اپنے کو ہاں کہتا ہے۔ یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں؟ .. .. .. گفت۔ کفر ست در طریقت من
۲۔ تو پھر زمین و آسمان کی نمود کیسی؟ .. .. گفت۔ ہے ہے نمی تواں گفتن
۳۔ دشمن جاں کا گلا کسا ہے۔ ہم کریں تو کیا کریں؟ .. .. گفت۔ طرح بنائے سبو فگن
۴۔ جاہ و منصب کے پیچھے دنیا اس قدر کیوں مٹی ہوئی ہے؟ .. .. .. گفت۔ دام فریب اہرمن
۵۔ دہلی سے کلکتہ ہم کو کھینچ کر کون لایا؟ .. .. گفت۔ جور و جفائے اہلِ وطن
۶۔ حضرت دہلی آخر ہے کیا؟ .. .. گفت۔ جان ست و این جہانش تن
۷۔ اور راج کماری بنارس؟ .. .. شاہدے مست۔ محوِ گل چیدن

دہلی اور بنارس کے بعد عظیم آباد اور آرہ کی باری آئی ؎

گفتمش چوں بود عظیم آباد؟ گفت رنگین تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد؟ گفت۔ خوشتر نباشد از سوہن
غالب

غالب نے پوچھا عظیم آباد۔ جبرئیلؑ نے کہا: بھلا چمن میں یہ رنگینی کہاں؟ پوچھا سلسبیل؟ جبرئیلؑ نے کہا: دور کا ڈھول سہاون! آزمانا ہو تو آرہ چلے جاؤ۔ دریائے سوہن کا ایک چلو پانی پی لو۔ پھر سلسبیل کا کبھی نام بھی نہ لو۔

دریائے سوہن کے ساتھ ساتھ آرہ میں دریائے سخن بھی موج زن ہے اور موجوں سے آواز آرہی ہے کہ ؎

اے اہل نظر عجیب جا ہے آرہ گلزار ہے۔ باغ پُرفضا ہے آرہ
اس باغ کو انقلاب کا خوف نہیں اولٹیں جو اسے۔ تو بھی ہرا ہے آرہ
صفیر بلگرامی

آرہ جن لوگوں کی وجہ سے جہاں آرا ہوا ان میں موہان ضلع اناؤ کے سادات زیدی کا وہ خاندان بھی تھا جس کے چشم و چراغ سید وارث علی۔ سید غالب علی اور سید امیر علی مرحومین تھے۔ رائٹ انریبل سید امیر علی کی شادی لندن میں مس اسپیلی بنت مسٹر کونستان سے ہوئی۔ یہ وہی مس اسپیلی ہیں جن کے صدقہ میں دنیا کو اسپرٹ آف اسلام کی ایسی نادر تصنیف نصیب ہوئی۔ نوشاہ عروس کو لے کر لندن سے کلکتہ آیا تو رپن پریس کلکتہ نے ایک قطعۂ تہنیت پیش کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

۱۔ میرے اشعار ہیں شایاں مبارک بادی ہیں یہ رنگیں گلِ بستان مبارک بادی
۵۔ فال کھولی تو پڑی حالِ زلیخا پہ نظر مل گیا مطلعِ دیوانِ مبارک بادی
۶۔ رسم شادی کا ہوا تیرے لیے لندن میں اب یہاں بھی تو ہے شایان مبارک بادی
۷۔ عقد سے تیرے شگفتہ ہوئی مس اسپیلی خوب پھولا تھا گلستان مبارک بادی
۹۔ مولوی بھی تو ہے۔ سید بھی ہے مشہور جہاں پھر امیر اور علی جان مبارک بادی
۱۲۔ حق ممدوح میں ہر وقت دعا ہے یہ قدیر ہو عیاں مہر درخشانِ مبارک بادی

پانچویں شعر میں حالِ زلیخا سے مراد یہ ہے کہ مس اسپیل نے اپنے کنبہ سے لڑ جھگڑ کر یہ عقد کیا تھا۔ وہ خود بڑی عالمہ و فاضلہ تھیں اور ان کا گھرانہ دولتِ علم و وجاہت سے مالا مال تھا۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی کے بڑے بھائی ڈپٹی سید وارث علی خاں، ان کی شادی نواب بہادر سید ولایت علی خاں بہادر رئیس عظیم آباد کی خانہ زاد بہن شاہ بیگم سے ہوئی۔ شاہ بیگم اپنے میکہ میں آج تک آرہ والی بیگم مشہور ہیں۔ کیونکہ ان سے پہلے یا بعد خاندان گندری عظیم آباد سے، یا یوں کہیے کہ صاحب سیر المتاخرین میر غلام حسین خاں کے خاندان سے کوئی لڑکی آرہ نہیں گئی۔

تقریباً اسّی برس ہوئے کہ ڈپٹی وارث علی خاں نے عظیم آباد میں اپنی صاحبزادی کی چھٹی کی۔ رقعہ نوید نواب بہادر سید ولایت علی خاں کی طرف سے تقسیم ہوا۔ نواب بہادر ہی کے دولت خانہ میں جلسہ تھا۔ صحن میں محفل نشاط۔ صحن کے بعد پھاٹک اور اس کے بعد وہ سڑک جو پچھم دروازے سے پورب دروازہ کو جاتی ہے۔ اس صحن میں چند احباب جمع تھے۔ ایک نووارد اپنے اشعار سنا رہا تھا۔ پاس ہی دو لڑکے کھیل رہے تھے۔ ایک کی عمر آٹھ برس۔ دوسرے کی گیارہ برس۔ کھیل یہ تھا کہ ایک مونڈھے کو دونوں اس طرح لڑھکاتے کہ وہ صحن سے پھاٹک تک چلا جاتا۔ پھاٹک کے بعد ہی سڑک تھی اس لیے دونوں لڑکے دوڑ کر پھاٹک سے مونڈھے لے آتے۔ اسی طرح پھر لڑھکاتے پھر دوڑ کر جاتے۔ پھیرے آتے۔ اور جب دوڑتے دوڑتے تھک جاتے تو وہی مونڈھا بچھا کر خود اس پر بیٹھ جاتے۔

لڑکوں کی یہ ادا نووارد کو بھا گئی۔ نووارد ان دو میں سے ایک کو پہچانتا تھا۔ جس کو نہیں جانتا تھا اس کی عمر اس وقت گیارہ برس کی تھی۔ پوچھا۔ نام کیا ہے؟ لڑکے نے نووارد کو اپنا نام بتلا دیا۔

کیسی شاہ بیگم؟ کہاں کا جلسہ؟ کیسی شعر خوانی؟ کہاں کا مونڈھا؟ ———— بات صرف اتنی تھی کہ قضا و قدر کو ایک دن یوں منظور ہوا کہ آرہ اور عظیم آباد کی طنابیں کھنچ جائیں اور وہ نووارد اِن دونوں لڑکوں کے ساتھ ایک ہی جال میں اس طرح آجائیں کہ مرنے کے بعد بھی چھٹکارا نہ ہو۔ قضا و قدر کے جال میں ان تینوں کا بہ یک وقت آجانا ایسا ہی تھا جیسا حروفِ تہجی کی محفل میں۔ س۔ ش۔ ص کا ایک ساتھ جگہ پانا اور اسی واقعہ سے اُن کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے جن کے لیے ایک ہزار ایک راتیں بھی کم ہیں ؎

تمھارا ہم سے ملنا یادگار اے جانِ عالم ہے
جو گزرا آج آنکھوں سے وہ کل افسانہ ہوتا ہے

(صفیر بلگرامی)

دونوں لڑکے کون تھے؟ نووارد کون تھا؟ جواب یہ ہے کہ س، ش، ص،

بابِ اوّل در بیانِ ۔ س

نواب بہادر کے ہاں جو تقریب تھی اس کے چند سال بعد عظیم آباد میں ایک اور تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں لکھنؤ کے حیدر جان آئی تھی تو لکھنؤ کی مگر کھوٹا دکھو تو عظیم آبادی) ۔ اور [illegible]

سرمہ کی تحریر دیکھو تو اصفہانی - اور زلفیں دیکھو تو شامی - اور صباحت دیکھو تو بنارسی - اور شان دیکھو تو شکوہ آبادی - اور جذبۂ دل دیکھو تو نجدی اور کافرماجرائی دیکھو تو الہ آبادی اور بے نیازی دیکھو تو فتح پوری! - الغرض حیدر جان عظیم آباد آئی تو کسی نے کہا کہ خانۂ انوری کو ڈھونڈنے والی بلا آئی - کسی نے کہا کہ کرشن جی کی بانسری آئی - کسی نے کہا کہ نواب مرزا کی مثنوی زہر عشق آئی - مگر خانقاہوں سے صدا آئی کہ خبردار! ہوشیار! نادر کی تلوار آئی!!

ادھر حیدر جان محفل میں آئی اُدھر زلفِ شب تا بہ کمر آئی مگر دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی عجیب آنکھیں تھیں - جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ آفتاب سوا نیزہ پر آگیا - اس سحر کو باطل کس نے کیا کہ خود حیدر جان کی ٹھمری نے ؎

توری سانوری صورت مورا من بھائے　　مدھ بھری انکھیاں - گجرا سہائے
چال البیلی .... نپٹ نویلی　　دیکھو حیدر! مور! جیرا ترڑ پائے

محفل آئینۂ حیرت تھی - اُس محفل میں ایک رئیس زادہ بھی تھا - قضا کار اس رئیس زادہ پر حیدر جان کی نظر پڑی تو ایسی پڑی کہ دفعتاً محفل خود پروانہ ہوگئی - نادر کی تلوار جس سے دو ٹکڑے ہوگئی - مثنوی زہر عشق میں آگ لگ گئی - کرشن جی کی بانسری کھو گئی - اور خانۂ انوری کو ڈھونڈنے والی بلا خود بلاؤں میں گرفتار ہوگئی - اب اس رئیس زادہ کا حال پوچھو تو حال یہ ہے کہ: "الفت کی آنکھ بیچ میں دلال ہوگئی"

تقریب ختم ہوئی اور قافلۂ ذروانِ لکھنؤ نے لکھنؤ کا قصد کیا تو عشق نے حیدر جان کو راہیں تبلا دیں - اُس نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ عظیم آباد دامن نہیں چھوڑتا - ماں مجبوراً ٹھہر گئی - جب سال بھر گیا اور پھر بھی حیدر جان نے جانے کا نام نہ لیا تو آخر اس کی ماں بیماری کا بہانہ کرکے خود لکھنؤ چلی گئی اور وہاں سے اپنی بہن کو بھیجا کہ جس طرح بنے اس دیوانی کو عشق کے پھندے سے چھڑا کر لے آ - اس علامہ نے یہاں پہنچ کر آسمان زمین ایک کر دیا اور غریب حیدر جان کو عظیم آباد آخر چھوڑنا ہی پڑا - رئیس زادہ عشق کا مارا اپنی روئداد یوں بیان کرتا ہے:

کیا کہوں اُس فراق کا احوال　　وہ مرا رنگ - وہ مرا احوال
نہ اُسے اختیار رہنے کا　　نہ مجھے وقت بات کہنے کا
شاق تھی اس نگار کی دوری　　تا بہ آرہ گیا بہ مجبوری
ریل جس وقت آرہ میں ٹھہری　　مجمع تھے سب دیہاتی اور شہری
اس گھڑی میں اٹھا جو پیارے　　بھرے آنکھوں لو اپنی آنسو
اور بولا کہ لو - خدا حافظا　　مجھ کو اب جانے دو خدا حافظا
کوئی دل کو ذرا قرار نہیں　　آگے جانے کا اختیار نہیں
سنتا تھا یہ کہ وہ بجوش فغاں　　بول اٹھی ہائے! کہاں کہاں پیا!!
میں نہ مانوں گی - میں نہ مانوں گی!　　اترو گے تم - تو جان دے دوں گی!

کہہ کے یہ میرا تھام کر دامن -　　چاہا بٹھلا لے ریل میں فوراً
میں نے زہٹ کی۔ بہ التجا ہٹ کر　　دامن اتنے میں رہ گیا پھٹ کر!
کھول کر کھڑکی اور دے کے دعا　　ریل نے سیٹی دی میں اتر ہی پڑا
اور کھڑکی کو تھام کر اک بار　　بولا جانے میں مجھ کو کیا انکار
پر مناسب نہیں مرا جانا -　　تمھیں مجبور ایسا کیا جانا
عزت خانداں کا بھی ڈر ہے　　دمبدم باپ ماں کا بھی ڈر ہے

کہتے تو یہ کہا۔ مگر کیوں کیا   دل پہ صدمہ جو کچھ گزرتا تھا   رنج کی بیٹھی اس طرف کو بھی۔   اور دونوں کا سفنا گیا تھی
اس طرف آہ تھی۔ ادھر نالے   آنکھوں سے آنسوؤں کے پرنالے   دونوں حیرت سے تکتے تھے باہم   لب کچھ کہہ نہ سکتے تھے باہم

رئیس زادہ محبت کا مارا چھاتی پر پتھر رکھ کر حیدر جان سے رخصت ہوا۔ وہ لکھنؤ گئی۔ یہ آرہ سے عظیم آباد واپس آیا۔ مگر اُن کی زبانی!

یہی حالت وہ تھی معاذ اللہ   کہ نہ دکھلائے وہ گھڑی اللہ   آرہ سے آیا تو میں گھر کو مگر   لانے والوں کو ہے کچھ اس کی خبر
آہ ایسا ہوا جو میں دلگیر   دل نے کی جان لینے کی تدبیر   کھانے پینے کو بس جواب دیا   بلکہ جینے کو بھی جواب دیا
سارے دروازے بند اندر سے   لوگ چلائے تھکے باہر سے   بند آنکھیں۔ زمین پر تھا پڑا   نقش پا تھا امید رفتہ کا!

ماں کو خبر ہوئی تو صاحبزادے کے پاس تشریف لائیں۔ دیکھ کر بہت روئیں۔ پوچھا کھانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ بیٹے نے لحاظ سے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اور لوگ پوچھنے آئے تو شرط پیش کی کہ کھلانا ہو تو حیدر جان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا دو۔ یہ راز کھلا تو اسی وقت ایک آدمی لکھنؤ بھیجا گیا۔ اس کی خبر رئیس زادے کے باپ کو ہوئی تو حکم آیا کہ ہم آج کلکتہ جا رہے ہیں۔ تم بھی تیار رہو۔ رئیس زادہ اسی نازک حالت میں اٹھ کھڑا ہوا اور باپ کے ساتھ کلکتہ پہنچا۔ ادھر یہ کلکتہ پہنچا اور اُدھر لکھنؤ سے حیدر جان کے تحائف عظیم آباد پہنچے۔ رائے ہوئی کہ ان چیزوں کو اسی طرح کلکتہ پہنچ جانا چاہیئے۔ چیزیں کلکتہ پہنچیں تو خدا خدا کر کے پورے سات دن کے بعد رئیس زادے نے فاقہ شکنی کی ؎

بس دلبر کے ہاتھ کا تھا طعام   ہوئے خوشبو مرے دماغ و مشام   میری مرغوب تھیں وہ سب چیزیں   خوب سے خوب تھیں وہ سب چیزیں
لقمہ جو تھا وہ بس تھا وجہِ حیات   شکر رازق کہ اس نے رکھ لی بات   ورنہ میں اور ہفتہ بھر یہ ضبط؟   اور قائم رہے حواس کا ربط؟
عقل کہتی ہے نور امید کا تھا   کہ ہے قائم امید پر دنیا   آس ملنے کی گو تھی ٹوٹی ہوئی   اور عنانِ شکیب چھوٹی ہوئی
پردہ الفت کہ جس نے دونوں پر   سحر کی طرح [illegible] کیا تھا اثر   جانتے کب تھے اس کو ظاہر بیں   ایک واقف تھے اس کشش سے ہمیں
اس کی حالت کو بس وہی جانے   جو کہ نبضِ وفا کو پہچانے   الغرض جب کہ کھایا وہ کھانا   من و سلویٰ جسے کہ تھا جانا
اور امید کو ہوئی قوت   اب تو بڑھنے لگی مری طاقت   رات دن یہ خیال گھر جائیں   جلد اس مہ لقا کو بلوائیں

رہنا کلکتہ کا ہوا دوبھر   سر پہ منزل سوار آٹھ پہر

رئیس زادہ الفت کا مارا کلکتہ سے عظیم آباد آیا تو ایک قاصد کو نامۂ شوق[1] دے کر حیدر جان کے پاس لکھنؤ بھیجا ؎

اے تمنائے عاشقِ ناکام   دلربائے زمانہ۔ دلبر نام   تو سلامت رہے بصد خوبی   روز افزوں ہو تیری محبوبی
تو مسلماں ہے جو اے کافر   یاد کر اپنے قول کو آخر   تجھ کو سوگند شاہ خیبر ہے   بالیقیں تو کنیز حیدر ہے

---

[1] نامۂ شوق میں ۱۱ ابیات ہیں۔ یہاں صرف ۴ بیتیں لکھ گئیں۔ اول بیت میں دلبر اور (آخری) دو بیتوں میں حیدر ان فرضی نام ہیں۔ دلبر بروزن حیدر چنانچہ چوتھی بیت میں اصل نام حیدر موجود ہے۔ رئیس زادہ کا نام بھی اس خط میں پوشیدہ ہے۔

کیا میں دوں اس سے بڑھ کے اور قسم کیا یہ کہنا کہ اے بہتر صنم تجکو اپنی اداؤں کی سوگند یا تجکو میری وفاؤں کی سوگند!
اپنے حیرانِ نیم جاں پہ نظر! جلد لے جلد۔ آ کے میری خبر! ختم اب داستان حیران ہے طولِ سلطانِ عشق پایاں ہے

حیدر جان نے یہ خط پایا تو تڑپ گئی۔ ماں سے کہا کہ اب لکھنؤ کو سلام ہے۔ ماں نے کہا کہ دیوانی لکھنؤ چھوڑنے کی چیز ہے؟ ؎

گل سے رنگیں تر ہیں خارِ لکھنؤ نقرہ سے بہتر غبارِ لکھنؤ تب الفت کی ماری نے جواب دیا:

سب سمجھتی ہوں میں۔ پہ زور نہیں دل چھڑاتا ہے لکھنؤ کی زمیں گر ہو غربت میں ہر طرح ایذا ہو گوارا جو دل کو۔ کیا پروا

ماں نے جب دیکھا کہ عظیم آباد جانے پر تلی ہوئی ہے تو اس نے رؤسائے لکھنؤ کو ابھارا کہ ؎

یہ حسیں جانے کی سناتی ہے آبروئے لکھنؤ کی جاتی ہے اب رئیسوں کو یاں کے لازم ہے کہ وہ دلبر فرار عازم ہے
روکیں اس کو جس طرح سے بن آئے کوئی فقرہ دے۔ کوئی بات بنائے پھر تو کیا تھا۔ تمام اہلِ دول ہو گئے سن کے یہ خبر بیکل
کوئی آیا۔ کسی نے بلوایا خوب سمجھایا خوب سمجھایا پر سمجھتے کہیں ہیں دل دادہ؟ کہیں گرتا ہے کارِ افتادہ؟
سب کی جانب خطاب ایک ہی تھا سب کو اس کا جواب ایک ہی تھا بس نہ اس امر میں کلام کریں میرا جینا نہ اب حرام کریں
میری حالت پہ چھوڑ دیں مجھ کو قصدِ غربت ہے چھوڑ دیں مجھ کو کیا ہوا۔ گو کہ دور جاؤں گی جاؤں گی میں۔ ضرور جاؤں گی
میرا دل اس جگہ نہیں لگتا دل وحشی بھی ہے کہیں لگتا

جب یہ تیر بھی خطا ہوا تو حیدر جان دھوکے سے ایک مکان میں بند کر دی گئی۔ باہر سے قفل لگا دیا گیا۔ اس طرح کہ ؎

التفاتِ جہاں سے ناامید مثلِ یوسف ہوئی زلیخا قید سر پہ چھت۔ زیرِ پا زمیں خالی گرد دیواریں۔ روکنے والی!
تھے طبیعت کی طرح بند کواڑ اور چاکِ دل و جگر تھے دراڑ ناامیدی جو ہوش کھو دیتی پھر تو مایوس ہو کے رو دیتی
باتیں سا اور ہم زباں نہیں کوئی! راز سا اور رازداں نہیں کوئی! سوچ ہی سوچ کر وہ چپ رہتی اپنے ہی دل سے کہنا جو کہنا
الغرض اس پہ بندشیں لاکھوں اس کے رہنے کی سازشیں لاکھوں پر محبت میں جو کہ کامل ہو کب وہ ان بندشوں سے بددل ہو
انھیں باتوں میں اس نے خاطر خواہ سوچتے سوچتے نکالی راہ واہ رے نقد جذبِ کامل کا! ٹوٹتا کب ہے سلسلہ دل کا؟
کششِ جذبۂ محبت ہے! تار ہستی کی کیا حقیقت ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ؎
سلسلہ وعظ و پند کا ٹوٹا! قفل سب قید و بند کا ٹوٹا کھلے بند وہ پائے بند وفا لکھنؤ سے چلی بصدق و صفا
کون کہتا ہے عشق کو مذموم؟ حال اس کا اسے نہیں معلوم کون کہتا ہے یہ ہے بے تاثیر؟ اس کی ظاہر نہیں اسے تاثیر!
کون کہتا ہے۔ عاشق ناکام مفت ہوتا ہے عشق میں بدنام دلبروں کو اثر نہیں ہوتا؟ کوئی ان میں خبر نہیں ہوتا؟
بے خبر خود ہے جو یہ کہتا ہے یاں تو مجھ پر یہ حال گزرا ہے اپنی تقریر کو جھوٹ کیوں جانوں باتیں ناواقفوں کی کیا مانوں؟

---

[1] ان چھ بیتوں میں اس محلہ کا نام پوشیدہ ہے جہاں رئیس زادہ کا محل تھا۔

عشق کی مہم سر کرتی ہوئی حیدر جان پھر عظیم آباد پہنچی ۔ نادر کی تلوار پھر مسلط ہو گئی ۔ حیدر جان کے ہاتھوں عظیم آباد نو برس تک دار الحرب بنا رہا ۔ نادر کی تلوار نو برس تک عظیم آباد میں قتل عام کرتی رہی ۔ اس قتل عام کی وجہ حیدر جان کی صورت نہیں بلکہ سیرت اس کا بانکپن نہیں بلکہ کمال فن تھا ۔ حاضر جواب تھی ۔ موسیقی میں انتخاب تھی ۔ سنجیدہ تھی ۔ مہذب تھی ۔ شاعرہ تھی ۔ باوفا تھی ۔ پاکباز تھی ۔ واضح رہے کہ بقول عبید زاکانی پاکباز اس کو کہتے ہیں جو ایک ہی عاشق پر اکتفا کرے ۔

حیدر جان کی پاکبازی اس کے سر پر قیامت لائی ۔ یعنی جب لوگوں نے دیکھا کہ نو برس کے بعد بھی دفا کی مہندی حیدر جان کی ہتھیلیوں کو اور لال کرتی جا رہی ہے تو سازش کر کے لکھنؤ سے امراؤ کو بلوایا ۔ اس سازش میں خود حیدر جان کی ماں شریک تھی ۔ حیدر جان محرم میں ہر سال لکھنؤ جایا کرتی اور صفر میں واپس آ جاتی ۔ یہ سلسلہ نو برس تک رہا ۔ دسویں برس کیا ہوا اس کا حال رئیس زادہ یوں بیان کرتا ہے ؎

سنو یہ طرفہ داستاں سنو　　نئی تجویز کا بیان سنو!　　دلبر اک سال لکھنؤ جو گئی　　گزرے تھے اس کو وہاں مہینے کئی
اس کی ماں نے کنیز اک پالی　　نام امراؤ ۔ رنگ میں کالی　　بدشمائل کریہہ صورت تھی　　طبع کو جس سے خود کراہت تھی
دلبر آنے لگی جو پٹنہ کو　　دم دیا ۔ میرا دم الٹنے کو　　یعنی امراؤ کو بھی ساتھ کیا　　اور سمجھا کے اس کو کہہ بھی دیا
دل کو نواب کے لبھا لینا　　سختیاں جو پڑیں اٹھا لینا
فتنہ تھی وہ بلائے مبرم تھی　　شعبدہ بازوں کی وہ محرم تھی　　یاں جو آئی تو کچھ زیادہ بڑھی　　ناگہاں ایک روز سر پہ چڑھی

امراؤ کس ضرورت سے بلائی گئی ہے کس ضرورت سے بھیجی گئی ہے نہ رئیس زادہ کو معلوم نہ حیدر جان کو معلوم ۔ ان غریبوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ سازش میں کون کون لوگ ہیں اور کیا کیا چال چلائے جا رہے ہیں ۔ بہرکیف امراؤ کی شعبدہ بازیوں نے رئیس زادہ اور حیدر جان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی ۔ اور حیدر جان اب اپنا سر پھوڑنے لگی ؎

وہ نواب صاحب ذی جاہ　　آپ کی آنکھ سے خدا کی پناہ　　سچ ہے ۔ جی بھر گیا حضور کا بھی　　اور پلہ ہے مجھ کو دوگنا بھی!
———　　لیجئے لکھنؤ میں جاتی ہوں!　　پردۂ درمیاں اٹھاتی ہوں　　———
خیر یہ بھی مقدر اپنا ہے!　　کیوں میں سمجھی تھی گھر یہ اپنا ہے؟　　گزرے کیا جانیں نو برس کیونکر　　پورے اب مجھ سے ہوں گے دن کیونکر!
نتیجہ یہ ہوا کہ　　———　　روٹھ کر میرے پاس سے اٹھی　　دیکھ کر چشم یاس سے اٹھی
گر پڑی چلتے ہی پلنگڑی پر　　اور رونے لگی مری دلبر　　لاگ دل کی یہی سو جاتی ہے　　یوں ہی الفت میں آفت آتی ہے

اس افتاد ناگہانی نے رئیس زادہ کو مجنوں اور حیدر جان کو نیم جان کر دیا ۔ عالم یاس میں وہ لکھنؤ جانے لگی تو عظیم آباد نے پھر دامن پکڑا ۔ کہا کہ جاتی ہے تو پہلے دل اپنا یہیں چھوڑتی جا ۔ باوفا نے جواب دیا کہ دل! دل! دل ہے کہاں؟ وہ تو کب کا مر چکا نماز میت بھی ہو چکی ۔ قبر بھی کھد چکی! ——— لے اب ہم کو لکھنؤ جانے دے ؎

نہ دردی دلیل صبوری بود　　کہ بسیار دردی ضرورتی بود

مختصر یہ کہ حیدر جان پھر عظیم آباد آئی - پھر گئی - پھر آئی - عشق اپنی نیرنگیاں دکھلاتا رہا - ساقی نے غالب سے سچ کہا تھا کہ عظیم آباد کی رنگینی چمن کو بھی نصیب نہیں -

عہد محمد شاہ میں محمد حسن اور شام سندر کا واقعہ عظیم آباد سے دلی تک آگ لگا چکا تھا - وہی شام سندر جس کا واقعہ خدائے سخن میر تقی علیہ الرحمہ نے اپنی مثنوی شعلۂ عشق میں اس سرخی کے ساتھ قلم بند کیا ہے :-

"آغاز قصۂ جانکاہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد در بردی وضیع و شریف بظہور پیوستہ"

جناب شوق نیموی مرحوم یادگار وطن میں لکھتے ہیں کہ محمد حسن عظیم آبادی کا مکان چھوٹی پٹن دیبی محلہ میں تھا - اور شام سندر عظیم آبادی کے نام پر سندر باڑا محلہ عظیم آباد چوک کے قریب باڑے کی گلی اور کچوری گلی کے درمیان واقع ہے - شام سندر ایک مہاجن کی لڑکی تھی - بہر کیف واقعۂ شام سندر سے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد اسی عظیم آباد میں تیغ محبت نے حیدر جان کو گھائل کیا تو جناب سلطان عظیم آبادی نے مثنوی دردِ دل لکھی - شام سندر کے عاشق نے ایک وصیت نامہ چھوڑا تھا - جس کی اصل اب ناپید ہے مگر نقل خواجہ عبد اللہ نابینا عظیم آبادی نے شاہزادہ جہاندار کو بھیجی تھی - یہ نقل شوق نیموی کی یادگار وطن میں موجود ہے - حیدر جان کے عاشق نے بھی ایک خط لکھا تھا - وہ اصل خط راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے -

انتخاب از نقل وصیت نامہ محمد حسن عظیم آبادی	انتخاب از اصل مکتوب ..... عظیم آبادی
اے یارانِ وفاکیش ...... شما از حالِ من آوارۂ کوچۂ محن ...... محمد حسن آگاہی ندارید؟ تا آں شعلۂ عشق انگیز کہ ...... کاشانۂ دلم را خاکستر نمودہ ازاں بے خبر ہستید؟ شمع رخیکہ دلم را پروانہ وار کردہ و آتش در سوگ من جان دادہ در حقیقت دختر مہاجنے بود (اس سے مراد شام سندر ہے) کہ .... روزے بلب دریا دوچار شدم ...... از احبائے من میر محمد رضا کہ فی الحال بہ پٹنہ ہستند مفصلاً آگاہی دارند - از ایشاں پرسیدنی است ...... اکنوں بہ تحقیق پیوست کہ از چند روز بعد نصف شب شعلۂ مشتعل ہودج از آسماں سر بر زند و بر آں روشے دریا (کہ مراد گنگا پار سے یعنی خواجہ کلاں گھاٹ کے اُس پار جہاں چھتے کے میلے سے واپسی میں محمد حسن کی کشتی تباہ ہوئی تھی) فرود آید ...... و بصدائے حسرت آمیز و لہجہ درد انگیز مرا یادمی	...... تب لوگوں نے (امراؤ سے) کہا کہ اری ظالم! تجھ کو عاشق معشوق کے بچھڑنے سے کیا مل جائے گی! (امراؤ نے) کہا تم نہیں جانتے؟ ... . (بہر کیف) یہاں ایک مہینہ تک اس قیامت کا صدمہ اور رنج تھا کہ بیان سے باہر ہے اور انھوں نے (حیدر جان نے) ایسا رنج کیا کہ علیل ہو گئیں - کبھی تو ان کو اس کے (امراؤ کے) بیان کا یقین ہوتا تھا - کبھی لوگوں کی گواہی اور میری قسموں پر آ جاتا تھا - اور میں نے اس کا ایسا صدمہ اٹھایا کہ تین مہینے تک تپ آیا کی .... اب ہم کو اکثر صدمہ ہوتا ہے اور اگلی باتیں یاد کر کے رنج ہوتا ہے کہ یا اللہ یہ کیا ہو گیا .... کیونکہ پندرہ برس کی محبت ہے

کند - نیک دانستم کہ روح پاک آں غیرت حور لاثانی (یعنی شام سندر) بتلاش من زندہ در گور می آید - ہیہات ہیہات کہ من زندہ مانم و دعوئ عشق بر زبان رانم ! . . .

واضح رہے کہ اس وصیت نامہ میں بار بار شعلۂ عشق کا ذکر ہے - ملک الشعراء میر تقی نے یہی نام اپنی مثنوی کے لئے چن لیا -

آج تک پندرہ برس ملاقات کو ہو گئے !!

واضح رہے کہ اس تحریر میں بار بار درد دل کا بیان ہے جناب سلطان عظیم آبادی نے یہی نام اپنی مثنوی کے لئے چن لیا -

مثنوی درد دل کے علاوہ حیدر جان نے اپنا نقش عظیم آباد کی شاعری پر کہاں کہاں چھوڑا ہے اس پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے - یہاں چند شعر ایک یادگار مشاعرہ کے لکھے جاتے ہیں - یہ اشعار طرحی غزل کے ہیں - ظاہراً ان کو حیدر جان سے کوئی واسطہ نہیں - مگر غور سے دیکھئے تو بہت کچھ واسطہ ہے -

سلطان عظیم آبادی

باغ میں میلہ، میلہ میں جلسہ، جلسہ میں شیشہ، شیشہ میں بادہ
لالہ رخوں کی مست ادائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے
موسم گل جب دیکھ گھٹاؤں کو - جوش طرب نے مست کیا ہے
پھٹ گئیں کیا کیا چست قبائیں - اُف ری جوانی ہائے زمانے
آنے کی ان کے دھوم ہے سلطان - پر یہ قیامت آنا کیا ہے
راہ میں کب تک آنکھیں بچھائیں - اُف ری جوانی ہائے زمانے

جناب سلطان کے پہلے شعر میں لالہ رخوں سے مراد عظیم آباد کی " لولیان شوخ و شیریں کار " ہیں جو ہر سال برسات میں حیدر جان کے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں - اور دھانی جوڑے [illegible] آتی تھیں - جناب شاد کا پہلا شعر دیکھئے اور ان دھانی دوپٹوں کا ہوا میں اڑنا دیکھئے -

جناب سلطان نے دوسرے شعر میں موسم گل کی جو تصویر کھینچی ہے - اس میں کسی کو شک ہو تو عبد الرحیم خانخاناں کا ایک دوہا ملاحظہ ہو

بار بار برہن گھر جھانکت ٹھاڑی   جوئی جوئی [illegible]

شاد عظیم آبادی

کالی گھٹائیں - باغ میں میلے - دھانی دوپٹے - لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں - اُف ری جوانی ہائے زمانے
اپنی ادا سے آپ جھجکنا - اپنی ہوا سے آپ کھٹانا
چال میں لغزش - منہ پہ حیائیں - اف ری جوانی ہائے زمانے
شاد نہ وہ دیدار پرستی - اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں - اف ری جوانی ہائے زمانے

جناب شاد کے پہلے شعر میں کالی گھٹائیں ہیں - اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ پری جمالوں کا جمگھٹ تھا - اس جگہ جہاں آج پٹنہ محمڈن اسکول ہے - ہوا بند تھی - گرمی سخت تھی - آسمان پر بادل کا نام نہیں - مہمانوں نے میزبان سے، یعنی حیدر جان سے کہا کہ - تمہارے ہوتے آسمان کا یہ رنگ ؟ حیدر جان نے کہا - میں کچھ خدا تو ہوں نہیں - تم لوگ کفر بکتی ہو - اس کے بعد حیدر جان کا جھولے کی طرف بڑھنا - جھولے کا پینگ میں آنا - حیدر جان کا کجری گانا - ہوا کا چلنا - زلفوں کا [illegible]

یعنی یہ جھگڑا کچھ آج کا نیا جھگڑا نہیں ہے۔ اس کو جب دیکھو یہی دیکھو کہ درزن کے کمر کوڑی ہوئی جھگڑ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ انگیا ہم نے تجھ کو دی تھی درست کرنے کے لئے یا اور تنگ کر دینے کے لیے تو یقیناً چور ہے!

جوں جوں انگیا سیوت۔ یعنی جیسے جیسے تو انگیا سیتی ہے۔

سوئی سوئی کاڑھ۔ یعنی ویسے ویسے تو کپڑا اور کاڑھ (نکال) لیتی ہے۔

کہیں جواب ہے اس الھڑپن کا؟ جرم موسم گل کا۔ اور چور بنائی جا رہی ہے درزن!

جناب سلطان کا مقطع بول رہا ہے کہ حیدر جان اس وقت لکھنؤ میں ہے۔ نامۂ شوق جا چکا ہے۔ قاصد کا ہر روز انتظار ہے۔ حیدر جان کسی طرح آ نہیں سکتی۔ اور عظیم آباد میں یہ کسی کو ابھی تک خبر ہی نہیں کہ ؎

مثل یوسف ہوئی زلیخا قید؟

کا اپنی ایک کنیز کی ہٹ رکھ لینا۔ رقاصۂ ابر کا اپنی مشک کی گرہ کھول دینا اور مہمانوں کا انگشت بدنداں ہونا یہ سماں وہ تھا جو عظیم آباد دیکھ چکا ہے!

جناب شاد کا دوسرا شعر ہے۔ اپنی ادا سے آپ جھجکنا اپنی صدا سے آپ کھٹکنا۔ چال میں لغزش۔ منہ پہ پسینہ۔ یہ تصویر یادش بخیر خود حیدر جان کے ہاتھوں کی کھینچی ہوئی تصویر ہے ؎

چال البیلی۔ نپٹ نویلی

جناب شاد کے مشہور مستزاد کا ایک شعر ہے ؎

رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی۔ بے پئے متوالی
سانولا رنگ۔ نمک ریز جراحات جفا۔ اُف کہاں دھیان گیا

یہ تصویر بھی پہچانی ہوئی ہے ؎

توری سانوری صورت موہ من بھائے
مدھ بھری انکھیاں۔ گجرا سہائے

اب معلوم ہوا کہ شاعر کا دھیان کہاں گیا تھا!

اب سوال یہ ہے کہ سلطان عظیم آبادی کون تھے؟ اس کا جواب شاد عظیم آبادی کے قلم سے سنئے ؎

(۱) عنوانِ نامۂ شاد بنام سلطان :۔

شفیق حالِ دلِ مبتلائے کامل یار   انیس خلوت راز و جلیس عاشق زار
کرم نما و خطاپوش و خسرو ذیشان   تمام ہند مروت کے سرور و سلطان
خدا جہاں میں سلامت رکھے قیامت تک   قریب آ نہ سکے تیرے کوئی آفت تک
بصد نیاز و بصد امتیاز و رسم قدیم   قبول خدمت عالی میں ہو مری تسلیم

(۲) حیات فریاد مؤلفہ شاد عظیم آبادی ص ۱۹۰

"نواب سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان مرزا صاحب۔ تخلص سلطان۔ خلف نواب بہادر نواب سید ولایت علی خاں مرحوم سلطان مرزا صاحب مرحوم نہایت شہ زور۔ خوش رو۔ خوش گفتار۔ خلق مجسم۔ رئیس ابن

رئیس تھے۔ بہت کم عمری میں انتقال کیا۔ گو ان کے انتقال کو ۲۵ - ۲۶ سال ہوئے لیکن اہلِ عظیم آباد کے دلوں سے ان کی یاد بھولی نہیں ہے۔ ان کی ہمشیرہ کے پوتے نواب سید اسمٰعیل خاں بہادر عرف مجھن نواب صاحب ان کی یادگار ہیں۔ سلطان صاحب مرحوم کو شاعری میں تلمذ میر فرزند احمد صفیر بلگرامی سے تھا۔

غالب کی ایک مشہور غزل کے دو شعر ہیں: -

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے   بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اگرچہ یہ جامہ کسی اور کے لیے قطع ہوا تھا۔ مگر نواب سید تجمل حسین خاں عظیم آبادی کے جسم پر بھی ٹھیک ہو رہا ہے ذرا جھول نہیں ہے۔

جناب سلطان عظیم آبادی اپنے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: -

"۔۔۔ میری کیا لیاقت تھی کہ شاعروں کے زمرے میں فروغ پاؤں۔ مگر یہ سب فیض استادِ کامل الفن، سخن آموز سخن حضرت صفیر بلگرامی کا ہے کہ آج چودہ برس سے سوائے ان کے کسی سے فیض نہیں پایا اور انھوں نے شفقت سے بہت کچھ بتایا۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں بدولت خانۂ سید علی محمد صاحب شاد شاگردی کا اتفاق ہوا۔ اس چودہ برس کے زمانے میں دو دیوان عاصی کے مرتب ہیں۔ ایک دیوان بحرِ خفیف کا۔ دوسرا مختلف اور بحروں میں۔ اور دو مثنویاں تیار ہیں۔ ۔۔۔"

ان دو مثنویوں میں ایک مثنوی دردِ دل ہے جس کا انتخاب گزر چکا ہے۔ اب ایک رباعی ملاحظہ ہو: -

شہرہ جو یہ میری خوش کلامی کا ہے   یہ شور جو میری نیک نامی کا ہے
واللہ ہزار میں کہوں گا سلطاں   سب فیض صفیر بلگرامی کا ہے

مثنوی دردِ دل کے بارے میں جناب سلطان کا ایک خط حضرت صفیر بلگرامی کو گیا تھا۔ وہ یہ ہے: -

"حضرت استاد صاحب قبلہ و کعبہ دام ظلہٗ۔ تسلیم۔ حضور نے بندہ سے فرمایا تھا کہ جب میں آرہ اپنے محالات پر جاؤں گا تمھارا آدمی اپنے ہمراہ لیتا جاؤں گا ۔۔۔۔۔۔ بلکہ میں نے میر پناہ علی کے بیٹے جو حضور کے حکم سے میرے پاس واسطے لینے کتاب ید بیضا کے آئے تھے ان سے میں نے کہا تھا کہ جناب استاد صاحب کی خدمت میں عرض کرنا کہ حضور کب تشریف لے جائیں گے؟ آدمی میرا آپ کے ساتھ جائے گا ۔۔۔۔۔۔ اور میری غزلوں کی کتاب حضور کے پاس ہے اور مثنوی بھی حقیر کی آپ کے پاس ہے۔ امیدوار ہوں کہ از راہ شاگرد نوازی مثنوی اصلاح دے کر اور تمام فرما کر عنایت ہو کہ ۔۔۔۔۔۔ یہ ہماری یادگار رہ جائے گی ۔۔۔۔۔۔ میں وہی سلطان ہوں جو تھا اور وہی شاگرد ہوں جو تھا۔ آج یہ عریضہ نہایت رنج و غم میں تحریر ہوا۔ از خورداں خطا و از بزرگاں عطا ۔۔۔۔

میں امیدوار ہوں کہ کتاب غزلوں کی اور مثنوی اصلاح فرما کر یا خود حضور کے ہمراہ آئے۔ یا آدمی روانہ کروں اس کو عنایت ہو۔

نامہ سیاہ سید تجمل حسین خاں

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر سلطان و شاد و صفیر کو اب تک کسی نے پہچانا نہیں۔ یہ وہی س۔ ش۔ ص ہیں جن کے لئے ایک دن عظیم آباد اور آرہ کی طنابیں کھنچ گئی تھیں اور جن کے لیے قضا و قدر نے نواب بہادر کے صحن میں اپنا جال بچھایا تھا۔ اس صحن میں آٹھ اور گیارہ برس کی عمر کے دو لڑکے ایک مونڈھے سے کھیل رہے تھے اور ایک پردیسی اپنے اشعار سنا رہا تھا۔

آٹھ برس کا لڑکا سلطان عظیم آبادی۔ گیارہ برس کا لڑکا شاد عظیم آبادی اور پردیسی صفیر بلگرامی۔ وہ پردیسی نواب بہادر کا رقعۂ نوید پا کر شرکت تقریب کے لئے آرہ سے عظیم آباد آیا تھا۔ باقی آئندہ

* * *

مشہور جرمن فلسفی شاعر اور حکیم حیات
یوحان ولہلم گوئٹے
کا مشہور ناول "نوجوان ورتھر کی داستان غم"

جس میں شباب کی رومانی کیفیت کی نفسیاتی تصویر
بڑی چابکدستی سے پیش کی گئی ہے۔

اردو ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے براہ راست جرمن زبان
سے کیا ہے۔ قیمت: پانچ روپے پچھتر پیسے

ملنے کا پتہ: گلڈ انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریا روڈ۔ کراچی۔
ادبی سنڈیکیٹ۔ ۶۱۳ الف/۲ ناظم آباد۔ کراچی

پروفیسر محمد عبدالغنی نیازی جبلپوری

عبدالحمید زیبا کوٹی

کسی ادب[1] کی تاریخ میں مختلف ادوار کا تعین سنین کے ساتھ کرنا دشوار ہے کیونکہ بعض خصوصیات دو مختلف ادوار کے ں مرحلے میں مشترک ہوتی ہیں۔ یعنی ایک دور کے آخری حصے کی پرانی خصوصیات کچھ دور تک تو نئے دور کی نئی خصوصیات تھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور بالآخر "تھک کر بیٹھ جاتی ہیں" یہی وہ وقت ہوتا ہے جبکہ نئی خصوصیات اپنی پوری آب و تاب تھ جلوہ گر ہو کر خاص و عام کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی ہیں۔ اس طرح ہر دو ادوار کے درمیانی حصے کو جس میں نئی اور پرانی یات ملی جلی موجود ہوں "متوسط" یا "عبوری" دور کہا جاتا ہے۔

ادب اردو کو بھی عموماً قدیم و جدید ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے، لیکن ہر دور میں متعدد شعرا و ادبا ایسے بھی نظر آتے ہیں ز مانۂ حیات کم و بیش دونوں ادوار پر مشتمل رہتا ہے۔ چنانچہ ان کے نگارشات میں حسب تقاضائے زمانہ ہر دو ادوار کی یات کا پایا جانا لازمی و فطری ہے۔ اگر شاعر یا ادیب کی طبیعت میں نئے ماحول سے متاثر ہو جانے کی استعداد زیادہ ہے تو وہ ات کو جلد قبول کر لیتا اور اس کا اظہار اپنی تخلیقات میں تیزی کے ساتھ کرتا ہے لیکن اس کے برعکس خاندانی اثرات ا تربیت، ابتدائی زندگی میں معاشرت کے گہرے اثرات، دینی تعلیم و تربیت اور استحکام عقاید میں اس کا حصہ، ابتدائی لیم و تربیت میں بعض اساتذہ یا ہم سبقوں کی موثر شخصیت اور ان کے پسندیدہ خیالات کے گہرے نقوش، ایسے عوامل بعد کی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات و نظریات سے جلد متاثر نہیں ہوتے۔ ذا ایسے شعراء و ادبا "رنگ جدید" کو جلد یار کر لینے کی استعداد رکھتے ہیں۔ پھر بھی وہ اچھی خصوصیات کو ضرور اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے شعراء و ادباء کی نگارشات حدت طرازی (جسے محض نقالی کہنا چاہیے) پاک اور زیادہ تر سلسلہ محاسن شعر و ادب سے مزین ہوتی ہیں۔

قالہ تقریباً بائیس سال قبل لکھا گیا تھا لیکن پاکستان آنے کی افراتفری میں گم ہو گیا۔ اتفاق سے اس کی ایک نقل ابھی حال ہی میں ۔ لہٰذا نذر ناظرین کی جاتی ہے (محمد عبدالغنی نیازی)

اس وقت اس بحث کا موقع نہیں ہے کہ مسلمہ ادبی و شعری محاسن جو ہمارے قدیم اساتذۂ فن کی مسلسل جد و جہد کے ہماری ثقافت و تہذیب کا علمی و ادبی سرمایہ بن چکے ہیں، انھیں کیا مزید وسعت کی خاطر بالکل مسترد کر دیا جائے۔ یا ان محاسن کے استعمال کو باقی رکھ کر جدید محاسن کا اضافہ کیا جائے۔ فی الحال میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت زیبا کوٹوی مرحوم کا تعلق تاریخ نظم اردو میں عصر جدید اور اس کے ماقبل عبوری عہد سے تھا۔ اور وہ اس نظریے کے قائل تھے کہ جدید رنگ بھی اختیار کیا جائے اور قدیم محاسن بھی برقرار رکھے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دور جدید کی سنجیدہ و پسندیدہ خصوصیات کے ساتھ طرز قدیم کے محاسن بھی نمایاں ہیں۔ مرحوم نے جن اساتذہ سے فیض حاصل کیا وہ عبوری دور سے متعلق تھے۔ اور اپنی شعری کلیات میں قدیم محاسن کے استعمال کے ساتھ ساتھ قابل قبول جدتوں کو اختیار کرکے اردو ادب میں وسعت پیدا کر رہے تھے حضرت زیبا نے حضرت شبلی مرحوم سے فارسی پڑھی۔ حضرت احسن مارہروی حضرت ریاض گورکھپوری۔ حضرت مضطر خیرآبادی۔ حضرت امیر مینائی کی ادبی دواوین سے کچھ عرصے تک مستفیض ہوئے۔ بعد ازاں جب حضرت امیر مینائی نے عہد پیرانہ سالی کے ساتھ حضرت شہیر مچھلی شہری سے مشورۂ سخن کرنے کی تاکید فرمائی تو مرحوم نے موصوف کی شاگردی اختیار فرمائی اور مدت العمر انہیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اشعار کی زبان صاف، شستہ، سلیس اور فصیح ہے اور ان کا کلام خصوصیات جدیدہ کا حامل ہوتے ہوئے فنی اسقام و اغلاط سے پاک ہے۔

حضرت زیبا بے حد ذہین اور طباع تھے۔ جدت پسندی اور ہمہ گیری ان کے فطری جوہر تھے، جنہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی مشہور عالم درسگاہ کے علمی ماحول نے کافی نمایاں کر دیا تھا۔ مرحوم ہر چمکدار چیز کو سونا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی جدت پسندی "جدت برائے جدت" یا ادبی محاسن سے معرا "ترقی پسندی" نہ تھی۔ بلکہ ان کی جدت اساتذۂ طبقۂ متاخرین کے قابل قدر محاسن کلام اور دور جدید کی پسندیدہ خصوصیات کا ایک حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔ ان کا کلام اس حقیقت کا آئینہ ہے۔

مختصر حالات

حضرت زیبا ۱۸۸۴ء میں بمقام کوٹ (ضلع فتحپور یوپی) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی اور ۱۷ سال ۵ ماہ کی عمر میں ایم اے او۔ کالج علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ کالج میں مولانا شبلی علیہ الرحمۃ سے فارسی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ شاعری کا شوق اسکول ہی میں پیدا ہوگیا تھا۔ علی گڑھ کالج کی فضا میں اس چنگاری نے شعلہ کی صورت اختیار کرلی۔ زمانہ طالب علمی میں اکثر بزمانۂ تعطیلات مارہرہ تشریف لے جاتے اور حضرت احسن مرحوم کے دولت خانہ پر مقیم رہ کر اپنے کلام پر اصلاح و مشورہ لیتے۔ کالج کی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد چند روز حضرت مضطر خیرآبادی سے بھی کلام پر اصلاح لی بعد ازاں حضرت شہیر کی جانب متوجہ ہوئے۔

مذکورۂ بالا حالات مرحوم کے خطوط سے اخذ کئے گئے ہیں۔ راقم الحروف سے بھی مرحوم نے بارہا ان واقعات کا ذکر کیا ہے اور کلیات میں بھی چند اشعار ایسے ہیں جن سے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ؎

زیبا مرے کلام میں ہے میرزا کا رنگ　　شاگردیٔ شہیر سے مجھ کو ملا یہ فیض

شہپرِ خوش بیانی فیض کا ہے یہ اثر زیبا مثالِ موجِ دریا صاف و شستہ ہو زباں میری

کیوں نہ ہو زیبا منیر نامور کا معتقد جس کا میں شاگرد ہوں اس کا بھی وہ استاد تھا

مرحوم کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی، ہر کام کو بحسن و خوبی انجام دیتے تھے استادِ زمانہ نے انھیں کبھی ایک جگہ چین سے بیٹھے
.با. ۱۹۰۹ء میں وہ جبل پور تشریف لائے اور ۱۹۳۶ء تک سی پی کے مختلف شہروں میں بہ سلسلہ ملازمت مقیم رہ کر مختلف
رنوں سے اردو کی خدمت کرتے رہے۔ ان کا زیادہ وقت ہائی اسکولوں کی ملازمت میں بحیثیت نائب صدر مدرس، یا
مدرس گزرا۔ تھوڑے عرصے کے لیے مرحوم ریاست پنا کے فرسٹ کلاس مجسٹریٹ پھر دیوان ریاست ہو گئے۔ بعد ازاں
است سرگودھا کے جواں سال والی و وارث جناب نواب عبدالوحید خان کے اتالیق و دیوان مقرر کیے گئے نواب صاحب
صوف کو اوائل عمری ہی سے شاعری کا شوق تھا حضرت زیبا کی صحبت و توجہ نے چار چاند لگا دیے۔ آج کل نواب صاحب کراچی
ہور میں مقیم ہیں اور ان کے کلام بلاغت نظام کے کئی نمونے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں حضرت زیبا پر فالج کا اثر ہوا اور میں نے انھیں اپنے غریب خانے پر تقریباً دس ماہ ٹھہرا کر علاج کرایا۔
رافاقہ نہ ہوا۔ بالآخر اپنے صاحبزادوں کے اصرار پر وہ وطن تشریف لے گئے اور وہیں ۱۴ر جنوری ۱۹۳۷ء کو انتقال فرمایا۔

حضرت قبلہ کلیم جبلپوری شاگرد رشید حضرت احسن مارہروی نے تاریخ لکھی۔

۱۰۳۰
۲۶۰
۳۰
۱ تا
۳۰
۱۳۵۵

؎ شاعرِ نازک بیاں زیبا ہے اب جنت نصیب (۱۳۵۵ھ)

اور اس ناچیز نے عرض کیا ہے

؎ یکصد و غم مرگ زیبا ہے زیبا (۱۳۵۵ھ) منکم کو ہے فکر تاریخ رحلت

حضرت زیبا مرحوم ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ انہوں نے تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی فرمائی ہے البتہ رباعیات
ست کم لکھی ہیں۔ غزلیات کا دیوان ضخیم تھا، لیکن خود ہی نہایت سخت انتخاب کر کے رنگ قدیم کی متعدد غزلیات قلم زد فرما دیں
لموں کا مجموعہ اب بھی بہت ضخیم ہے۔ جس میں حمد۔ نعت۔ مراثی و سلام اور ادبی و قومی نظمیں کثیر التعداد ہیں۔ ان سے
لم نیچرل نظمیں اور انگریزی نظموں کے ترجمے ہیں۔ تقریباً اسی قدر متفرق نظمیں ہیں جو مختلف عنوانات پر لکھی گئی ہیں۔ تاریخیں
بھی اکثر بے مثل ہیں۔ غزلیات محاسن شعری سے مالا مال ہیں۔ قومی نظمیں پُر درد اور سبق آموز ہیں۔ سلام و مراثی جدید
رنگ کے اور قومی و ملی تعلیمات کے حامل ہیں۔ مضمون زیر بحث میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر حصۂ کلام پر کچھ مفصل لکھا جائے اور
اقتباسات پیش کیے جائیں لہٰذا فی الحال صرف صنفِ غزل پر اکتفا کی جاتی ہے

محاسن تغزل

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کلام زیبا مختلف اساتذۂ باکمال کی شاعرانہ خصوصیات سے مالا مال ہوتے ہوئے جدت ادا اور جدت خیال کا آئینہ ہے۔ مرحوم اپنے ایک شعر میں اپنے مسلکِ شاعری کی وضاحت یوں کرتے ہیں:۔

؎ شعر میں لازم ہے جدت وہ زمانہ اب کہاں مطلعِ محشر کا مصرع جب قدِ دلدار تھا

بہ حیثیتِ مجموعی ان کی غزلوں میں صفائی سادگی اور متانت کے ساتھ زور، جوش اور درد ہے۔ ان میں تاثیر کے لحاظ سے تیز سے تیز نشتر موجود ہیں۔ وہ جذباتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار میں خاص توجہ سے کام لیتے ہیں ان کے اشعار میں صنائع کلام کے موزوں استعمال کے ساتھ ساتھ داخلیت کی ترجمانی استادانہ انداز میں پائی جاتی ہے۔ بندش کی چستی و روانی کے ساتھ ساتھ سچائی اور واقعیت کی پرلطف آمیزش ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں میر و درد کے دلگداز تغزل کو کامیابی کے ساتھ جذب کیا ہے۔ اور اپنے اکثر اشعار میں روایت حسن و عشق کے ان عناصر کو پیش کیا ہے۔ جن کی ہمہ گیری مسلم ہے اور یہی ایک کامیاب شاعر کا اہم فریضہ ہے۔ مختصر یہ کہ جناب زیبا کا تغزل حقیقی اور سچے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اور درد و سوز اس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ مثلاً ؎

اک تیر تھا کہ دل سے جگر تک اتر گیا اک قہر تھا نگاہ سے ملنا نگاہ کا
کیا ڈھونڈتا ہے برق سے جو شاخ جل چکی اے باغباں اسی پہ مرا آشیانہ تھا
اندوہِ ہجر، سوزِ جگر، حسرتِ وصال اتنی بلائیں ایک مری جانِ زار پر
ہے یہ سوزِ عشق کا زیبا اثر دل مرا بجھ کر بھی جلتا رہ گیا
وہی ہے وہی حال عاشق کے دل کا جسے تو نے جانا نہ پوچھا نہ دیکھا
زیبا کبھی میں خاک کا پتلا ضرور تھا لیکن غموں نے درد کا پتلا بنا دیا

واقعیت و صداقت

کہا جاتا ہے کہ" دورِ حاضر میں حسن و عشق کے تصادم کو ذرا دور سے دیکھا جا رہا ہے۔ کیونکہ اشعار میں انہماک و گمشدگی ذرا کم نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شعرا محض رسمی عشق یا سنی سنائی باتوں کا اظہار اشعار میں کر دیتے ہیں۔ یا عاشق و عاشقی کا نظریہ ہی تبدیل ہو گیا ہے اور اس میں محبت کی ربودگی، خلوص و پاکیزگی کی جگہ محض سطحیت اور جنسی خواہشات کے اظہار نے لی ہے۔ لیکن جناب زیبا کو اس تصادم کا ذاتی تجربہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہمیں جذباتِ حسن و عشق کے دل نواز مرقعے اور دردِ خاطر کے ابھرے ہوئے نقوش نظر آتے ہیں۔ اور چونکہ یہی صفات غزل کی جان سمجھی جاتی ہیں۔ جناب زیبا کا تغزل نہایت کامیاب اور موجودہ ہوس پسندی کی سطحیت سے بہت بلند ہے علاوہ بریں ان کا کلام عامیانہ انداز کی معاملہ بندی سے بھی قطعی پاک ہے اور اشعار میں لب و لہجہ کی متانت ہر جگہ نمایاں ہے۔ واقعیت خوشنما مرقعے اور انہماک و گمشدگی کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

محفل میں ان کی غفلت تھی طاری گو میں وہیں تھا لیکن نہیں تھا

وارد

شاعر بھی ہوں تو ممکن نہیں کہ دو شعرا کے جذبات ایک سے نہ ہوں۔ چند اشعار میں توارد کی زیادہ تر وجہ یہی جذبات کی ہمہ گیری اور واقعیت ہے شاعر کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے شاعر نے بھی اسی قسم ،جذبات ملتے جلتے الفاظ میں ادا کئے ہوں گے۔ بہرحال دو شعرا کیا، جہاں تک جذبات حسن و عشق کا تعلق ہے وہ ہمہ گیر ہیں۔ رتمام شعرا بلکہ تمام انسانوں کے دلوں میں یکساں طور پر موجود رہتے ہیں۔ " جدت " صرف طرز ادا اور اسلوب بیان میں نمایاں .لی ہے۔ شاعر کے اچھوتے انداز بیان سے روایات قدیم میں از سر نو جان پڑ جاتی ہے اور اشعار کی جاذبیت میں چار چاند لگ نے ہیں۔ وہ پرانے اسالیب بیان کو بھی اختیار کرتا ہے تو جدید رنگ و روغن کے ساتھ۔ تاکہ انداز بیان میں نئے امکانات راہو جائیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی کوشش کے نمونے ہیں۔

جناب میر فرماتے ہیں ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

زیبا اسی خیال کو اپنی ٹکسالی زبان میں یوں ڈھالتے ہیں ؎

آئندہ اور دیکھئے کیا کیا ہو عشق میں   قسمت کو اپنی روتے ہیں زیبا ابھی سے ہم

غالب نے لکھا تھا ؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

زیبا کہتے ہیں ؎

مجھے تو ان کے آنے سے ہوئی صحت، وہ کہتے ہیں   بڑا دھوکا ہوا ہم آپ کو بیمار سمجھے تھے

مولانا احسن فرماتے ہیں ؎

جب کسی نے ان کی محفل میں نہ پوچھی میری بات   درد دل اٹھا بہ مجبوری بٹھانے کے لئے

حضرت زیبا اسی مضمون سے ایک نیا مضمون پیدا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

عدو کی دشمنی بھی آج اپنے کام آگئی   اٹھے جو بزم یار سے درد نے بٹھا دیا

مندرجہ ذیل اشعار کے تیور محض جدت ادا کی بدولت بے پناہ معلوم ہوتے ہیں۔

وہ عکس اپنا دیکھ کے حیرت زدہ ہوئے   آئینہ ان کو دیکھ کے تصویر ہو گیا
میں خاک میں ملا تو بنا خانۂ مزار   اک گھر گرا تو دوسرا تعمیر ہو گیا
پھر ہے ہمارے خانۂ دل میں ہجوم غم   پھر گھر تمہارا غیر کی جاگیر ہو گیا

زک خیالی

مندرجہ ذیل اشعار جدت ادا کے علاوہ نازک خیالی کے بھی اعلیٰ نمونے ہیں۔

زندگی وہ دن کی ہوا میں بکھرے ہیں ہزار   اک ذرا سے خواب کی اتنی بڑی تعبیر ہے

عبث کی کاتبِ اعمال نے تکلیف لکھنے کی
تری رحمت کے آگے کون تھا منکر گناہوں کا
تمہارے حسن کی تعریف غیروں سے سنی میں نے
تعجب ہے ثبوتِ حق ملا جھوٹے گواہوں سے
چشمِ نرگس محوِ چشمِ یار ہو کر رہ گئی
دیکھ کر بیمار کو بیمار ہو کر رہ گئی
محبت کی یہی دھن ہے جسے چاہا اسے چاہا
طبیعت کی یہی لے ہے جدھر آئی ادھر آئی
جان کے دشمن وہی زیبا ہوئے
جن کو میں سمجھا تھا میری جان ہیں
انگور شاخ سے جو جدا ہو شراب ہو
حیرت ہے تارہ ٹوٹتے ہی آفتاب ہو
بار بار اس نے پڑھتا ہوں جوابِ نامہ
کہ مرے حرفِ تمنا پہ کہیں صاد نہ ہو
میری آنکھوں کو کسی بایک دگر یہ بدگمانی ہے
نظارہ ساتھ ہی کرتی ہیں دونوں روئے جاناں کا
ہماری جان لیں گے عشق میں آنسو رواں ہو کر
ہمارے واسطے رہزن ہمارا کارواں ہوگا

زندگی اور مقصدِ زندگی

دنیائے عشق و محبت میں حیات اور مقصدِ حیات دونوں بدل جاتے ہیں۔ نگاہِ عاشق میں عشق و محبت ہی زندگی ہے اور وہی مقصودِ زندگی ہے۔ محض اس لئے کہ اس کے ذریعے حصولِ معشوق ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ دردِ عشق اور غمِ محبت درد اور غم نہیں رہتے۔ بلکہ عین علاج اور عین لطف بن جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ عاشقِ صادق محسوس کرتا ہے کہ اسے زندگی اس لئے عطا ہوئی ہے کہ معشوق پر قربان کر دی جائے۔ اس منزل میں خود موت عین حیات بن جاتی ہے ان ہی جذبات کو حضرت زیبا یوں بیان کرتے ہیں :-

عشق میں موت کی پروا نہیں کچھ زیبا کو
حاصلِ زیست ہے جان آپ پہ قربان کرنا
زندگی کا تھا یہی مقصد کہ تم پر ہوں نثار
مجھ کو جینا صرف مرنے کے لئے درکار تھا
فدا سو جان سے ہیں ہم تو اس دردِ محبت پر
وہ لطفِ زندگی نکلا جسے آزار سمجھے تھے
محشر میں بھی کرشمے یہ ہوں گے عاشقی کے
جو تم پہ مر چکے ہیں وہ پھر مریں گے جی کے
سمٹ کر تم سے ملوں میں کچھ اس طرح مٹا دینا
حاصل جس سے لطفِ بقا ہو ایسا جام فنا دینا

بعض اشعار میں عشقِ حقیقی کی ترجمانی پرکیف انداز میں کی گئی ہے :-

نہاں ہو کر عیاں ہوگا۔ عیاں ہو کر نہاں ہوگا
مری آنکھوں میں پتلی دل میں وہ بت نورِ جاں ہوگا
نہ دیکھیں گے جو دیکھیں گے کبھی تم کو دیکھنے والے
کہ حسنِ دل ستاں خود اک حجابِ جلوہ ستاں ہوگا
فنا جب تک نہ ہو کوئی بقا حاصل نہیں ہوتی
نشاں تیرا وہی پائے گا جو خود بے نشاں ہوگا
تم پہ مرنے کی تمنا کیوں نہ اک عالم کو ہو
زندگی اس موت کے صدقے بقا ہو جس کے بعد

غالب کا اثر

جناب زیبا کو کلامِ غالب بہت مرغوب تھا۔ متعدد اشعار کی شرح بھی لکھی ہے غالباً ایک جز

شرح لکھنے کا ارادہ تھا۔ جو پورا نہ ہو سکا۔ ان کے رجسٹروں میں جو مرحوم نے خود بطور امانت میرے سپرد کئے ہیں ایک رجسٹر ہے جس میں غالب کا غیر مطبوعہ کلام خود ان کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے جس پر یہ نوٹ درج ہے۔

" یہ وہ اشعار ہیں جو غالب کے دیوان مرتبہ ۱۲۳۶ھ میں موجود تھے اور جو بعد میں بڑھائے گئے۔ مگر مرتجب دیوان میں موجود نہیں ہیں " اس کے نیچے ایک جدول میں جس ردیف وار " مشترک " اور غیر مشترک کے تحت مطبوعہ و غیر مطبوعہ اشعار کی تعداد درج ہے اور میزان مشترک مطبوعہ ۵۲۲ غیر مطبوعہ ۰، ۵ غیر مشترک مطبوعہ ۳۶۰، اور مطبوعہ ۲۲۹ ہے۔ اس طرح غیر مطبوعہ اشعار کی میزان ۱۰۵۱ ہے۔ معلوم نہیں پورا دیوان کس کتب خانہ سے نقل کیا گیا ہے۔ بہرحال اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کو حضرت غالب کے کلام اور اس سے متعلق تحقیقات سے کتنی دلچسپی تھی۔ وہ خود تو فلسفی نہ تھے، لیکن حقائق زندگی اور نفسیات حسن و عشق کے بیان میں فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ایسے اشعار میں رفعت و نزاکت خیال اور حسن بیان سب کچھ ہے۔ یہ خصوصیات غالب کے تتبع کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں مثلاً

کیسی اجل یہ روح کا اس پر پڑا ہے صبر   زندان روح جسم تھا، زندانِ جسم قبر
بے پردہ کیا رہے وہ تجلّی برق سوز   جس نے بنایا برق کی خاطر حجاب ابر
گر بصیرت ہو تو جگنو کی چمک ہے شمعِ طور   نکتہ مقصود بھی ہے نکتۂ باطل کے پاس
اس سے دوری کا اثر یہ ہے کہ قطرا میں ہوں   ڈوب کر اس میں جو مٹ جاؤں تو دریا میں ہوں
بت پرستی ہے مری عین عبادت تیری   تیرے بندوں پہ تصدق ہوں وہ بندا میں ہوں
لوگ کہتے ہیں تڑپتا ہے یہ بے چینی سے   دل یہ کہتا ہے تڑپنے ہی سے زندا میں ہوں
بن گئی وجہِ ظہورِ نورِ تاریکی شرک   بت پرستی شرط ہے تکمیل ایماں کے لئے
حسن کو ہر حال میں ہے بے حجابی سے گریز   تابشِ جوہر ہے پردہ تیغ عریاں کے لئے

ایک دل کش امتزاج

جذبات غم کی مصوری دل نشیں طرز استدلال کے علاوہ رنگ تغزل کا امتزاج بعض دفعہ شعر کے تیور کو بے پناہ بنا دیتا ہے، مثلاً ؎

ہنسی بھی رنج میں آئے تو کوئی جی بہلتا ہے   ٹپکتا ہے لہو زخمِ جگر کے مسکرانے پر
اب اور محبت کا کہتے ہیں اثر کس کو   روتے رہے وہ پہروں زیبا مرے مدفن پر

بات سے بات پیدا کرنا

یہ بھی حضرت غالب کی تقلید کا اثر معلوم ہوتا ہے کہ زیبا نہایت سلیس زبان اور سادہ الفاظ استعمال کر کے بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔ اور اپنے اچھوتے انداز بیان سے شعر کو نہایت دلکش بنا دیتے ہیں۔ البتہ یہ خصوصیت مابہ الامتیاز ہے کہ وہ رعایت لفظی، مراعاۃ النظیر اور صنعتِ تضاد کا زیادہ استعمال کرتے ہیں اور بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں انھوں نے اپنے استاد حضرت شہیر مچھلی شہری اور دادا استاد

حضرت منیر شکوہ آبادی کی تقلید نہایت کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہے یہ سوزِ عشق کا زیبا اثر
دل ہمارا بجھ کر بھی جلتا رہ گیا
یہ سن لو کہ طول شب غم نے مارا
بہت مختصر ہے فسانہ کسی کا
فردا سے گو تمہاری قیامت مراد ہو
کل کا ہے میرے دل کو مگر انتظار آج
شکر کو وہ گلہ سمجھتے ہیں
کیا کہا میں نے کیا سمجھتے ہیں
مجھ کو سب لوگ کہتے ہیں زیبا
آپ فرمائیں کیا سمجھتے ہیں
بے چین کئے دیتا ہے کہنا یہ کسی کا
بیتاب کئے دیتی ہے فریاد کسی کی
تیری خاموشی نہیں ہے بے سبب
ہو نہ ہو اس میں بھی کوئی بات ہے
مان لیا سُن جو لیا غیر سے
آپ کے تو آنکھیں نہیں کان ہیں

کبھی بعض الفاظ کی تکرار یا اُلٹ پھیر سے شعر میں حسن و بلندی پیدا کرتے ہیں مثلاً :۔

رنگ وحدت میں ہے قرب و بُعد اک راز عجیب
دور ہے جو پاس ہے جو پاس ہے وہ دور ہے
نہ دیکھیں گے جو دیکھیں گے کبھی تم کو دیکھنے والے
کہ حسن دل ستاں خود اک حجاب جاں ستاں ہوگا
محبت کی یہی دھن ہے جسے چاہا لیے چاہا
طبیعت کی یہی لے ہے جدھر آئی ادھر آئی
آنے والی تھی طبیعت آ گئی
ہونے والی تھی محبت ہو گئی

خمریات

غالب کی طرح وہ مے نوش بھی تھے اور خمریات پر نہایت پرلطف اشعار ان کی کلیات میں موجود ہیں۔ لیکن آخر عمر میں وہ اس "کافر" سے قطعی متنفر ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اس مشہور مقولہ ؎

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کو قطعی غلط ثابت کر دکھایا۔ اور اپنے کلام کا انتخاب کرتے وقت (جو میرے غریب خانہ پر اپنے دو ماہہ قیام کے زمانے میں کیا تھا) خمریات سے متعلق اکثر اشعار قلمزد فرما دیئے۔ جو باقی رکھے ان کا نمونہ یہ ہے :۔

میکدے میں نشۂ عرفاں رہا مجھ کو مدام
میں ہوں وہ مے نوش جو غفلت میں بھی ہشیار تھا
اس کے پینے کو میں جائز کہوں کیونکر زیبا
خون انگور کا ہے یہ مے انگور نہیں

اور اس شعر کو سُن کر تو نہ پینے والے بھی جھومنے لگیں گے۔

گھٹا اٹھی تو بوچھاریں ہمیں پر
ارے واعظ بچے جائیں کہاں تک

مصائب و ظرافت

حضرت زیبا کی زندگی مصائب و آلام ہی میں گزری۔ وہ خود اس کی جانب متعدد جا اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں :۔

مصائب پر مصائب رات دن ہم پر گذرتے ہیں   مزے کی زندگی ہے ہم تو اس جینے پہ مرتے ہیں

لیکن طبعاً وہ ایک زندہ دل اور خوش مزاج انسان تھے، چنانچہ شوخیٔ طبع اور سنجیدہ ظرافت کے نمونے غالبؔ ان کے کلام میں بھی جا بجا ملتے ہیں۔ مثلاً

مری روح کی خطا کیا جو عذاب کی ہے دھمکی   یہ کب اس کی التجا تھی لباس جسم پہنا
صف عشاق کے آگے ہوں یا رب حضرت یوسف   ہماری فوج کا محشر میں افسر خوب صورت ہو
تبرکاً ہوئے تقسیم آج رندوں میں   قبائے شیخ فضیلت مآب کے ٹکڑے
حور و قصور کے لئے پڑھتا ہے یہ نماز   زاہد کو اور کچھ نہیں اللہ سے غرض
مے کوثر کی بھی کیا بات ہے اے حضرت زاہد   کہ جیتے جی نہ تم نے پی نہ یاروں ہی کو پلوائی
مسافر کو بھی یہ منزل میں دم لینے نہیں دیتے   خدا سمجھے فرشتوں سے سوال آ آ کے کرتے ہیں

مذاق تصوف

تصوف میں انہیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا، لیکن حضرت غالب کی اصطلاح میں وہ " م ضرور تھے۔ ان کے متعدد اشعار اس مسلک کے ترجمان ہیں۔ مثلاً :-

میرے سر نیاز کو سجدے سے کام ہے   مسجد سے واسطہ ہے نہ بتکدے سے غرض
میں اس بزم جہاں میں شمع وحدت کا ہوں پروانہ   جنوں عین خرد ہے جس کا زیباؔ ہوں وہ سودائی
کلیسا میں، کعبہ میں، دیر و حرم میں   کہاں یار کو جلوہ فرما نہ دیکھا
زیباؔ اسی کے سب ہیں پجاری جہان میں   کافر کسے کہوں کسے سمجھوں یہاں میں گبر
اس کی وحدت پر بھی سب کثرت کا دھوکا کھا گئے   مختلف شکلوں میں حسن اس کا نمایاں دیکھ کر
ہر جا عیاں ہے عالم فانی میں اس کا رنگ   پہچاننے میں جس کے ہے زاہد کی عقل دنگ

دیگر اثرات

ماحول، حالات زندگی اور نقطۂ نظر کی تبدیلیوں کے مطابق جناب زیباؔ کا رنگ سخن گیا۔ عہد شباب میں تغزل کا مطلب "حسن و شباب کی مصوری" یا "کتاب دل کی ت اور "خواب جوانی کی تعبیر" تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ "رنگین و شگفتہ اسلوب" کا نام تغزل ہو گیا۔ شوخی طبع کم اور س مزاج زیادہ ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ آخر عمر میں وہ اچھے خاصے "مصلح قوم" نظر آتے ہیں۔ کلام میں حسن و عشق کی لفظی مصو بجائے قومی درد کی ترجمانی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آخر عمر میں غزلیں برائے نام لکھیں۔ لیکن قومی و اصلاح زیادہ لکھیں (نظموں کا تعارف انشاء اللہ دوسرے مضمون کے ذریعے آئندہ کسی وقت کراؤں گا)

مندرجہ ذیل دو غزلوں سے رنگ طبیعت کا اختلاف ظاہر ہوگا پہلی غزل عہد شباب کی اور دوسری آخر ع کی یادگار ہے۔

غزل (۱) مطبوعہ "پیام یار" اپریل ۱۸۹۵ء (اس زمانہ میں حضرت زیبا ساقی تخلص کرتے تھے)

مٹی عشق میں سب جوانی ہماری   مگر قدر تم نے نہ جانی ہماری
پسند آگئی خوش بیانی ہماری   وہ سنتے ہیں ہم سے کہانی ہماری
نہ تھی دل میں گرد کدورت ذرا بھی   عبث خاک اس بت نے چھانی ہماری
یہ پوچھا جو میں نے کہ ہے داغ دل کیا   محبت یہ بولی نشانی ہماری
مئے عشق سے ہم رہیں مست یارب   مزے سے کٹے زندگانی ہماری
انھیں غیر نے کچھ پڑھایا ہے ساقی   نہیں سنتے اب وہ کہانی ہماری

غزل (۲) پیرانہ سالی کی غزل گوئی کا نمونہ :—

پرتو نور حقیقت سے تھا دل روشن کبھی   آئینے کا تھا مرا آئینہ بھی مسکن کبھی
اب حرم میں بھی نظر آتا نہیں جلوہ ترا   دیر میں بھی پہلے ہوتے تھے ترے درشن کبھی
خوف گلچیں تھا نہ کھٹکا تھا کسی صیاد کا   نغمہ ہائے عیش سے معمور تھا گلشن کبھی
آج ہے نغموں سے پیدا نالہ و شیون کی شان   خوش کلامی سے ہمیں تھے رونق گلشن کبھی
طور کو برق تجلی سے نہ دی اس نے پناہ   امن کی شاید نہ تھی جا وادی ایمن کبھی
تھا جنوں لیکن جنون حق پرستی تھا ہمیں   کرتے تھے وحشت میں شمع عقل کی روشن کبھی

خبط ہم کو دوستوں سے دشمنی کا کب ہوا
ہم تو اے زیبا نہیں تھے عقل کے دشمن کبھی

اصلاح معاشرہ

حضرت زیبا اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے، اور شاعر بھی۔ مدرس و شاعر دونوں حقائق زندگی کی توضیح اور تعمیر قوم کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ہی شخص کا معلم اور شاعر ہونا نور علیٰ نور کا مصداق ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ صاحب ذوق سلیم اور فرض شناس بھی ہو۔ دور جدید میں شاعر کا معلمانہ انداز اختیار نہ کرنا اور اپنی شاعری کو اخلاقی حیثیت سے مفید قوم نہ بنانا تعجبات سے ہے۔ مولانا آزاد سے علامہ اقبال تک ہر بڑا شاعر مصلح قوم تھا۔ ان کے پیرو بھی اسی رنگ کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یا اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر حضرت زیبا کس طرح اور کب تک اس شاہراہ سے ہٹ کر گامزن رہ سکتے تھے۔ تعجب ہوتا اگر علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک گریجویٹ شاعر قومی و اخلاقی اصلاح کی جانب توجہ نہ کرتا۔ چنانچہ مرحوم نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ قوم کی خدمت کی اور آخر عمر میں انھوں نے پچاسوں نظمیں اخلاقی مذہبی اور قومی رنگ میں لکھیں۔ جن کی مجموعی ضخامت غزلوں سے زیادہ ہے۔ ان نظموں سے قطع نظر وہ اپنی غزلوں میں بھی جا بجا زندگی کے ایسے زریں اصول بیان کرتے ہیں جن

پر عمل کرکے ہر انسان اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار ضرب الامثال بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ چند اشعار مثالاً پیش کرتا ہوں۔

بشر میں کچھ بھی نہیں پر جو انکسار نہیں　　کمال عجز ہی مجموعہ ہے کمالوں کا
اگر ہے فکر معیشت تو کچھ کرو کوشش　　کسی کو کھانا کھلانے خدا نہیں آتا
جہاں میں پاک طینت غیر کا احساں نہیں لیتے　　ہرا سرسبز بارش سے کبھی دانہ نہ گوہر کا
مشکل نہیں وہ حل جسے انساں نہ کر سکے　　ہمت کے آگے کوہ بھی تنکا ہے کاہ کا
راحت بغیر رنج جہاں میں کہاں نصیب　　بے آہ لفظ بن نہیں سکتا ہے واہ کا
جو کریں قوم کی امداد بہت کم وہ ہیں　　یوں تو کہنے کو ہیں دنیا میں مسلمان بہت
بے ضرورت ہے محض رسم تکلف زیبا　　دل جو ہے صاف تو ہے پان کا اک پان بہت
کوشش حصول مقصد دل کے لئے ہے فرض　　شکوہ بغیر اس کے ہے تقدیر کا عبث
پہلے کر ہر کوشش جائز کہ ہو دولت نصیب　　پھر توکل کر خدا پر لطف استغنا بھی دیکھ
منحصر ہے سعی کامل پر مقاصد کا حصول　　جس کو سب تدبیر سمجھے ہیں وہی تقدیر ہے
اسے کیا دیکھنا ہے تیری منزل اور آگے ہے　　فلک کو یاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے

عروضی قابلیت

حضرت زیبا عروض میں دستگاہ کامل رکھتے تھے شاگردوں کی سہولت و ہدایت کے لئے عروض پر ایک نہایت اچھا رسالہ تحریر فرمایا تھا۔ جو شائع نہ ہو سکا۔ انھوں نے بعض غزلیں مشکل اوزان میں لکھیں، جو ان کی عروضی قابلیت کا ثبوت ہیں۔

یہ آج اس کے دل میں کیا سما گیا　　کہ میرے گھر وہ بے بلائے آ گیا
ہماری جاں نثاریوں کا تم نے یہ صلہ دیا　　کہ دل جو لے چکے تو ہم کو خاک میں ملا دیا
جوشش جنوں میں جب اس طرف گذر ہوگا　　ان کا سنگ در ہوگا اور میرا سر ہوگا

قدما کے تتبع میں مشکل زمینیں بھی اختیار کی ہیں، مثلاً پندرہ شعر اس مشکل ردیف میں ہیں۔

کیوں نہ بنتی بڑھ کے رخ پر دھوپ، سونے کا ورق　　لائی ہے کرنے نچھاور دھوپ سونے کا ورق
رات دن ہیں قبر عاشق پر نئی آرائشیں　　چاندنی بنتی ہے چادر، دھوپ سونے کا ورق
زرد پتے اب خزاں میں اڑ رہے ہیں چار سو　　مانگتی پھرتی ہے گھر گھر دھوپ سونے کا ورق
سامنے سورج کے دم بھر بیٹھ کے تم دیکھ لو . . .　　کیا کہوں بنتی ہے کیونکر دھوپ سونے کا ورق

۱۲ شعر کی غزل اسی ردیف میں ہے :۔

بلبل کو تو ہے صفحۂ ہستی ورقِ گل   چودہ طبق اس کے ہیں یہی اک ورقِ گل
بے عشق نظر حسن کا پہلو نہیں آتا   بلبل کی نظر سے کوئی دیکھے ورقِ گل
بے قدر ہوں آنکھیں تو وہ کیا جلوہ نما ہو   نرگس کو دکھائی نہیں دیتا ورقِ گل

چھوٹی چھوٹی بحروں میں نہایت شگفتہ اشعار لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے روانی و فصاحت کے دریا بہہ رہے ہیں مثلاً

چشمِ جاناں بے مروت ہو گئی   ہو گئی برگشتہ قسمت ہو گئی
اس کے پھرتے ہی پھرا سارا جہاں   چشمِ جاناں میری قسمت ہو گئی
اتنی ہی اب ان سے رسم و راہ ہے   دل گئے صاحب سلامت ہو گئی
آنے والی تھی طبیعت آ گئی   ہونے والی تھی محبت ہو گئی
اس کے جلووں نے کہاں پہنچا دیا   چشمِ عاشق محوِ حیرت ہو گئی
عشق کو سمجھے تھے زیبا دل لگی   دو ہی دن میں کیسی صورت ہو گئی

دوسری غزل کے چند اشعار سنئے :۔

تاک کے ایسا تیر لگایا   ٹوٹ گیا دل زخم نہ آیا
باغ میں ایسا رنگ جمایا   خاک میں گل کا رنگ ملایا
کھینچ دیا گلزار کا نقشہ   داغ نے ایسا رنگ جمایا
آنکھ سے دل میں آپ تو آئے   آنکھ سے میں ہی دیکھ نہ پایا
کون عدم میں ساتھ دے زیبا   لوگ پرائے دیس پرایا

ایک اور غزل کے چند اشعار یہ ہیں :۔

درد اٹھا تیر بیٹھا رہ گیا   دل میں جو دم بھر کو آیا رہ گیا
جب نہ پایا اس نے کچھ تیرا پتا   "پی کہاں" کہہ کر پپیہا رہ گیا
فیض ہم جیسوں سے دنیا میں کہاں   ساحلِ دریا بھی پیاسا رہ گیا
ہے یہ سوزِ عشق کا زیبا اثر   دل مرا بجھ کر بھی جلتا رہ گیا

ایک خاص بات

حضرت زیباؔ کے متعلق ایک خاص بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ ناموافق (بلکہ بعض اوقات مخالف) حالات کے باوجود وہ اپنی راہ علیحدہ نکال لیتے اور اس پر قائم رہتے تھے۔ یہی ان کا اصولِ زندگی تھا اور یہی اصولِ شاعری۔ شاعری میں بحیثیت مجموعی ان کا تعلق لکھنوی اسکول سے تھا۔ مگر انھوں نے دہلی اسکول کے شعرا

بالخصوص غالب سے اثرات زیادہ قبول کئے۔ ان پر یونیورسٹی کے ماحول اور انگریزی ادب کا بھی کافی اثر پڑا۔ چنانچہ انھوں نے متعدد انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا۔ اور ترجمے میں اردو شاعری کی خوبیاں قایم رکھیں۔ انھوں نے اپنے اساتذۂ سخن اور ان کے رنگ قدیم کی مدح سرائی اور قدردانی میں کمی نہیں کی۔ چنانچہ حضرت امیر مینائیؔ کے صنم خانۂ عشق اور حضرت شہیر مچھلی شہری و حضرت منیر شکوہ آبادی وغیرہ کی تعریف میں متعدد اشعار لکھے ہیں۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ اساتذۂ رنگ قدیم کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی زیباؔ نے خیالات اور طرز ادا میں جدت و ندرت کا کافی خیال رکھا ہے۔ جیسا کہ مثالوں سے واضح ہو گیا ہے

ان کی زندگی معروفیت کی زندگی تھی اور وہ تمام عمر صدمات پیہم کا شکار رہے۔ لیکن ہمت شکن اسباب و افکار کے باوجود انھوں نے بہت لکھا اور خوب لکھا ہے۔ مصائب و تفکرات کے باوجود زندہ دلی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شوخی و ظرافت کے چٹخارے جا بجا ملتے ہیں۔

خلاصۂ خدمات زیباؔ

ان کی نگارشات میں نظم بھی ہے نثر بھی۔[1] افسوس کہ ان کا تعلق تمام عمر ایسے صوبے سے رہا جسے کبھی اچھا پریس نہیں ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام زیادہ مشہور نہیں ہو سکا۔ ان کے تلامذہ کثیر التعداد تھے اور وہ کثرت مشاغل کے باوجود نہایت شفقت و محبت اور توجہ کے ساتھ ان کے کلام کو درست فرمایا کرتے تھے۔ شاگردوں میں بعض کا انتقال ہو چکا ہے بعض ابھی موجود ہیں جن کے نام مجھے معلوم ہیں وہ نیچے نوٹ میں درج[2] ہیں۔

---

[1] نثر میں ایک کتاب "ہمارا مذہب اور ہماری رسمیں" شائع ہو چکی ہے لیکن اب کہیں نہیں ملتی۔ ایک ڈرامہ تاریخ پٹنہ۔ رسالہ عروض غیر مطبوعہ تھے، اور چند مضامین علمی ہیں جو رسالہ مشورہ جبلپور میں شائع ہوئے تھے۔ یہ نگارشات ان کی زندگی ہی میں ان کے اسباب کی جا بجا منتقلی کے باعث تلف ہو چکی تھیں۔ لہٰذا مرحوم نے اپنا کلام میرے سپرد فرمایا جس کی حفاظت حتی الامکان کی جا رہی ہے۔ مرحوم ریاست پنّا میں عرصہ تک مجسٹریٹ درجہ اول رہے جہاں وہ راجہ صاحب کی ثقافتی سرگرمیوں میں برابر شریک رہتے تھے۔ اسی طرح وہ ریاست گورھا سی۔ پی کے نواب جناب عبدالوحید غازی کے اتالیق اور ریاست کے دیوان بھی کافی عرصہ تک رہے۔ اور ہر دو حیثیت سے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ جناب غازی نے اپنے کلام میں انھیں اپنا استاد اور دیوان ریاست لکھا ہے اور ان کی خدمات کی تعریف کی ہے۔ اسی بنا پر نواب صاحب موصوف سے اس ناچیز کے تعلقات بہت گہرے اور برادرانہ ہیں۔ وہ نامور شاعر اور ادیب ہیں اور اردو کی سرپرستی کے سلسلے میں ان کی خدمات بے حد قابل قدر ہیں۔ رسالہ آجکل میں موصوف کے متعلق ایک مبسوط مضمون شائع ہو چکا ہے۔ اور اخبار الفاروق کامٹی کو انھیں کی سرپرستی حاصل ہے

[2] ان میں چند خاص تلامذہ کے نام یہ ہیں: انعام الرحیم صاحب۔ آئی سی ایس۔ ریٹائرڈ کمشنر کراچی مرحوم۔ نواب عبدالوحید صاحب غازی۔ والی گورھا اسٹیٹ سی پی (بھارت)، بابو عبدالصمد مجنوں۔ جبلپور (بھارت) حاجی عبدالحمید خاں حمید مرحوم۔ نظامی مرحوم

(باقی اگلے صفحہ

قطعاً مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ صوبہ سی پی جیسے دور افتادہ خطہ میں جہاں اردو کی ترقی کے لئے حالات زیادہ سازگار نہ تھے، حضرت زیبا نے تمام عمر اردو کی خدمت کی اور یہ محض ان کی اور ان کے چند احباب کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ کہ رفتہ رفتہ صوبہ مذکور کے زیادہ حصے میں اردو کا مذاق معیاری ہوگیا۔

دو شہادتیں :-

اس سلسلے میں جناب محمد فاضل عبقری بریلوی مرحوم کے دو مدحیہ قطعات سے چند اقتباسات بطور شہادت پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔ جناب عبقری کافی عرصہ تک اپنے روزگار کے سلسلے میں جبل پور میں رہے۔ اس ناچیز کو بھی ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ ابھی چند ماہ قبل مرحوم (جناب عبقری) پر ایک مختصر مضمون ماہنامہ قومی زبان کراچی میں شائع ہوا تھا۔ بہرحال حضرت زیبا کے متعلق ان کا مندرجہ ذیل قطعہ خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس محفوظ ہے۔

عقیدت کے پھول

یوں صاحب کلام ہیں زیبا کے سامنے   جیسے کلیم برق تجلّےٰ کے سامنے
دعویٰ سخن کا حضرت زیبا کے سامنے   قطرہ چلا ہے موجِ دریا کے سامنے
شاعر ہیں یوں حضور مصطفےٰ کے سامنے   گونگوں کا اجتماع ہے گویا کے سامنے
زیبائیوں کا خدمت عالی میں ہے ہجوم   حاضر ہیں دردمند مسیحا کے سامنے
رہتے ہیں دست بستہ مضامین حضور میں   خدام ایستادہ ہیں آقا کے سامنے
تیرے شمیم فیض سے سارا جہاں ہے مست   ڈالوں نظر نہ عنبر سارا کے سامنے
اردو زباں کو تو نے عطا کی حیات نو   دم توڑ چکی تھی یہ دمِ عیسیٰ کے سامنے
سی پی کو کس نے معدن گوہر بنا دیا   دعویٰ ہو جو کر آئے وہ زیبا کے سامنے
دشمن اڑے لگا کے پر جبرئیل اگر   پہنچے نہ تیری خاکِ کفِ پا کے سامنے

(بسلسلہ صفحہ ما سبق)
حافظ عبدالحمید جودت مرحوم۔ خادم حسین خادم مرحوم جان محمد جان جبلپور بھارت۔ نبی احمد صاحب صنجٹ۔ سائل بنگلوری (لاپتہ) شاد بنگلوری (لاپتہ) کیف رائے پوری (لاپتہ) اور یہ ناچیز کراچی

کاش فرزندان حضرت زیبا جو آجکل کراچی میں صاحبِ حیثیت ہیں، اپنے والد گرامی کا دیوان اور نظموں کا مجموعہ شائع کرنے کی جانب توجہ کریں اور مرحوم کے بیش قیمت علمی سرمائے کو تلف ہونے سے بچالیں۔ یہ ناچیز انہیں بارہا اس امر کی جانب متوجہ کر چکا ہے اور اب [illegible] ہر قسم کی امداد کے لئے تیار ہے (عتیق نیازی زیبائی)

[redacted]

دیکھیں گے مجھ کو کور سوادانِ ذوق کیا   تو دیکھتا ہے دیدۂ بینا کے سامنے
اشعار[لہ] چند نذرِ عقیدت کے طور پر
کرتا ہوں عرض عبقری زیبا کے سامنے

دستخط (احقر فقیر محمد فاضل عبقری بریلوی)

مسودۂ کلیات زیبا میں دوسرا قصیدہ بھی چسپاں ہے جو مسدس ہے اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

x x x x x x

ادبی جنس کا کوئی بھی خریدار نہ تھا   کوئی یوسف سبب گرمی بازار نہ تھا
خالی سیپی تھی فقط گوہر شہوار نہ تھا   خواب غفلت میں پڑے تھے کوئی بیدار نہ تھا
کوٹ سے حضرت زیبا نے جگایا آکر
قلعہ اردوئے معلیٰ کا بنایا آکر

x x x x x

مژدۂ موسم گل باد صبا لائی ہے   ہر طرف باغ میں بزم چمن آرائی ہے
ادبی ذوق کی گھنگھور گھٹا چھائی ہے   جوش پر بادۂ خمخانۂ زیبائی ہے
میکشو آؤ لگی ہے مے زیبا کی سبیل
لوٹ لو دوڑ کے اردوئے معلیٰ کی سبیل

اور آخری شعر ہے:-

نام زیبا کا اچھلتا رہے دلشاد رہے   عبقری کی ہے دعا میکدہ آباد رہے

جناب راز چاندپوری بھی حضرت زیبا کے مداحوں میں ہیں۔ جس زمانے میں (سنہ ۱۹۳۶ء میں) حضرت زیبا جبلپور میں میرے غریب خانے پر بغرض علاج مقیم تھے، اسی زمانے میں حضرت راز چاندپوری بھی بسلسلہ ملازمت وہیں موجود رہتے اور تقریباً ہر ہفتہ حضرت زیبا سے ملنے تشریف لایا کرتے تھے انھوں نے بھی ازراہ عنایت ایک مقدمہ لکھا تھا لیکن افسوس کہ طباعت کلیات زیبا کے متعلق اس ناچیز کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں نہ وہ مقدمہ اب تک شائع ہو سکا۔ آئندہ جب حکم الٰہی ہوگا کلیات زیبا کے ساتھ مقدمہ مذکور بھی شائع کر دیا جائے گا۔

عرض آخر:

آخر میں عرض ہے کہ کلام زیبا بہرحال کلام بشر ہے اور اس میں سقم یا نقص کا رہ جانا اقتضائے بشریت ہے۔ لیکن تعارف

[لہ] کئی شعر حذف کر دیئے گئے ہیں۔

ورنہ نقد میں فرق ہے۔ یہ کام نقد نگار کا ہے کہ وہ کلیات زیبا شائع ہو جانے کے بعد ان کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالے۔ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ غلطیاں بڑے بڑے شعرا سے ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ چند معمولی اسقام یا اغلاط سے کسی صاحب کمال کے کمال اور اس کی کاوشوں پر حرف نہیں آ سکتا۔ نہ اس کی ادبی خدمات کو فراموش کیا جا سکتا ہے۔ ؎

جس میں ہنر ہو اچھا، دیکھو نہ عیب اس کا
داغ قمر نہ دیکھو، نور قمر کو دیکھو

تلخیص الاُردو

سید ہاشمی فرید آبادی

یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی "اُردو" کے تیس سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل علمی و ادبی مقالات شامل ہیں:

اصول وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم
ہجو سلطان محمود	حافظ محمود شیرانی
کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ	مولوی عبد الحق
بنگالی زبان و ادب کی نشوونما	دنیش چندر سین
ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی	مرزا فرحت اللہ بیگ
عماد الملک بلگرامی	عبد الحلیم شرر
بنگالی اور اُردو	محمد اجمل خاں
رومی، نطشے اور اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم
اُردو میں دخیل الفاظ	مولوی عبد الحق
ولی کے سن وفات کی تحقیق	مولوی عبد الحق
پرانی اُردو میں کتبے	مولوی عبد الحق

قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اُردو۔ بابائے اُردو روڈ کراچی ۱

ڈاکٹر مدد علی قادری

شاہ عبداللطیف بھٹائی

ہر قوم میں شاعر کو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے، اسلئے کہ وہ نسبتاً زیادہ حساس ہوتا ہے اور عوام کی امنگوں اور جذبات کا وقت کے تقاضوں اور دور کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق، ترجمانی کرتا ہے۔ وہ اپنی قوم کی عزت و آبرو کا پاسبان ہوتا ہے۔

ابن رشیق قیروانی (م ۴۵۶ ھ) اپنی مشہور کتاب "العمدۃ فی محاسن الشعر" میں رقمطراز ہیں کہ عرب زیادہ تر تین چیزوں پر خوشیاں کرتے تھے۔ اور وہ تھیں۔ ایک گھر میں لڑکے کا پیدا ہونا، گھوڑی کو نر بچہ پیدا ہونا ایک قبیلہ میں شاعر کا ظہور ہونا۔ ان تین موقعوں پر بڑی خوشیاں اور شادمانے ہوتے تھے۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کو مبارکباد کہتے۔ سب قبیلوں کے لوگ جمع ہو جاتے عورتیں گانے بجانے کی چیزیں لاتیں اور گھر گھر میں نغمہ سرائی ہوتی تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر کو سراہا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے:

"إنّ من البیان لسحراً وإنّ من الشعر لحکمۃ"

(بلاشبہ بیان میں جادو ہے اور شعر میں حکمت)

آپ کے دربار میں شعراء رہتے تھے، جن میں حسان بن ثابت اور کعب بن زہیر قابل ذکر ہیں۔ کعب بن زہیر نے جب آپ کی مدح میں "قصیدہ بانت سعاد" پڑھا تھا تو آپ نے خوش ہو کر اس کو ایک چادر مرحمت کردی تھی۔ وہ چادر حضرت معاویہؓ نے ۲۰ ہزار درہم دے کر کعب بن زہیر سے خرید لی اور جمعہ اور عیدین کے موقعوں پر تبرکاً پہنتے تھے۔

لیکن شعرا عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جو حق و صداقت سے کام لیتے ہیں اور دوسرے کذب آمیز ہیں۔ رسول اکرم صلعم کا قول ہے:

انما الشعر کلام مؤلف فما وافق الحق منہ فھو حسن، وما لم یوافق الحق منہ فلا خیر فیہ (تحقیق شعر ایک کلام ہے۔ اگر وہ حق سے موافقت رکھتا ہے تو اچھا ہے۔ اگر نہیں تو اس میں کوئی فائدہ نہیں)

اس امر کے متعلق قرآن مجید میں بھی اشارا آیا ہے ۔

الشعراء یتبعھم الغاوون ۔ الم تر انھم فی کل واد یھیمون ، وانھم یقولون ما لا یفعلون الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات ۔

(شاعروں کی گمراہ ہی تقلید کرتے ہیں ۔ وہ ہر وادی میں پھرتے رہتے ہیں ۔ اور وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں ۔ لیکن سوا ان شاعروں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ہیں)

اس دوسرے گروہ کے شعراء کے متعلق رسول اکرمؐ کی حدیث منقول کی گئی ہے:

الشعراء تلامیذ الرحمٰن (شاعر اللہ کے شاگرد ہیں)

راویان شعر نے روایت کی ہے کہ صحابہ کرامؓ شعر کہتے تھے ۔

مولانا جلال الدین رومیؒ شعر کے متعلق فرماتے ہیں:

شاعری جزویست از پیغمبری
جاہلانش کفر دانند از خری

اللہ تبارک و تعالیٰ نے کسی قوم کو کسی بھی نعمت کے لئے مخصوص نہیں کیا ہے ۔ لیکن آپ کی نعمت عام ہے ۔ ہر قوم اور ہر خطے میں ایسے شعرا پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے زندگی کے مختلف شعبوں اور عنوانات کو عام فہم زبان اور سلیس انداز میں واضح کیا ہے ۔ عربوں میں امرؤ القیس ، ایرانیوں میں جلال الدین رومیؒ ، یونانیوں میں ہومر ، جرمنوں میں گوئٹے ، انگریزوں میں چاسر گزرے ہیں ۔ اسی طرح پاکستان میں وارث شاہ اور شاہ عبداللطیف کو ایک بلند مقام حاصل ہے ۔

شاہ عبداللطیف (م ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) اس خطہ کے ایک لاثانی صوفی شاعر گزرے ہیں ۔ آپ سے پہلے بھی کچھ شاعر مثلاً قاضی قاضن ، شاہ کریمؒ وغیرہ گزرے ہیں اور بعد میں بھی مثلاً سچل سرمست ، روحل ، بیدل اور بیکس وغیرہم ؛ لیکن یہ تمام شاعر آپ سے مقابلہ نہیں کر سکتے ۔

شاہ صاحبؒ کی شاعری اسلامی افکار کی حامل ہے ۔ آپ نے اپنی وہبی صلاحیتوں سے توحید ، رسالت ، شریعت ، طریقت ، روحانیت اور الٰہیات جیسے مشکل اور ادق عنوانات کو اپنی آسان اور عوامی زبان میں واضح کیا ہے ۔

توحید کے متعلق آپ کا قول ہے ؛

اول اللہ علیم ، اعلیٰ ، عالم جو ڌڻي
قادر پنھنجي قدرت سين قائم آھي قديم
والي واحد وحدہٗ ، رازق رب رحيم

توحید کے پرستار ہونے کے ساتھ ، شاہ صاحب عاشق رسول تھے ۔ کیونکہ توحید اور رسالت دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں ۔

یہ کلام آشکار چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے اقرار کرنے سے، ایک انسان پکا مسلمان نہیں بن سکتا، جب تک وہ سچے دل سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے رسول اور خاتم النبیین تسلیم نہیں کرتا۔ شاہ صاحب کا اس ضمن میں ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

وحدہ لا شریک لہ، جن اتو سین ایمان
تن مڃیو محمد ڪارڻ، قلب سان لسان
او فائق ہم فرمان، اوتڑ نھن نہ اولیا

سر سارنگ میں، درحقیقت رسول اکرم کی ولادت، ظہور نبوت اور اطراف عالم پر باران رحمت کا ذکر ہے:

وڄون وسڻ آئيون چوڏس ٿي چوڌار
ڪي اٿي هليون استنبول ڏي، ڪي مٿيون مغرب پار
ڪي چمڪن چين تي، ڪي لهن سمرقند سار
ڪي رمي ويون روم تي، ڪي ڪابل ڪي قنڌار
ڪي دلي، ڪي دکن، ڪي گڙن مٿي گرنار
ڪنھين الا عمرڪوٽ تان وسايا ولهار
سائين! سدائين ڪرين مٿي سنڌ سڪار
دوس! مٺا دلدار! عالم سڀ آباد ڪرين

شاہ صاحب کے شعر کی روح ہے دل و جان سے عبادتِ خدا کرنا۔ عبادت خداوندی میں بندہ اتنا مستغرق ہو جائے کہ اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھے۔ ایک بندے کی نماز، روزے اور دیگر اعمال تب مستجاب ہوں گے جب کہ وہ اپنے آپ کو خدا میں گم کر دے۔

جان جان ھئين پاڻ، تان تان ناھ نماز
سڀ وڃائي ساز، تھان پوءِ تڪبير چئو

شاہ صاحب ایک سچے مسلمان، اور صوفی باعمل تھے۔ سچے دل سے شریعت پر چلتے تھے۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ معرفت خداوندی کا راز شریعت اسلامی پر کاربند رہنے میں ہے۔ یہ نکتہ کتنی دلکش زبان میں ادا کیا ہے۔

ماري سڪ سبق، شريعت سندو سچ
طريقتا تنکو وهي، حقيقت جو حق،
معرفت مرڪ، اصل عاشقن کي،

(اے طالب اور سالک شریعت کا سبق اچھی طرح سے پڑھ لے دیکھو حقیقت (جس کی کہ تمھیں جستجو ہے) کی اصلیت طریقت میں ایک تیز دھارے کی طرح بہہ رہی ہے اصلی عاشقوں کا کام ہے معرفت حاصل کرنا۔

اسی طرح شاہ صاحب کا پورا رسالہ معرفتی نکات سے معمور ہے۔ اور مخلوق کو خالق سے . طالب کو مطلوب سے ملاتا ہے۔

مضامینِ سلیم
مولوی وحید الدین سلیم

مولانا سلیم کے وہ تمام علمی، ادبی اور مذہبی مضامین جو مختلف علمی و ادبی جرائد میں شائع ہوئے تھے اور اب تک کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آئے تھے، انھیں مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تین جلدوں میں مرتب کر دیا ہے چند اہم مضامین یہ ہیں:۔

جلد اوّل (ادبی مضامین):

- اُردو شاعری کا مطالعہ • سچی شاعری
- زندہ قوم کی علامات • فلسفۂ تاریخ پر ایک سرسری نظر
- مسلمانوں کا تمدن قیمت:۔ چار روپے پچاس پیسے

جلد دوم (تاریخی و سوانحی مضامین)

- ابن جبیر اور اس کی سیاحت • شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم
- طبیعیات اور اہل اسلام • جنگ طرابلس کی ایک دلچسپ کہانی
- یونانیوں کی بہشت قیمت:۔ چار روپے

جلد سوم (انشائیے)

- شاعرانہ خیالات • تنہائی کے فوائد
- حقیقی خوش نصیبی • عجائبات قدرت

قیمت: چار روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

بزم اقبال

احمد دین[1] نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر بھی ایک نظر ڈالی ہے۔ اور خودی، خودداری اور خود افزائی کا عنوان قایم کر کے کسی حد تک فلسفۂ خودی کی افہام و تفہیم کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اقبال کے فارسی کلام کو نظر انداز کر کے صرف اردو کلام کی مدد سے اقبال کے نظریۂ خودی کی وضاحت ممکن نہیں۔ لیکن احمد دین نے اردو نظموں کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی حد تک اقبال کے نظریے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

کلام اقبال کی سب سے اہم خصوصیت پیغام عمل ہے۔ احمد دین نے بتایا ہے کہ یہی پیغام کلام اقبال کی اصل روح ہے اور اسی کی گونج شروع سے آخر تک سنائی دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ 'اقبال کے مذہب میں عمل زندگی کا اصل اصول ہے اور اس کے نزدیک ہماری روحانی ترقی اور تنزل بھی عمل سے ہی وابستہ ہے۔ بہشت کی نعمتیں، دوزخ کا عذاب اسی عمل کا نتیجہ ہے[2]

کلام اقبال میں مذہب کو جو اہمیت حاصل ہے ظاہر ہے۔ وہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر جتنے آنسو انھوں نے بہائے ہیں اور ان کے خوشگوار مستقبل کے خواب جس تعداد انھوں نے دیکھے ہیں وہ فکر اقبال کی ابتدا بھی ہیں اور انتہا بھی۔ احمد دین نے "مذہب" کا عنوان قایم کر کے ان آنسوؤں اور خوابوں کی نہایت دلکش تصویر پیش کی ہے۔ اور مذہب کے سلسلے میں یہ امر بھی واضح کر دیا ہے کہ اقبال دوسرے مذہبوں کے پیرووں کی دل آزاری نہیں کرتے۔

اقبال کے نظام اخلاق پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کے سیاسی نظریات کو بھی تفصیل سے پیش کر کے بتایا ہے کہ اقبال کے نزدیک مغرب کا جمہوری نظام قیصریت ہی کا دوسرا روپ ہے۔

اقبال آزادی، انفرادی اور قومی کا حامی ہے۔ لیکن ..... وہ آزادی کے لیے آئین کی پابندی لازمی سمجھتا ہے۔ اس کے ذہن میں حریت کی بنیاد اطاعت پر ہے۔ اور جو آزادی ربط و ضبط سے نفور ہے، آزادی نہیں، طغیان ہے اور اس کا انجام معلوم[3]

تہذیب نو کی خامیوں کی طرف اقبال نے جو اشارے کیے ہیں انھیں بھی احمد دین نے پوری طرح واضح کیا ہے اور بتایا ہے

---

[1] اپریل سے جون ۱۹۶۸ء تک کے شماروں میں اس مضمون کی تین قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔ تیسری قسط کے ساتھ سہواً "آخری قسط" لکھ گیا تھا۔ زیر نظر قسط آخری ہے۔

[2] اقبال از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۶۰

[3] 〃 〃 ص ۱۶۸–۶۹

جولائی ۶۸ء

قومی زبان کراچی

کہ اقبال تہذیب نو کی کم عیاری سے پوری طرح واقف ہے اور اپنے ہم مشربوں کو وہ اس تہذیب کے زہر سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے ۔

احمد دین نے اقبال کے متصوفانہ خیالات کا بھی جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اقبال نے تصوف کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے تصوف سے اس کا دلچسپی لینا فطری رجحان ہے۔ لیکن وہ اس تصوف کا قائل نہیں جو انسان کو خود فراموش بنا دے بلکہ اس تصوف کی تلقین کرتا ہے جو عین خودی ہے۔ تصوف اور فلسفہ و حکمت کا جو گہرا تعلق ہے اس کی بنا پر احمد دین نے اقبال کے ان فلسفیانہ خیالات کا جائزہ بھی لیا ہے جو حیات و کائنات کے گوناگوں مسائل سے متعلق ہیں۔ زندگی اور موت کے مسئلے پر بھی اقبال کے خیالات کی وضاحت کی ہے یہ ساری بحث تقریباً بائیس تیئیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور آج بھی اقبال کے خیالات کو سمجھنے میں بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے ۔

آخر میں "وطنیت، عجمیت اور پان اسلام ازم" کے بارے میں اقبال کے خیالات کی تشریح علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت کی گئی ہے۔ ان بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال "وطن" کے بت کو ملی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں اس طرح وہ عجمیت سے اپنی بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ اور حجازی تہذیب کی پرانی شراب کے پیاسے نظر آتے ہیں ۔

اقبال کے پین اسلام ازم کے نظریے کے بارے میں احمد دین کی رائے یہ ہے :

> "کہا گیا ہے کہ اقبال، اتحاد سیاسیہ ملیہ کا علمبردار ہے۔ وہ مسلمانان عالم کی تنظیم سے ان کا سیاسی اقتدار رفتہ دنیا پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اقبال کا کلام اگر بغور پڑھا جائے، ہمیں بتا دے گا کہ اسلامیوں کا سیاسی تسلط اس کی شاعری کا مقصد ہرگز نہیں، اس کا مدعا اس کی نغمہ سرائیوں کا موضوع سیاسیات کی چالبازیوں سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ سیاسیات میں اقتصادیات میں دنیا کی مادی ترقی میں، نئی تہذیب کے آرام و آسائش میں اس کی شوکت و سطوت میں، اس کے تجمل و شان میں ارتقائے انسانی نہیں دیکھتا وہ تو عالم موجودات میں حضرت انسان کی عظمت و وقار کے جلوے، عظمت و وقار جو خلافت الٰہی کے شایان شان ہے دیکھنے کا خواہاں اور متمنی ہے[1] ۔"

کتاب کا آخری حصہ "طرز بیان" ہے جو انہیں ذیلی عنوانات میں تقسیم ہے ۔ سب سے پہلے فاضل نقاد نے بتایا ہے کہ اقبال اگرچہ روایتی عشق و محبت اور بوالہوسی سے اپنے پیش روؤں، حالی اور اکبر کی طرح سخت متنفر ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے خیالات کے لیے عشق و محبت کی قدیم اصطلاحات اور رموز و علائم سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ قدیم شاعروں کی طرح ان کے ہاں بھی گل و گلزار، رنگ و بو، ساقی و مینا اور رقص و سرود کی علامتیں موجود ہیں۔ لیکن اقبال نے ان علامتوں کو ایک نئی معنویت دی ہے۔ اقبال قدیم شاعروں کی رنگین بیانی کا شیدائی ہے اور اس رنگین بیانی کے ذریعے وہ ان خیالات کو پیش کرتا ہے جن کا قدیم شاعروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سارے معاملے کی وضاحت یوں کی گئی ہے :-

---

[1] اقبال۔ از احمد دین مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۲۱۱

" بوالہوس قوم سو سال سے ہوس بازی میں مشغول اور کئی سو سال سے عیش پرستی اور غفلت و سکون کی زندگی کی مفتون ہو رہی تھی۔ مذاق بگڑے ہوئے تھے۔ قوم کے مایہ ناز چشم بتاں کے مجروح، خم ابرو کے شہید، بے کار، نادار، مۓ پندار سے سرشار، غفلت کی شراب سے مخمور، دنیا و فیہا سے بے خبر اور زمانے کی چال سے ناآشنا بے اعتنائی کے سرور میں پڑے تھے، اور ان حالات میں شنوائی اور کام کی بات کی شنوائی مشکل نظر آتی تھی، فلسفی دماغ نے سامعین کے مذاق کو ملحوظ رکھنے میں مکمل تاثیر دیکھا۔ قوم کو اس خواب غفلت سے جگانا ضروری تھا۔ ان کی ان سرمستیوں سے انھیں ہوش میں لانا لازمی تھا۔ تقاضائے وقت سے وہی مجلسیں گرما دیں۔ وہی راگ، وہی رنگ، وہی ساقی۔ وہی مینا وہی شکوے اور وہی شکایتیں ہونے لگیں۔ سننے والے جو پہلے ہی سے حالی کے نالوں اور اکبر کی چٹکیوں سے کچھ کچھ جاگ رہے تھے اپنے پرانے مذاق کے موافق حسن و عشق کی سُریں سن کر اٹھ بیٹھے ہیں۔ اور شاعر یقین کرتا ہے کہ یہ لوگ زبان کی چاشنی سے لذت پاکر نئے مذاق کی حقیقت سے آپ ہی آشنا ہو جائیں گے۔ میدان سعی میں نکل آئیں گے۔ اسلام کی روایات کو سامنے رکھ کر خلوص کے راستے پر قدم بڑھائیں گے اور نور توحید جہان میں پھیلا کر کفر و استبداد کی ظلمت کا پردہ اٹھا دیں گے۔ اور محبت و اخوت کے نقش پہنائے عالم میں جما دیں گے اقبال اعلیٰ قومی جذبات بیان کر رہا ہوتا ہے اور وہی ہوس بازی کی اصطلاحیں، وہی حسن و عشق کی زبان وہی استعارے وہی تشبیہیں، وہی رنگ، وہی راگ، وہی سُریں استعمال کرتا ہے۔ [1] "

اقبال کی "خیال بندی" کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی چند نظموں "نیا شوالہ"، "شمع و شاعر" اور "شکوہ و جواب شکوہ" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دو مختصر نظمیں "ایک پرندہ" اور "جگنو" اور "حقیقت حسن" درج کر کے اقبال کی بلند خیالی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کا انداز تنقید سراسر تاثراتی ہے۔ انھوں نے بلند خیالی کا تجزیہ کچھ زیادہ گہرائی سے نہیں کیا۔ اقبال کی مشکل پسندی کو انھوں نے غالب کا اثر بتایا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ سر شیخ عبدالقادر نے "مخزن" میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا تھا اسے درج کرنے کے بعد احمد دین لکھتے ہیں۔

" اہل بینش بخوبی سمجھتے ہیں کہ اقبال کا خطاب عوام کو نہیں وہ صرف انھیں لوگوں کو مخاطب کر رہا ہے جو اہم امور ملیہ کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ جذبات عامہ کو نہیں ابھارتا۔ شورش اس کا مقصد نہیں۔ فوری انقلاب میں وہ فلاح قومی نہیں دیکھتا۔ وہ نمو کا قائل ہے وہ دماغ کی اعلیٰ ترین تحریکوں سے دل کے افضل ترین ولولے ابھارتا ہے دل اور دماغ کی اشتراکی قوت عمل سے کمال انسانیت کے جلوے دکھانا چاہتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس کے خیالات عالم روحانیت کے پرتو ہیں۔ اور عوام ان کے فہم و ادراک سے

---

[1] اقبال از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۴۷۔

ظاہر ہیں۔ اور اس کی زبان بھی خیالات کے مطابق رقیق ہو جاتی ہے۔ اور ہر ایک آدمی کو اس سے حظ اٹھانا میسر نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب بیان کے لئے موقع و محل ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر مضمون دقت طلب اور اہم ہے اور مخاطبین قوم ہی کے خاص ہیں تو اس کی زبان مشکل اور دقیق نظر آئے گی اگر وہ عوام کو لوری یا بچے کو "چاند" سنا رہا ہو تو ان کا کلام عام فہم ہوتا ہے۔[1]

احمد دین نے اقبال کی مشکل گوئی اور سادہ بیانی کو مثالوں سے بتایا ہے کہ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" اس لئے آسان زبان میں ہیں کہ ان کا تعلق عام مسلمانوں کے جذبات سے ہے۔ "شمع و شاعر" کا تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ان علماؤں سے ہے جو قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس لئے اس کا اسلوب بدلا ہوا ہے۔

اس کے بعد کلام اقبال میں "شوکت بیان" "سوز و گداز" "تشبیہات و استعارات" "جوش" "طرفگیٔ بیان" اور "موسیقیت" کے عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے۔ "امید" کا عنوان قائم کر کے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اقبال کسی عالم میں مایوسی کا شکار نہیں ہوئے ان کے کلام میں ناامیدی کی سرد آہ و بکا کم یاب ہے ان کے نالے بھی امید کے ہوتے ہیں ان کی شام غم بھی صبح امید کی خبر دیتی ہے اور ظلمت شب میں بھی امید کی کرن نظر آتی ہے۔[2]

طرز بیان کے سلسلے میں احمد دین نے سب سے اہم بحث اس موضوع پر کی ہے کہ اقبال مناظر قدرت اور مادی دنیا سے اخلاقیات، معاشرت اور سیاسیات کے زریں اصول اخذ کرتا ہے اور مسائل فلسفہ کے لیے نکات کا استدلال کرتا ہے جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مضمون آفرینیاں دلفریب اور حیرت انگیز ہیں۔[3] اس موضوع پر احمد دین نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی خداداد بصیرت کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ کلام اقبال کے اس پہلو پر آج تک کسی نقاد نے اس انداز سے روشنی نہیں ڈالی۔ احمد دین نے دلیل سے بتایا ہے کہ اقبال جب بھی کسی قومی و ملکی مسئلے پر یا انسانی زندگی کے کسی پہلو پر اظہار رائے کرتے ہیں اور انسانی فطرت کی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ تو خود فطرت بھی ان کے لئے ایسی ہی مثالیں مہیا کر دیتی ہے۔ جن سے ان کے شاعرانہ مطالب کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ دریا، قطرہ، درخت کی سوکھی ٹہنی، شبنم، گوہر وغیرہ کے استعارے قومی اتحاد۔ اور انسانی نفسیات کے بیان میں بڑی وضاحت پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح "پھول" کا استعارہ بھی "چشم بینا" اور "گوش شنوا" کے لئے اسباق کا ایک دفتر کھولے ہوئے ہے۔ اقبال کو حیات انسانی کے مختلف مراحل میں جو کیفیات نظر آتی ہیں ان کے اظہار کے لئے بھی خصوصیات گل یعنی دلربائی، خود فروشی اور خود فراموشی وغیرہ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح گل و گلزار کے تمام متعلقات شعر اقبال میں بہاراں کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ علو ہمتی کے بیان کے لئے بھی اقبال نے جو مثالیں "دانہ، خاک، اور روئیدگی، بالیدگی" پیش کی ہیں وہ بھی آغوش فطرت ہی سے

---

[1] اقبال از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۲۲۶-۲۷

[2] اقبال، از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۲۴۲

[3] اقبال، از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۲۴۴

ستقال ہیں۔ خودداری کے لیے بھی اقبال حباب ہی کی مثال پیش کرتے ہیں جو دریا میں بھی اپنا پیمانہ نگوں رکھتا ہے۔ اس طرح وہ ج اور دریا کی علامتوں سے قومی اتحاد کا پہلو نکالتے ہیں۔ سادہ زندگی بسر کرنے اور ذوقِ عمل پیدا کرنے کے لیے بھی اقبال ، بحر و بیابان کی وسعتوں سے استفادہ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال نے اپنا سارا فلسفہ فطرت کے مظاہر کے ذریعے پیش کیا ہے۔ صبح و شام ر سپہر، رات، سورج، چاند اور ستارے آسمان۔ یہ سب اقبال کے محبوب استعارے ہیں اور ان مظاہر کی کیفیات اور انسانی ندگی کے مختلف پہلوؤں میں مماثلت اور مطابقت کی نشان دہی کر کے اقبال نے اپنے سلسلۂ سخن کو موثر و دل نشیں بنایا ہے۔ احمد دین ، یہ بھی بتایا ہے کہ اقبال نے مظاہر فطرت کو محض ایک وسیلے کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ ایک بلند پایہ مصور کی طرح کی ان کی صورکشی بھی کی ہے جس سے حسن فطرت اور بھی کچھ نکھر جاتا ہے۔ اقبال کی واقعات نگاری اور جذبات نگاری کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں "غلام قادر روہیلہ"، "آفرینش محبت" اور "عشق اور موت" کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ اضح کیا گیا ہے کہ اقبال کو جذبات نگاری میں کمال حاصل تھا۔ آخر میں "اردو اور اہل پنجاب" کے عنوان سے خود اقبال اور ولانا اسلم جیراجپوری کے مضامین سے اقتباسات پیش کر کے ان اعتراضات کے جواب میں جو اقبال کی زبان پر کیے گئے تھے، اقبال ی پختگیٔ بیان کو واضح کیا گیا ہے۔ آخر میں اقبال اور ابنائے وطن کے عنوان سے اقبال کی اس شکایت کو پیش کیا ہے کہ مضامین کلام سے ابنائے وطن بے اعتنائی کرتے ہیں اور پیام مشرق کے وہ فارسی اشعار نقل کیے ہیں جن میں اقبال نے یہی شکوہ خود اپنی زبان یں کیا ہے۔ اس طرح اقبال کے اردو کلام کے بارے میں یہ کتاب اقبال کے فارسی اشعار پر ختم ہو جاتی ہے۔

احمد دین کی یہ کتاب ایک بہت بڑا تنقیدی کارنامہ ہے۔ اردو تنقید کی تاریخ لکھنے والوں نے احمد دین کو کبھی قابل التفات نہیں سمجھا حالانکہ وہ ہر اعتبار سے اردو کے نقادوں میں ایک ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ ان کی یہ تصنیف "اقبال" عملی تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد دین تنقید میں تشریحی و تاثراتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ لیکن وہ اقبال کو اس کے عہد اور احول سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ انھوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا تجزیہ کرتے ہوئے ہر موقع پر ان کی معاشرتی و سیاسی حالت کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ جن میں اقبال کی ذہنی نشوونما ہوئی تھی۔

احمد دین نے یہ کتاب ایک ایسے زمانے میں لکھی جب کہ اردو تنقید کا سرمایہ بہت ہی محدود تھا۔ اس طرح انھوں نے اردو کی تنقیدی روایت کو آگے بڑھانے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ یہ کتاب اس نقطۂ نظر سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اردو میں پہلی بار اس کتاب کے ذریعے کسی شاعر کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے شعرا کے بارے میں مختلف مضامین تو نظر آ جاتے ہیں لیکن کوئی مستقل کتاب نہیں ملتی۔ اقبال کے فن کا پہلا سیر حاصل جائزہ ہونے کی وجہ سے بھی اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مولوی احمد دین پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اقبال کے کلام کا ایسا مفصل تجزیہ پیش کیا جس نے بعد کے لکھنے والوں کے لیے ایک رہنما کا فرض انجام دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ استفادہ کرنے والوں نے اس کتاب کا حوالہ دینے کو اپنے شایان شان نہ سمجھا۔

مولوی احمد دین اور اقبال کے تعلقات کے پیش نظر یہ ممکن تھا کہ مولوی صاحب بلا وجہ اپنے موضوع کی مدح سرائی کرتے.

لیکن ان کی کتاب اس عیب سے پاک ہے۔ انھوں نے کہیں کسی جگہ اقبال کی بے جا تعریف نہیں کی۔ نیز اپنی عقیدت کو مبالغے کا لباس نہیں پہنایا۔ انھوں نے جو بات بھی کہی ہے مدلل انداز سے کہی ہے، اور اسی بنا پر یہ کتاب آج بھی اقبال فہمی کے لئے ایک مفید دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضمنی طور پر اس کتاب میں حیات اقبال کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ خصوصاً اقبال کی ابتدائی ادبی زندگی کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات ہیں۔ لاہور کی ادبی محفلوں اور حمایت الاسلام کے جلسوں میں اقبال کی مقبولیت کے بارے میں مولوی صاحب نے عینی شاہد کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے سوانح نگار کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تھی تو برصغیر ہندوستان و پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا ہوا تھا۔ اردو کے کئی ممتاز لکھنے والوں نے مختلف رسائل میں اس پر تبصرے کئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ایک مفصل تبصرہ لکھا تھا نے دبے لفظوں میں اس کتاب پر یہ اعتراض کیا تھا کہ "یہ تنقید نہیں بلکہ اقبال کی شاعری کے محاسن ہیں۔" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولوی احمد دین نے کلام اقبال کی خامیوں سے بحث نہیں کی لیکن اس کتاب کو دائرہ تنقید سے خارج کرنا اور اسے محض محاسن شماری" بھی درست نہیں۔ شاید یہاں بابائے اردو مرحوم نے لفظ تنقید کو نہایت محدود معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ورنہ ان جیسے بالغ نظر۔ ایسی رائے کی امید نہیں ہو سکتی۔

اسلوب بیان: مولوی احمد دین کی تصانیف سے بہت سے اقتباسات اس مقالے میں دیے گئے ہیں جن سے مولوی صاحب کے اسلوب اور انداز تحریر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب نے سوانح، تنقید، ادب، تاریخ، انشائیہ، ناول اور لسانیات موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن موضوعات کی اس بوقلمونی کے باوجود ان کے اسلوب میں کسی قسم کی ناہمواری پیدا نہیں اور وہ اپنے استاد محمد حسین آزاد کی روش پر چلتے ہوئے ہر میدان میں انشا پردازی کا لوہا منواتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مولانا آزاد کے اسلوب کی کامیاب پیروی کی ہے۔ اور بعض جگہ تو ان کی تحریروں پر آزاد ہی کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ مثلاً بازار حکیماں کی ادبی محفلوں کے متعلق جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے وہ بالکل "آب حیات" کے رنگ کا ہے یا "راز و نیاز" کا۔ محولہ اقتباس 'نیرنگ خیال' کے اسلوب کی غمازی کرتا ہے۔ مولوی احمد دین نے آزاد کی محض نقالی نہیں کی بلکہ ان خصوصیات کو اپنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جو آزاد کی نثر کا طرۂ امتیاز ہیں۔

احمد دین نے تاریخی تحریروں میں سادہ بیانیہ ہی سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کے اسلوب کی نمائندہ تصانیف اور سرگزشت الفاظ ہیں۔ وہ زور بیان پیدا کرنے کے لئے مترادفات کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں اور کہیں کوئی لفظ ضروری محسوس نہیں ہوتا۔ جہاں انھیں کوئی اخلاقی یا قومی مسئلہ پیش کرنا ہے وہاں وہ اپنا زور بیان خوب دکھاتے ہیں کی طرح مسائل کو تمثیلی انداز سے پیش کرنے میں بھی انھیں کمال حاصل ہے اس کی بہترین مثال ان کا انشائیہ "راز و نیاز" ہے جس سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہے۔ بعض اوقات وہ علمی مباحث میں ایسا پیرایہ اختیار کرتے ہیں جس سے تحریر میں گفتگو کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ بار مخاطب کر کے بھی وہ کتاب کی علمی فضا کو "ذاتی رنگ" دے دیتے ہیں۔ (م۔ع)

نئے خزانے

جولائی تا دسمبر [illegible]ء کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ

(آخری قسط)

مرتبہ

ابوسلمان شاہجہانپوری

انجمن ترقی اردو پاکستان
کراچی

کتابیات

ابوسلمان شاہجہان پوری	نئے خزانے (ماہ دسمبر ۱۹۶۶ء کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ)	قومی زبان، ص ۹۲ تا ۱۰۹، جولائی
〃 〃	نئے خزانے (جنوری تا جون ۱۹۶۷ء کے رسائل کا اشاریہ)	〃 〃 ۱۱۳ تا ۱۲۸، اگست
〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃 〃 ۸۱ تا ۱۰۲، اکتوبر
〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃 〃 ۷۱ تا ۹۰، نومبر
〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃 〃 ۶۵ تا ۸۲، دسمبر
〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃 〃 ۳۴ تا ۹۶، جنوری ۱۹۶۸ء
احمد نواز، ملک	پنجاب یونیورسٹی کے تحقیقی مقالات	کتاب، لاہور، ص ۶۵ تا ۷۲، اگست
اکرام احمد	۱۹۶۶ء کی مطبوعات	قومی زبان، ص ۴۴ و ۳۸، جولائی و اگست
امام مرتضیٰ نقوی	کتابیات اور اس کا فن	ہماری زبان، ص ۶ تا ۷، ۱۵ نومبر
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا، ص جون جولائی
بیدار، عابد رضا	اشاریہ اختر شہنشاہی	قومی زبان، ص ۶۶ تا ۷۶، جولائی
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۱۰۲ تا ۱۱۲، اگست
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۶۱ تا ۶۸، اکتوبر
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۶۳ تا ۷۰، نومبر
خادم، عبدالستار	۱۹۶۶ کی اردو کی مطبوعات	کتاب، لاہور، ص ۵۵ تا ۷۹، جولائی
خالدی ابوالنصر محمد	قاموس الوفیات اعیان الاسلام	برہان، ص ۱۱ تا ۳۵، جولائی
〃 〃	〃 〃 〃	〃 〃 ۸۶ تا ۱۰۱، اگست
〃 〃	〃 〃 〃	〃 〃 ۲۷۷ تا ۲۸۸، نومبر
〃 〃	〃 〃 〃	〃 〃 ۳۴۵ تا ۳۶۳، دسمبر
شفیع احمد عثمانی	ببلیوگرافی	فروغ اردو، ص نومبر
〃	〃	〃 〃 ۷ تا ۱۱، دسمبر
ضیا نرگس جعفری	سندھ یونیورسٹی میں اردو مخطوطات	بصائر، ص ۳ تا ۸، اپریل

ضیاءالحسن حمزہ	سندھ یونیورسٹی میں اردو مخطوطات	مآثر، ص ۳۱ تا ۴۵، جولائی
〃	〃	〃 〃 ۴۱ تا ۵۹، اکتوبر
عبدالمجید قریشی	کتابیں جو قید خانوں میں لکھی گئیں[1]	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۲۴۵ تا ۲۵۹، اپریل
محمود الرحمان (پرویز کاکوی)	نیشنل بینک کی دو مطبوعات (پاکستان۔ نیشنل بینک کی تاریخ)	جام نو، ص اکتوبر
یمین، آغا	کتابیات	ارمغان، ص ۹۵ تا ۱۰۰، نومبر

کتب خانے

اختر، شبیر محمد	کتب خانے اور قومی تعمیر	قندیل، ص ۳، ۸ر نومبر
اشرف علی	برصغیر کے معدوم کتب خانے	کتاب لاہور، ص ۳۲ تا ۳۸، ستمبر اکتوبر
انور، مختار علی	یورپ کے اہم کتب خانوں کا تعارف	ارمغان، ص ۸۳ تا ۹۰، نومبر
انیس خورشید	قومی تعمیر و ترقی میں لائبریریوں کی اہمیت	الزبیر، ص ۲ تا ۱۵،
ایوب قادری، محمد	کتب خانہ شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ	الرحیم، ص ۵۰۵ تا ۵۱۵، دسمبر
حبیب الرحمان ندوی، مولانا	کتب خانہ دارالعلوم مئو (ضلع اعظم گڑھ)	کتابی دنیا، ص جون جولائی
خالد جمیلی	انڈیا آفس لائبریری کی داستان	〃 ، ۲ تا ۷، اگست و ستمبر
زبیر، عبیداللہ	لینن اسٹیٹ لائبریری	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۳۴۳ تا ۳۴۴، اپریل
شاہد، ایم حنیف	روسی کتب خانہ	کوہستان، ص ۱۰، ۱۱ر ستمبر
صارم الازہری، عبدالصمد	اسلامی خلافت میں کتب خانوں کا نظام	امروز، ص ۵، ۶ر دسمبر
عرشی، مولانا امتیاز علی	کتابوں کا تاج محل ۔ رضا لائبریری رام پور	کاکل، ص ۲ تا ۹، ستمبر
علیم قریشی	لیاقت نیشنل لائبریری	جنگ، ص ۱۵، ۲۳ر ستمبر
متعدد حضرات	ذوق کتب اندوزی[2]	الزبیر، ص ۵۵ تا ۲۰۵،

---

[1] مشاہیر پاک و ہند کی علمی و تصنیفی خدمات کا تعارف۔ یہ مضمون کتاب لاہور کے جولائی ۶۸ء کے شمارے میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

[2] الزبیر کتب خانہ نمبر ہے اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

میرا کتب خانہ از عبدالمجید قریشی، میرا ذوق کتب اندوزی از سید محمد حسین، مبارک احمد لائبریری محمد آباد از سید زاہد حسین، حضرت شیخ الجامع لائبریری (بہاولپور) از غلام نصیر الدین فضلی مہروی، میرا کتب خانہ از فضل الحق قریشی

متعدد حضرات	غیر ممالک کے چند کتب خانے[1]	الزبیر، ص ۳۳۵ تا ۳۷۰،
"	کتب خانے ۔ افادیت، اہمیت اور تاریخ[2]	" " ۹ تا ۸۳،
"	کتب خانے ۔ جو ہندوستان میں رہ گئے[3]	" " ۸۵ تا ۱۹۲،
"	کتب خانے ۔ مملکت اسلامیہ پاکستان میں	" " ۱۹۳ تا ۲۸۸،

---

[1] اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل مضامین ہیں :۔
انڈیا آفس لائبریری لندن از عاشق حسین بٹالوی، کتب خانہ مانچسٹر کے بعض مخطوطات از مختار الدین راشدی، قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے از سید حسام الدین راشدی۔

[2] الزبیر کتب خانہ نمبر کے اس حصے میں مندرجہ ذیل مضامین شائع ہوئے ہیں ۔
قومی تعمیر و ترقی میں لائبریری کی اہمیت از انیس خورشید، عہد قدیم میں کتب خانوں کی تاریخ از اشرف علی، اسلامی عہد کے کتب خانے از محمد حفیظ اللہ پھلواروی، برصغیر کے شاہی کتب خانے از حنیف شاہد، برصغیر کے معدوم کتب خانے از اشرف علی، شاہان مغلیہ کا کتب خانہ از پروفیسر سعید احمد رفیق، کتب خانہ ٹیپو سلطان از حکیم محمود احمد برکاتی، اودھ کا شاہی کتب خانہ از سبط الحسن ۔

[3] الزبیر کتب خانہ نمبر کے اس حصے میں مندرجہ ذیل کتب خانوں پر مضامین شامل ہیں ۔
کتب خانہ رضائیہ رام پور از عابد رضا بیدار، کتب خانہ وزیر الدولہ ٹونک کے چند نوادر از حکیم محمود احمد برکاتی، کتب خانہ معین الدولہ کے مخطوطات از محمد انصار اللہ نظر، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن از سید بیلدی، سالار جنگ میوزیم از ڈاکٹر محمد حسن، ضلع پٹنہ صوبہ بہار کے بعض قدیم کتب خانے از محمد حفیظ اللہ پھلواروی، خدا بخش لائبریری، از ؟ کلکتہ کی قومی لائبریری از ؟ علی گڑھ کے ذخیرہ مخطوطات کی سیر از پروفیسر رشید احمد صدیقی، مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ از الحاج محمد زبیر، دہلی کے کتب خانے از رشید احمد رشد، کتب خانہ نذیریہ دہلی از نصیب اختر بھیکا لائبریری کی کچھ نایاب مطبوعہ کتابیں از سید امام یحییٰ، کتب خانہ نمریافی میں کچھ دیر از سخاوت مرزا، دار العلوم احمدیہ سلفیہ کا کتب خانہ از مولوی عبد الرحمان سلفی، دیسنہ لائبریری مرحوم از سید شہاب الدین دسنوی، کتب خانہ عبد الرشید خاں کانپور میں اردو کی کمیاب مطبوعات از محمد انصار اللہ نظر

[4] الزبیر کے کتب خانہ نمبر میں اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل کتب خانوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔
پاکستان کا قومی کتب خانہ از اشرف علی، سندھ کے دینی کتب خانے از رحمت فرخ آبادی، سکھر کے کتب خانے از رحمت فرخ آبادی، اوچ شریف کے علمی نوادر از مسعود حسن شہاب، کتب خانہ آزاد (محمد حسین) از آغا محمد باقر، پنجاب پبلک لائبریری از سید اسلم سعیدی، دیال سنگھ لائبریری از تاجور حسن، کتب خانہ اسلامیہ کالج پشاور از ڈاکٹر کے بی نسیم، سینٹرل لائبریری بہاولپور از علی احمد رفعت، کراچی یونیورسٹی لائبریری میں چند قدیم اردو مطبوعات از فضل اللہ فاروقی، کراچی یونیورسٹی لائبریری از محمد عثمان، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی لائبریری کراچی میں چند کمیاب مطبوعات از فضل اللہ فاروقی۔

متعدد حضرات	متفرقات[1]	الزبیر، ص
"	مخطوطات کے ذخائر[2]	" ، ۲۴۷ تا ۲۸۴،
محمد نعیم گوالیاری	خلیفہ الحکم کا کتب خانہ اور اس کا ذوق علم	فاران، ص ۱۹ تا ۲۳، نومبر
نور محمد، سعید	میرا فاقی کتب خانہ	کتاب، ص ۴۹ تا ۵۱، نومبر
———	پاکستان کا قومی عجائب گھر	حریت، ص ۲، ۱۳ اگست

لسانیات

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر	اردو کا صوتی نظام	نگار پاکستان، ص ۱۳ تا ۲۵، ستمبر
آسی ضیائی رام پوری	امالہ یا انصراف	سیارہ، ص ۲۵ تا ۳۹، دسمبر
ترقی اردو بورڈ، کراچی	اردو لغت (مجمل ایڈیشن نمبر ۲۲) - (۲۳)	اردو نامہ، ص ۱۵۴ تا ۲۴۴، جون و اکتوبر
حسینی، سید خواجہ	اردو کا ایک قدیم لغت	سب رس، ص ۱۰ تا ۱۳، جولائی
خیر بہوروی	ایک مستند اردو لغات	آج کل، ص ۲۷ تا ۳۴، مئی
رشید حسین خاں	املا کا اختلاف	اردو نامہ، ص ۷۶ تا ۸۲، اکتوبر
سہیل بخاری، ڈاکٹر	اردو زبان کی بنیادی آوازیں	نقوش، ص ۹۴ تا ۱۰۱، ستمبر
" "	اردو زبان کے چند محاورے	اوراق، ص ۳۳۶ تا ۳۴۲،
شمس الرحمان فاروقی	انگریزی اصطلاحات کے مجوزہ اردو مرادفات	ہماری زبان، ص ۴، ۳ + ۴، ۷، ۲۲ جولائی

---

[1] الزبیر کتب خانہ نمبر میں "متفرقات" کے زیر عنوان مندرجہ ذیل مضامین شائع ہوئے ہیں ۔

کتاب زندگی کا مخلص اور بے لوث ساتھی از ؟، میرا مطالعہ از مولانا محمد ناظم ندوی، کتابیں ہیں ۔ چمن اپنا از عبد المجید قریشی، اسلامی عہد کے مصنف اور تاجران کتب از ؟ بچوں کی لائبریری از مس خالدہ شیخ، قرآن پاک کے انگریزی اور لاطینی تراجم از مولانا عبد الماجد دریا بادی، کتابوں کے کیڑے از وقار بن الٰہی، حرمین کے کتب خانے از مولانا نور احمد فریدی، انتخاب پبلک لائبریری از عرفان چغتائی، مشرقی پاکستان کی لائبریریاں از ؟

[2] الزبیر کتب خانہ نمبر کے اس حصے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں ۔

خزائن مخطوطات کتب خانہ وال میانہ شریف از محمد شفیع، کراچی کے دو نجی کتب خانے (کتب خانہ محمد ایوب قادری اور کتب خانہ سید محمد بیدری) از شاہ الحق، کتب خانہ مدرسہ عربیہ مظہر العلوم کراچی از مولانا محمد عبد الرشید نعمانی، مخطوطات کا ایک نادر ذخیرہ (کتب خانہ مولوی شمس الدین لاہور) از مولوی عبد الحلیم چشتی، فن خطاطی کا ایک نادر ذخیرہ از محمد ایوب قادری، ذخیرہ خطاطی بہادر مولوی ظفر حسن مرحوم از محمد ایوب قادری ۔

عبدالحق، بابائے اردو مولوی	لغت کبیر اردو	اردو، ص ۱۶۹ تا ۱۹۹، اکتوبر
عبدالقدیر، منش	سہ حرفی الفاظ	ہندوستانی ادب، ص ۲۸ تا ۳۰، اپریل تا جون
عین الحق فریدکوٹی	سنسکرت اور پراکرتیں	اردو نامہ، ص ۳۹ – ۴۹، جون
محبوب عالم فریدی	کچھ "ہمزہ" کے بارے میں	ہماری زبان، ص ۵ تا ۸، ۲۲ اگست
نارنگ، ڈاکٹر گوپی	اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت	نقوش، ص ۲۳ تا ۳۱، ستمبر
نسیم اختر، محمد	علم نحو کی ابتدا و ارتقا	ثقافت، ص ۴۴ تا ۵۹، نومبر
نیر اقبال	صوتی آلات	ہماری آواز، ص ۳ تا ۴، ۱۵ اکتوبر
"	قواعد زبان	اردو نامہ، ص ۳۴ تا ۴۰، اکتوبر
وارث سرہندی	اجزائے لغت پر تنقید	" " ۸۵ تا ۱۱۶، جون
" "	" "	" " ۱۳۲ تا ۱۴۱، اکتوبر

مذہبیات

احادیث

ارشد، مولانا عبدالحمید	رجال الحدیث	الجامعہ، ص ۳۴ تا ۴۵، جولائی
جعفری، مولانا رئیس احمد	امام مالک اور موطا امام مالک	ثقافت، ص ۳۳ تا ۵۰، دسمبر
حبیب الرحمان اعظمی	ابو عبید کی غریب الحدیث	معارف، ص ۲۰۵ تا ۲۱۲، اکتوبر
طاسین، مولانا محمد	جواہر حدیث	بینات، ص ۳ تا ۱۱، شعبان
ولی اللہ دہلوی، حضرت شاہ	تاویل الاحادیث (مترجمہ)	الرحیم، ص ۲۰۳ تا ۲۲۹، اگست
" " "	" "	" " ۲۰۹ تا ۲۱۶، ستمبر
" " "	" "	" " ۲۸۴ تا ۲۹۴، نومبر
" " "	"	" " ۴۱۵ تا ۴۲۲، دسمبر

تصوف

جمال احمد امین آبادی، سید	تصوف کا چشمہ صافی	زندگی، ص ۲۳ تا ۳۰، اکتوبر

جمال احمد ابن آبادی، سید	تصوف کا چشمۂ صافی	زندگی، ص ۴۳ تا ۵۰، نومبر
یوسف سلیم چشتی، پروفیسر	اسلامی تصوف	میثاق، ص ۸ تا ۲۵، اگست
〃 〃	تصوف کیا ہے؟	〃 〃 ۲۵ تا ۳۴، جولائی

سیرت نبوی

اکبر جیلانی	کتب مقدسہ میں ظہور اقدس کی بشارتیں	وائس آف اسلام، ص ۶۲ تا ۶۵، اگست
الطاف، شیخ عبد اللہ	خطبۂ افتتاحیہ جلسۂ عید میلاد النبیؐ	〃 〃 ۶۹ تا ۷۲، 〃
امین احسن اصلاحی، مولانا	محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاستؐ	المنبر، ص ۵ تا ۱۰، ۱۰ر نومبر
آزاد، مولانا ابوالکلام	ولادت نبویؐ [1]	ہمدرد صحت، ص ۳۳ تا ۳۶، جولائی
پرویز، غلام احمد	رحمۃ للعالمین	طلوع اسلام، ص ۳۳ تا ۴۶، جولائی
رام دہاری سنگھ	اسلام کی فتح پیغمبر اسلام کے اعلیٰ کردار کا اعجاز ہے	انوار اسلام، ص ۲۰ تا ۲۲، جولائی
سعید دہلوی، حکیم محمد	مطالعہ سیرت نبوی	لاہور، ص ۵، ۱۲، ۱۳ر جولائی
شہابی، مفتی انتظام اللہ	سیرت الرسول من القرآن	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۳ تا ۲۰، مئی تا نومبر
عبد الغفار خیری، مولانا	مقام محمد صلی اللہ علیہ وسلم	صحیفۂ اہل حدیث، ص ۱۱ تا ۱۳، ۱۶ر دسمبر
عشرت صدیقی	انسان کامل	بینات، ص ۶ تا ۱۵، شعبان ۱۳۸۲ھ
غازی، محی الدین	سیرت رسول اکرمؐ کا مطالعہ	ماہ نو، ص ۴۴ تا ۴۷، اکتوبر
فاروقی، ابو طاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور، ص ۵، ۱۳ر اگست
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۵، ۱۳ر دسمبر
قاضی، صلاح الدین	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام حکومت	قندیل، ص ۹، ۲۲ر جولائی
〃 〃	〃 〃 〃	〃 〃 ۹، ۲۰ر 〃
〃 〃	〃 〃 〃	〃 〃 ۹، ۶ر اگست
〃 〃	〃 〃 〃	〃 〃 ۹، ۲۰ر 〃

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات و سیرت طیبہ پر ان حضرات گرامی کے مضامین بھی ہیں: سید سلیمان ندوی، سید ابو الحسن علی ندوی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سید رشید احمد ارشد، حکیم سید احمد اللہ ندوی (ص ۳۶ تا ۴۴)

محمد احمد قادری، مولانا	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بینات، ص ۵ تا ۲۰، جمادی الآخر
" "	" "	" " ۵۰ تا ۵۸، رجب المرجب
محمد سعید دہلوی، حکیم	مطالعہ سیرت نبویؐ	بصائر، ص ۷ تا ۱۳، اکتوبر
معین الحق، ڈاکٹر سید	مغربی مستشرقین اور سیرت نبویؐ کا مطالعہ	" " ۱۳ تا ۲۴، "

عبادات

اشرف حکیم عبدالرحیم	زکوٰۃ اور ملت کی تعمیر	المنبر، ص ۴، ۱۰ر نومبر
جان سیلان، ڈاکٹر	روزے کی اہمیت سائنس کی زبان سے	ہمدرد ڈائجسٹ، ص ۱۰ تا ۱۵، دسمبر
خلیل احمد صدیقی، حافظ	حقیقت صوم	پیام حق، ص ۱۰ تا ۱۲، دسمبر
عبداللہ غازی پوری	زکوٰۃ کا شرعی نظام	صحیفہ اہل حدیث، ص ۹ تا ۱۱، ۱۹ر دسمبر
نعیم الدین زبیری، حکیم	روزہ اور تعمیر سیرت	ہمدرد ڈائجسٹ، ص ۶ تا ۹، دسمبر
ولی حسن ٹونکی، مفتی	زکوٰۃ عبادت ہے	بینات، ص ۳۳ تا ۴۴، جمادی الاولیٰ[1]
" "	" "	" " ۴۵ تا ۴۹، جمادی الآخر
" "	" "	" " ۴۲ تا ۵۵، رجب المرجب
" "	" "	" " ۳۳ تا ۳۶، شعبان

عقائد

اختر ایم اے	توحید وجودی	الرحیم، ص ۱۹ تا ۳۰، اگست
صفدر علی بیگ، ڈاکٹر	وجود باری	معارف، ص ۴۶ تا ۵۳، جولائی
————	مسئلہ ختم نبوت — علم و عقل کی روشنی میں	المنبر، ص ۱۵ر دسمبر

قرآن

ابن قیم، علامہ	قرآنی کلمات کی حکیمانہ ترتیب	نظام، ص ۱۲۵، مارچ اپریل

---

[1] المنبر کی یہ اشاعت ردِ قادیانیت کے لیے وقف ہے ص ۴۰

ابوسلمان شاہجہان پوری	قرآن مجید کے فارسی تراجم	نظام، ص ۱۰۹، مارچ اپریل
اجمل خاں، محمد	ترتیب نزول قرآن کریم	الجامعہ، ص ۵۶ تا ۶۴، دسمبر
احتشام الحسن کاندھلوی، مولانا	قرآن کیوں نازل کیا گیا؟	نظام، ص ۱۰۳، مارچ اپریل
احتشام الحق تھانوی، مولانا	درس قرآن ـــ البقرہ[۵]	جنگ، ص ۵، ۰ر جولائی
″	نزول قرآن کا واقعہ	″ ″ ۲، ″
احمد قادری، سید	قرآن محکم	زندگی، ص ۲۲ تا ۲۹، دسمبر
احمد کمال عمر	تخلیق کرۂ ارض ـــ آیات قرآن کی روشنی میں	صدق جدید، ص ۲، ۸، ۳ و ۱۰ر نومبر
اصلاحی، مولانا امین احسن	تدبر قرآن ـــ تفسیر سورہ النساء (۵)	میثاق، ص ۹ تا ۲۵، جولائی
″	″ ″ ″ (۶)	″ ″ ۱۷ تا ۳۷، اگست
″	قرآن اور حکومت الٰہیہ کا قیام	نظام، ص ۱۰۱، مارچ اپریل
انظر شاہ کاشمیری، مولانا	مرتب صحیفہ الٰہی یا غیر مربوط کلام	″ ″ ۱۱۳، ″ ″
بشیر احمد صدیقی، مولانا	سورہ نساء کے اہم مضامین	شہاب، ص ۶، ۷، ۷ر اگست
بھٹی، ایم ایس	دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم	ثقافت، ص ۷۵ تا ۹۲، دسمبر
جمیل الرحمان سیوہاروی، مولانا	قرآن کا معاشی نظام	نظام، ص ۹۷، مارچ اپریل
حبیب الرحمان خیرآبادی، مولانا	فہم قرآن اور اس کے شرائط	″ ″ ۱۴۰، ″ ″
خالد مسعود	افادات فراہی ـــ اسالیب قرآن (۳)	میثاق، ص ۲۲ تا ۳۴، جولائی
ریاض بٹالوی	قرآن مجید کے قدیمی نسخے ـــ میجر فقیر سید مغیث الدین کا مراسلہ	مشرق لاہور، ص ۵، ۱۳ر دسمبر
زاہد الحسینی، مولانا قاضی	مفسرین قرآن کا تقویٰ اور دیانت	نظام، ص ۱۲۳، مارچ اپریل
سالم قاسمی، مولانا محمد	قرآن کی روشنی میں اسلام کا اصولی تعارف	″ ″ ۵۳، ″ ″
سعید احمد اکبرآبادی، مولانا	قرآن فہمی کے اصول	″ ″ ۱۴۸، ″ ″
شبیر احمد عثمانی، مولانا	قرآن مجید میں تکرار کیوں ہے؟	″ ″ ۱۳۳، ″ ″
صارم الازہری، عبدالصمد	نزول قرآن	المنبر، ص ۱۰ تا ۱۷، ۹ر دسمبر
طاہر سورتی	قرآن اور عربی زبان	الجامعہ، ص ۲۲ تا ۳۲، دسمبر

---

[۵] تفسیر قرآن کا مستقل سلسلہ ہر جمعہ کی اشاعت میں تا حال (۳۰ر دسمبر ۱۹۸۳ء) جاری ہے۔

ظفر احمد عثمانی تھانوی، مولانا	قرآن اور یہودیت کی ذلت	صدق جدید، ص ۵، ۱۱ راگست
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۵ تا ۶، ۱۸ راگست
عبدالحق، بابائے اردو مولوی	قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر اردو میں	نظام، ص ۲۱۷، مارچ اپریل
عبدالقیوم مظاہری، مولانا	قرآن ـــ ایک صحیفۂ انقلاب	〃 〃 ۹۳، 〃 〃
عبدالماجد دریابادی مولانا	خوف و حزن کا علاج ـــ قرآن سے	صدق جدید، ص ۴-۵، ۱۵ رستمبر
〃 〃	سورہ الحاقہ	〃 〃 ۴، ۱۳ راکتوبر
〃 〃	〃	〃 〃 ۴، ۲۶ 〃
〃 〃	〃	〃 〃 ۴، ۳ رنومبر
〃 〃	〃	〃 〃 ۵، ۱۰ 〃
〃 〃	〃	〃 〃 ۵، ۸ ردسمبر
〃 〃	〃	〃 〃 ۴، ۲۹ 〃
〃 〃	قرآن مجید کے انگریزی تراجم	نظام، ص ۲۲۲، مارچ اپریل
〃 〃	یہود اور قرآن	صدق جدید، ص ۸، ۱۴ رجولائی
〃 〃	〃	〃 〃 ۵ تا ۶، ۲۱ 〃
〃 〃	〃	〃 〃 ۳ تا ۴، ۲۵ راگست
عضد الدین، محمد	تفسیر فتح العزیز (چند حقائق کی روشنی میں)	الرحیم، ص ۲۲۲ تا ۲۳۲، ستمبر
علاؤ الدین صدیقی، علامہ محمد	〃	〃 〃 ۲۷۱ تا ۲۸۲، اکتوبر
	سورہ بقرہ کے اہم مضامین	شہاب، ص ۷، ۲۰ رجولائی
فرحت افضل	نظام عالم کے قرآنی نظریات	الجامعہ، ص ۷ تا ۱۲، دسمبر
قدیری، عبدالرشید	مقالہ امثال القرآن للماوردی کا مختصر تعارف	الرحیم، ص ۳۴۳ تا ۳۴۹، اکتوبر
قمرالدین مظاہری، مولانا	جمع و تدوین قرآن	نظام، ص ۱۷۰، مارچ اپریل
متین الخطیب، مولانا محمد	قرآن کے مختلف اسلوب بیان	جنگ، ص دسمبر
محمد احمد صدیقی، مولانا	طبقات المفسرین	نظام، ص ۱۴۰، مارچ اپریل
محمد ادریس میرٹھی، مولانا	قرآن کیا ہے؟	بینات، ص ۲۶ تا ۴۰، رمضان
محمد ثانی حسنی، مولانا سید	عربی زبان میں تفسیری خدمات	نظام، ص ۱۹۵، مارچ اپریل

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

قومی زبان

بابائے اردو نمبر

ستمبر سنہ ۱۹۶۸ء

شمارہ ۲ جلد ۳۳

990
6/ X / 68

قیمت فی پرچہ - ایک روپیہ
قیمت سالانہ - دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ - کراچی

فون: ۲۳۲۷۸۴

اس شمارے [illegible] لکھنے والے

[illegible] (صدر انجمن)
قدرت اللہ شہاب
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
پروفیسر ممتاز حسین
ابن انشا
فضل احمد صدیقی
جمیل نقوی
حبیب اللہ رشدی
شیخ محمد اسماعیل پانی پتی
سعادت میرزا
ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر
شمیم احمد
سید معین الرحمان
غیور عالم
نرگس صادق
اختر اخلاق
حافظ بشیر احمد غازی آبادی
احفاظ الرحمان
محمود الرحمان
اکبر رحمانی

فہرست مضامین

یوم بابائے اردو		۳
ساتویں برسی	اختر حسین (صدر انجمن)	۹
اپیل		۱۲
اینٹ کا جواب روپیہ	قدرت اللہ شہاب	۱۳
زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات		
مولوی عبدالحق کا مشن	پروفیسر ممتاز حسین	۱۷
چند یادیں چند تأثرات	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲۱
مرد جنوں پیشہ (نظم)	جمیل نقوی	۲۹
اینٹوں کا کاروبار	ابن انشا	۳۱
یادوں کا تتمہ	فضل احمد صدیقی	۳۳
مولوی عبدالحق سے بابائے اردو تک	شمیم احمد	۳۵
مولوی عبدالحق بحیثیت محقق	ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر	۴۱
بابائے اردو کی مکتوب نگاری	نرگس صادق	۴۷
بابائے اردو کی سیرت کا ایک پہلو	اکبر رحمانی	۵۷
وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھا	حافظ بشیر احمد غازی آبادی	۶۵
بابائے اردو کے ساتھ پانچ سال	سید صلاح الدین	۶۹
یادش بخیر	محمود الرحمان	۷۵
رسالہ "افسر" اور مولانا حالی	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	۸۱
رسالہ "نورس" کا کالج ڈے نمبر	سخاوت میرزا	۸۵
سلسلۂ روز و شب	حبیب اللہ رشدی	۸۷
حیات عبدالحق	غیور عالم	۸۷
۳۶۳ دنوں کا حساب	احفاظ الرحمان	۱۱۷
بابائے اردو کی یاد میں	آنسہ اختر اخلاق	۱۲۳
نقد عبدالحق	معین الرحمان	۱۲۷

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

CENTRAL LIBRARY
NEW DELHI 25
JAMIA MILLIA ISLAMIA

یوم بابائے اردو

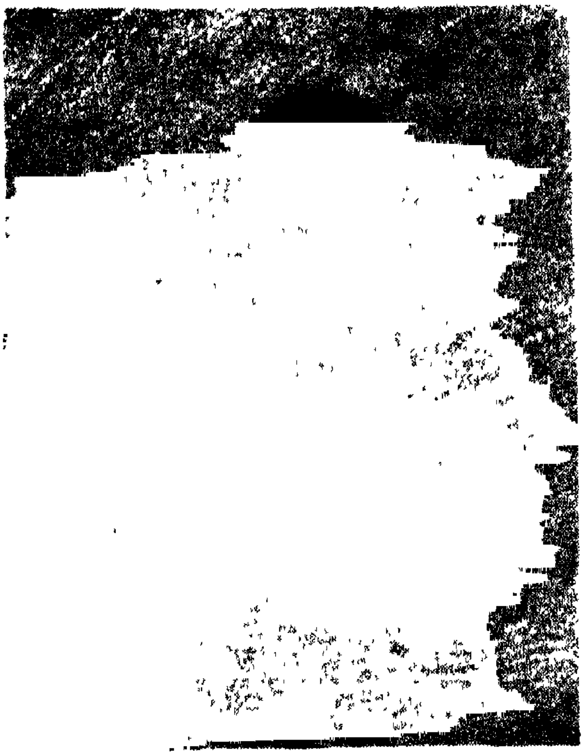

۱۶ اگست کو انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی ساتویں برسی منائی گئی۔ صبح ۹ بجے انجمن میں قرآن خوانی ہوئی جس میں بابائے اردو کے بہت سے عقیدت مندوں نے حصہ لیا۔ شام کو پانچ بجے ایک جلسۂ عام ہوا جس کی صدارت مرکزی وزارت تعلیمات کے معتمد جناب قدرت اللہ شہاب نے فرمائی۔ انجمن کے صدر جناب اختر حسین کے خطبۂ استقبالیہ کے بعد پروفیسر ممتاز حسین، سید محمد تقی، فضل احمد صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، سید سبط حسن مس مارگریتا (روسی طالبہ) اور کشور غنی نے تقاریر کیں اور جمیل نقوی صاحب نے نظم پڑھی۔ آئندہ صفحات میں اس جلسے کی بعض تقریریں اور مضامین پیش کئے جا رہے ہیں۔

جناب قدرت اللہ شہاب

جناب اختر حسین

دائیں سے بائیں: قدرت اللہ شہاب، کیپٹن اکرام الرحمٰن، ابن انشار، جمیل الدین عالی، ممتاز حسین
اختر حسین، (صدر انجمن) اور دوسرے

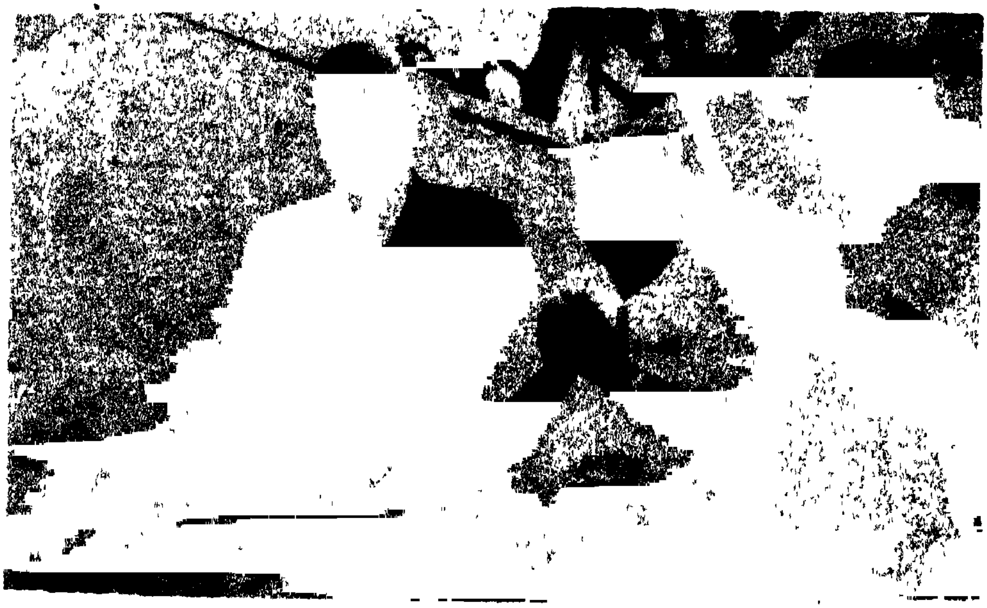

دائیں سے بائیں: جناب ضیاء اللہ وائس چیرمین بلدیہ کراچی ۔ جناب فضل احمد صدیقی ۔ جناب جلیل قدوائی

ڈاکٹر شوکت سبزواری

پروفیسر ممتاز حسین

سید محمد تقی

فضل احمد صدیقی

سید سبط حسن

جمیل الدین عالی

مس مارگریتا (روسی طالبہ)

کشور غنی

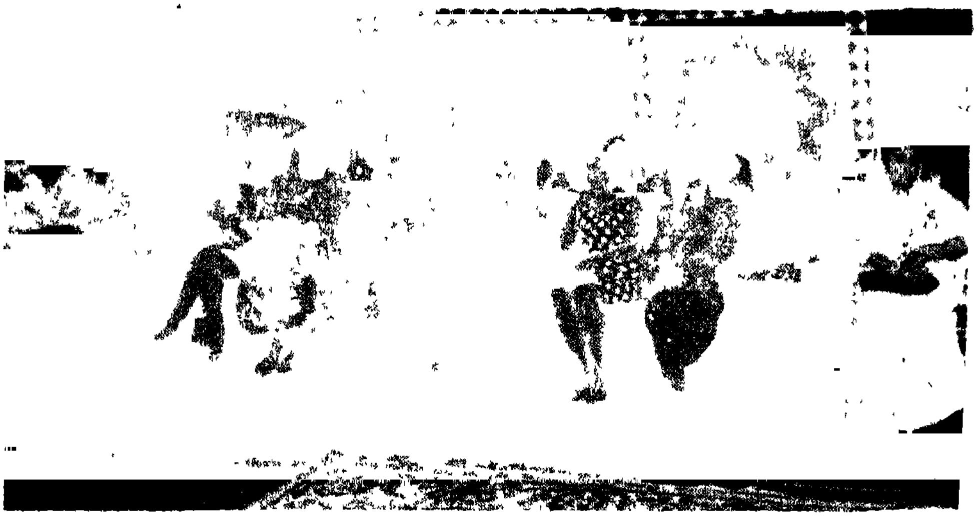

چند شرکائے جلسہ

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ

کہ آپ جو الفاظ استعمال کریں انکے معنی سے آپ پوری طرح واقف ہوں

اس سلسلے میں

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اُردو ڈکشنری

آپ کی بہترین معاون ہوسکتی ہے

آپ گھر میں ہوں

دفتر میں ہوں

یا سفر میں

ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی رفیق ہوگی۔

طلبہ، اساتذہ، وکلاء، اطبا، مترجمین اور سرکاری کارکنوں کے لئے۔

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اُردو ڈکشنری بہترین تحفہ ہے!

خوبصورت طباعت، اعلیٰ درجہ کا بائبل پیپر

ڈیڑھ ہزار صفحات۔ مضبوط جلد۔ قیمت صرف ۲۱ روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اُردو روڈ۔ کراچی

ساتویں برسی

اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو

خواتین و حضرات

آج ہم سب یہاں بابائے اردو کی ساتویں برسی کے موقعے پر انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں ۔ اور اسی لیے میں اس موقعے پر ایک خوش گوار فرض ادا کرنا چاہتا ہوں جو موقعے کے لحاظ سے نہایت موزوں اور مناسب ہے ۔

گزشتہ دنوں ہمارے صدر جمہوریہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اردو زبان کے بارے میں جو بیان دیا ہے وہ پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا ۔ انھوں نے اردو اور پاکستان کے گہرے تاریخی اور معاشرتی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ زبان اس خطے میں پیدا ہوئی جو آج مغربی پاکستان ہے لہٰذا اردو ہماری اپنی زبان ہے اور اسے اپنانا ہماری قومی روایات کے عین مطابق ہے ۔

صدر جمہوریہ کا یہ بیان ہر محب وطن پاکستانی کے لیے ایک مژدۂ جانفزا سے کم نہیں کیونکہ آج تک اردو کے بارے میں حکومت کا کم اور ارباب حکومت کا زیادہ رویہ ایسا رہا ہے جسے ہم صرف غیر ہمدردانہ کہہ سکتے ہیں اور اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ صدر جمہوریہ تمام اہل پاکستان کے شکریے کے مستحق ہیں اگر آج بابائے اردو زندہ ہوتے تو انھیں صدر پاکستان کے اس بیان سے جتنی خوشی ہوتی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں یہی وجہ ہے کہ آج کے جلسے میں جو بابائے اردو کی یاد میں منعقد ہو رہا ہے میں نے اپنا یہ فرض سمجھا ہے کہ اپنی اور آپ سب کی طرف سے صدر پاکستان کا شکریہ ادا کروں ۔

ایک بات مجھے اپنے مہمان خصوصی جناب قدرت اللہ شہاب سے بھی کہنی ہے اور وہ یہ کہ آپ نہ صرف حکومت کے ایک اہم کارکن ہیں بلکہ اردو کے بڑے ادیب اور ادارۂ مصنفین کے بانیوں میں سے بھی ہیں ۔ اور اردو سے آپ کی وابستگی قدیم اور گہری ہے ۔ اسی لیے ہمیں توقع ہے کہ آپ اپنے وسیع اختیارات کو اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کام میں لائیں گے ۔ آپ کو اس کا علم ہے کہ اردو کی خدمت کرنے والے کل اداروں کو حکومت صرف آٹھ دس لاکھ روپے کی سالانہ امداد دیتی ہے ۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ معمولی رقم سارے اداروں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور [illegible] ادارہ بھی زبان کی

خاطر خواہ خدمت کرنے کا اہل نہیں رہتا آپ انجمن ترقی اردو کی کارکردگی سے بھی واقف ہیں اور چونکہ آپ خود مصنف ہیں اس لیے مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتابیں چھاپنا اور خصوصاً علمی اور تحقیقی کتابیں چھاپنا ہمارے ملک میں منفعت بخش کاروبار نہیں ۔ پھر بھی ہم نے انجمن کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کو جاری رکھا ہے ۔ بابائے اردو کے ورثے کے طور پر ہمیں بہت سے نامکمل علمی منصوبے ملے ہیں ان کی تکمیل کے لیے ہم پوری طرح کوشاں ہیں ۔ قاموس الکتب، اردو انگریزی ڈکشنری اور اسٹینڈرڈ ڈکشنری کی تکمیل و طباعت کا کام جاری ہے ۔ اس کے علاوہ متعدد علمی و ادبی کتابوں کے مسودے زیر طباعت ہیں ۔

یہ وقت آپ کو اپنی کارکردگی کے بارے میں بتانے کا نہیں ہے پھر بھی مختصراً یہ عرض کر دوں کہ جو عظیم مقصد بابائے اردو کے پیش نظر تھا ہم نے اسے حاصل کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی ہے ۔

اس سلسلے میں بابائے اردو کی معنوی یادگار اردو کالج کے دائرۂ عمل کو وسیع تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس سے صرف کراچی ہی کے نہیں بلکہ پورے پاکستان کے طالب علم مستفید ہو سکیں، ہم نے اردو کالج کو ایک عظیم الشان اقامتی ادارہ بنانے کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا اس مقصد کے لیے نہ صرف یہ کہ ایک بڑا قطعۂ اراضی حاصل کر لیا گیا ہے بلکہ اس پر تعمیر بھی شروع کر دی گئی ہے ۔ تعمیر کا یہ کام صرف خدا کے بھروسے اور آپ حضرات کے تعاون کی امید پر شروع کیا گیا ہے اور مجھے پوری توقع ہے کہ جلد ہی یہ ادارہ اپنی زندگی کے ایک نئے اور شاندار دور کا آغاز کر دے گا ۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ ہم اس منصوبے کو صرف حکومت کی امداد یا اہل ثروت کے تعاون سے مکمل کرنا نہیں چاہتے، میری یہ خواہش ہے کہ اس منصوبے میں تمام اردو دوست شریک ہوں اور وہ اتنی ہی مدد کریں جتنی ان کے حالات اجازت دیں ۔ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ کم سے کم لوگوں سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کر کے اس منصوبے کو مکمل کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون اس طرح حاصل کیا جائے کہ مطلوبہ رقم جمع ہو جائے ۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ایک روپے اور پانچ روپے کی رسیدیں طبع کرائی تھیں اردو دوستوں نے یہ رسیدیں خرید کر ہماری مدد کی ہے لیکن ابھی ہم اتنی رقم بھی جمع نہیں کر سکے ہیں کہ کلی اطمینان کے ساتھ کام آگے بڑھا سکیں ۔

اب ہم نے ایک نئی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قدم اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو خواتین و حضرات اردو کالج کی نئی عمارت کی تکمیل میں حصہ لیں ان کے اسمائے گرامی عمارت پر کندہ کرائے جائیں ۔ ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ ہر اردو دوست اپنے نام کی ایک اینٹ ضرور عطا کرے ۔ اور اس ایک اینٹ کی قیمت پچیس روپے رکھی گئی ہے ۔ مجھے امید ہے کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کے اس سب سے بڑے منصوبے سے ہر اردو دوست وابستہ ہونا اپنا فرض سمجھے گا ۔

آخر میں میں ایک سخن گسترانہ بات کرنا چاہتا ہوں ہماری حکومت نے اعلان کیا تھا کہ ۱۹۷۷ء میں ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو اس امر کا جائزہ لے گا کہ اردو میں سرکاری اور تعلیمی زبان بننے کی اہلیت ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں اردو کے حق میں بے شمار دلیلیں دی جا سکتی ہیں اور بہت کچھ کہا بھی جا چکا ہے۔ ان سب سے قطع نظر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صدر جمہوریہ کے مذکورہ بیان کی روشنی میں حکومت کو مجوزہ کمیشن کے مقصد میں تبدیلی کرنی چاہیئے یہ کمیشن اس لیے مقرر نہیں ہونا چاہیئے کہ اردو کی اہلیت کا جائزہ لیا جائے بلکہ اس لیے مقرر ہونا چاہیئے کہ اردو کو سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کے لیے ٹھوس اور عملی تجاویز پیش کرے۔ کسی زبان کے جانچنے کا معیار بحث و تمحیص نہیں بلکہ یہ ہے کہ اسے اپنی عملی زندگی کا جزو بنا لیا جائے۔ یہاں میں آپ کو یاد دلادوں کہ انگلستان میں یہ فیصلہ کرنے سے پہلے کہ لاطینی کی جگہ انگریزی اختیار کی جائے نہ کمیشن بیٹھے تھے نہ انگریزی کی اہلیت جانچی گئی تھی۔ یہ پوری قوم کا فیصلہ تھا۔ ہم نے بھی پاکستان کے قیام کے وقت اردو کے لیے ایسا ہی فیصلہ کیا تھا لیکن آج اکیس سال گزر جانے کے بعد بھی ہم اپنے فیصلے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔

مجھے آخر میں اپنے مہمان خصوصی سے یہ عرض کرنا ہے کہ بابائے اردو سے آپ کو جو لگاؤ تھا اور جو خدمت ان کی آپ نے کی تھی اس کی بنا پر مجھے پوری توقع ہے کہ انجمن ترقی اردو اور اردو کالج پر آپ کی خاص نظر عنایت رہے گی۔

خواتین و حضرات

آج ہم ایک ایسے فرد کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں جو نہ صرف ایک عظیم دانشور، ایک بڑا ادیب اور ایک محقق تھا بلکہ خود ایک تحریک بھی تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی صرف ایک مقصد کے لیے وقف کر دی تھی اور آخر دم تک اس نے اسی تندہی اور اسی لگاؤ اور اسی محنت سے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش میں خود کو لگائے رکھا۔ اس کی زندگی ہم سب کے لیے ایک سبق ہے۔ خدا ہمیں بھی وہی مقصدیت وہی لگن اور وہی محنت کا جذبہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اُردو آپ کی
اردو کالج آپ کا
اس کی تعمیر میں ایک اینٹ آپ بھی لگائیے

اپیل

اردو کالج جن حالات میں قائم ہوا اور اپنی تمام بے بضاعتی کے باوجود قوم کی اور قومی زبان کی اس نے جو خدمات انجام دی ہیں اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں کیونکہ آپ کے تعاون اور اشتراک ہی سے یہ سب کچھ ممکن ہوا۔

آپ ہی کی ہمت افزائی کے سہارے اردو کالج نے ایک اقامتی کالج کی تعمیر کے عظیم منصوبے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم سب کی کوششوں سے یہ تین کروڑ روپے کا منصوبہ جلد از جلد مکمل ہو جائے اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے جہاں ایک عظیم درسگاہ قائم ہو وہاں انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ کس کس نے اس عمارت کی اینٹیں رکھی ہیں۔ جس اینٹ کا آپ عطیہ دیں گے اس پر آپ کا نام کندہ کیا جائے گا۔ امید ہے آپ ایک سے زیادہ اینٹوں کا عطیہ دیکر اپنے نام کو جلی لکھوائیں گے۔

آج ہی اپنا نام صاف لکھ کر صرف پچیس روپے بھیج دیجئے آپ کا نام ابدالآباد تک زندہ رہے گا۔

اس کار خیر میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی شریک رکھئے۔ عطیات آپ انجمن ترقی اردو کے حساب میں ان بینکوں کی کسی بھی شاخ میں جمع کرا سکتے ہیں۔

۱۔ نیشنل بینک آف پاکستان۔
۲۔ حبیب بینک لمیٹڈ۔
۳۔ یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ۔

اختر حسین
(ہلال پاکستان)
صدر ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان

اینٹ کا جواب روپیا

قدرت اللہ شہاب

بھارت کے صوبہ اڑیسا میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں اب تک نہایت قدیم —— ABORIGINAL قومیں آباد ہیں - ایک قوم کا نام ساورا ہے - ان کی اپنی ایک خاص تہذیب اور زبان ہے - ۱۹۴۶ء میں ایک انگریز ادیب ساورا زبان کی ڈکشنری مرتب کر رہے تھے - وہ کئی برس سے ساورا قوم کے جنگلات ہی میں مقیم تھے - یہاں کے دوسرے بیرونی باشندوں میں چند بنیے تھے جو وہاں کی خود رو بھنگ اور کیوڑے کی تجارت کیا کرتے تھے - ایک ہسپانوی مشنری تھے جو تیس برس سے عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھے - اور پھر یکایک یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ ساورا دیس میں ایک مولوی صاحب بھی جا پہنچے ہیں - اب یہ اضطراب پیدا ہوا کہ کہیں ساورا قوم میں اسلام کی تبلیغ بھی شروع نہ ہو جائے - چنانچہ اڑیسا گورنمنٹ کے حکم سے پولیس کا ایک دستہ ساورا دیس گیا اور اپنی نگرانی میں اُن مولوی صاحب کو گھیر گھار کر کٹک لے آیا - جب وہ صوبائی دارالحکومت میں پہنچے تو اپنے بابائے اردو نکلے -

اڑیسا میں مسلمانوں کی آبادی ڈیڑھ یا دو فی صد سے زیادہ نہ تھی - لیکن ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ شہری گھرانوں میں اردو بولنے کا رواج تھا - چنانچہ جب بابائے اردو پولیس کی حفاظت میں کٹک تشریف لائے تو مسلمان اہالیانِ شہر نے لگے ہاتھوں مسلم مڈل اسکول کے احاطے میں ایک جلسہ کر ڈالا - کانگریس کی حکومت کا زمانہ تھا - کسی مسلمان افسر کا مسلمانوں کے بے ضرر جلسوں تک میں شریک ہونا شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا - لیکن میں صرف اس شوق میں نظر بچا کر وہاں پہنچا کہ اُن مولوی صاحب کو بھی ایک جھلک دیکھوں جو سی - آئی - ڈی کی اطلاعات کی رُو سے ساورا قوم کے دُور افتادہ اور دشوار گزار جنگلوں میں اشاعتِ اسلام کی غرض سے پہنچے ہوئے تھے - لیکن جب مولوی صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو یہ عقدہ کھلا کہ آپ وہاں آئے تو ضرور تبلیغ کے لیے تھے لیکن اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں بلکہ اردو کی تبلیغ کے لیے -

اپنی تقریر میں بابائے اردو نے اڑیسا کی کانگریسی حکومت کو بڑے آڑے ہاتھوں لیا - آپ نے فرمایا کہ کوئی غیر ملکی مشنری تیس برس سے وہاں عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہو تو کانگریس کے سرکاری دھرم پر کوئی آنچ نہیں آتی - لیکن اگر ایک مسلمان

ٹوپی اور شیروانی پہن کر اس طرف آنکلے تو کانگرس کے ایوانِ حکومت میں زلزلہ آجاتا ہے اور " لحوقِ ضرر " کا احتمال انھیں قدم قدم پر ستانے لگتا ہے ۔

" لحوقِ ضرر " کی ترکیب مولوی صاحب نے خود اپنی تقریر میں استعمال کی تھی ۔ لیکن سی ۔ آئی ۔ ڈی کا جو نمائندہ جلسے کی کارروائی لکھ رہا تھا وہ غالباً لحوق کو حلق کی جمع اور ضرر کو زر کا کوئی صیغۂ کبیرہ سمجھا اور اس نے اپنی رپورٹ میں یہ اطلاع دی کہ " اردو مولوی صاحب مسلمانوں کو زر کا لالچ دے کر گلا کاٹنے پر اکسا رہے ہیں "

کلکتے کے اس جلسے میں مجھے پہلی بار بابائے اردو کی زیارت نصیب ہوئی تھی ۔ کوئی بارہ برس بعد ۱۹۵۸ء کے شروع میں ایک روز اچانک آپ ابنِ انشا کے ساتھ میرے غریب خانے پر تشریف لے آئے ۔ مجھے مسرت بھی ہوئی ، حیرت بھی ، اور شدید ندامت بھی ۔ کیونکہ انجمن کے جو مصائب آپ نے بیان فرمائے وہ بے حد الم ناک اور حوصلہ شکن تھے ۔

چند روز کے بعد میں بابائے اردو کو باری باری اس وقت کے وزیرِ اعظم اور صدرِ مملکت کی خدمت میں لے گیا ۔ ان میں سے ایک نے تو بڑی بے تکلفی سے پہلے یہ پوچھا کہ آپ کس مسجد کی امامت فرماتے ہیں ؟ اس کے بعد انھوں نے مولوی صاحب مرحوم کی باتیں بڑے غور سے سنیں ۔ ہمدردی کا اظہار کیا ، لیکن جو فیصلہ صادر فرمایا اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ انجمن سازی مسلمانوں کا قدیمی پیشہ ہے ۔ انجمنوں میں اندرونی تنازعات بھی مسلمانوں ہی کا طرۂ امتیاز ہیں ۔ پاکستان کی گلی گلی میں ایک چھوڑ دو دو تین تین انجمنیں چل رہی ہیں ۔ اب اگر حکومتِ عالیہ ان انجمنوں کے داخلی معاملات میں الجھ جائے تو پھر ملک کا کاروبار کون چلائے گا ؟

بابائے اردو مایوس ہو کر اپنے اسی حجرے میں جا بیٹھے جہاں تک پہنچنے کے لیے انھیں نوّے برس کی عمر میں اسّی پچاسی سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں ۔ آپ کے کمرے میں گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی کا معقول انتظام رہتا تھا ۔ یہاں آپ کبھی بجلی کے بغیر ، کبھی پانی کے بغیر اور اکثر پیسے کے بغیر اپنے علمی و ادبی کام میں حسبِ سابق معروف ہو گئے ۔ اور باہر ارا کینِ حکومت ملک کے کاروبار کو کچھ ایسی چابکدستی سے چلاتے رہے کہ چند ہی مہینوں میں ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ۱۹۵۸ء کا انقلاب آگیا ۔

انقلاب کے بعد ایک روز بابائے اردو صدر ایوب سے ملنے آئے ۔ صدر نے انجمن کی داستانِ مصائب کو غور سے سنا اور یک دم چپ ہو گئے ۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا " مولوی صاحب تو اردو کے قائدِ اعظم ہوئے نا ۔ انھیں انجمن سے بے دخل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ پاکستان بن جانے کے بعد قائدِ اعظم کو دیس نکالا دے کر کسی اور ملک میں بھیج دیا جاتا "

چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مارشل لا ریگولیشن تیار ہو گیا اور راتوں رات انجمن کا بابا از سرِ نو انجمن میں آگیا ۔

کچھ کم دو برس بعد جب بابائے اردو بیمار ہوئے تو صدر ایوب نے مری بلوا کر انھیں اپنے ذاتی معالج کی زیرِ نگرانی فوجی ہسپتال میں داخل کروا دیا ۔ ہر دوسرے تیسرے روز صدر خود ان کی عیادت کو جاتے رہے ۔ اور جب ہسپتال کے ڈاکٹروں نے باہمی مشورے کے بعد صدرِ مملکت کو اطلاع دی کہ ہر انسانی کوشش کے باوجود قانونِ فطرت نافذ ہوا چاہتا ہے اور مولوی صاحب کا جہادِ زندگی اردو کے شہید کو پاکستان کا غازی بنانے ہی والا ہے تو جلد سے جلد انھیں کراچی واپس بھیجنے

کا بندوبست کیا گیا تاکہ انجمن کی امانت بعین حیات انجمن تک پہنچ جائے ۔

بابائے اردو کی وفات ذاتی، صفاتی اور اجتماعی طور پر ایک سانحۂ عظیم تھی ۔

ذاتی طور پر وہ مسلمانوں کی اس نشاۃِ ثانیہ کی آخری شمع تھے جو سرسید کے ہاتھوں فروزاں ہوئی اور حالی، شبلی، اقبال اور قائداعظم کے چراغ سے چراغ جلاکر حصولِ پاکستان کی شاہراہ کو منور کرتی گئی ۔

جب یہ آخری شمع بھی بجھ گئی تو اس برصغیر میں مسلمانوں کی علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کی ایک پوری صدی ماضی کے دھندلکے میں گم ہو گئی ۔

صفاتی طور پر بابائے اردو ان درخشاں روایات کا جیتا جاگتا مرقع تھے جن میں ہر ذاتی آرام، مفاد اور خواہش خدمت کے جنون، کام کی لگن اور دیانتداری کی دھن پر قربان ہو جاتی ہے ۔ ایک انسان میں یہ صفات صدیوں کے بعد یکجا ہوتی ہیں اور یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم نے ایک ایسے انسان کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔

ہماری دوسری خوش نصیبی یہ ہے کہ بابائے اردو کی وفات کے بعد انجمن ترقی اردو کی انتظامیہ میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پُر کرنے کے لیے صدر ایوب نے اپنے قابل ترین اور معتمد ترین رفیق، جناب اختر حسین کو نامزد کیا اور جمیل الدین عالی جیسے انتھک اور مخلص کارکن کو انجمن کا سکریٹری مقرر کیا ۔

پاکستان کے نظم و نسق، اور تعمیر و ترقی میں اختر حسین صاحب کا جو حصہ ہے اس کے پیش نظر وہ ریٹائر ہونے کے بعد اپنا وقت اور اپنا تجربہ بڑے مہنگے داموں فروخت کر سکتے تھے ۔ لیکن جیسا کہ ابن انشا نے اپنے خوبصورت انداز میں اشتہار دے دیا ہے وقت اور تجربہ بیچنے کی جگہ اختر حسین صاحب نے اردو کالج کے لیے اینٹوں کا بیوپار شروع کر دیا ہے ۔

اردو محاورے میں اب تک اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا رواج رہا ہے ۔ آج ہم یہاں اردو کی ٹکسال میں بیٹھے ہیں کیوں نہ اب اس محاورے کی صورت بدل کر اینٹ کا جواب روپے سے دینے کی طرح ڈالی جائے ۔ پیش ازاں کہ یہ اینٹیں کسی ذخیرہ اندوز کے ہاتھ میں پڑ کر بلیک میں بکنے لگیں، میں اپنے سارے خاندان کے لیے اردو کالج کی اینٹوں کی رسد جمع کر لینا چاہتا ہوں ۔ اب یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اس ڈھاک میں فقط تین پات ہیں ۔ یعنی یہ خاندان صرف تین افراد پر مشتمل ہے ۔ میری ان تین اینٹوں سے بظاہر کالج کی عمارت میں زیادہ فرق نہ پڑے گا ۔ لیکن میں انھیں اپنے لیے سعادت کا سامان سمجھتا ہوں ۔ اور یوں بھی یہ اتنی بڑی بڑی بلند و بالا عمارتیں جو آپ جگہ بہ جگہ دیکھتے ہیں، آخر دو دو، تین تین اینٹوں کا مجموعہ ہی تو ہیں ۔

۱۰ر اگست ۱۹۶۸ء

قواے طبیعیہ انسان کی فطری قوتوں اور ان کے وظائف و حرکات پر یونانی فلاسفہ ارسطو، جالینوس بقراط وغیرہ کی آرا کا خلاصہ اور ان پر تبصرہ ۔ قیمت :۔ دو روپے ۲۵ پیسے
ڈاکٹر صادق حسین ۔
انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

زیرِ تعمیر اُردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیرِ تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ تین لاکھ انتالیس ہزار پانچسو چوّن روپے (۰۰،۵۵۴،۳۹،۳ روپے جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ مہینے میں جو رقوم موصول ہوئیں ان کی تفصیل یہ ہے

عطیات

جناب اختر حسین صاحب (ہلال پاکستان) صدر انجمن ترقی اُردو	دو ہزار سات سو روپے

بذریعہ فروخت رسائد

۱۔ ڈپٹی کمشنر کراچی	دو ہزار تین سو بانوے روپے
۲۔ ایم مظفر احمد صاحب ایڈیشنل ڈائرکٹر آف انڈسٹریز۔ کراچی	ایک ہزار آٹھ سو پانچ روپے
۳۔ خلیل اللہ صاحب وائس پرنسپل اردو کالج	پانچسو روپے
۴۔ کیپٹن محمد اکرام الرحمٰن سینئر وائس پرنسپل اردو کالج۔	تین سو روپے
۵۔ چند گمنام معطیان ۔	پچاس روپے

اینٹوں پر نام کندہ کرانے والوں کے عطیات

۱۔ علاؤ الدین خالد صاحب۔ کراچی	ایک ہزار روپے
۲۔ بیگم صاحبہ جناب جمیل الدین عالی صاحب کراچی	سو روپے
۳۔ فضل احمد صاحب کراچی	سو روپے
۴۔ ونگ کمانڈر امیر احمد صاحب کراچی	سو روپے
۵۔ جناب۔ قدرت اللہ شہاب	پچھتر روپے
۶۔ محمد احمد صدیقی صاحب۔ کراچی	پچیس روپے
۷۔ ابن الحسن صاحب کراچی	پچیس روپے
۸۔ ہمایوں اختر عادل صاحب کراچی	پچیس روپے
۹۔ سید اقبال حسین صاحب کراچی	پچیس روپے
۱۰۔ اطہر حسین صاحب۔ کراچی	پچیس روپے
۱۱۔ سیٹھ ایم۔ یوسف صاحب کراچی	پچیس روپے
۱۲۔ جلیل احمد قدوائی صاحب کراچی۔	پچیس روپے
۱۳۔ اقبال نعیم پاشا صاحب کراچی	پچیس روپے
۱۴۔ حاجی شمس النبی صاحب لاہور	پچیس روپے
۱۵۔ حاجی مقصود الرحمٰن لاہور	پچیس روپے
۱۶۔ کیپٹن ظفر علیم صاحب۔ جہلم	پچیس روپے
۱۷۔ شمشاد عالم صاحب جہلم	پچیس روپے
۱۸۔ کیپٹن محمد اکرام الرحمٰن سینئر وائس پرنسپل اردو کالج	پچیس روپے
۱۹۔ سید غلام یزدانی مینجر یونائیٹڈ بنک	پچیس روپے
۲۰۔ حبیب الرحمٰن صاحب	پچیس روپے

مولوی عبدالحق کا مشن

پروفیسر ممتاز حسین

صاحب جو یہ طرزِ تخاطب میرا نہیں بلکہ مولوی صاحب کا ہے۔ اس ایک لفظ کے استعمال سے میں تھوڑی دیر کے لیے ان کی یاد تازہ کرلینا چاہتا ہوں۔ جب میں انجمن کے احاطے میں داخل ہوتا ہوں تو یہ احساس گزرتا ہے جیسے مولوی صاحب زندہ ہیں کیونکہ ان کی انجمن کا دفتر، ان کا کتب خانۂ خاص اور اردو کالج سب بدستور اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ اور کام بھی کر رہے ہیں۔ لیکن جب گھوم پھر کر میری نظر اس میز پر پڑتی ہے جہاں مولوی صاحب بیٹھے ہوئے مطالعہ کیا کرتے یا کچھ لکھتے ہوتے تو وہ احساس زائل ہو جاتا ہے اور میں اس سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے کہ ان کی جگہ خالی ہے۔ کیوں نہیں مولوی صاحب نے اپنی زندگی میں کوئی ایسی ٹیم کام کرنے والوں کی تیار کی جو ان کی موت کے بعد ان کے علمی کاموں کو سنبھال لیتی۔ کوئی ٹیم نہ سہی، ایک آدھ شخصیت ہی ایسی ہوتی جو صحیح معنوں میں ان کی خوبیوں کی نمایندگی کرتی۔ مجھے اس کا کوئی معقول جواب نہیں ملتا ہے۔ کبھی میرا ذہن اس بات کی طرف بھٹکتا ہے کہ مولوی صاحب پر وہ دور ہی ختم ہو گیا جس کی وہ نمایندگی کرتے تھے تو کبھی اس طرف کہ مولوی صاحب ایک ایسے چھتنار درخت کے مانند تھے جس کے سایے میں تو سبھی دم لیتے ہیں لیکن اس کے نیچے کوئی شے پھلتی پھولتی نہیں ہے، اور کبھی یہ احساس غالب آجاتا ہے کہ مولوی صاحب نے تو اپنے گرد بہت سے لوگ جمع کیے لیکن جب وہ سب کے سب داغِ مفارقت دے گئے تو اس کے لیے دائرۂ انتخاب بہت تنگ ہو گیا۔ اس وقت ایسے ہی لوگ ان کے گرد جمع ہوئے جو مولوی صاحب کے کام سے کم اور اپنے پروگرام سے زیادہ سروکار رکھتے تھے۔ مولوی صاحب کی زندگی کے آخری دنوں کا المیہ اسی دائرۂ انتخاب کی تنگی سے وجود میں آیا۔ آزادی مولوی صاحب کی فطرت کا خاصہ تھا اور وہ اس کا تحفظ بڑی بے جگری سے کرتے، اسی کے ساتھ ساتھ ان میں بغاوت کا بھی جذبہ تھا، ہر اس شے سے جو عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اترتی۔ جو مردہ، بے جان مصنوعی اور جھوٹی ہوتی۔ یہ بغاوت انھیں وراثتاً سرسید کی اس تحریک سے ملی تھی جسے عقلیت کا نام دیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کے دورِ ابتلا میں جو لوگ ان کے گرد جمع ہوئے وہ ان کی اس روشن خیالی سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ اس ناہم آہنگی اور ذاتی اغراض و مقاصد کی ریشہ دوانیوں نے ایک ایسی جنگ کی صورت اختیار کرلی کہ اگر اس نازک موقعے پر آج کے جلسے کے مہمانِ خصوصی

قدرت اللہ شہاب ان کی دستگیری نہ کرتے تو نہ تو مولوی صاحب کی عمرِ مستعار کے آخری چند سال عزت آبرو کے ساتھ کٹتے اور نہ یہ انجمن اور یہ کالج قایم رہتے۔ پھر میں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ پاکستان رائٹرس گلڈ کی پہلی کانفرنس میں مولوی عبدالحق کرسی صدارت پر اور سربراہ مملکت سامعین کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور مولوی صاحب یہ حکم صادر کر رہے ہیں کہ آج کے دن ابھی ابھی غروب آفتاب سے پہلے یہ حکم نامہ نکلنا چاہیئے کہ انگریزی زبان کی حاکمیت اس دیار سے ختم کی جاتی ہے۔

حضرات یہ نازبرداریاں ان کی خدمات کے اعتراف میں تھیں۔ مولوی صاحب ایک عظیم شخصیت کے حامل تھے۔ اردو ہندی کے جھگڑے میں اردو کی حمایت سے متعلق ان کی جو خدمات ہیں وہ ایک طرف اردو زبان اور ادب پر ان کے بے شمار احسانات ہیں۔ انھوں نے ہمارے لیے جہاں اردو ادب کا ماضی وسیع تر کیا وہاں اس کے مستقبل کو بھی روشن کیا۔ یہ دونوں کام ایک ہی شخص شاذو نادر ہی کیا کرتا ہے۔ یوں تو بنیادی حیثیت سے مولوی صاحب ایک محقق، مبصر، ماہر لسانیات اور زبان کے مورخ تھے لیکن اپنی ہمہ گیر شخصیت کے اثرات میں ایک مفکر اور رہنما بھی تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ مولوی صاحب کا سارا کارنامہ صرف تحقیق تھا۔ وہ زبان کے استعمال میں ایک فنکار بھی تھے۔ اردو نثر کے جدید اسلوب کو جو حقائق روزمرہ کا ترجمان ہے اس کو پروان چڑھانے اور سادگی کو پرکاری کا درجہ دینے میں ان کی نثر کو بہت بڑا دخل ہے۔ ہر لفظ ان کے ہاں جچا تلا اور خیال کا حامل ہوتا۔ ٹھوس سے ٹھوس موضوع کو اس طرح بیان کرتے کہ اس کے سمجھنے میں نہ تو دشواری ہوتی اور نہ اکتاہٹ۔ یہ موقع نہیں کہ میں ان کے سارے علمی اور تحقیقی کارناموں پر روشنی ڈالوں۔ آج کے دن تو میں صرف ان کے مشن کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ میری قومیت اردو ہے اس سے ان کی اردو پرستی کے جذبے کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے اس کے باوجود مولوی صاحب کا مشن یہ نہ تھا کہ پاکستان کی ساری زبانوں کو یا کسی ایک یا چند زبانوں کو مغلوب کرکے اردو زبان کو آگے بڑھایا جائے۔ جس سال سردار عبدالرب نشتر مرحوم کی صدارت میں اردو کانفرنس انجمن کے احاطے میں منعقد ہوئی ہے اس سال کی کانفرنس میں مولوی صاحب کے منشا سے ایک قرارداد اس مضمون کی کھلے اجلاس میں منظور کی گئی کہ اردو کی ترقی علاقائی زبانوں کی ترقی کے منافی نہیں ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کو بھی ترقی دینی چاہیئے۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب پر لسانی جارحیت کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اس سلسلے میں کچھ فروگزاشتیں ہوئی ہیں تو اس کے ذمہ دار مولوی صاحب کم اور اردو کے بعض نادان دوست زیادہ تھے، مولوی صاحب کا موقف کبھی بھی یہ نہ تھا کہ پاکستان کی کسی زبان کو دبایا جائے بلکہ یہ تھا کہ اردو کی تاریخی اہمیت جتائی جائے اور پاکستان کے لوگوں میں بہ رضا و رغبت اسے مقبول بنانے کی کوشش کی جائے۔ مولوی صاحب کے اس عمل اور جارحانہ عمل میں بڑا فرق ہے۔ جس طرح کسی بھی مذہب کے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تلقین بغیر کسی تشدد اور جبر کے کریں اسی طرح کسی بھی زبان کے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زبان کی ترقی و اشاعت بغیر جبر و تشدد کے کریں۔ اگر مولوی صاحب نے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے اردو کی تاریخی اہمیت کو پسندیدہ طریقے سے پیش کیا اور اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا تو انھوں نے اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کیا جہاں تک اردو کی تاریخی

اہمیت کا تعلق ہے اسے ہر مورخ تسلیم کرتا ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے جغرافیائی ماحول میں مسلمانوں کے تہذیبی عناصر کی جس قدر بھرپور نمائندگی اردو زبان کرتی ہے کوئی اور زبان برصغیر کی نہیں کرتی ہے۔ اور یہ بھی ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ اردو کئی سو سال سے برصغیر ہند و پاک میں ایک لنگوا فرینکا کی خدمت انجام دیتی رہی ہے اور اس کا یہ عمل ابھی تک جاری و ساری ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں، بالخصوص اس وقت جب کہ قائداعظم نے جن کی مادری زبان گجراتی تھی، اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دیا۔ مولوی صاحب کے جوش و خروش کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ یہ مانا کہ کسی شے کے حاصل کرنے کے بعد حالات بدل جاتے ہیں نئی قوتیں ابھر آتی ہیں۔ اور وہ پرانے حالات کو منقلب کر لیتی ہیں۔ اور مولوی صاحب نے قیام پاکستان کے بعد کے ان بدلتے ہوئے حالات کا صحیح طور سے جائزہ نہیں لیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخ کی کوئی اہمیت نہیں۔ اردو آج بھی قومی اتحاد کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ معاملہ زبان کے مسئلے کو سلجھانے اور مختلف زبانوں کے درمیان ایک ربط پیدا کرنے کا ہے کیونکہ اتفاقاً یہ ساری زبانیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ بسا اوقات سیاسی اور اقتصادی اسباب زبان کے مسئلے کو حل کرنے میں اس قدر زیادہ حائل ہو جاتے ہیں، کہ کسی لفظ کے تلفظ کا معمولی سا فرق بھی بہت بڑا نظر آنے لگتا ہے اس وقت اتحاد اور یگانگی کے سارے رشتے ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں، سیاسی جذبے کی زد میں زبان کا مسئلہ حل نہیں ہوا کرتا ہے۔ اس موقع پر، سیاسی اور اقتصادی اسباب سے جدا کر کے اس کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اردو ہندی کے قضیے میں تو ایک بڑا مسئلہ دونوں زبانوں کے تہذیبی اشتراک کا تھا، لیکن یہاں تو اس پر کوئی جھگڑا اٹھتا ہی نہیں ہے پھر ایسا کیوں ہے کہ زبان کا مسئلہ حل نہیں ہو پاتا ہے؟ اس پر ہمارے دانشور غور کریں اور ان سارے عوامل پر بھی غور کریں جو اس مسئلے کو سلجھنے نہیں دیتے۔ جو بات کہ آج متفقہ طور سے سب لوگ تسلیم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان کی حاکمیت نہ صرف اردو اور یہاں کی دوسری زبانوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہے بلکہ قومی اتحاد کی راہ میں بھی رکاوٹ کا باعث ہے جب تک انگریزی زبان کی حاکمیت کا سہارا موجود رہے گا پاکستان کے لوگ اپنی فطری صلاحیت اور قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ پیوند نہ ہو سکیں گے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ مولوی عبدالحق کی سب سے بڑی جدوجہد انگریزی زبان کی حاکمیت کو ختم کرنے کی تھی۔ اور ہمیں اس جدوجہد کو آگے بڑھانا ہے۔ اس سلسلے میں اس چیز کو بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ مولوی صاحب انگریزی زبان کی حاکمیت کے مخالف تھے نہ کہ انگریزی زبان کے۔ وہ سرسید، حالی اور آزاد کے اس خیال سے متفق تھے کہ اب اردو انشا اور ادب کی ترقی یورپی زبانوں کے ادب سے استفادہ کئے بغیر ممکن نہیں چنانچہ یہی سبب ہے کہ وہ اپنی انجمن سے نہ صرف انگریزی بلکہ دوسری زبانوں کے ادب کے بھی ترجمے شائع کراتے۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم انگریزی زبان کی حاکمیت کو بھی تسلیم کر لیں۔ انگریزی زبان کی حاکمیت ہماری غلامی کے دور کا ایک ایسا ورثہ ہے جو ہمیں اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہا ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری تخلیقی قوتیں مجروح ہو رہی ہیں بلکہ ہم میں ایک شدید احساس کمتری بھی برابر بڑھتا جا رہا ہے۔

اور یہ اسی احساس کمتری کے بڑھنے اور تخلیقی قوتوں کے گھٹنے کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے انشا، اور ادب میں مغرب کی نقالی کا رجحان اس قدر زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی ۔ کسی بھی زبان میں تخلیقی قوتیں اس وقت تک راہ نہیں پاتی ہیں جب تک کہ اسی زبان میں سوچا نہ جائے اور اسے ہر شعبۂ حیات میں استعمال نہ کیا جائے زبان کا جوہر استعمال سے کھلتا ہے اور اس میں نئے سے نئے اسالیب ضرورت کے تحت جنم لیتے ہیں ۔ انگریزی زبان کی حاکمیت ہماری ان ساری تخلیقی قوتوں کو دبائے ہوئے ہے ۔ چنانچہ مولوی عبدالحق کے مشن کا ایک جزو تو یہ ہے کہ انگریزی زبان کی حاکمیت کے خلاف جد و جہد کی جائے ۔ ان کے مشن کا دوسرا جزو یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کو ترقی دی جائے کسی بھی ایسے ملک میں جو کثیر اللسان ہو وہاں کی کوئی بھی زبان اس وقت تک ملک گیر وقار حاصل نہیں کرتی ہے جب تک کہ وہ اس ملک کی ساری تہذیبی اور تمدنی ضرورتوں کو پورا نہ کرے ۔ مثل مشہور ہے کہ کام پیارا ہوتا ہے نہ کہ چام ۔ ہم اردو کو صرف اس کے شاندار ماضی کے سہارے ان لوگوں کے درمیان مقبول نہیں بنا سکتے ہیں جن کی مادری زبان اردو کے علاوہ کچھ اور ہے وہ تو صرف اس کے عملی فوائد ہی سے متاثر ہوں گے ۔ اگر اردو ان کے ذہن کو وسعت فکر عطا کرتی ہے، ان کے مسائل کا تشخص کرتی ہے، ان کو قوت گویائی بخشتی ہے اور انھیں آزادی کی اعلیٰ ترین سطحوں پر لے جاتی ہے تو وہ اردو کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھیں گے ورنہ وہ اس سے بے تعلق رہیں گے ۔ ہماری اردو صحافت نے اس سلسلے میں بڑی خدمت انجام دی ہے ۔ اور مجھے قوی امید ہے کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب انگریزی اخبار صرف غیر ملکی باشندوں اور بین الاقوامی ضروریات کے لیے نکلا کریں گے ۔ لیکن یہ ترقی ابھی صرف صحافت ہی تک محدود ہے ۔ اعلیٰ نثری تخلیقات کا بڑا قحط ہے ۔ میری مراد ایسی نثری تخلیقات سے ہے جو عالمی ادب کی صف میں برائے مسابقت پیش کیے جانے کے لائق ہوں ۔ یہ کام ہمارے ادیبوں اور دانشوروں کے لیے ایک چیلنج ہے ۔ رسل و رسائل کے جدید ترین ذرائع کے مہیا ہونے اور روز افزوں اور بین الاقوامی تہذیبی تعلقات کے پیش نظر آج ہم ایک عالمی تہذیب اور عالمی ادب کے دور میں بھی ہیں ۔

شکم تو معمولی غذا گوارا بھی کر لیتا ہے لیکن ذہن ہمیشہ اچھی ہی غذا کی تلاش میں رہتا ہے ۔ مغرب کی طرف ذہنی جھکاؤ جس سے انگریزی زبان کی حاکمیت کو تقویت ملتی ہے اس کا سدباب صرف ماضی کی یادآوری سے نہیں کیا جا سکتا ہے، اس کے لیے عصر جدید کی مسیحائی کی حامل اعلیٰ روحانی غذا بھی درکار ہے ۔ اگر ہم واقعۃً اردو سے محبت کرتے ہیں تو ہمیں اس چیلنج کو بھی قبول کرنا چاہیے ۔

اردو کا قاعدہ
آسان قاعدہ جس سے بچے بہت جلد الفاظ اور جملوں کا لکھنا اور پڑھنا سیکھ جاتے ہیں ۔ قیمت :۔ پچیس ۲۵ پیسے
انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

چند یادیں، چند تاثرات

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

میں عثمانیہ یونیورسٹی کا اصلی بانی مولوی عبدالحق کو سمجھتا ہوں۔ جب حیدر نواز جنگ (سر اکبر حیدری) ایجوکیشن سکریٹری ہوئے تو مولوی عبدالحق نے جو ان کے مزاج میں دخیل تھے، اردو زبان کے ذریعے اعلیٰ تعلیم دینے کی تجویز ان کے روبرو پیش کی۔ حیدر نواز جنگ کی تحریک پر میر عثمان علی خان نظام ریاست حیدرآباد نے اس تجویز کو شرف قبولیت بخشا۔ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ اردو میں اعلیٰ معیار کی علمی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائی جائیں۔ چنانچہ سررشتۂ تالیف ترجمہ جو عام طور پر دارالترجمہ کے نام سے مشہور ہے قائم کیا گیا۔

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک خط میں بتایا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ "آپ پوچھیں گے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ ہوا یہ کہ ایک بار سر اکبر اورنگ آباد آئے اور میں نے ان کی صدارت میں ایک تقریر مروجہ تعلیم اور طریقہ تعلیم پر کی۔ اس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس کا اعتراف خود انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کیا جو انھوں نے اورنگ آباد کے ایک سالانہ جلسے میں کی تھی۔ وہ نورس (کالج کا رسالہ) میں چھپی تھی۔ خیر حیدری صاحب تو آمادہ ہو گئے۔ وہ خود اس کی تحریک نہیں کر سکتے تھے البتہ ان کے سامنے یہ تحریک آئے تو وہ کارروائی کرنے کو تیار تھے۔ ناظم (ڈائرکٹر تعلیمات) کے ذریعے اس تحریک کو پیش کرنا خلاف مصلحت تھا۔ وہ اس کے مخالف تھے۔ اس زمانے میں دارالعلوم کے پرنسپل مولوی حمیدالدین مرحوم تھے۔ انھوں نے میرے متواتر اصرار پر یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ میں نے انھیں ہم خیال بنا لیا اور ان سے کہا کہ آپ بحیثیت پرنسپل دارالعلوم یہ تحریک کیجئے۔ انھوں نے کہا تم لکھ دو، میں دستخط کر دوں گا۔ میں نے ہوم سکریٹری کے نام چند سطریں لکھ کر درخواست پیش کر دی۔ ہوم سکریٹری اس وقت سر اکبر حیدری تھے۔ اب بموجب انگریزی محاورے کے گیند لڑھکنا شروع ہوئی۔ مجھے اورنگ آباد سے اسپیشل ڈیوٹی پر بلایا گیا۔ کام دھیرے دھیرے شروع ہوا۔ عرض داشت جو اعلیٰحضرت کے سامنے منظوری کے لئے پیش کی گئی تھی وہ میری ہی لکھی ہوئی تھی۔

مولوی عبدالحق اپنی ذات سے انجمن تھے۔ وہ علیگڑھ سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آ گئے۔ اور مدرسہ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ مدرسہ سر افسر الملک کے ایما پر ان کے داماد ممتاز یار الدولہ نے خاص طور پر فوجیوں کے بچوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا۔ کچھ عرصے اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہنے کے بعد وہ انسپکٹر آف اسکولز اور پھر ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہو گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد انھیں دارالترجمہ کا ڈائریکٹر (ناظم) مقرر کیا گیا۔ یہاں سے وہ اورنگ آباد کالج کی پرنسپل پر گئے اور مولوی وحیدالدین سلیم کے انتقال

پر عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے صدر شعبہ ہوئے ۔

مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اُردو کے اعزازی سکریٹری مقرر ہوئے۔ یہ انجمن ۱۹۰۱ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کی ایک شاخ کے طور پر قائم ہوئی تھی۔ مولوی صاحب نے انجمن کے بے جان قالب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کی مستعدی انہماک اور سچی لگن نے انجمن کی کمزور بنیادوں کو مضبوط کر دیا۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں سہ ماہی "اردو" نکالنا شروع کیا جو اعلیٰ معیار کا رسالہ تھا اور اب بھی کراچی سے نکلتا ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ اُردو زبان پر تحقیقاتی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ چند سال بعد سہ ماہی رسالہ "سائنس" بھی جاری ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ سائنٹیفک علوم میں اُردو میں مضامین لکھائے جائیں اور اُردو داں لوگوں کو ان علوم سے روشناس کرایا جائے۔

صداقت شعاری مولوی صاحب کا فطری جوہر تھا۔ جس کا اظہار وہ بے باکی سے کرتے تھے۔ اور ایسا کرنے میں کبھی مصلحت کا خیال نہیں کرتے تھے۔ جو لوگ مصلحت کا خیال رکھتے ہیں، انھیں وہ منافق کہتے تھے۔ انکی سیرت کا ایک اور وصف انکی دریا دلی اور فیاضی تھا۔ وہ عزیزوں دوستوں اور طالب علموں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ نادار طلبہ کی وہ بلا امتیاز مذہب و ملت کی کھلے دل سے امداد کرتے تھے۔ دکن میں ایسے طلبہ کی کافی تعداد موجود ہے جن کی انھوں نے امداد کی اور جن میں سے بعض آئندہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ مولوی عبدالحق کی مہمان نوازی اور دستر خوان کی وسعت مشہور تھی۔ بلا مبالغہ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا مہمان ان کے ہاں آتا تھا۔ ان کے دستر خوان پر سادہ اور لذیذ کھانے اور طرح طرح کی مٹھائیاں اور پھل سیر چشمی کے ساتھ صرف ہوتے تھے۔ مولوی صاحب کے کردار کی یہ خصوصیت تھی کہ جس کے موافق ہوتے دل سے موافق ہوتے اور اس کے لئے سب کچھ کرنے کو آمادہ رہتے۔ ان کی مخالفت بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جس کے مخالف ہوتے وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے مخالف ہیں۔ ان کے ہاں درمیانی راستہ اور مصلحت آمیز طرز کار نہ تھا۔ ہمیشہ دو ٹوک بات کرتے تھے۔ لگی لپٹی رکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ ان کی سیرت کا ایک اور نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ ارادے کے پکے اور نہایت مستقل مزاج تھے۔ دشواریوں سے کبھی گھبراتے نہیں تھے۔ بلکہ ان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے۔ شکوہ شکایت اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب نے انجمن ترقی اُردو کا دفتر اورنگ آباد میں رابعہ دورانی کے مقبرے کے پاس جسے بی بی کا روضہ کہتے ہیں، قائم کیا تھا اور وہیں ایک عمارت میں انجمن کا مطبع بھی تھا۔ یہ مقبرہ اورنگ آباد شہر کے ایک سرے پر کوہستانی سلسلے کے قریب واقع ہے۔ جسے تاج محل کے نمونے پر بنایا گیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ تاج محل سنگ مرمر کا ہے اور یہ اینٹ چونے کا۔ میں نے گرمیوں کی کئی چھٹیاں یہاں گذاریں۔ نہایت پر فضا مقام ہے۔ یہ کوہستانی سلسلہ ایلورا اور اجنتا تک چلا گیا ہے۔ کبھی کبھی قریب کے پہاڑوں میں سے تیندوے کے دہاڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں نے ایلورا اور اجنتا کی سیر پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں کی۔ جب مولوی صاحب کے ساتھ انگلش اُردو ڈکشنری پر نظر ثانی کے لئے اورنگ آباد گیا تھا۔ مولوی صاحب کو اورنگ آباد بہت پسند تھا۔ وہ حیدرآباد میں رہتے تھے۔ تب بھی ان کا دل اورنگ آباد میں اٹکا رہتا تھا۔ وہاں کی ہوا اور پانی کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ کہتے تھے جیسی صاف ہوا اورنگ آباد کے کوہستانوں میں ہے ایسی ہندستان بھر میں کہیں نہیں ہے۔

اورنگ آباد میں مولوی عبدالحق کے معمولات یہ تھے۔ وہ صبح اندھیرے منہ پو پھٹنے سے پہلے پہاڑوں کی سیر کو نکل جاتے تھے۔

ٹے بھر کی سیر کے بعد آکر نہاتے، ناشتہ کرتے اور پھر کام پر بیٹھ جاتے، جس کا سلسلہ ایک بجے اور کبھی ڈیڑھ بجے تک چلتا تھا۔ دوپہر کے کھانے بعد قیلولہ کرتے۔ لیٹے لیٹے حقہ پیتے اور کتاب پڑھتے جاتے۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے چائے پیتے، اور اس کے کچھ دیر بعد پھر کام شروع جاتا ہے چائے کے ساتھ نمکین، خشک میوہ اور مٹھائیاں ہوتیں۔ دہلی کا سوہن حلوہ اور حبشی حلوہ بہت پسند تھا۔ چائے پر التزام کے ساتھ یہ وں حلوے موجود ہوتے۔ لیکن وہ خود بہت تھوڑا کھاتے تھے۔ ان کی پارسلیں دہلی کے شاہی حلوائی کے ہاں سے برابر آتی رہتی تھیں۔ ہال میں نے کی بڑی میز بچھی تھی جس کے اردگرد سب لوگ جو ڈکشنری کی نظر ثانی میں شریک تھے، بیٹھتے تھے اور کوئی شخص مغرب سے پہلے اپنی جگہ سے ں ہلتا تھا۔ مولوی صاحب کا ملازم رستم تھوڑے تھوڑے وقفے سے حقہ بھر کر لاتا اور ان کے قریب رکھ دیتا۔ مولوی صاحب حقے کے لئے نؤ سے نہایت عمدہ قسم کا تمباکو منگاتے تھے جس کی خوشبو سے سارا ہال مہک جاتا تھا۔ میں خود حقہ نہیں پیتا تھا۔ لیکن مجھے تمباکو کی خوشبو ی لگتی تھی۔ مولوی صاحب مالوے سے بھی تمباکو منگاتے تھے اور اس کی تعریف کرتے تھے کہتے تھے کہ لکھنؤ کی تمباکو کے مقابلے میں وے کی تمباکو تیز ہوتی ہے، اس میں لطافت پیدا کرنے کے لئے بعض اجزا اپنے ہاں اس میں ملواتے تھے۔ مولوی صاحب کا حقے کا اہتمام ے کھانے کے اہتمام سے کم نہ تھا۔ ان کے حقے کی گڑگڑاہٹ سے بعض دفعہ موسیقی کا زیر و بم پیدا ہو جاتا تھا۔ صبح کے ناشتے اور سہ پہر کی ے کے علاوہ رات کا کھانا کھاتے تھے۔ میں نے انہیں دوپہر میں کبھی کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ دوپہر میں سنگترے کے عرق کا ایک گلاس یتے تھے۔ اور اس کے ساتھ کچھ پھل کھا لیتے تھے۔ اورنگ آباد اور جالندھر کے سنگترے بہت پسند تھے۔ کہتے تھے کہ یہ ناگپور کے سنگتروں سے ہتر ہیں۔ اس لئے کہ ان میں لطیف چاشنی ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق اردو زبان کے عاشق تھے۔ ان کی ساری عمر اسے بنانے سنوارنے اور اس کی خدمت میں صرف ہوئی۔ اپنی طویل عمر ی بدولت انھوں نے سید احمد خاں، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی جیسے بزرگوں کا زمانہ بھی دیکھا اور بعد میں خوردوں کا زمانہ بھی دیکھا زرگوں کی روحانی تاثیر اور فیضان سے انھوں نے اپنی زندگی کا ڈول ڈالا۔ میں ان سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ملا تھا۔ اس وقت ن کی داڑھی کھچڑی تھی۔ کئی لوگوں نے کہا کہ وہ دہلی کی دسمبر کی سردی میں بھی ٹھنڈے باسی پانی سے نہاتے ہیں۔ اس پر مجھے تعجب ہوا۔ پھر جب ن سے ۱۹۳۰ء میں میری ملاقات ہوئی تو ان کی داڑھی میں سفید بال کالے بالوں پر غلبہ پا چکے تھے۔ پھر چند سال بعد کالے بال اکا دکا رہ گئے۔ خر میں ان کی داڑھی برف کی طرح سفید بھک ہو گئی۔ مولوی عبدالحق کی شخصیت ان کی گول سفید براق داڑھی کے ساتھ کم و بیش ۲۵ سال تک یسی وابستہ رہی کہ اس کے بغیر ان کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔ وہ لوگ جن کی عمر اب پچاس سے تجاوز ہے انھوں نے مولوی صاحب کو ہمیشہ بوڑھا ہی دیکھا۔ یہ مشہور تھا کہ شہر اورنگ آباد کے دو بڑے اونچے پلے کے عاشق ہوئے ہیں اور وہ دونوں بوڑھے تھے، ایک اورنگ زیب دوسرے مولوی عبدالحق۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں بوڑھے اورنگ آباد پر جان چھڑکتے تھے۔ اس لئے کہ شہر اورنگ آباد ان مقاصد کے حصول میں ممد و معاون تھا جو دونوں کے پیش نظر تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ دونوں بوڑھے تھے۔ لیکن جب انھوں نے اورنگ آباد سے عشق شروع کیا۔ اس وقت وہ بوڑھے نہ تھے۔ اورنگ زیب ادھیڑ عمر کا تھا اور مولوی عبدالحق نوجوان تھے اور جوان بھی ایسے کہ انھوں نے صرف اردو زبان سے اپنا ناتا جوڑا اور پھر یکہ و تنہا رہے۔ چونکہ دونوں نے بڑی عمر پائی۔ اس لئے ان کے دور کے جوانوں کے نزدیک ان کی

شخصیتیں بڑھاپے کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ جیسے وہ کبھی جوان رہے ہی نہ ہوں۔ اگر کوئی اورنگ زیب یا مولوی عبدالحق کی جوانی کی تصویر دیکھے تو لوگ تعجب کرتے ہیں کہ یہ معمول سے ہٹ کر ہے۔ اورنگ زیب کی طرح مولوی عبدالحق کی جواں ہمتی پر بھی بڑھاپے کا کوئی اثر نہ ہوا آخر تک ان کی قوت ارادی نے طبعی انحطاط و ضعف کے سامنے جھکنے سے انکار کیا۔ مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی ترویج اور بقا کے لئے جب مجاہدہ شروع کیا تو اس وقت ان کی عمر ۶۵ کے لگ بھگ تھی۔

مولوی صاحب نے اردو کے شبینہ مدارس قائم کرنے کی جو مہم شروع کی تھی اس کے سلسلے میں سارے ملک کا دورہ کیا اور بڑھاپے میں سفر کی صعوبتیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر کسی کو اپنے مقصد کی لگن اور انہماک اور محویت ہو تو اس کے حصول میں جو تکلیف اور زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ مولوی صاحب کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اپنے کام کے آگے نہ وہ تھکاوٹ کو مانتے تھے، اور نہ عمر کے طبعی تقاضوں کو جو ان کے نزدیک بے حقیقت تھے۔ ان کیلئے صرف ایک حقیقت تھی اور وہ تھی اردو کی خدمت۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں گرمیوں کی چھٹی ہو چکی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "جنوبی ہند کے دورے پر اگر میرے ساتھ چلتے ہو تو چلو" میں تیار ہو گیا۔ یہ ان کا بڑا طوفانی دورہ تھا۔ شروع میں اوٹی میں پروفیسر اسپیٹ کے ساتھ دو ہفتے ٹھہرے۔ اسپیٹ مولوی صاحب کے پرانے دوست تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ ملازمت ختم ہونے پر اپنی نوجوان اینگلو انڈین بیوی اور بچوں کے ساتھ اوٹی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا وسیع بنگلا نہایت خوش نما جگہ پر تھا۔ مولوی صاحب نے ان کے دو کمرے کرائے پر لے لئے اور کھانے کا اپنا علیحدہ انتظام رکھا۔ ان کا باورچی بشیر ہمارے ساتھ تھا جس کے ہاتھ کا کھانا مولوی صاحب کو بیحد پسند تھا۔ جہاں کہیں جاتے وہ ضرور ساتھ جاتا تھا۔ اوٹی کے قیام کے دوران میں کوئم بٹور اور آس پاس کے علاقوں میں شبینہ مدارس قائم کئے۔ اس دورے میں جنوبی ہند کے متعدد چھوٹے چھوٹے مواضع اور قصبات میں اردو کے شبینہ مدارس قائم کئے اور مقامی اہل خیر کی مدد سے ان کے اخراجات کا انتظام کیا۔ انجمن نے بھی کچھ تھوڑی بہت مدد دینے کا یقین دلایا۔ مدراس والے افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق سے بڑی مدد ملی۔ انہی کے ذریعہ جنوبی ہند کے مختلف مقامات کے لئے تعارفی خطوط حاصل کئے گئے۔ اس لئے کہ ان سب علاقوں میں مسلمان ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ مولوی صاحب، ڈاکٹر عبدالحق کے بڑے مداح تھے۔ حالانکہ دونوں میں نام اور گول داڑھی کے سوا بظاہر بہت کم چیزیں مشترک تھیں لیکن حقیقت میں ان دونوں کا ذہن ان تہذیبی قدروں کے متعلق صاف تھا۔ جن کا مکمل اظہار اردو زبان کے ذریعے ہوا اس کے علاوہ یہ دونوں دریا دل سیر چشم اور مہمان نواز تھے۔ دونوں مخلص اور دوست پرور تھے۔ مختلف مقامات میں مدارس شبینہ قائم کرنے کے لئے جو جلسے منعقد ہوتے ان میں مولوی صاحب کی فرمائش پر میں نے لوگوں کو مخاطب کیا اور مولوی صاحب کے مشن اور ان کے مقاصد کی تشریح کی۔ دو ایک جگہ خود مولوی صاحب نے بھی تقریر کی۔

مولوی صاحب تقریر کم کرتے تھے۔ لیکن جب کرتے تھے تو بڑی پُر اثر ہوتی تھی۔ اسلئے کہ ان کے اخلاص اور ان کی غیر معمولی جد و جہد کا عکس لوگوں کو صاف نظر آتا تھا۔ اور اکثر اوقات تو بغیر تقریر کے بھی ان کی شخصیت ان کے مقاصد ظاہر کر دیتی تھی۔ جنوبی ہند کے دورے سے مجھے اس بات کا اندازہ ہوا تھا کہ اردو کی بقا اور تحفظ کے لئے مولوی صاحب جو مساعی کر رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے انہیں پیرانہ سالی میں کس قدر

زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے یہ انھی کا دل گردہ تھا کہ سال دو سال نہیں برسوں اسی طرح وہ ہندوستان کے کونے کونے میں مارے مارے پھرے اور عوام تک اپنا پیغام پہنچایا۔ میں نے محسوس کیا کہ باوجود ان کی عقل پرستی کے ان پر بے خودی کا عالم طاری تھا جس کی وجہ سے انھیں سوا اپنے مقصد کے دوسری چیزوں کی سدھ بدھ باقی نہیں رہی۔ انھوں نے اب تک اپنی زندگی بڑے آرام و آسائش سے گزاری تھی۔ مگر اب انھیں اس کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ شروع میں وہ اپنے باورچی بشیر کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں تنہا سفر کرنے لگے کبھی کوئی کام کرنے والوں میں سے ساتھ ہو گیا تو ہو گیا۔

۱۹۳۹ء میں ناگپور میں بھارتیا ساہتیہ پریشد کا جو اجلاس ہوا اس میں قومی زبان کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کی روداد مولوی صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "اس بھرے شہر میں بھارتیا ساہتیہ پریشد کے اجلاس کے موقع پر گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں سے بڑا معرکہ ہوا۔ وہ ہندی کے حق میں تھے۔ اور میں ہندوستانی کی حمایت میں۔ میں نے بہت کہا۔ آپ ہندوستانی فرمائیے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نے کہا کہ نیشنل کانگریس کا ریزولیشن بھی تو میں نے ہی بنایا تھا۔ اس جلسے میں انڈین نیشنل کانگریس کے تین جیتے جاگتے پریسیڈنٹ موجود تھے جو بت بنے بیٹھے تھے۔ ایک کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا اور کسی نے میری کیا، کانگریس کے ریزولیوشن کی بھی تائید نہ کی۔ آخر میں حضرت مہاتما نے فرمایا میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا، تو میں نے کہا، ہم اردو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم ہندی اتھوا ہندوستانی کے دھوکے میں نہیں آ سکتے۔ ہم لفظوں کو نہیں عمل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

مولوی عبدالحق دل سے اسلامی اصول کی عظمت مانتے تھے۔ ویسے عقلیت پسند تھے اور مذہب کی ظاہری رسوم کی پابندی غیر ضروری سمجھتے تھے اصل میں ان کا مذہب اردو کی خدمت تھا۔ جس کے لئے انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اس کے معیار سے وہ خیر و شر کا حکم لگاتے تھے۔ وہ بات کے دھنی اور وعدے کے سچے تھے۔ اپنی جرأت اور ہمت سے ہر مشکل آسان بنا لیتے تھے۔ ان کا جوش عمل، انہماک، استقلال اور بے باکی سید احمد خاں کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ اور متانت سادگی اور پختگی حالی کی صحبت کا۔ سید احمد خاں کی ہمہ گیر شخصیت نے عمل کے مختلف میدانوں میں اپنی شہسواری کے جوہر دکھلائے لیکن مولوی عبدالحق نے اپنی مساعی کو صرف اردو کی بقا و تحفظ کے لئے محدود رکھا۔ سید احمد خاں کے عمل کی وسعت اور ہمہ گیری کو سراہتے تھے۔ اور انھیں فوق الانسان خیال کرتے تھے جس کا اظہار انھوں نے متعدد مرتبہ میرے سامنے کیا۔ کہتے تھے کہ سید احمد خاں کی ذہنی توانائی اور قوت عمل بے نظیر تھی۔ ایسے لوگ اب نہیں پیدا ہوں گے۔ سید احمد خاں کے بعد وہ سب سے زیادہ حالی کے مداح تھے۔ میں نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ حالی کی مسدس اور ان کی نظموں کی تو تعریف نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان کی غزل ذرا پھیکی ہے۔ انھوں نے نہ صرف میری رائے سے اختلاف کیا بلکہ برا مانا۔ وہ غزل میں بھی حالی کو داغ اور میر مینائی سے بہتر سمجھتے تھے۔ میں ان کی اس رائے سے متفق نہیں تھا لیکن میں نے اس کا ان کے سامنے اظہار نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ اس معاملے میں کچھ سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے فرمانے پر میں نے حالی کی غزلیں بڑے غور سے پڑھیں اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی مولوی صاحب جو کہتے تھے اس میں بڑی حد تک صداقت تھی۔ حالی کے ہاں اعلیٰ درجے کا تغزل موجود تھا۔ مثلاً یہ شعر ـــ

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ پہلی سی درازیِ شبِ ہجراں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ تری کاکلِ پیچاں میں نہیں

مولوی عبدالحق نے اردو زبان و ادب کی خدمت میں اپنی عمر کے ساٹھ سال سے اوپر گزارنے۔ اردو کے قدیم ادب کو پہلی مرتبہ منظرِ عام پر لائے اور اس طرح اردو کی عمر میں اضافہ کیا۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں تنقیدی شعور سمویا اور تنقید میں تحقیق کی صح اور گہرائی پیدا کی۔ اپنے ہم عصروں کے جو سوانحی خاکے انھوں نے کھینچے ہیں ان میں تنقید اور تخلیق ایک دوسرے میں سما گئی ہے۔ ان کے خطبا میں زبان و ادب کے مسائل کے علاوہ سیاسی اور سماجی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی خاص تصانیف یہ ہیں۔ قواعدِ ارد انگریزی، اردو ڈکشنری، چند ہم عصر، مقدمات، عبدالحق، نصرتی، سب رس، مرحوم دہلی کالج، اردو کی پیدائش، اردو نشو و نما م صوفیائے کرام کا کام، مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر۔ برسوں سے اردو زبان کا ایک جامع لغت ترتیب دے رہے تھے۔ جو مکمل نہ ہو س اگر اس کی تکمیل ہو جائے تو اردو زبان کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔

میں نے پوری غیر جانب داری سے مولوی عبدالحق کے کاموں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے یہ ضرور ہے کہ ان کے ذکر کے میرے حافظے میں ایسی یادیں ابھرتی ہیں۔ جن کا جذبات سے تعلق ہے۔ میں انھیں اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ میرے حال پر ان کی ہمیشہ شف اور عنایت رہی۔ میں نے ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا۔ جس کا اعتراف کرنا میں اپنا خیال کرتا ہوں۔ شروع میں تقریباً ایک سا میں ان کے ساتھ رہا۔ جب میں نے علیحدہ مکان کر لئے پرے لیے تو بھی ان سے برابر تعلق قائم رہا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں وہ میری ش میں شرکت کیلئے قائم گنج تشریف لائے تھے۔ وہاں کے سیدھے سادے پٹھانوں سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے اور ان میں سے

کی سد عادت اور سادگی کے متعلق بعد میں بھی ذکر کرتے تھے۔ وہ خود بے ریا اور بے تصنع انسان تھے اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کو پسند کرتے تھے۔ قائم گنج کے بیر اور سرکے کی فرمائش کرتے رہتے تھے۔ جب تک حیدرآباد میں رہے یہ دونوں چیزیں میں قائم گنج سے منگا کر ان کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ کہتے تھے کہ اُرد کی دال کے ساتھ یہ سیر کا خاص مزہ دیتا ہے، سرکے میں بھی لبھیڑے خاص طور پر پسند تھے جو لسوڑے کی قسم کا ایک پھول ہے اور قائم گنج میں کثرت سے ہوتا ہے۔ سرکے میں پڑ کر اس میں خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ویسے ہمارے ہاں سرکے میں آم بھی ڈالتے ہیں۔ مگر ان میں لبھیڑے کا مزہ نہیں آتا۔ آم کے مزے میں وہ سوندھا پن نہیں ہوتا جو سرکے میں پڑے ہوئے لبھیڑے میں ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق کی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول میں گزرا، لیکن انھوں نے نہ اپنی علمی صلاحیتوں کو سلب اور نہ اپنے دماغ کی جودت کو زنگ آلود ہونے دیا۔ انھوں نے انجمن ترقیٔ اردو اور عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعے ان مقاصد کو فروغ دینے کی کوشش کی جو انھیں عزیز تھے۔ یعنی اردو زبان کی ترویج اور اس کا تحفظ انھوں نے اپنے شخصی اثر کو ذاتی فائدے کے بجائے انجمن ترقیٔ اردو کے لئے استعمال کیا اور نامساعد حالات کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ اقبال کی نظم "مردِ بزرگ" کے یہ شعر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھی کے لئے لکھے گئے ہوں۔

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں   ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو   شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں   بات میں سادہ و آزادہ معانی میں رقیق
اس کا اندازِ نظر سارے زمانے سے جدا   اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

مذہب کے معاملے میں مولوی صاحب کا مسلک رواداری تھا۔ اور وہ وسیع مشرب تھے۔ ان کے دوستوں میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ ہوش بلگرامی سے مولوی صاحب کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ انھوں نے اس کا بدلا اس طرح لیا کہ "مشاہدات" میں واقعات کو توڑ مروڑ کے مولوی صاحب پر یہ اتہام لگایا کہ وہ شیعوں کے خلاف تعصب برتتے تھے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ان کے تعلقات شیعہ حضرات سے نہایت درجہ مخلصانہ تھے۔ نواب عماد الملک آخر تک ان کے قدرداں رہے۔ مولوی صاحب ہر معاملے میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف ان کے قدرداں تھے بلکہ انجمن ترقیٔ اردو کے صدر بھی تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر سراج الحسن سے ان کی دانت کاٹی دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ اگر ڈاکٹر سراج الحسن دوسرے تیسرے دن مولوی صاحب سے نہ ملتے تو انھیں چین نہ پڑتا تھا۔ اسی طرح مولوی صاحب ان کے ہاں برابر جاتے رہتے تھے اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی سید علی بلگرامی خواجہ غلام الثقلین نواب مہدی نواز جنگ اور ڈاکٹر سید عابد حسین، ان سب سے ان کے تعلقات مخلصانہ تھے۔ اور یہ سب صاحبان شیعہ تھے۔ پھر ہوش بلگرامی کا یہ دعویٰ کہ مولوی صاحب کے دل میں شیعوں کے خلاف تعصب تھا حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ جس واقعے کا ہوش بلگرامی نے "مشاہدات" (ص ۱۳۵) میں

ذکر کیا ہے۔ وہ میرے سامنے کا ہے۔ ہوا یوں کہ مولوی صاحب نے مہاراجہ کشن پرشاد کی فرمائش پر ان کی دعوت کی جس میں دوسرے معززین بھی مدعو تھے۔ مہاراجہ صاحب صدر اعظم کی حیثیت سے جب بھی اورنگ آباد کے دورے پر جاتے تو مولوی صاحب ان کی بڑی پرتکلف دعوت کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی دعوتوں کے کھانے مہاراجہ بہادر کو بہت مرغوب تھے جب مولوی صاحب حیدرآباد آ گئے تو انھوں نے مہاراجہ بہادر کی کوئی دعوت نہیں کی۔ اس لیے کہ مولوی صاحب کے بنجارا ہل والے مکان میں گنجائش بہت کم تھی۔ لیکن جب مہاراجا نے خود فرمائش کی تو مولوی صاحب نے دعوت کا انتظام کیا۔ اگرچہ مہاراجہ بہادر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مولوی صاحب سر اکبر حیدری کے خاص لوگوں میں ہیں۔ جو اب صدر اعظم تھے۔ لیکن بہ ایں ہمہ ان کے قدیم تعلقات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ مہاراجا کشن پرشاد ہمیشہ ان کے دلی قدردان رہے۔ مہاراجا بہادر کی یہ فرمائش بھی تھی کہ کھانے کے بعد مجرا ہو۔ چنانچہ اس کوچے کے کسی واقف کار کے ذریعے مولوی صاحب نے دو گانے والیوں کو شہر سے بلوایا۔ میں مولوی صاحب کے پاس دعوت شروع ہونے سے آدھ گھنٹے پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ جب کہ ان کے ملازم رستم نے آ کر کہا کہ گانے والیاں آ گئی ہیں۔ انھیں کہاں بٹھاؤں۔ مولوی صاحب نے میرے سامنے فرمایا کہ جس مکان میں شیرو اور بشیر رہتے ہیں اس کے برآمدے میں بٹھا دو۔ چنانچہ رستم نے انھیں وہاں بٹھا دیا۔ یہ چبوترا باورچی خانے کے پیچھے اور اس کمرے کے سامنے تھا۔ جسے ہوش بلگرامی عاشور خانہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کسی زمانے میں یہ عاشور خانہ رہا ہو۔ لیکن اب عرصے سے یہ مولوی صاحب کا مہمان خانہ تھا۔ میں نے خود اصغر گونڈوی اور پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی کو ٹھہرتے دیکھا ہے۔ پنڈت کیفی تو یہاں کم و بیش ایک سال رہے۔ اور کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہوش بلگرامی کا یہ دعوا کہ مولوی صاحب نے گانے والیوں کو ٹھہرانے کے لیے عاشور خانے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ جگہ ان کے لیے موزوں ہو سکتی ہے" صریح بہتان ہے۔ افترا پردازی کو بعض لوگوں نے فن لطیف بنا دیا ہے۔ دراصل ہوش بلگرامی کو مولوی صاحب سے یہ شکایت تھی کہ انھوں نے انھیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ شمالی ہند سے بعض نہایت قابل لوگ دکن آئے۔ جنھوں نے یہاں بڑی خدمات انجام دیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگ بھی آ کر اعلا عہدوں پر فائز ہو گئے۔ جو شمالی ہندوستان میں نائب تحصیل دار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ دراصل انھی کی وجہ سے شمالی ہند والے دکن میں غیر مقبول ہوئے۔ اور اسی سے ملکی تحریک کو فروغ پانے کا موقع ملا۔ جو بالآخر اپنی جائز حدود سے متجاوز ہو گئی۔

اضافیت
ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

سائنس کے مشہور مسئلہ اضافیت پر اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نہایت شگفتہ پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ممتاز سائنس دان ہیں اور مسئلہ اضافیت ان کا خاص موضوع ہے۔ قیمت: تین روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

مردِ جنوں پیشہ

جمیل نقوی

یہ سوچتا ہوں کہ احساس کے اندھیرے میں
جنوں کی شمع نہ جلتی تو زیست کیا ہوتی
شعورِ نغمہ و آہنگ و سوز سے محروم
خرد کے ہاتھ میں اک سازِ بے صدا ہوتی

جنوں کے سوز سے روشن ہے آگہی کا چراغ
نہ ہو یہ سوز تو نقدِ حیات کارِ زبوں
نہ ہو یہ سوز تو ہر شے فسانہ و افسوں!
جنوں کا نام خرد ہو خرد کا نام جنوں

بہت حسین ہیں رنگینیوں کے افسانے
کہ مستعار ہیں رنگ آفریں بہاروں سے
جلو میں جلوۂ صد لالہ زار ہو تو کیا
جنوں کی پیاس تو بجھتی ہے خار زاروں سے

اسی جنوں کے پیمبر تھے مولوی صاحب
اسی جنوں کی حرارت سے گرم و جولاں تھے
نفس نفس میں فروزاں تھی شمعِ اردو کی
اسی کے نور سے تابندہ و درخشاں تھے

ہزار بار روایت کا فسوں ٹوٹا!
مگر وہ رسم کہ جو اُن کے آستاں سے چلی
انھیں قرار میسر نہ تھا کسی پہلو
مثالِ کفر تھی نزدیک اُن کے بے عملی!

جنوں سے اُن کے یہ ثابت [illegible] ملنے پر
جنوں ہی عقل کی کوتاہیوں کا محرم ہے
یہ اور بات کہ تہذیب تو ہے خوردہ فروش
وگرنہ عظمتِ انسانیت مسلّم ہے

انھیں جمیلؔ بہت کچھ دیا زمانے نے!
مگر جنوں کے تقاضوں کا ساتھ دے نہ سکا
وہ اُن کا عزمِ مصمّم وہ اُن کا جوشِ عمل
بقدرِ ظرفِ تمنّا خراج لے نہ سکا

زمانہ دیکھ چکا ہے کہ عشقِ اُردو میں
خودی سے، خرد سے، خدا سے صنم سے ٹکرائے
دل و نظر نے ہر اک موڑ پہ کیا آگاہ!
جنوں کے جوش میں ہر پیچ و خم سے ٹکرائے

اک ایسا وقت بھی آیا نزاعِ اُردو میں
بھنور سے اُلجھے، خمِ موجِ یم سے ٹکرائے
انھوں نے نوکِ قلم سے سناں کا کام لیا
ٹھٹک کے رہ گئے دشنہ بدست ہمارے

مقامِ نقد و نظر سے گزر گئے جو لوگ
لکھا جریدۂ عالم پہ ہے دوام اُن کا
مقابلوں کی کسوٹی پہ جو کھرے نکلے
جمیلؔ کرتی ہے تاریخ احترام اُنکا

اینٹوں کا کاروبار

ابن انشا

ہمارے ملازمت پیشہ بزرگوں میں جو خدماتِ جلیلہ سے ریٹائر ہوتے ہیں کام کی کچھ ایسی دھن ہوتی ہے کہ ان کا مشغولیت یا مشغلے کے بغیر نہیں رہ سکتے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کی وجہ شہرت ملازمت کے دنوں میں کام کی نہیں ہوتی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے [illegible] والے پنشن خواروں میں آج کوئی تیل بیچ رہا ہے کوئی اخبار بیچ رہا ہے کوئی کھاد بیچ رہا ہے اور جس کے پاس یہ کچھ نہیں وہ خود کو بیچ رہا ہے زمینوں مربعوں والے ہل چلا رہے ہیں۔ اور جن کے مکانات کی پیشانی ہذا من فضل ربی سے منور ہے وہ چھڑی لیے کرایہ داروں کی خیریت دریافت کرتے پھرتے ہیں اور آتشیں شیشے سے یہ دیکھتے ہوئے کہ کسی بچے نے کسی دیوار پر خراشیں تو نہیں ڈال دیں بعضے [illegible] ذاتی ملازمت کے دنوں کے مقابلے میں کئی گنا چوگنا بھی کما رہے ہیں۔ اللہ ان سب کو خوش رکھے۔

لیکن کل جب کسی صاحب نے بتایا کہ اختر حسین صاحب نے اینٹوں کا کاروبار شروع کر دیا ہے تو ہم بہت حیران ہوئے کہ وہ تو انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔ ہمیں تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے تصدیق کی کہ آیا انہی اختر حسین صاحب کی بات ہے جو کبھی گورنر بھی تھے۔ اور مرکزی وزیر بھی۔ جواب ملا، جی ہاں۔ انہوں نے اینٹیں بیچنے کا اعلان کیا ہے۔ ہم نے کہا، بھئی عجیب خبر ہے، خیر۔ لیکن ان کا یہ ارادہ مبارک ہے۔ ہم اپنے احاطے کی دیوار اونچی کرنی چاہتے ہیں۔ کم از کم ہمیں تو بارعایت ہی دیں گے۔ تب ان صاحب نے کہا۔

”ہاں نایاب ہے اور سستا بھی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کے لیے پچیس روپے فی اینٹ بھاؤ نکالا ہے۔ فوراً اپنا آرڈر بک کرا دو۔“ ہم نے کہا ”شاید تمہارا مطلب پچیس روپے سینکڑہ سے ہے۔“ بولے ”جی نہیں۔ پچیس روپے فی اینٹ خصوصی رعایت ہے کہ اس پر آپ کا نام بھی لکھا ہوگا۔ اینٹ اینٹ پر یاں ابن انشا کے نام کی مہر ہوگی۔“ ہم نے اپنے احاطے کی دیوار کے لیے مطلوبہ اینٹوں کا حساب جوڑنا شروع کیا تو ان مہربان نے کہا ”یہ اینٹیں بے شک آپ کی ہوں گی لیکن آپ کے احاطے کے لیے نہیں بلکہ آپ کی طرف سے اردو کالج کی نئی عمارت میں لگا دی جائیں گی جو اتنے دنوں سے یونیورسٹی روڈ پر ننگی بچی کھڑی تماشائے اہل کرم دیکھ رہی ہے۔

ہم کچھ جھنجلا گئے کہ پیسے بھی دیں اور اینٹیں بھی نہ ملیں ۔ یہ اختر حسین صاحب نے کیسا کاروبار شروع کیا ہے۔ ت معلوم ہوا کہ وہ عمارت ان کی ذاتی نہیں ہے ۔ ہر اینٹ جو اس کالج میں لگے گی اردو کے کام کے لیے ہوگی ۔ آپ کے نام کے لیے ہ اور آپ دور کی سوچیں تو پاکستان کے استحکام کے لیے ہوگی ۔ ہم خرما و ہم ثواب کے ایسے موقعے روز روز نہیں ملا کرتے ۔

اس پر ہمیں بابائے اردو مرحوم و مغفور یاد آئے کہ وہ بھی پچاس برس تک اینٹیں ڈھویا کیے اور دیکھتے دیکھ ایک بام بلند کھڑا کر دیا ۔ پاکستان آئے تو لوگوں نے ان کو دیوانہ جان کر ان پر اینٹیں پھینکیں بلکہ ان کی تیار کردہ عمار کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی کوشش کی ۔ لیکن مارنے والے سے بچانے والا زیادہ زور آور ہوتا ہے ۔ انھیں صدر ایو سا مربی ، قدرت اللہ شہاب سا نیاز مند اور جمیل الدین عالی سا خدمت گزار مل گیا ۔ ان کا وقت ختم ہوا تو یہ بار امانت اختر ح صاحب کے دوش پر آن پڑا اور وہ جو کبھی حاکم تھا ۔ اردو کے لیے سائل بنا در در پر دستک دیتا نظر آیا ۔ بڑے ایوانوں نے سے مایوس نہ کیا کہ کون ہے جو اختر حسین صاحب کی بات ٹالے لیکن بابائے اردو کی طرح اختر حسین صاحب بھی یہ جانتے تھے عمارت تو عوام کی اپنی ہے ۔ جب تک عوام رضا کارانہ طور پر اس کی تعمیر میں ہاتھ نہ بٹائیں ، اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی میں تانبے کا پیسہ نہ نکالیں اس میں برکت اور صلابت نہیں پیدا ہوگی ۔ چنانچہ روپے روپے کی پانچ پانچ روپے کی پرچیاں بھی اور اب یہ پچیس روپے کی اینٹ ۔

ہو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید

کراچی میں ہمارے دیکھتے دیکھتے اہل نظر نے بھی اور انھوں نے بھی جو اہل نہ تھے تازہ بستیاں آباد کر لیں بنکو اور کمپنیوں میں مقابلے کی ٹھنی کہ دیکھیں کون اونچی عمارت بناتا ہے ۔ ہوٹل والوں میں مسابقت چلی کہ کون پرتکلف ایوا کرتا ہے ۔ بنک کارخانے کوٹھیاں پھیلتے گئے ۔ پھیلتے ہی گئے ۔ مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی ، ہم نے پچھلے دو سال میں یونیورسٹی روڈ سے گزرتے ہوئے اردو کالج کی عمارت کو تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہی پایا اس کے دروا اور کھڑکیوں کے روزنوں سے بے بسی اور بے زری ہی جھانکتی دکھائی دی ۔ ان آثار کو اینٹوں کا انتظار ہے اور اینٹوں اپنے قدر دانوں کا انتظار ہے اور قدر دانوں کو نہ جانے کس کا انتظار ہے ' قیامت کا ؟ کیا خوب قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن ا

آج بابائے اردو کی برسی ہے ۔ لوگ ان کی یاد منانے کو جمع ہو رہے ہیں ، اختر حسین جلسہ کر رہے ہیں ، شہاب صا بابائے اردو کے مزار کو بوسہ دینے آ رہے ہیں ۔ آیئے ہم بھی اپنا دل پیش کریں ، اپنی وفا پیش کریں ۔ ایک اینٹ ہم خرید رہ ہیں ۔ ایک ابراہیم جلیس نے خریدی ہے ۔ جمیل الدین عالی نے ایک ایک اپنے بچوں کے ہاتھ بیچی ہے ۔ سید محمد تقی ۔ رئیس امرو انعام درانی اور ہم سب اینٹوں کے طلب گار قطار میں آ کھڑے ہوئے ہیں ۔ اے ہمارے پڑھنے والو کیا تم بھی ایک ایک انی نہ خریدو گے ؟ دیکھنا کل بھاؤ بڑھ جائے گا ۔ ڈھونڈتے پھرو گے ۔ بونس واؤچر پر ملیں گی یہ اینٹیں دور اندیش بیوپا چاہیں تو ان اینٹوں کی ذخیرہ اندوزی کی بھی اجازت ہے ۔ ("جنگ" کراچی)

یادوں کا تتمہ

فضل احمد صدیقی

ہمارا ملک سیاسی اعتبار سے سن بلوغ کو پہنچ چکا ہے۔ اب چشم بددور یہ اس منزل میں ہے جہاں بقول شاعر۔

مئے رنگیں ہے سادہ پانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

لیکن کیا طلسم گردش لیل و نہار ہے کہ یادوں کے باب میں اب ہمارے یہاں گویا گھٹتی کا پہرہ ہے۔ جیسے ہم بہت سوں کو یاد رکھا تھا۔ صرف بھلانے کے لئے بالفاظ دیگر ہم ایسے کڑیل جوان ہیں۔ جس کا ذہن ابتدا ہی میں بوڑھا ہو جائے۔ ٹھیک ہے کہ سوچنے کا وہ انداز جو انسان کو بار بار اس کے ماضی میں لے جا کر چھوڑ دے۔ ذرا الٹ پھیر کی رائگنی ہو جاتی ہے یا قبل وقت کا بڑھاپا۔ لیکن اتنی چالاکی بھی کس کام کی جس کے تحت ہم پچھلا آموختہ بھولتے جائیں اور صرف آگے کا سبق پڑھنے کی رٹ ا رہے۔

پچھلے دس بیس برس میں ہم نے جس تیزی سے اپنے محسنوں اور پیشروؤں کو بھلایا ہے اس کی رفتار کا اشاریہ یگراف یر کائنات کے اس جدید مساحتی دور میں بھی شاید ہی ابھی صحیح نکل سکے۔ ہم یہ تو کبھی کا بھول چکے تھے۔ رہبران آزادی کو پیدؑ رکی بشارت جب پہلے پہل ۱۸۶۷ء میں سرسید احمد خاں نے دو قومی اشاریئے کی صورت میں دی تھی تب بھی بات اردو زبان ہی مسئلۂ تحفظ سے نکلی تھی۔ لیکن غضب تو یہ ہوا کہ نغمۂ سید کے ۷۰ سال بعد جنھوں نے اپنی پاٹ دار آوازیں ہماری آواز کے ساتھ مطالبۂ پاکستان کو فی الواقع فلک شگاف بنا دیا تھا۔ ان کم نصیبوں کو تو ہم بھولے یا نہ بھولے۔ ہم یہی بھول گئے کہ کس زبان وہ نعرۂ مستانہ لگایا گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ وہ نعرۂ مستانہ جو عوام کے سینوں سے نکل کر سیدھا سوئے فلک پہنچا کہ شانۂ جبرئیل کو چھو اور آخرش مستجاب ہوا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمۃ دس کروڑ مسلمانان برصغیر کے بے تاج کے بادشاہ اور ایشیا بہترین شخصیت تھے یہ مملکت آنا موصوف ہی کی بے مثال قیادت کا عطیۂ لازوال ہے۔ لیکن کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ جس بزرگ نے قائداعظم کی سیاسی تحریک اور دو قومی نظریے کو لسانی اور ثقافتی رنگ دیکر آبجو سے قلزم پرشور میں تبدیل

کیا وہ مولوی عبدالحق تھے ۔ اور تنہا مولوی عبدالحق ؟ وہ عظیم سرمایہ تہذیب و ثقافت جس کے تحفظ کی لگن مطالبہ پاکستان کی اولین محرک تھی ۔ وہ سرمایہ تمام کا تمام نہیں تو ۹۰ فیصد صرف اردو زبان میں مدون و محفوظ تھا کسی اور زبان میں نہیں ! اس اعتبار سے تحریک پاکستان کو اگر اس کے خالص لسانی پہلو یا تحریک اردو سے علیحدہ کر دیا جاتا تو صاف گوئی معاف ، ساری تحریک ، سازِ کم آواز ہو کر رہ جاتی یا مانند اس شعر کے جس کے بول سرِ مشاعرہ اٹھانے والے نہ ہوں ۔ قائداعظم کے بصیرت افروز ارشادات جب تک انگریزی میں محدود رہے ان کا دائرہ سماعت بھی وسعتوں کے باوجود محدود سا رہا ۔ جونہی انہوں نے اردو میں خطابت شروع کی انہیں قبول عام نے اپنایا ۔ ان کا پیغام کروڑوں کانوں تک پہنچ کر دلوں میں جا اترا ۔ ساری قوم ہمہ تن گوش اور ہر گوش کانِ ملاحت بن گیا ۔ موصوف مسٹر سے قائداعظم کہلائے جانے لگے اور ہر در و دیوار سے یہی شورِ تحسین بلند ہوا کہ تیری آواز مکے اور مدینے ! لہٰذا ! یہ اردو اور صرف اردو ہی تھی جس کے کاندھے پر آپ نے غلبۂ اغیار کا جنازہ اٹھا کر آخری آرام گاہ تک پہنچایا اور آج آپ اور ہم ایک مملکت آزاد میں فروکش ہیں ؛ آج اسی اردو کی ترویج و اشاعت کو جذباتیت کا نام دینا ٹھوس تاریخی حقائق کو جھٹلانا اور یادوں کے ساتھ کھیلنا ہے ۔ اس انوکھے عمل کا کوئی جواز نہیں ۔ اگر ہو سکتا ہے تو وہی جو ستم ظریفی یا ناسپاسگزاری کے لئے ہوتا ہو ۔

اب جب کہ ہمارے مکرم و محترم صدر مملکت کا ارشاد گرامی بھی یہی ہے کہ اردو کی جنم بھومی دلی اور لکھنؤ نہیں پاکستان کو سمجھو تو پھر اس باب میں ہمارے ارباب علم و دانش کی ذمہ داری ہزار گنا بڑھ جاتی ہے ۔ البتہ معاملے کا دوسرا رخ بھی ہے اور وہ ہے ہمارا اپنا طریق کار !

اگر اردو سے لگاؤ اور اس کے علمی اور تدریسی پھیلاؤ کا ذریعہ یہی سمجھ لیا گیا ہو کہ ہم برس کے برس بابائے اردو کا دن منا لیا کریں اور باقی تین سو چونسٹھ دن انگریزی میں سوچیں ۔ انگریزی میں لکھا پڑھی کرتے رہیں ۔ حتیٰ کہ بچوں کو بھی انگلش میڈیم کی چاٹ پر لگا دیں ۔ تالیف و ترجمہ کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی تو کجا 'انگریزی چور' 'انگریزی گزیدہ' کا طعنہ دیکر انہیں گاؤدی اور قتل آموختہ سمجھیں اور لسانی مسائل کو صرف انجمن ترقی اردو ہی کا نجی مسئلہ قرار دیں "ادب شرط" یہ برسیاں اور یوم داریاں سب زبانی جمع خرچ ہوا ۔ جس سے ان کو کوئی فیض نہیں پہنچتا ۔ اگر روح عبدالحق ہمارے ان کاموں سے کار فرما نہیں تو یقیناً ہمیں ع

روح بابا سے شرمساری ہے ۔

گویا بابائے اردو کے بعد یہ ایک اور المیہ ہے جس سے ہم دوچار ہیں ۔ مجھے غالب کا یہ شعر الہامی سا معلوم ہونے لگا ہے جو شاید ہمارے ہی لئے کہا گیا تھا ؛ ع ۔ رہیئے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

صاحبو !

وہ قوم جو اپنی ہی زبان سے شرمائے اسے کسی آزاد قوم سے آنکھ ملا کر بات کرنے کا حق نہیں پہنچتا ۔

مولوی عبدالحقؒ سے
بابائے اردو تک

شمیم احمد

انجمن ترقی اردو کے عقبی احاطے میں ایک قبر ہے جو برِ صغیر کی تاریخ کے لیے ایک ایسی امانت ہے جسے واپس لینے کی توفیق رہتی دنیا تک اب کسی کو نہیں ہوگی۔ یہ قبر ایک چیلنج[1] ہے۔ ان ارواح کے وارثوں کے لیے جنھوں نے اپنی تمام مذہبی منافرت، نسلی افتراق، تہذیب و تمدن کے اختلاف، سیاسی مفادات، معاشی تحفظات، وقتی مصالح اور روحانی مخاصمتوں کے باوجود انسانیت کے سب سے فطری اور سب سے قیمتی جذبے کا اظہار، غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کو قبول کر کے کیا تھا۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ اتحاد، یگانگت، خلوص اور محبت میں نکلتا ہے۔ جو انسان کو ہزار رنگوں اور ہزار بے رنگیوں کے باوجود "آدمیت" کے رشتے میں پروتا ہے۔ اور یہ غیر شعوری ارتباط و اظہارِ آدمیت "زبان" ہے۔ جس میں ان گنت ان دیکھے اور نا معلوم دل ایک ساتھ ایک تال و سم، ایک آہنگ میں دھڑکنے لگتے ہیں۔ الفاظ دل ہی تو ہیں جس میں جب انجان جسموں اور پیکروں کی خواہشات، امنگیں، آرزوئیں اور خواب مرئی شکل میں ڈھلتے ہیں تو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کب ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔ اور جو ہاتھ نہ آئیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کون کس کے لیے مٹ گیا۔ آدمیت کی سب سے پہلی شرط اور پہچان یہی تو ہے کہ وہ اظہار میں آتی ہے۔ سرِ آدم خدا جانے صوفیا، علما، فلسفیوں اور سائنسدانوں کے لیے کیا ہو۔ میری سنئے تو سرِ آدم "لفظ" ہے جس سے وہ اظہار میں آتا ہے۔ اور اگر نہ آئے تو حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے۔ لیکن "لفظ" کو کبھی کسی نے دین و ایمان نہیں بنایا۔ سوائے اس شخص کے جو انجمن ترقی اردو کے عقبی احاطے میں محوِ خواب ہے۔ مولوی عبدالحق جنھیں بابائے اردو کہنا میرے لیے خوش آہنگ بات نہیں۔ کیونکہ پوری معلوم انسانی تاریخ میں ایک مثال ایسی نہیں ملتی جس نے اپنی زندگی کے کم و بیش ساٹھ سال یعنی ایک پوری زندگی "لفظ" کے لیے وقف کر دی ہو۔ اور وہی اس کا دین ہو، وہی اس کا قانون، اصول اور یہی نہیں بلکہ پوری زندگی

---

[1] جیسے مولوی صاحب "چنوتی" لکھ کر بہت خوش ہوتے۔

ہو۔ نعرۂ کثرت یعنی زبان کی وحدت ہے اور سب سے بڑا موحد وہی ہوتا ہے جو اس کے لیے سب کچھ قربان کر دے۔

مولوی عبدالحق برصغیر کے سب کے سب موحد تھے۔ مسلمان ہوں یا نہ ہوں۔ مگر انھوں نے اپنے لیے جو خدا چنا تھا اس کا انوکھا ہونا یقیناً ثابت ہے۔ مولوی صاحب کی اس انفرادی اور امتیازی شان کے بعد ان کے وہ کارنامے جو ان سے بعض اوقات جائز طور پر اور بعض اوقات ناجائز طور پر منسوب کر دیے جاتے ہیں بہت حقیر نظر آتے ہیں۔ ہمیں اپنی آلائشوں، خود پسندی، مفاد پرستی اور مکروفریب کو ان بڑے آدمیوں سے دور رکھنا چاہیے۔ کیونکہ "بڑائی" چھوٹی نہیں ہوتی۔ وہ ہماری خود غرضی اور ناپاک مصلحتوں کی اعانت کے باوجود "بڑائی" رہے گی۔ اور تمام سازشوں، خباثت اور مخالفت کے باوجود چھوٹی نہیں ہوگی۔ اس لیے ہمیں اگر واقعی کسی کی عظمت لبھاتی ہے تو پھر ہمیں اس کے بارے میں سچ بولنا چاہیے۔ کیوں وہ ہمارے جھوٹ کی سزاوار نہیں ہو سکتی۔

مولوی عبدالحق کا شمار ان عظیم شخصیتوں میں ہو سکتا ہے۔ جن میں کئی صلاحیتیں بیک وقت دست و گریباں رہتی ہیں۔ ان میں سے شاذ ہی ایسی ہوتی ہیں جو ہر صلاحیت میں یگانۂ روزگار ہوتی ہیں۔ لیکن بیشتر ایسی ہوتی ہیں جو پھیلنا تو کئی اطراف چاہتی ہیں مگر ان کی مرکزی قوت کا اظہار کسی ایک ہی سمت ہوتا ہے۔ مثلاً سرسید احمد خاں ایک جامع الکمالات شخصیت تھے۔ وہ بیک وقت مدبر، مصلح، ماہر تعلیم، ادیب، مورخ، منتظم کار اور ماہر قانون تھے۔ لیکن ان کی مرکزی قوت تعلیم پر صرف ہوئی اور باقی حیثیتیں ثانوی ہو گئیں۔ جب کہ سرسید احمد خاں کی عظمت میں ان تمام حیثیتوں کا حصہ برابر کا تھا۔ اس بات کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سرسید کا عہد ہند مسلم تہذیب کا ایک زریں عہد تھا اور اس عہد میں عظیم دل و دماغ کی ایک نسل تیار ہوئی تھی۔ جس میں محمد حسین آزاد۔ مولوی نذیر احمد۔ اکبر الہ آبادی۔ مولانا شبلی اور مولانا حالی جیسے ادیب و شاعر، مولوی ذکاءاللہ اور مولوی چراغ علی جیسے نثار اور امیر علی جیسے مورخ پیدا ہوئے تھے۔ جس کے ایک سرے پر غالب اور دوسرے پر اقبال جیسے شاعر پیدا ہوئے تھے جنھوں نے نابغوں کے اس عہد کی حد بندی کر کے اس زمانے کو ہماری ذہنی تاریخ کا ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ اسی عہد میں مولوی عبدالحق بھی پیدا ہوتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے مولوی صاحب کا شمار سرسید کا دوسری پیڑھی میں ہوتا ہے وہ پیڑھی جس میں مولانا سلیمان ندوی۔ محمود شیرانی۔ ابوالکلام آزاد۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی۔ عمادالملک اور مولانا محمد علی جوہر جیسے مشاہیر کا شمار ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایک سے زیادہ حیثیت کے حامل تھے اور ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح علم و ادب سے تھا۔ مگر ان سب کی صلاحیتیں سرسید کے عہد کے سامنے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ سوائے مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد کے جنھوں نے خالص سیاست کو اختیار کر لیا تھا۔ اور اس میں ممتاز ترین مقامات حاصل کر لیے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان سب کو اردو ادب میں وہ جگہ کیوں نہیں حاصل ہو سکی جو محمد حسین آزاد۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی کو حاصل ہے۔ جب کہ ان حضرات سے یہ توقع بجا طور پر کی جا رہی تھی کہ وہ اس روایت کو بہتر سے بہتر معیار تک لے جائیں گے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انھیں لازمی طور پر ان سے بہتر صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ مگر جن خیالات سے روشناس ہو کر سرسید اور ان کے عہد کی شخصیات نے ایک نشاۃ الثانیہ کی بنیاد رکھی۔ ان

ہی خیالات سے زیادہ آگہی کی بنیاد پر ان کے جانشینوں سے اعلیٰ کارناموں کی توقع بجا طور پر کی جاتی تھی۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ دورِ ثانی میں شعرا کو چھوڑ کر کسی شخص نے ایک ایسی کتاب نہیں چھوڑی جسے اس کا مستقل کارنامہ کہا جا سکے اور اگر کسی نے کوئی کتاب لکھی ہے تو ایسی نہیں کہ اس کو اردو کا عہد آفریں کارنامہ قرار دیا جا سکے۔ ان کی پوری زندگی کا حاصل چند مضامین ہیں۔ جن کی وقعت سے ہرگز انکار نہیں مگر کیا وہ آزاد۔ حالی۔ شبلی اور نذیر احمد کی مستقل تصانیف کا نعم البدل قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ اسی طرح انھوں نے اس تنقیدی شعور کا اظہار بھی کہیں نہیں کیا۔ جس کا تقاضا آزاد، شبلی اور حالی کے مقابلے پر ان حضرات سے بجا طور پر تھا۔ ان سے پچھلا دور تنقیدی، تاریخی اور علمی ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر تخلیقی دور تھا۔ اور شعر و ادب کے مذاق کو نہ صرف عام کرتا تھا بلکہ تخلیقی طور پر بھی اثر انداز ہوتا تھا۔ جس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شعر و ادب کا تخلیقی مذاق اس دورِ ثانی میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور اس کے لکھنے والوں میں تنقیدی صلاحیت قدرِ اول کی نہیں تھی۔ شاید اسی لیے یہ دور بنیادی طور پر تحقیقی دور تھا۔ تحقیقی دور کوئی بے بضاعت دور نہیں ہوتا بلکہ بنیادی طور پر علمی دور ہوتا ہے جس سے علم و ادب اعتبار حاصل کرتے ہیں لیکن ہمیں بڑی مایوسی اس وقت ہوتی ہے جب اس دور میں ہمیں کوئی مستقل تحقیقی کارنامے بھی نہیں ملتے۔ انفرادی طور پر بڑی سعی و کاوش نظر آنے کے باوجود اس کا نتیجہ عہد ساز تحقیقی کارناموں کا نہیں ہے۔ اس دور میں یقیناً مذاقِ علمی کو بہت سہارا ملا۔ مگر ایک تو خود تحقیق نئے سراغوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے دوسرے اگر بہت ہی اعلیٰ پایہ کا تنقیدی شعور موجود نہ ہو تو پھر اس کی حیثیت کچھ انکشافات سے آگے نہیں بڑھتی۔ جس کی تردید و تائید تحقیق کا ایک عمومی عمل ہے جہاں تک صحیح مذاقِ تحقیق کا سوال ہے وہ بھی کوئی سہل الحصول نسخہ نہیں ہے۔ بعض طبائع علمی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں اس اعتبار سے حافظ محمود شیرانی اور کسی حد تک پنڈت دتاتریہ کیفی کو چھوڑ کر ہمیں اس دور کے بیشتر محقق صرف انکشافات کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس دور کو عبوری دور بھی کہا ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن چیزوں سے ناقص واقفیت نے نشاۃ الثانیہ کے دورِ اول کو ناقابلِ فراموش دور بنا دیا ہے اس سے دورِ ثانی میں زیادہ واقفیت اور زیادہ صحیح واقفیت کے باوجود وہ نتیجہ کیوں نہیں برآمد ہو سکا جس کی توقع فطری طور پر کی گئی تھی۔ اس اعتبار سے غور کیجئے تو ایک سیدھی سادی بات تو صلاحیت کی سامنے آتی ہے اور چھان پھٹک کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ سے وہ صحیح اور فطری رشتہ اور ربط ان لوگوں میں نہیں تھا۔ جو پہلے دور کی بنیادی صفت تھی۔ اس میں تخلیقی صلاحیت کا بھی ایک سوال ابھرتا ہے۔ جس سے دورِ ثانی کے بڑے نام دور کا واسطہ رکھتے تھے۔

اب اس پس منظر اور تحقیقی پہلوؤں کے پیشِ نظر مولوی عبدالحق کی شخصیت پر غور کیا جائے تو ہمیں دو ایک ایسی باتوں کا سراغ ملتا ہے جس سے آشنا ہوئے بغیر ہم اس دور کے مزاج کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ مولوی صاحب نے تقریباً ستر سال علم و ادب سے براہِ راست تعلق رکھنے کے باوجود ایک بھی ایسی مستقل کتاب نہیں چھوڑی ہے جو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ

رکھ سکے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے شعرا اور شاعری پر کوئی ایسی تحریر نہیں چھوڑی جسے اُن کے ادبی و شعری نظریات کا حامل قرار دیا جا سکے یا اُن کے ایسے مقدموں اور تبصروں میں جو شعرا پر لکھے گئے ہیں اُن سے شعری مذاق یا اس کے افہام و تفہیم کا اتنا اندازہ بھی نہیں ہوتا جتنا یادگار غالب سے ہوتا ہے۔ اور یہ بھی خیال کوئی زیادہ غلط نہیں ہے کہ انھوں نے زیادہ تر مقدموں میں جس تحقیقی زاویۂ نظر کو پیش کیا ہے وہ اپنی ساری افادیت کے باوجود ایسے ہیں جن میں سے اکثر کی تردید ہو چکی ہے۔ یا ایسے انکشافات پر مبنی ہیں جس کی چھان پھٹک جتنی چاہیے تھی نہیں کی گئی یا ان کی بعض جگہ تکرار کی گئی ہے۔ لیکن یہ اعتراض کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مولوی صاحب کا اصل تحقیقی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی عمر کئی سو سال بڑھا دی۔ خواہ یہ اتفاق ہو مگر مولوی صاحب اگر اردو کو اپنا دین و ایمان نہ بنا لیتے تو یہ کارنامہ پتہ نہیں اور کتنے عرصہ تک پردۂ خفا میں رہتا۔ مولوی صاحب کا دور بعض اعتبارات سے انتخاب کا دور تھا اس کا سب سے گہرا سراغ مولوی صاحب کی تحریریں اور اُن کی شخصیت دیتی ہے۔ دراصل سرسید احمد خاں کے دور میں عمل اور ردِ عمل کی اتنی گہری اور بنیادی تحریکیں ملتی ہیں جنھوں نے ان کے دور کو بہت بڑے "امکانات" کا دور بنا دیا تھا۔ ایسے "امکانات" جن پر برصغیر کی آئندہ تاریخ کا دار و مدار تھا۔ خصوصیت سے سرسید کے جس بنیادی کارنامے کو نظر انداز کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک ناامید اور پژمردہ قوم میں عمل کی روح پھونک دی تھی اور عمل کی طرف یہ دعوت صرف ان کی وعظ و تلقین کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ انھوں نے اپنے خیالات اور عمل سے برصغیر کے مسلمانوں کے افکار و خیالات اور ذہنی رویوں پر اتنے غیر متوقع کاری اور بعض اوقات غیر متوازن وار کیے کہ ان کے خلاف ایک مؤثر ترین تحریک پیدا ہو گئی۔ اور اسی تحریک نے قومی اور معاشرتی سطح پر ایک ہلچل پیدا کر دی۔ سرسید احمد خاں جو کہتے تھے۔ اس پر عمل کرتے تھے۔ ردِ عمل میں بھی لازمی ٹھہرا کہ سرسید احمد خاں کی عملی تردید کی جائے جس کا نتیجہ شاندار اور مؤثر برآمد ہوا کہ اس دور کی تمام موافق اور مخالف تحریکوں نے مثبت عمل اور مثبت طریقۂ کار اختیار کیے۔ علی گڑھ یونیورسٹی۔ ندوۃ العلماء۔ جامعہ ملیہ۔ دارالعلوم دیوبند۔ جامعۂ عثمانیہ۔ دائرۃ المعارف۔ انجمن ترقی اردو اور لاتعداد اسکولوں کے قیام اور اُن کے تمام افادی کارناموں میں ان کے متضاد نظریوں کے باوجود اس عہد کی یہی روح کام کر رہی تھی۔ یہی وہ اصل نکتہ ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان میں عملی قوتیں پیدا کرنے میں سب سے زیادہ نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اور اسی روح نے سرسید کے بعد آنے والے دور میں ہر شخص کے سامنے ایک انتخابی "امکان" کی راہ کھول دی۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ اپنی صلاحیتوں کا عملی ثبوت دینا چاہتا تھا۔ اس دور کے مزاج میں یہ بات ایک ابدی صداقت کی طرح موجزن تھی کہ آدمی وہ ہے جو کچھ کام کر کے دکھائے۔ کام ہی سے اس کا نام باقی رہے گا۔ اس لیے اس دور کا ہر شخص سراپا عمل ہے اور اپنے عمل کے لیے اس نے زندگی کے وسیع تر شعبوں اور وسیع تر قومی خدمات میں کسی خاص راہ اور شعبہ کو انتخاب کر کے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔ اسی لیے اس دور میں سیاست، تعلیم، مذہب، معاشرت، ادب اور فنونِ لطیفہ ہر شعبے میں بہت بڑے کارکن پیدا ہوئے۔ اور یہی وہ دور ہے جس میں نیا ہندوستان انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور زندگی کے تمام شعبوں

میں سیلابی کیفیت سے آگے بڑھا۔ مولوی صاحب کی تحریروں کا مطالعہ اگر کیا جائے تو ان کے دور کے اس خاص مزاج کا اندازہ ان کے چند خاص موضوعات اور فقروں سے ہوتا ہے جنھیں انھوں نے باربار استعمال کیا ہے۔ وہ اکثر اس بات کو ایک کلیہ کی طرح بیان کرتے ہیں کہ "کاہلی انسان کی فطرت ہے یا انسان فطری طور پر کاہل الطبع واقع ہوا ہے۔ اور اس کے بعد وہ ہر جگہ عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے مولوی صاحب کو سمجھنے کے لیے اس دور کے اس عام رجحان اور مزاج کو نظرانداز کر کے ہم اس کی روح تک نہیں پہنچ سکتے اور مولوی صاحب تو براہِ راست اس تحریک کا نتیجہ تھے جس کو سرسید اور حالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کے لیے بھی سب سے پہلے انتخاب کا سوال تھا کہ وہ کس میدان میں اپنی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں اور یہ ان کی انفرادیت کا عجیب پہلو ہے کہ انھوں نے کوئی راہ عام اختیار نہیں کی بلکہ اپنے لیے وہ منزل وہ مقصد اور (۱۸۹۹) انتخاب کیا جو اس سے پہلے دنیا کی کسی قوم میں کسی فرد نے انتخاب نہیں کیا تھا۔ انھوں نے ایک زبان کی حفاظت، اس کی اشاعت، اس کی ترویج اور اس کی لسانی اور ادبی خدمات کو علمی وقار ہی نہیں دیا بلکہ اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ اس زبان کو عملی طور پر اس طرح فتح یاب کرایا جائے جس طرح قومیں آزادی حاصل کرتی ہیں اور فتوحات انجام دیتی ہیں۔ ان کے لیے صرف ادیب ہونا، محقق ہونا یا تنقید نگار بننا ایک چھوٹی بات تھی۔ انھوں نے اردو کی جنگ مذہبی جنگ کی طرح لڑی ہے اب اگر ان کے مزاج کے اس پہلو سے آشنا نہیں ہیں تو ان پر اس اعتراض کو من و عن قبول کر لیں گے جو بعض اعتبارات سے صحیح اور قابلِ غور ہے کہ مولوی صاحب نے اردو کو سیاسی مسئلہ بنا کر اسے نقصان پہنچایا ہے۔ یقیناً ایک نقطۂ نظر سے مولوی صاحب کے اس رویے نے خالص اردو کے نقطۂ نظر سے اسے نقصان بھی پہنچایا ہے جس کا نتیجہ ہندوستان میں اردو سے شدید منافرت کی صورت میں یوں نمودار ہوا کہ اردو وہ زبان ہے جسے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بہت زور شور سے پیش کیا گیا اور تحریک پاکستان کے تین سب سے مؤثر نکات میں شامل رہی ہے۔ پاکستان میں یہ عمل بنگلا تحریک کی صورت میں نمودار ہوا جس کا نتیجہ دو قومی زبانوں کی صورت میں نکلا۔ یہ اعتراض کرنے والوں کی مراد یہ ہے کہ اردو کو بجائے حکومت اور لیڈروں کے تعاون سے رائج کرنے کی تجاویز کی جگہ اگر صرف انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے یگانگت، محبت اور التجا کی صورت میں پیش کیا جاتا۔ اور جگہ جگہ اردو پڑھانے کی رضاکارانہ خدمات کو بھی نظر میں رکھا جاتا تو شاید یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ مگر یہ اعتراض کرنے والے اس شخص کے ساتھ بہت ہی زیادتی کرتے ہیں جس نے اپنی زندگی کا اعلیٰ اور واحد مقصد اردو کو عملی طور پر رائج کرانا قرار دیا ہو اور اسے اپنا دین و مذہب اور مسلک بنا لیا ہو۔ مولوی صاحب اردو کے پیغمبر ہیں اور اردو کے خلاف ذرا سی تحریک یا گریز کو فطری طور پر برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ان کے لیے کفر و ارتداد کے برابر تھا مولوی صاحب میں وہ ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک تنقید نگار کے لیے بنیادی صفات ہوتی ہیں۔ وہ بہت کھرے بلکہ کھرے اور صاف گو بھی تھے۔ اور بے لاگ رائے دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے مگر ان کی یہ صفات اس سے بلند تر مقصد کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔ انھوں نے کبھی اردو کے مخالف کو نہیں بخشا اور اپنی ان صلاحیتوں کا بے محابا استعمال کیا ہے۔

اگر مجموعی طور پر مولوی صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں بے اختیار سرسید یاد آجاتے ہیں۔ وہ بھی بحیثیت ادیب، مورخ اور بحیثیت مفکر کسی مستقل حیثیت کے مالک نہیں ہیں۔ یہ ساری حیثیتیں ان کے یہاں ثانوی ہیں۔ اسی طرح مولوی صاحب کی بھی ساری صلاحیتیں ثانوی ہو جاتی ہیں اور صرف اردو ہی ان کے قالب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اس اعتبار سے وہ سرسید ثانی نظر آتے ہیں۔ مولوی صاحب سے زیادہ سرسید سے مشابہ کوئی اور شخص اس پوری تحریک میں نظر نہیں آتا۔ بحیثیت ایک ادیب مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی نثر ہے۔ یہ وہ نثر ہے جس کے خواب سرسید اور حالی نے دیکھے تھے۔ اگر سرسید اور حالی کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں بے اختیار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی نثر ان کی نثر کی تکمیل کرتی ہے جس مزاج اور اسلوب کو سرسید اور حالی نے الگ الگ اختیار کیا تھا مولوی عبدالحق نے اس کو یک جا کر دیا۔ مگر یہ کوئی اختیار کردہ چیز نہیں ہے مولوی صاحب نے سرسید اور حالی کو اپنی ذات میں اتنا جذب کر لیا تھا کہ اس سے مولوی صاحب کے مزاج کی تشکیل ہو گئی تھی اور مولوی صاحب کا اسلوب اسی تشکیل کا اظہار ہے جس کو شعوری طور پر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے سادہ نثر کو اپنے لیے اصول بنا لینا غیر فطری بات ہے۔ اسلوب شخصیت سے مل کر بنتا ہے اور یہی اسالیب بڑے ادب کی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں مگر اس کو نمونہ بنا لینا یقیناً نقل کے مترادف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نثر سرسید اور حالی سے زیادہ شبلی کے قریب ہے۔

مولوی صاحب کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے عموماً اولیات کے جو زریں اصول برتے جاتے ہیں یعنی انھوں نے سب سے پہلے کن کن چیزوں کی بنیاد ڈالی۔ تنقید کو آگے بڑھایا۔ تحقیق کو علمی وقار دیا۔ شعرا کو دریافت کیا۔ کتابیں شائع کیں۔ نایاب نسخے تلاش کیے۔ یہ سب صحیح مگر مولوی صاحب کی یہ ’اولیات‘ کے باوجود ان کی ان خدمات کے پاسنگ بھی نہیں ہے جو انھوں نے اردو کے لیے انجام دی ہیں مولوی عبدالحق کی شخصیت کا مظہر جامعۂ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، اردو کالج اور رسالہ ’اردو‘ ہیں۔ جو صرف اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایک شخص کی محبت، اس کا خلوص، اس کا ایمان کیا کیا کچھ کر کے دکھا سکتا ہے۔

مولوی صاحب اس کا بن الطبیع انسانی دنیا میں ایک عملی صداقت کا اظہار تھے اور یہ صداقت اردو تھی جسے ہم نے زمین کے سپرد کر دیا ہے۔ مگر امانت کے طور پر۔ جو اس وقت تک واپس نہیں لی جا سکتی جب تک ہم اپنے اس عہد کو پورا نہ کر لیں جو ہم نے اردو کے ساتھ کیا ہے۔

داستانِ زبانِ اردو
ڈاکٹر شوکت سبزواری

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کے لسانی مسائل پر کئی گراں قدر مقالے اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ’’داستانِ زبانِ اردو‘‘ میں انھوں نے اردو زبان کے لسانی سرمائے، مختلف نظریوں، مولد، منشا، صرفی نحوی نشو و نما، مزاج و منہاج، ادوارِ ارتقا کے مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اردو زبان کے بارے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت: پانچ روپے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

اردو میں تدوین

بابائے اردو بحیثیت محقق

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے جس مخصوص نقطۂ نظر کے ساتھ تدوین کے کام کی طرف توجہ کی۔ اس کا ذکر میں پچھلی قسط میں کر چکا ہوں۔ یوں تو مولوی صاحب نے مختلف موضوعات اور انداز کی کتابیں خود مدون کی ہیں اور اپنے احباب سے مدون کرائی ہیں۔ لیکن تذکروں کی اشاعت پر زیادہ زور دیا۔ تذکرۂ گردیزی کے مقدمے میں لکھا ہے۔

”ہمارے شعرا کے تذکرے گو جدید اصول کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں تاہم ضمنی طور پر ان میں بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو ایک ادیب اور محقق کی نظروں میں جواہر ریزوں سے کم نہیں ہوتیں۔ اسی لئے انجمن ترقی اردو نے قدیم تذکروں کے شائع کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔“

اس بات کو سب جانتے ہیں کہ آج سے پینتیس (۳۵) سال قبل انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق گویا مترادف نام تھے۔ تذکروں کی اہمیت کو اس طور پر محسوس کر کے ان کی اشاعت کی کوشش کرنا بلاشبہ مولوی عبدالحق کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولوی صاحب نے جتنی کتابیں مدون کی ہیں ان میں تدوین کے معیار اور اصول کی حد تک حیرت انگیز یکسانیت ملتی ہے اس کا سبب غالبًا یہ ہے کہ مولوی صاحب نے کام کی اہمیت کو محسوس کرنے کے باوجود کماحقہ محنت و کاوش نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے معیاری تدوین کے بجائے اس بات پر زور دیا کہ زیادہ سے زیادہ کتابوں کے متن شائع کر دیں۔ اور اہل تحقیق و تدوین کے لئے خام مواد فراہم کر دیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرح جو متن سامنے آیا۔ اس میں ہر قسم کے اغلاط موجود ہیں۔ لیکن ان کی بڑی افادیت یہ ہے کہ ان سب کتب کے تقابلی مطالعے سے صحیح نتائج تک پہنچنا بڑی حد تک ممکن ہو گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب کے مدون کئے ہوئے اور ان کی انجمن ترقی اردو کے شائع کئے ہوئے متون کی مدد سے ہی اردو میں تحقیق کا رواج ممکن ہوا۔ مولوی صاحب کے بڑے سے بڑے مخالف کے لئے بھی تحقیق کے سلسلے میں ان کے کاموں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ مولوی صاحب کے اصول اور معیار تدوین کا اندازہ کرنے کے لئے سطور ذیل میں ان کے شائع کردہ تذکرۂ گردیزی کا ذکر کیا جائے گا۔

سید فتح علی حسینی گردیزی کا تذکرۂ ریختہ گویاں مولوی عبدالحق بی۔ اے (علیگ) نے سنہ ۱۹۳۳ء میں مدون کر کے انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن کے سلسلۂ اشاعت میں نمبر ۷۶ پر شائع کیا۔ اس سے پہلے چھپتر کتابیں اسی انجمن سے

شائع ہو چکی تھیں جن میں اس نوعیت کی کتابوں کی بھی قابل ذکر تعداد تھی یعنی اس زمانے تک مولوی صاحب کو ایسے کاموں کا تجربہ کافی ہو چکا تھا۔

کتاب کے شروع میں سترہ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں مولف کے حالات اس کی تصانیف کے علاوہ زیر تدوین تذکرے کے سبب تالیف وغیرہ سے بحث کی ہے۔ مولوی صاحب نے حالی اور شبلی جیسے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ الفاظ کے صحیح استعمال پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے اس تذکرے کو گردیزی کی تصنیف نہیں تالیف کہا ہے۔ (افسوس ہے کہ بعد میں بعض اہل قلم نے جن میں بعض بڑے بھی شامل ہیں۔ اس امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا، جیسا کہ اگلی قسطوں میں عرض کروں گا) مقدمے میں تدوین کے اصولوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ البتہ اتنا لکھا ہے۔

> یہ تذکرہ ہم نے تین مختلف قلمی نسخوں سے مرتب کیا ہے ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے جیسا کہ کاتب تذکرہ کی عبارت سے معلوم ہوگا کہ وہ حیدرآباد میں سید عبدالولی عزلت کے لیے ۱۱۷۲ھ میں (یعنی تصنیف سے چھ سال بعد) لکھا گیا تھا۔"

باقی دو مخطوطات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ اس خاص نسخے کے متعلق بھی یہ نہیں بتایا کہ مدون کو وہ کہاں سے ملا تھا اور اب کہاں ہے۔ اس کا سائز کیا ہے۔ خط تحریر کیا ہے۔ وغیرہ۔ دراصل اس وقت تک تحقیق کا کام ابتدائی مدارج میں تھا اور اس نوعیت کی اطلاعات کو کچھ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اختلاف نسخ کے لئے حاشیہ 'ن' لکھا ہے لیکن اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے کہ 'ن' سے کونسا نسخہ مراد ہے۔ ترتیب دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ مدون نے نسخہ مذکور (مکتوبہ ۱۱۷۲ھ) کو بنیاد بنایا ہے اور باقی نسخوں سے اس کا مقابلہ (غالباً سرسری) کر لیا ہے۔ جہاں کہیں اختلاف سمجھ میں آیا ہے اس کی حاشیے پر نشاندہی کر دی ہے متن کی تیاری کے لئے کسی ایک نسخے کو بنیاد بنانے کی روایت اردو میں سب سے پہلے مولوی عبدالحق مرحوم کے ہاں ملتی ہے۔ اور یہی سلسلہ رفتہ رفتہ چل پڑا۔

ایک نسخے کو بنیاد بنا کر متن تیار کرنا نسبتہً آسان ہے لیکن اس طریقہ کار میں کچھ قباحتیں بھی ہیں۔

۱ بنیادی نسخے میں کتابت وغیرہ کی غلطیاں جو رہ گئی ہوں گی۔ بدستور باقی رہ جائیں گی۔

۲ عین ممکن ہے کہ دوسرے نسخے میں بعض اصلاحات مصنف نے کی ہوں۔ ان کو اس طریقہ تدوین کے مطابق حاشیے پر جگہ ملے گی گویا انکی ثانوی حیثیت ہوگی۔

۳ دو مخطوطوں میں سے کسی ایک کو اہم تر قرار دینے کے لئے تاوقتیکہ نہایت واضح، غیر مبہم اور مستحکم شواہد نہ ملیں اس طریقے میں غلط فہمی کے پورے امکانات ہیں اور اس کے نتائج دور رس ہو سکتے ہیں۔

مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنے مخصوص حالات میں یہ طریقہ کار اختیار کیا تھا۔ لیکن اس کا رواج عام پا جانا تدوین کا تک محدود [illegible] افسوسناک بات ہے۔

پوری کتاب میں مشکل سے دو چار مقامات ایسے ہیں جہاں مدون کو سوالیہ نشان (؟) بنانے کی ضرورت پیش آئی ہے ۔ ایسا کوئی موقع نہیں آیا جہاں عبارت نہ پڑھی جا سکی ہو ، اور نقطے لگائے گئے ہوں ۔

اس سے حسب ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں ۔

۱۔ مولوی عبدالحق مرحوم کو اپنی صلاحیتوں پر کامل اعتماد تھا اور
۲۔ انھیں پورا مخطوطہ پڑھنے میں بجز دو ایک مقامات کے کہیں زحمت نہیں ہوئی ۔ (لیکن واقعات سے یہ بات ثابت نہیں)
۳۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مولوی صاحب نے متن کو جیسا بھی پڑھا بجنسہٖ شائع کر دیا ۔
۴ ۔ جہاں نہیں پڑھا گیا وہاں قیاسی تصحیح کر دی (اور کتاب دیکھنے سے یہی بات سامنے آتی ہے ۔)

اس طریقۂ کار سے یہ نقصان ضرور ہوا کہ متن میں اغلاط بہ کثرت ہیں لیکن سوالیہ نشان یا نقطے بنانے یا "کذا" لکھ دینے کے رواج نے سہل پسندی کیلئے جتنی گنجائش پیدا کر دی ہے ، مولوی عبدالحق کے ہاں اتنی ہرگز نہیں تھی ۔ نقطے لگا کر یا "کنا" لکھ کر ہمارے دور کے اکثر محققین اپنی علمیت کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں ، مولوی عبدالحق مرحوم نے (میں ذاتی طور پر ان سے بالکل واقف نہیں محض ان کے تدوین کے کام کو دیکھ کر جو رائے قائم کر سکا ہوں عرض کرتا ہوں) اپنی علمیت کا نہ تو بے جا رعب ڈالنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کی فکر کی ۔ چنانچہ ان کے مدون کردہ تذکروں میں ناموزوں اشعار بھی ملتے ہیں ۔ زیر نظر تذکرے سے چند مثالیں درج کرتا ہوں ۔

صفحہ	شعر / مصرع	صحیح شعر یا مصرع
۲۷ ۔	کسو کوئی جو بلبل دیکھ گل کو جی سنا پاتے ہیں ۔	.... جی سا پاتے ہیں
۴۲ ۔	لوگ کہتے ہیں ہمیں اس دل کے سمجھانے کے تئیں	.... سمجھانے کتیں
	کیوں کر سمجھا دیں کہو ایسے دوانے کے تئیں	کہو ہم ایسے دیوانے کتیں
۶۶ ۔	خاکساری نہ کر موذی کے ہرگز اعتبار	خاکساری پر نہ کر موذی کی ....
۷۰ ۔	کسی دل آزردے کے دامن کش ہیں یہ خار چمن	کس دل آزردہ ....
۸۲ ۔	مر جائے ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا ،	مر جا ستم سے ....

ایسے اشعار بھی ملیں گے جو موجودہ صورت میں مہمل ہو کر رہ گئے ہیں یا کم از کم وہ معنویت انھیں نہیں ہے جو اصل شعر میں تھی چند مثالیں یہ ہیں ۔

۱۲	فوجوں سے بڑھ چلے ہے جیو کا کوئی سپاہی	.... چلے جیون یکا کوئی سپاہی
	یوں خال چھوٹ جس کا مکھ پر رہے نرالا	...... چھوٹ تھا سے مکھ پر ......
۱۶ ۔	یکبار بھر کے کہہ لے اپنی زباں سے کیا خوب	یکبار بھر کے کھیلے اپنے لباں سے کیا خوب
۲۲ ۔	فرشتے کا بھی من ایسے پری اوپر لبھاتا ہے	...... ایسے پری اوپر ....

۲۳۔ نتیجہ جس سے خدمت کا اگر یہ بے دماغی ہے	نتیجہ حسن خدمت کا ....
۲۴۔ یار کا جب خیال آتا ہے ۔ ہول میرا تمام جاتا ہے	...... ہوش میرا ....
۲۶، ورنہ عاشق گواہ سولی ہے	ورنہ عاشق کو آہ سولی ہے ....
۲۸، جان کر معنی کسی کے گر تمھیں باندھے کہیں	...... کسی کے میں نہیں باندھے کہیں
۳۰۔ تیرے ابرو کی تیغ ہے باڑھیل ؟	...... تیغ باڑھ تلے
۳۲ تجھے بے مروت مودت کہاں ہے	تجھے بے مروت ۔ مروت کہاں ہے
۷۵ ملائم ہو گئیں دلبر برہ کی ساعتیں کڑیاں پھڑکنے لگی ان بن نکٹ تیں جب بنا گھڑیاں	... ہو گئیں دل پر برہ .... پھر کٹنے لگے ان بن نہ کٹتیں جن بنا گھڑیاں
۷۸۔ جلتا ہوں ایک میں دل پُر آرزو سیلے !	جاتا ہوں ....

کہیں کہیں دو مختلف اشعار کے ایک ایک مصرع کو ملا کر ایک نیا شعر بنا لیا گیا ہے ۔ مثلاً

۲۳۔ توڑ تاز نجیر جاناں تھا پڑا ایکتا بہار لے گیا ہے شوخ میرے ہاتھ سے دل بے طرح	توڑ تاز نجیر جاتا تھا پڑا .... آج ہم دیکھے جنوں سرشار دیوانے کی طرح کیا بلا لادے گا سر پر اس کی حیراں ہوں بہار لے گیا ہے شوخ ....

اس کا بخوبی امکان ہے کہ کسی ایک مخطوطے میں شعر اس طرح لکھا ہو لیکن تینوں نسخوں میں اس غلطی کا پایا جانا حیرت انگیز ہے ۔★ یہیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ تینوں مخطوطوں کا مقابلہ بھی صحیح طور پر نہیں کیا گیا ۔ یہی نہیں بلکہ مذکورہ بالا مثالوں کی موجودگی میں تو یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ شاید متن کی صحیح قرات پر بھی کماحقہ توجہ صرف نہیں کی گئی ۔

مولوی عبدالحق مرحوم کے بعض معترضین بڑی شد و مد سے یہ بات کہتے ہیں کہ مولوی صاحب نہ تو شعر صحیح طور پر پڑھ سکتے تھے اور نہ نثر پڑھنے کا ملکہ انہیں حاصل تھا اور کچھ شک نہیں کہ مذکورہ اغلاط کی موجودگی میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس کا امکان بھی تو ہے کہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں ، ان کی قدیم متون کو جلد سے جلد شائع کر دینے کی خواہش اور غالباً ان کی سہل پسندی نے ان اغلاط کی تصحیح کی طرف متوجہ ہونے ہی نہ دیا ہو ۔ ان کے مزاج کی سادگی کو بھی اس میں دخل ہو سکتا

★ حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے تذکرہ گردیزی کا ایک ناقص الاول مخطوطہ خریدا ہے ۔ راقم سطور نے سرسری طور پر مطبوعہ نسخے سے اس کا مقابلہ کیا چنانچہ اہم تر اغلاط جو سامنے آئیں ، انھی سے یہاں چند مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔ اسی مخطوطے سے یہ دونوں شعر (توڑتا ہے ۔ کیا بلا لادے گا ۔) یہاں لکھے گئے ہیں ۔

ہے۔ میرے نزدیک متن میں جو بھی غلطیاں رہ گئی ہیں، ان میں سے زیادہ کا سبب بے توجہی ہے چنانچہ ذیل میں کچھ نثر کے اقتباسات پیش کرتا ہوں جس سے میرے خیال کو تقویت ہوتی ہے ۔

صفحہ	مطبوعہ عبارت	صحیح عبارت
۶ ۔	مثنوی بہ شور عشق	مثنوی مسمّٰی بہ شور عشق
۱۸ ۔	بحسن سیرت وسلاست طبع	بحسن سیرت وسلامت طبع
۵۲ ۔	گویند بسیار برمی پیچد وخود را ' درزی شعرائے مسلم محبوب می کنند	گویند بسیار برخودی پیچد ...... درزمرہ شعرائے ....

جہاں سہل پسندی، جلد بازی اور بے توجہی ہو، وہاں تحقیق کا گزر ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں معلوم ہوتا کہ مولوی صاحب بالطبع محقق بالکل نہ تھے۔ البتہ چونکہ کام کی اہمیت سمجھتے تھے۔ ان سے ان کے مخصوص حالات میں جو بھی ہو سکا۔ انھوں نے کیا اور کچھ شک نہیں کہ بہت کیا۔ تحقیق و تدوین کے کام کی ضرورت اور اہمیت کا محسوس کر لینا اور دوسروں کو بھی اس کا احساس دلا دینا اور کام کرنے والوں کے لئے خام مواد خود فراہم کر دینا یقینی طور پر مولوی عبدالحق کا وہ کارنامہ ہے جسے اردو تدوین کی تاریخ میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

طبیعیات کی داستان
پروفیسر نصیر احمد عثمانی

طبیعیات کے موضوع پر جامع اور مفصل کتاب جس میں نہایت سادہ اور آسان زبان میں دقیق مضامین کو پیش کیا گیا ہے۔

قیمت :۔ آٹھ روپے پچہتر پیسے

حیوانیات
پروفیسر محشر عابدی

اس کتاب میں حیوانیات سے متعلق تمام معلومات جمع کر دی گئی ہیں اور اس کے محققین کی آرا کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ قیمت تین روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

سرشار کی ناول نگاری

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

رتن ناتھ سرشار اردو کے عظیم ناول نگار ہیں ان کی حیات اور کارناموں پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے ہیں اور وہ بھی نہایت تشنہ ڈاکٹر ادیب نے بڑی محنت سے اس کتاب میں سرشار کے حالات زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالی ہے اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو الٰہ آباد یونیورسٹی نے پی۔ ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی۔

قیمت: چھ روپے پچاس پیسے

غالب۔ فکر و فن

ڈاکٹر شوکت سبزواری

مطالعہ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں۔ انہوں نے غالب کی شخصیت اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں، وہ اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہ مقالات حسب ذیل ہیں۔

غالب محقق کی حیثیت سے
میر و غالب
غالب کے اردو کلام کی اشاعت
غالب، خطوط کے آئینے میں
ذال معجمہ فارسی میں
غالب اور میرٹھ
غالب کی شخصیت

قیمت: — پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

مولوی صاحب کی مکتوب نگاری

نرگس صادق

جدید اردو خطوط نگاری کے امام مرزا غالب ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف مراسلے کو مکالمہ، بنا دیا بلکہ خطوط جیسی نجی و ذاتی چیز کو 'فن' کا مرتبہ بخشا۔ غالب کے خطوط اپنے مواد اور انداز بیان دونوں اعتبار سے نہایت اہم ہیں ۔ ان خطوط ہی میں ایک پورے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی حالات ملتے ہیں دوسری طرف خود مرزا کی حیات کا گوشہ گوشہ اس طرح نمایاں ہے کہ ان سے نہ صرف غالب کی داستان حیات مرتب، بلکہ مکمل بھی ہو سکتی ہے ان میں خلوت و جلوت دونوں کے جلوے ہیں ۔ اور باعتبار انداز بیان یہ منفرد حیثیت کے مالک ہیں ۔ جدید اردو نثر نگاری کے ارتقا میں خطوط غالب بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل یہ میر امن کے سادہ، خوبصورت اور دل کش انداز بیان کو بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھاتے ہیں ۔

خطوط غالب کے بعد مکتوبات شائع کرنا ایک فیشن بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے متعدد مجموعے خطوط کے شائع ہو گئے اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بعض خطوط میں اس عہد کے کچھ سیاسی معرکے، تاریخی حقائق اور سماجی مسائل جن سے تاریخ کے اوراق خالی ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ بعض خطوط اپنی جدت اور طرز ادا کی بنا پر ایک نئے اسلوب بیان کے بانی ہوئے لیکن ایسے مجموعے بہت کم نظر آئیں گے بلکہ غالب کے بعد صرف ایک ہی شخص ایسا نظر آتا ہے جس کے خطوط اپنے مواد اور انداز بیان، ہر اعتبار سے قابل ذکر ہیں اور وہ ہیں مولوی عبدالحق ۔

مکتوبات عبدالحق ایک طرف برصغیر ہندو پاک کی سیاسی داستان ہیں، اس میں پوری ایک صدی کی سیاسی کشمکش ہے، اس میں دور غلامی کے اندھیروں کی کہانی بھی ہے اور غلامی سے نجات پانے کی جد و جہد کے سرفروشانہ نقشے بھی۔ اس میں زنجیر غلامی سے آزاد ہونے کا جانفزا مژدہ بھی ہے اور آزادی کے نام پر جو کشت و خون ہوا اس کا مرثیہ بھی ۔ دوسری طرف یہ خطوط خود مولوی صاحب کی داستان حیات ہیں ۔ ان کے عزم و استقلال، جرأت و حیا کی اور خود داری کی کہانی ہیں، اس میں دوستوں کا بھرپور پیار اور خلوص بھی ہے اور دشمنوں کی دشمنی بھی، اس میں غیروں سے

جنگ آزما ہونے کے مناظر بھی ہیں اور اپنوں سے نبرد آزما ہونے کا ماتم بھی ہے، اس میں فتح وکامرانی کے نشانات بھی ہیں اور شکست کے نقوش بھی۔ غرض کہ یہ خطوط مولوی صاحب کی حیات، انجمن ترقی اردو کے آغاز و ارتقا اور سیاسی و تاریخی وقائع کا مرقع ہیں۔

ان میں مولوی صاحب کی شخصیت اپنے حقیقی رنگ میں نظر آتی ہے ان کے متعلق عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نہایت بدمزاج، خودرائے، اکھڑ اور بددماغ تھے۔ کسی معاملے میں اپنی رائے کے آگے کسی کی نہیں سنتے تھے اور اپنی اسی عادت کی بنا پر اپنے نہایت عزیز دوستوں اور ساتھیوں سے ترک تعلقات کر بیٹھتے تھے۔ لیکن مولوی صاحب کے خطوط تو ہمیں بالکل مختلف کہانی سناتے ہیں، ان خطوط سے مولوی صاحب کی جو تصویر بنتی ہے وہ اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو رشک و حسد اور افواہوں نے بنائی ہے۔ مولوی صاحب مہر و وفا کے پتلے تھے' دوست احباب، اہل قلم حضرات، شاگردوں اور سب سے بڑھ کر اپنے ماتحتوں سے ان کا جو رویہ تھا وہ قابل رشک حد تک اچھا تھا۔ نہ صرف انجمن ترقی کے منصوبوں اور کاموں کے متعلق دوسروں سے مشورے اور رائیں طلب کرتے تھے بلکہ اپنے ذاتی کاموں اور تحریروں کے لیے بھی دوسرے کے مشوروں کے طالب رہتے اور ان کے قابل عمل مشوروں پر عمل پیرا بھی ہوتے۔

ماتحتوں اور شاگردوں سے ان کا رویہ ہمیشہ دوستانہ رہا اور بعض شاگردوں اور ماتحتوں سے ان کا یہ رویہ انتہائی خوش گوار دوستانہ تعلقات کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ نواب منظور جنگ، سید ساجد علی اور منشی محمد علی ایسی ہی دوستی کی مثالیں ہیں جن کا آغاز شاگردی اور ماتحتی سے ہوا اور اختتام بے پناہ دوستی اور محبت پر!!

مولوی صاحب کے مزاج کا اہم جز انکسار اور مروت تھا وہ نہ صرف اپنے رشتے داروں، دوستوں کے ساتھ منکسرانہ وعاجزانہ رویہ اختیار کرتے بلکہ اپنے شاگردوں اور اپنے سے کم رتبہ ومنصب رکھنے والے حضرات' اور اپنے ماتحتوں سے بھی اسی انکسار اور عاجزی سے ملتے، یہ انکسار اور عاجزی مولوی صاحب کی سی عظمت اور مرتبہ رکھنے والوں میں بہت کم ہی نظر آتی ہے اور اس کے حسین جلوے مولوی صاحب کے خطوط کے ہر صفحے اور ہر سطر میں نظر آتے؛ حکیم امامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں" آپ نے جن الفاظ میں میرا ذکر فرمایا ہے اس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن جن محسنین اردو کے ساتھ آپ نے میرا نام لیا ہے' میں ان کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہوں' میرا کیا منہ ہے کہ ان کی برابری کا دعویٰ کروں' میں اردو کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور بس"۔

یہ تو ایک دوست کے نام خط تھا اب ایک ماتحت کو لکھا گیا خط ملاحظہ ہو" میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ا فرائض کس طرح ادا کئے اور آپ کے ساتھ میرے تعلقات کیسے رہے' اس کا اندازہ آپ ہی صحیح طور سے کرسکتے ہیں لیکن ا بہت کمزور مخلوق ہے . . . مجھے خود اپنی کمزوریوں کا احساس ہے اگر آپ کو کبھی میری کسی کمزوری یا غلطی سے رنج پہ ہو تو امید ہے کہ آپ اس سے درگزر کریں گے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کبھی عمداً کوئی ایسی بات نہیں کی ج

پ کو رنج پہنچا ہو۔ آپس کے تعلقات میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے شکایت کا موقع ہوتا ہے اور ممکن ہے
ارے باہمی تعلقات میں بھی ایسے مواقع آئے ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی ایسی بات تھی تو وہ عارضی اور سرسری ہوگی
۔۔۔۔ اور آپ نے جس محبت اور شرافت کا برتاؤ ہمیشہ مجھ سے کیا ہے میں اس کا بہت ممنون ہوں اور اس کا اثر ہمیشہ
رے دل پر رہے گا۔"

اس طرح کے خطوط دوسرے مجموعوں میں بہت کم بلکہ شاید ہی ملیں جس میں ایک افسر، حاکم اپنے ماتحت سے جو
راور منصب دونوں میں اس سے کمتر ہو اس انکسار ، محبت و مروت سے پیش آتا ہے، کس طرح اس کی تعریف و توصیف
نا اور اپنی غیر دانستہ غلطیوں کی معافی چاہتا ہے۔ اپنے ایک ماتحت کو ایک مدرس کی سفارش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔" ان
بھائی نے کئی مہینے سے میری جان کھا رکھی ہے کہ اس کے تبادلے کی سفارش آپ سے کروں۔ میں نے بہتیرا ٹالا اور حیلے حوالے
ے مگر اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، اس وقت بھی میرے سر ہے اس لیے ناچار یہ خط آپ کی خدمت میں لکھتا ہوں اگر کوئی ہرج
ہو تو اس کا تبادلہ کہیں کر دیجیے یا آیندہ جب موقع ہو تو اس کا خیال رکھیے۔"

یہ ہے افسری کی شان کہ کسی لفظ سے تحکم کی بو نہیں آتی۔ مولوی صاحب چاہتے تو حکم دے سکتے تھے لیکن ان کا
ہیشہ یہ انداز رہا کہ انھوں نے اپنے عملے اور ماتحتوں کے کاموں میں کبھی بے جا دخل اندازی نہیں کی البتہ جب کبھی سرزنش
موقع آیا یا ان کی ہدایت کے باوجود ضروری امور سے بے توجہی برتی گئی تو مولوی صاحب نہایت دھیمے لہجے میں اس کی خامی
طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لطیف طنز و مزاح کے رنگ میں اس ناگوار بات کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے ایک ماتحت کو لکھا
ہے "میں نے گزشتہ سال بار بار تاکید کی تھی اور گشتی بھی جاری کی کہ نیچ اقوام کے مدارس اور ان کی تعداد وغیرہ کا خاص طور
رپورٹ میں ذکر کیا جائے لیکن افسوس ہے کہ آپ کی رپورٹ میں ان کا نام تک نہیں۔ کیا آپ بھی انھیں ناقابل ذکر
یال کرتے ہیں؟ کیا سید بھی اب برہمن ہو گئے!! براہ کرم بواپسی نیچ اقوام کے مدارس اور طلبہ کی تعداد کے متعلق جو قابل ذکر
مور ہوں مطلع فرمائیے۔"

منشی محمد علی صاحب کو جو ان کے ماتحت کام کرتے تھے لکھتے ہیں :

عزیز القدر منشی محمد علی سلمہٗ

جانے کے لیے کون سی تاریخ مقرر ہوئی؟	کچھ نہیں معلوم!
بمبئی سے سید کا پیغام آیا؟	کچھ نہیں معلوم!
بمبئی سے کیا جواب لایا؟	کچھ نہیں معلوم!
حامیان اردو کا کام اورنگ آباد میں شروع ہوا یا نہیں؟	کچھ نہیں معلوم!

آخر کچھ معلوم بھی ہے!!

فیضی کو لکھتا ہوں کہ وہ مہینے بھر میں خط کا جواب دیتا ہے اس میں بڑے بڑے حرف تین ہوتے ہیں قدم بوسی، معافی، بیماری اس شخص نے بیماری کو پیشہ بنالیا ہے" (خطوطِ عبدالحق مرتبہ اکبرالدین صدیقی صاحب)

مولوی صاحب کی اخلاقی اداؤں نے دوست، احباب، چھوٹے بڑے، شاگرد، ماتحت سب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ لیکن جہاں مولوی صاحب کے مزاج میں انتہا درجے کا انکسار اور عاجزی تھی وہیں خودداری بیباکی اور جرأت بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اس معاملے میں وہ سرسید احمد خاں کے ہمنوا ہیں انھوں نے کبھی اور کسی موقع پر خوشامد سے کام نہیں لیا نہ کبھی کسی کی بے جا رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کیا حیدرآباد کی شخصی ریاست ہو یا دلّی کا نگر اور لاہور کی گلیاں ہوں یا کراچی کا دیار کہیں اور کبھی مولوی صاحب کا سر نہیں جھکا۔ وہ سر کٹوانا جانتے تھے جھکانا نہیں! بڑے بڑے معرکے رہے شکست کے زخم بھی کھائے اور فتح و کامرانی سے سرخرو بھی ہوئے۔ دشمنوں کے ساتھ ساتھ دوستوں سے بھی صف آرا رہے لیکن کبھی سچائی سے نہ پھرے گاندھی جی، ابوالکلام آزاد، سرسکندر حیات وغیرہ کے نام لکھے ہوئے خطوط پڑھئے اور دیکھئے کہ کس طرح ہتھیلی پر سر رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مولوی صاحب کو بعض دوستوں اور ساتھیوں سے اختلافات بھی ہوئے۔ اور اختلاف ہونا کوئی نئی یا معیوب بات نہیں لیکن مولوی صاحب نے کبھی کسی اختلاف کی "زد" دوستی اور پرانے تعلقات پر نہ آنے دی محمد امین زبیری اور مولوی صاحب میں نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔ محمد امین صاحب کو مولوی صاحب سے کسی مسئلے پر اختلاف تھا اور اسی بنا پر وہ ان سے کچھ عرصے تک کشیدہ رہے لیکن مولوی صاحب نے ان کی کشیدگی اور ناراضگی کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے "اگرچہ آپ ناراض ہیں اور ناراضگی کی حالت میں انسان بہت کچھ تند و تلخ کہہ جاتا ہے لیکن میں نے آج تک ایک لفظ اپنی زبان سے آپ کے خلاف نہیں کہا۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں سے سننا بھی گوارا نہیں کیا .... آپ جو چاہیں کہیں اور لکھیں لیکن اپنی زبان یا قلم سے آپ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں نکالوں گا بلکہ کبھی ایسا موقع آیا تو آپ اپنی تعریف ہی دیکھیں گے" اسی طرح کے خلوص و محبت اور اعلا ظرفی کی مثالیں ان کے خطوط میں ملتی ہیں اپنے ایک صحافی دوست کو لکھتے ہیں کہ "یہ معلوم کرکے بہت افسوس ہوا کہ "صدق" کی وجہ سے آپ کو بہت خسارہ آیا اور آپ نے سب کچھ اس کی نذر کردیا میں ایک چیک اس خط کے ساتھ بھیجتا ہوں یہ حقیر رقم ہے اس کو قبول فرمائیے اور "صدق" ہی میں صرف کیجئے لیکن شرط یہ ہے کہ اخبار یا نجی طور پر مطلق اس کا ذکر نہ آئے اور آپ کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو"

مولوی صاحب کو عموماً نہایت روکھی پھیکی طبیعت، اور خشک مزاج کا سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ان کے خط اس کے برعکس انھیں باغ و بہار قسم کا شخص ثابت کرتے ہیں ان کے خطوط میں جگہ جگہ لطیف و پاکیزہ طنز و مزاح کے ایسے اشارے ملتے ہیں جن کو پڑھ کر بے اختیار مسکراہٹ آجاتی ہے کہیں کسی لفظ سے مزاح پیدا کرتے ہیں کہیں کسی واقعے اور

کہیں خود اپنی ہی شخصیت کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے مزاح کی لطافت کہیں مجروح نہیں ہونے پاتی ۔ غرض ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے آخری دور میں جب انسان دنیا اور دنیا والوں سے بیزار بلکہ اپنے آپ سے بھی بیزار ہو جاتا ہے مولوی صاحب کس قدر خوش مزاج اور زندہ دل تھے۔ بزرگوں ، ساتھیوں ، دوستوں ، شاگردوں اور اپنے ماتحتوں سے نہایت خوش مزاجی سے پیش آتے چھیڑ چھاڑ دل لگی اور شستہ مذاق ان کی شخصیت کا اہم جزو ہے ایک خط میں لکھا ہے " کیا عجیب بات کہ اقبال کا ' شیطان ' آپ کے یہاں پیدا ہوا ہے اس کو میری طرف سے بہت بہت دعا اور پیار کہیئے مسز قریشی اور دوسرے ' معمولی بچوں کو ' پیار اور دعا "[1]

ایک صاحب نے انجمن ترقی اردو کا مستقر ' اجمیر شریف ' تجویز کیا اس کو لکھتے ہیں " اجمیر کی مستقر کی آپ نے خوب کہی ، کیا آپ مجھے درگاہ کا مجاور بنانا چاہتے ہیں حضرت مجھ جیسے آدمی کو تو وہاں کوئی زندہ نہ چھوڑے گا دکن جیسے غفلت شعار اور کم حس ملک میں جب ایک طوفان بپا ہو گیا تو اجمیر میں تو قیامت ہی آ جائے گی ہاں کتابیں عرس کے موقعے پر بک سکتی ہیں مگر افسوس کہ انجمن کے پاس نہ پیروں کی کرامات ، نہ غوث الاعظم حضرت عبدالقادر جیلانی کی کرامات نہ ہنداولی کے حالات بھر بکری کس چیز کی ہو گی ! آپ ساتھ دیں تو ہر عرس پر قوالوں کی ٹولی لے کر پہنچا کروں اس میں کچھ مل جاوے تو مل جائے ۔ سید صاحب ! یاد رکھیئے کہ جتنے شہروں کے ساتھ " شریف " کا لفظ آتا ہے وہاں سے بڑھ کر کہیں نحوست ، جہالت ، بداخلاقی اور افلاس نہیں پایا جاتا مجھے اب تک اجمیر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر اب تک میں نے جتنے شریف شہر دیکھے ہیں ان کی حالت با استثنا یہی ہے ۔ کیا آپ مجھے اجمیر بھیج کر زندہ درگور کرنا چاہتے ہیں ؟"[2]

مولوی صاحب نے محمود احمد عباسی صاحب کو ایک خط لکھا ہے جو ان کی ظرافت کا دلآویز نمونہ ہے لکھتے ہیں " آپ نے پچھلی سردیوں میں مجھے ایک ٹوپی بنوا دی تھی آپ کو معلوم ہے کہ ہماری پڑوسن چیل ایک روز جھپٹا مار کر میرے سر سے لے گئی ، اب سردی کی شروعات ہے ، ابھی سے چھینکیں آنے لگیں ، ہر چھینک پر بجائے الحمدللہ کے آپ کا نام زبان پر آ جاتا ہے ۔ مہربانی فرما کر ویسی ہی ایک ٹوپی پھر بنوا دیجیئے آپ کا یہ احسان میرے سر پر رہے گا "

غرض مولوی صاحب کے خطوط شوخی شگفتگی اور ظرافت میں مرزا غالب کے خطوط سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں کہیں الفاظ سے کہیں حرکات سے اور کہیں موقع اور منظر سے مزاح پیدا کرتے ہیں ۔ ایک سفر کا حال ان الفاظ میں پیش کیا ہے " اول تو ڈبے میں پورے گیارہ حیوان ناطق وغیرہ بھرے ہوئے تھے بعض ان میں خدا کے فضل سے (الضربہ

---

[1] مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی

[2] خطوط عبدالحق مرتبہ اکبرالدین صدیقی

مرد آدمی، ایسے موٹے تازے تھے کہ بلا مبالغہ ایک ایک میں مجھ جیسے دو دو نکلتے اور ان کی شلواریں ایک ایک قیلو کی جگہ گھیرے ہوئے تھیں، وہ سب ایک ساتھ غراتے اور کھنکارتے چیختے چلاتے اور ہنستے قہقہے لگاتے تھے۔ یہ سب آوازیں ملکر جو بعض پیٹ سے بعض گلے سے اور کچھ ناک سے نکلتی تھیں صور اسرافیل کی یاد دلاتی تھیں گویا عالم کہ سارا خطۂ نار معلوم ہوتا تھا رفتہ رفتہ مجھے یقین ہوگیا کہ میں جہنم کو جا رہا ہوں اور ڈبے کے باقی ہم سفر عذاب کے فرشتے ہیں جو مجھے دوزخ میں لیے جا رہے ہیں۔ دوپہر سے دن ڈھلا، تیسرا پہر ہوا، شام ہوئی، شام سے رات ہوئی او میں اسی طرح سکڑا سکڑا یا سہما ہوا کونے میں بیٹھا رہا، سر میں درد، آنکھوں میں جلن، کانوں میں گڑگڑاہٹ، دل میں غصہ، دماغ میں کھولن، اب اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ اس ماحول میں میرا کیا حال ہوگا۔"[1]

ان خطوط میں کہیں کہیں مولوی صاحب نے حیات و کائنات کے متعلق نہایت شگفتہ انداز میں فلسفیانہ خیا کا اظہار کیا ہے، راشدی صاحب کو ایک خط میں لکھا ہے "آپ کے جانے کے بعد ہم خوب سوئے گھوڑے بیچ کر سو کا محاورہ بالکل ہم پر صادق آتا تھا دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی .... ریل چلتی رہی اور ہم سوتے رہے یہی حال انسان کا ہے، دنیا چلتی رہتی ہے اور بدلتی رہتی ہے اور ہم سوتے رہتے ہیں۔ آج کل جو حالات پیش آ ہیں اس میں سوتے ہی گزر جائے تو اچھا ہے۔"

ایک دوسرے خط میں کہتے ہیں "بس آج کل بہت مصروف ہوں کیا ہوں، اب جا کے آنکھیں کھلی ہیں، بچپن سے حیات مستعار اور عمر پنج روزہ سنتے آئے تھے مگر وہ عالم خواب تھا، اب جو آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ دن ڈھل چکا۔ اب آپ اس شخص کی پریشانی کا خیال کیجیے جس کا سارا سامان بکھرا پڑا ہے اور بہت سی چیزیں تلاش کرنی باقی ہ بعض مقامات پر خود جا کر کھوج لگانا ہے .... ہر چیز ٹھکانے لگانی ہے اور یہ سب "غروب" سے پہلے پہلے ہ چاہیئے ہے۔ میں اکثر صبح سویرے مقبرے پر چڑھ کر طلوع آفتاب کا نظارہ کرتا ہوں مگر اس کے 'طلوع' میں بھی مجھے اکثر غروب کا' نظر آتا ہے۔ زندگی ہم اب تک کھیل سمجھا کیے مگر اب معلوم ہوا کہ یہ کیسی کٹھن ہے اور اس کا ایک ایک لمحہ کیسا عزیز اور قیمتی ہے ا اس عمر کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہوئی ہے۔ افسوس کہ رات تھوڑی ہے اور سوانگ بہت ہیں۔"[2]

مولوی صاحب کی زندگی اردو زبان و ادب سے وابستہ تھی ان کی حیات کا ہر ہر لمحہ اسی کے خیال دل نواز سے گزرا۔ اردو سے ان کی یہ وابستگی ہم سب کو معلوم ہے لیکن اس جذب عشق کی حقیقی تصویریں اگر دیکھنا ہوں تو مولوی صاحب کے خ پڑھیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ان کی خوشی و مسرت، رنج و کرب، محنت و آرام سب اسی 'آرام جاں' کے لیے

---

[1] قومی زبان بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء خط بنام حسام الدین راشدی

[2] خطوط عبدالحق مرتبہ اکبرالدین صدیقی

شاید ہی مولوی صاحب کا کوئی خط ایسا ملے جس میں اردو کا ذکر کسی نہ کسی طور سے نہ آیا ہو مجھے مولوی صاحب کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو انھوں نے سرسید احمد خاں کے متعلق لکھے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ "جب قومی خدمت کا بار اپنے سر لیا تو یہ شغف اور بڑھ گیا اس دھن میں وہ سب کچھ بھول گئے فرہاد کو شیریں اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا انھیں اپنی قوم سے تھا سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یہی ان کا ورد تھا، وہ بلا مبالغہ 'فنا فی القوم' کے درجے کو پہنچ گئے تھے" بعینہ یہی تعلق مولوی صاحب کا اردو کے ساتھ تھا اور وہ 'فنا فی الاردو' کے درجے کو پہنچ گئے تھے مولوی صاحب نے اردو کے لیے کیا کچھ تکلیفیں نہ اٹھائیں اور بقول مولوی صاحب وہ اس کے لیے زمین کا گز بن گئے اس کی محبت میں دوست دشمن اور عزیز غیر بن گئے لیکن مولوی صاحب نے اردو کے مقابلے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کی انھوں نے اپنی عزیز سے عزیز شئے کو بھی اردو پر ترجیح نہیں دی تھا کہ خود اپنی ذات حیات پر بھی اردو ہی کو مقدم رکھا مولوی صاحب نے اردو کی ترویج و اشاعت کی خاطر بڑھاپے میں جب ان کے آرام کا وقت تھا غیر منقسم ہندوستان کے کونے کونے تک سفر کیا جگہ جگہ انجمن کی شاخیں، اردو کے مدارس اور کتب خانے قائم کئے اور ہر جگہ اردو کے لیے جگہ بنائی اور اس کی ترقی و اشاعت کی گنجائش پیدا کی۔ کہیں سے سرخرو ہو کر لوٹے اور کہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا غرض کہ عمر کے اس دور میں جب لوگ دو قدم چلنے کے لیے سہارا تکتے ہیں مولوی صاحب اردو کے لیے زقندیں بھر رہے تھے آج شمال میں ہیں تو کل جنوب میں کبھی مشرق سے آفتاب اردو طلوع ہوا تو کبھی مغرب سے ماہتاب اردو نمایاں ہوا غرض جنون خیزی کے اس دور کی تمام وارداتیں، جذب و عشق کی تمام حکایتیں مولوی صاحب کے خطوط میں نظر آتی ہیں ان میں مولوی صاحب کی اپنی ذات سے زیادہ اردو کی داستان حیات کا ذکر ہے مولوی صاحب اس کی خاطر کہاں کہاں گئے کس کس کے در پر جبیں سائی کی، کن لوگوں سے جنگ آزمائیاں اور معرکے ہوئے کس منزل پر کامیاب و کامراں ہوئے اور کہاں شکست کی ٹھوکریں کھائیں اور ان ٹھوکروں نے ان کو شکستہ پائی کے بجائے عزم اور ولولے کی پرواز عطا کی، ان کی ہر شکست ان کے لیے بے پناہ کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اس

ایک خط میں لکھتے ہیں "اب تو بھیک کی کچھ عادت سی پڑ گئی ہے یوں تو بہت سی ذلتیں سہیں پر یہ باقی رہ گئی تھی الحمد اللہ کہ آخر عمر میں یہ سعادت بھی نصیب ہو گئی رفتہ رفتہ گوارا ہو جائے گی اور پھر مزا آنے لگے گا"[1] ایک دوسرے خط میں اپنی جبیں سائی کے متعلق لکھتے ہیں "اس تگ و دو میں بعض اوقات مجھے ایسے حضرات کے دروازوں پر بھی حاضر ہونا پڑا ہے جن سے کبھی ملنا بھی عار سمجھتا تھا لیکن انجمن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے اس کوچے میں ہر ذلت عزت ہے"[2] اردو کے فروغ

اردو کے فروغ اور اس کی ترقی کے لیے مولوی صاحب کس طرح بے چین و مضطرب رہتے تھے اور اس کے لیے

---

[1] مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی

[2] ، ، ، ، ،

کس کس سے اور کس کس طرح کام کیا ان سب کی تفصیل ان کے خطوط میں مل جاتی ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں "مدراس پہنچ کر ایک شاخ قائم کی، بنگلور میں ہماری شاخ موجود ہے، اس کو جگایا اور اس کے کتب خانے کے لیے ایک عمارت تجویز کی جس کے لیے روپیہ جمع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مالابار شمالی و جنوبی ہند کے دوسرے مقامات میں بھی کام کا آغاز کر دیا ہے، انشا اللہ یہاں کام بخوبی چلے گا[1]" دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "میں بے شک کچھ دنوں جنوبی پہاڑ پر رہا لیکن اپنے کام سے غافل نہیں رہا اب کے تامل ناڈ کا دورہ تھا اور راس کماری تک ہو آیا اب میں عینی شہادت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کوہ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک اردو کا راج ہے[2]" ترکی میں مقیم ایک پاکستانی نے وہاں بلا معاوضہ اردو پڑھانی شروع کی تو اس کو ایک خط میں لکھتے ہیں "آپ ایک غیر رسمی کورس ابتدائی اردو کا پڑھانا شروع کریں گے اور بغیر کسی معاوضے کے۔ اس کا آخری فقرہ پڑھ کے میں اچھل پڑا اس کا صلہ تو میں خدا سے بھی نہیں مانگتا، میرا خیال ہے کہ اب اللہ میاں ملائکہ کو بھی اردو پڑھنے کی ہدایت کریں گے اور منکر و نکیر اب قبر میں اردو میں سوال و جواب کریں گے اور جنت میں داخل ہونے کے لیے اردو لازمی زبان قرار پائے گی[3]"

راشدی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں "سب سے بڑی عنایت اور احسان یہ کہ اردو کا کام جو سندھ میں شروع ہو چکا ہے وہ تکمیل کو پہنچ جائے اس سے بڑھ کر دنیا میں میرا کوئی مقصد نہیں، یہی میرا دین و ایمان ہے . . . . سندھ اردو مرکز کے مصارف کے لیے تھوڑا بہت سرمایہ ضرور ملنا چاہیئے اس وقت جس مشکل سے میں کام چلا رہا ہوں وہ میں ہی جانتا ہوں اب یہ کام آپ کے حوالے ہے، بگاڑیئے یا بنایئے، خدانخواستہ اگر بگڑا تو پھر مجھے آپ نہ پائیں گے[4]"

مولوی صاحب کے اپنے دوستوں شاگردوں اور ماتحتوں سے نہ صرف نہایت پرخلوص تعلقات تھے بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح وہ ہر شخص کا خیال رکھتے تھے کس طرح وہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اور ان کی ان ہی باتوں سے محبت اور خلوص کی کیسی حکایتیں مرتب ہوتی ہیں، مہر و وفا کے کیسے فسانے جنم لیتے ہیں، راشدی صاحب نے مولوی صاحب کو ایک بٹیر دیا تھا ایک خط میں ان کو اس بٹیر کے متعلق لکھتے ہیں "میں اب بے چارے بٹیر کی پرورش کا بار بھی برداشت نہ کر سکوں گا ایک صاحب اسے لے جانے کے لیے تیار ہیں لینے آئے تھے میں نے کہا پیر صاحب نے مجھے دیا ہے ان کی اجازت کے بغیر نہیں دے سکتا میں نے ان سے تین دن بعد آنے کو کہا ہے آپ کو کوئی عذر نہ ہو تو ان کے حوالے کر دوں ورنہ پھر آپ جسے چاہیں عنایت کر دیں[5]"

---

[1] مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی

[2] " " " "

[3] " " " "

[4] قومی زبان بابائے اردو نمبر [illegible]

[5] " " " "

مولوی صاحب کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے روشن دماغ اور ترقی پسند تھے وہ زمانے کے اقتضا کے مطابق عمل کرنے اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کو لازمی سمجھتے تھے محمد امین زبیری کو ایک خط میں لکھتے ہیں " ارے میاں! کس کس کی شکایت کروگے زمانہ بہت بدل گیا ہے اور بدلتا جاتا ہے اور تم ابھی تک انھیں جھگڑوں کو دیکھنا چاہتے ہو جو چالیس برس پہلے دیکھ چکے ہو۔ اب نہ وہ علی گڑھ ہے اور نہ وہ علی گڑھ والے اور نہ وہ بھوپال ہے اور نہ وہ بھوپال والے' تم بھوپال جاتے ہو ۱۹۳ء میں ...... اور سماں تمھاری نظروں میں سمایا ہوا ہے بیگم صاحب کے زمانے کا' جس دل و دماغ نے اس عہد میں پرورش اور تربیت پائی تھی وہ اس عہد سے میل نہیں کھاتا۔ ذرا کسی نے بے رخی کی اور تم آپے سے باہر ہوگئے' ذرا کسی نے قاعدے کی بات کی اور تمھارے تیور بدلے قاعدے بدل گئے، قانون بدل گئے، زمانہ بدل گیا' حکومتیں بدل گئیں آسمان زمین بدل گئے اور تم ہو کہ اپنی جگہ پر اٹل کھڑے ہو اور چاہتے ہو کہ دنیا تمھارے گرد گھومے .... پچھلی باتیں بھول جاؤ اور نئے بتوں کے سامنے جھک جاؤ اگر اتنی توفیق نہیں تو سامنے سے چپ چاپ گزر جاؤ اور اپنی آنکھ، ہاتھ زبان کو قابو میں رکھو ان کے بتوں کو برا نہ کہو ورنہ تمھارے خدا کو برا کہیں گے "[1]

یہ چند باتیں تھیں جو ان کے خطوط کے سرسری مطالعے سے سامنے آتی ہیں اگر ان کا بہ نظر غور مطالعہ کیا جائے تو ان سے مولوی صاحب کی ذات و شخصیت کے متعلق ایسی ایسی گرہ کشائیاں اور عقدہ کشائیاں ہوتی ہیں جو بڑی حسین اور دلفریب بھی ہیں اور تحیر خیز بھی۔ ان کے خطوط پڑھ کر ان کا وہ بت چکنا چور ہو جاتا ہے جو افواہوں، حسد اور دشمنی نے تراشا تھا۔ ان کے خطوط سے ان کی شخصیت کے ایسے دلآویز خطوط نمایاں ہوتے ہیں جن سے ایک ایسا پیکر تشکیل پاتا ہے جو ایک اچھے اور مخلص انسان ہی کا کہا جاسکتا ہے ۔

---

[1] مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی

وضع اصطلاحات
مولوی وحیدالدین سلیم

یہ کتاب اردو کے نامور انشا پرداز و عالم مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے یہ بالکل نیا موضوع ہے۔ اس میں اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہیں۔

قیمت: ساٹھ روپے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

گلشن ہمیشہ بہار

نصر اللہ خاں خویشگی نے یہ تذکرہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ ”گلشنِ بے خار“ کے جواب میں لکھا تھا۔ ۱۸۵۳ء یہ پہلی بار شائع ہوا تھا پہلی اشاعت کے بہت کم نسخے اب دستیاب ہیں۔ یہ ایڈیشن ڈاکٹر اسلم فرخی (استاد شعبۂ اردو، کراچی یونی ورسٹی) نے مرتب کیا ہے اس میں ۹۱۴ شاعروں کے حالات ہیں۔ مرتب نے جابجا حواشی لکھ کر اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔۔

آفسٹ کی طباعت صفحات ۳۴۳ قیمت :۔ آٹھ روپے

انجمن ترقیٔ اردو

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

بابائے اردو کی

سیرت کا ایک پہلو

اکبر رحمانی جلگانوی

لانگ فیلو نے بڑی سچی اور امید افزا بات کہی ہے کہ ،

"کسی عظیم شخص کی موت صدیوں تک انسانی زندگی کی راہیں روشن کر دیتی ہے"

مولوی عبدالحق کی اچانک اور بے وقت موت اکثر محبان اردو کیلئے سانحۂ عظیم سے کم نہیں۔ اپنے پُرآشوب دور میں ان کا اٹھ جانا جبکہ اردو زبان کو ایسے جنونی پرستار اردو کی اشد ضرورت ہو۔ یقیناً دلوں پر شاق گذرتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو عزم و عمل میں یقین رکھتے ہیں، بادِ تندِ مخالف سے گھبراتے نہیں بلکہ اسے اونچا اڑانے کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں۔ مسلسل جدوجہد جن کا ایمان ہے، اچانک حادثات اور سانحات سے جن کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں ہوتی۔ راہ عمل میں لگنے والی ہر ٹھوکر سے سنبھلنے کا اشارہ پاکر منزل کی جانب تیزی سے گامزن ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی ہر ناکامی کو کامیابی و کامرانی کا زینہ تصور کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے کسی عظیم رہنما اور شخص کی موت پر دن رات آنسو نہیں بہاتے، تقدیر کا رونا روکر اپنی کم ہمتی اور بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ بلکہ مرنے والے کی زندگی سے درس نمو لیتے ہیں۔ مرنے والے نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جس محنت و ریاضت سے کام لیا۔ مقصد سے جس شوق و شغف کا اظہار کیا اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اور مرنے والے کے ادھورے خواب کی تکمیل کے لئے تن من اور دھن کو نچھاور کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں یہی زندہ اور بیدار قومیں کرتی ہیں۔ اور حقیقت میں مرنے والے عظیم شخص کے لئے یہی صحیح خراج عقیدت ہے۔ بیدار قوم کے اس کردار سے زندگی کی تاریک راہیں روشن ہوتی ہیں۔ راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہوتی ہیں۔ ایسی ہی زندہ قوم کے کردار کو سامنے رکھ کر لانگ فیلو نے شاید یہ بات کہی ہے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق آج ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کی مجاہدانہ زندگی چیخ چیخ کر محبان اردو سے کہہ رہی ہے جیو تو اردو کی خاطر مرو تو اردو کی خاطر، مقصد سے عشق اور پیہم جدوجہد کو اپنی زندگی کا وطیرہ بنالو تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ بابائے اردو کی زندگی سے جو چیز ہر شخص سیکھ سکتا ہے۔ وہ ہے زندگی کا ایک مقصد متعین کرکے اس کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دینے کا سبق"

بابائے اردو کی زندگی کا مقصد سوائے اردو کی خدمت کے کچھ نہ تھا۔ ان کا ہر کام اردو کی بہتری کے لئے ہوتا تھا۔ انھوں نے آخر عمر تک شادی نہیں کی۔ اردو کو اپنی دلہن سمجھا، گیسوئے اردو کو سنوارنے اور تابناک بنانے میں اپنی زندگی وقف کر دی۔ ان کی دوستی اور دشمنی کا معیار ”اردو“ تھا۔ اردو سے جو نفرت کرتا اس سے وہ نفرت کرتے۔ اردو سے جو محبت کرتا اس پر دل و جان نچھاور کرتے تھے جو اردو کا دوست وہ ان کا دوست اور جو اردو کا دشمن وہ ان کا دشمن۔ وہ اردو کی حفاظت کیلئے بڑی سے بڑی شخصیت سے لڑ جاتے تھے اور اس کے لئے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے سامنے جھک جاتے تھے۔ ان کی زندگی اردو کے لئے تھی۔ زندہ رہے تو اردو کے لئے اور مرے تو اردو کے لئے۔ اگر کوئی ان سے کہتا کہ تم اردو کی محبت سے باز آجاؤ تو ہم تمہیں دنیا کی عزت، دولت اور عیش و آرام دیتے ہیں تو یقیناً وہ یہی جواب دیتے۔ ”اگر تم میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دو گے تب بھی میں اردو کا دامن چھوڑوں گا“ اردو ان کا ایمان تھا۔ اس ایمان میں ذرا سا کھوٹ ان کے لئے کفر تھا۔ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی محسن اردو مولوی عبدالحق کا نام بھی زندہ جاوید رہے گا۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو اردو سے جو والہانہ عشق تھا اور انھوں نے نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دیں۔ اس کا اعتراف ہر ادنیٰ و اعلیٰ خادم اردو نے کیا ہے۔ مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین بابائے اردو کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”مولوی عبدالحق صاحب نے گزشتہ چالیس سال میں جس دلجمعی، دل سوزی اور یکسوئی کے ساتھ اردو کی خدمت ہے۔ اس کی مثال زبان و ادب میں تو کیا قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی بہت کم ملے گی۔ انھوں نے فنا فی الاردو ہو کر بقا بالاردو کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔“

مولوی عبدالماجد دریابادی ڈاکٹر عبدالحق کی اردو سے محبت کا ذکر کتنے دلنشیں انداز میں کرتے ہیں۔

”یونانیوں کے خلاقِ مذہب کے مطابق اردو زبان اگر دیوی ہوتی تو شاید اس مندر کے سب سے بڑے پجاری اور پروہت ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہی ہوتے۔ اپنے کو اس خدمت میں ایسا لگایا، لگایا کیا، یہ کہیے کہ مٹایا، کہ عرف ہی بابائے اردو پڑ گیا اور اس عرفیت کی شہرت رفتہ رفتہ اصل نام پر غالب آگئی۔“

فراق گورکھپوری مولوی عبدالحق کی خدمات کا صرف اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی تحریروں سے ادبیات عالیہ کا درس لینے کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ فراق فرماتے ہیں۔

> ”بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی اعلیٰ خدمات کی یاد ہند و پاکستان میں لوگ آسانی سے فراموش نہ کر سکیں گے۔ خود میں نے ان کی تحریروں سے ادبیات عالیہ کا درس لیا ہے۔ ان کی نثر میرے لئے اور مجھ جیسے کئی اوروں کے لئے چراغ راہ رہی ہے۔“

غرض کہ ایوان اردو مولوی عبدالحق کی علمی ادبی اور علمی خدمات سے ہمیشہ منور و تابندہ رہے گا۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید یہ مبالغہ

ہوگا کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور اردو ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں

مولوی عبدالحق جہاں ایک اچھے نثر نگار، اعتدال پسند نقاد اور عظیم محقق تھے ۔ وہاں وہ ایک اچھے اور ہمدرد انسان بھی تھے اردو زبان و ادب کی جتنی انھوں نے خدمت کی اتنی ہی بے بس اور مجبوروں کی بھی کی ۔ کسی انسان کو دکھ میں مبتلا دیکھکر ان کا دل بے چین ہو جایا کرتا تھا ۔ اردو کے اتنے بڑے ادیب نقاد اور محقق ہونے کے باوجود ان میں تکبّر نام کو نہ تھا ۔ اپنے بزرگوں سے ہمیشہ عزت و احترام سے پیش آتے تھے ۔ اپنے سے کم عمروں کی عزت اور حوصلہ افزائی ہمیشہ کرتے تھے ۔

یہی ان کی بڑائی تھی ۔ انہی خوبیوں نے انھیں عظیم شخص بنایا ۔ حکیم محمد سعید دہلوی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی بڑائیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

> "بابائے اردو میں بہت سی بڑائیاں تھیں ۔ ان میں سے ایک بڑائی چھوٹوں کی ہمت افزائی اور ان کا دل بڑھانا تھا ۔ اردو کیلئے کسی نے ذرا سا کام بھی کیا تو بابائے اردو نے اس کا اتنا حوصلہ بڑھایا کہ وہ واقعی کام کا آدمی بن گیا ۔ انھوں نے اس طرح نہ معلوم کتنوں کو بنایا ۔ ان کی حوصلہ افزائی نے بہت سوں کو زندہ رہنے کا اعتماد اور آگے بڑھنے کا ولولہ عطا کیا ۔"
>
> (قومی زبان بابائے اردو نمبر سنہ ۶۱ء)

انسانی خدمت میں مذہب و ملت کی تفریق ان کے راستے میں کبھی حائل نہ ہوئی ۔ یہی وجہ ہے کہ مرتے دم تک ہر مذہب و ملت کے افراد سے ان کے تعلقات خوشگوار رہے ۔ یہ انسان دوستی آجکل عظیم شخصیتوں (نام نہاد) سے مفقود ہوتی جا رہی ہے ۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ لکھا جا رہا ہے ۔ اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا ۔ لیکن ان کی سیرت کا ایک تابناک پہلو جس پر بہت کم لکھا گیا ہے (جو نہ لکھنے کے برابر ہے) جس نے راقم الحروف کو یہ مقالہ لکھنے کی تحریک دی ہے ۔ وہ ان کا غریب اور مستحق طلباء کی امداد کرنا تھا ۔ جن لوگوں نے مولوی عبدالحق مرحوم کی خدمت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا ہے ۔ وہ ان کی سیرت کے اس تابناک پہلو سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ اسی پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بابائے اردو کے ایک قدیم خادم جناب سید بدر عالم نے ریڈیو پاکستان کراچی سے یوم بابائے اردو کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :۔

> "مولوی صاحب کی ایک عادت میرے لئے ہزار نیکیوں سے افضل تھی ۔ اور وہ یہ تھی کہ وہ غریب اور مستحق لوگوں اور بیوہ عورتوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ اور ان کی ہر ممکن امداد کرتے تھے ۔ کسی کو بھی دکھ میں دیکھکر بے چین ہو جایا کرتے تھے ۔ اور اس مذہب و ملت کی کوئی تخصیص نہ تھی ۔ نادار طلباء کا بے حد خیال رکھتے اور ان کی تعلیم میں ہر قسم کی مدد کرتے تھے ۔ وظائف دیتے تھے اور کتابیں مہیا کرتے تھے ۔"
>
> (قومی زبان ۔ بابائے اردو نمبر ۶۲ء)

آج کتنے ایسے ادباء، شعراء اور عظیم شخصیتیں ہیں جن کی سیرت میں یہ تابناک پہلو جھلکتا ہے ۔ جب بھی کسی شاعر یا ادیب

سے "کردار" کے متعلق سوال کیا گیا۔ تو اکثر اپنی انسانی کمزوری کو چھپانے کے لیے سوال پوچھنے والے پر قدامت پرستی اور رجعت پرستی کا الزام لگایا گیا۔ کیونکہ ان کے نظریے اور کردار میں ہمیشہ تضاد رہا ہے۔ لیکن بابائے اردو کی سیرت میں یہ کھوٹ نہیں تھا۔ ان کا کردار ہمیشہ صاف رہا۔ جس نظریۂ زندگی پہ ان کا ایمان تھا اس پر آخر دم تک عمل کرتے رہے، دو عملی کی پالیسی کبھی اختیار نہیں کی۔ دنیاوی منفعت یا کسی سیاسی مصلحت کی بناء پر اپنے نظریے میں تبدیلی نہ کی۔ آغاز سے جس راہ مستقیم کو منتخب کیا، اس پر مرتے دم تک چلتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گفتار و کردار میں کبھی تضاد نہ پیدا ہوا۔ ایسے کردار کے غازی اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو غریب اور مستحق طلبا کی امداد فرماتے ہیں۔ ان کے دکھ درد میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ راہ میں آنیوالی مشکلات کو دور کرنے میں حتی الامکان مدد فرماتے ہیں ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ہمیشہ غریب اور نادار طلبا کی امداد کی۔ ان کو وظائف دیئے، کتابیں مہیا کیں ان کی مشکلات سے آگاہ ہونے پر جہاں تک ہو سکا انھیں دور کرنے کی سعی کی۔ مشکلات میں گھرے ہوئے طالبعلموں کو تسلی و تشفی دی اور ان میں مصائب کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کی۔ جہاں بھی رہے شدید مصروفیات کے باوجود ایسے طالبعلموں سے ہمیشہ رابطہ قائم رکھا۔ خط و کتابت کے ذریعہ ان کے حالات سے آگاہی حاصل کرتے رہے۔ موقع ملنے پر ان سے ملنے بھی گئے۔ ان کی مشکلات کو جانا اور انھیں دور کرنے کی کوشش کی۔ نہ جانے کتنے ایسے طلبا ہوں گے جن کی انھوں نے مدد فرمائی اور ان سے خط و کتابت کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر ایسے خطوط جمع کئے جائیں تو یقیناً بابائے اردو کی سیرت کا یہ تابناک پہلو "گمراہوں" کیلئے چراغ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ ایسے ہی ایک نادار اور غریب طالب علم کے نام بابائے اردو کے لکھے ہوئے چند خطوط مجھے ملے ہیں جنھیں استفادۂ عام کے لئے یہاں پیش کر رہا ہوں۔ جنھیں پڑھکر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی سیرت کے اس تابناک پہلو کو جو اب تک چھپا ہوا تھا سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

خطوط پیش کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس نادار اور غریب طالب علم کے حالات زندگی سے آپ کو متعارف کرا دوں تاکہ آپ یہ جان سکیں آیا یہ طالب علم بابائے اردو کی نظر کرم کا مستحق تھا بھی یا نہیں۔

اس خوش نصیب طالب علم کا نام سید وحید تھا۔ اودے پور میں ان کا جنم ہوا۔ بچپن ہی میں والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ پرورش داخت اور تعلیم و تربیت دادا جان نے کی۔ اودے پور سے انٹرمیڈیٹ امتیازی نمبروں سے کامیاب کیا۔ اسی سال دادا جان کا انتقال ہوا۔ دل کو سخت صدمہ ہوا۔ بچپن ہی سے ذہین و ہوشیار تھے۔ تعلیم سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ والدہ کی بھی دلی خواہش تھی کہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہے۔ گھر کے حالات ایسے نہ تھے کہ مزید تعلیم حاصل کرتے اسی زمانے میں مولوی عبدالحق کو خط لکھا اور اپنے حالات اور تعلیم سے شوق و لگن کو نہایت موثر الفاظ میں بیان کیا۔ مولوی صاحب نے افلاس کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیرے کو فوراً پہچان لیا اور انھیں ہر قسم کی امداد دینے کا یقین دلایا۔ مشکلات سے مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلہ پیدا کرنے کی تلقین فرمائی اور انھیں مزید تعلیم کے لیے علیگڑھ جانے کی ترغیب دی۔ والدہ بھی انتہائی صابر و شاکر خاتون تھی۔ اپنے اکلوتے لڑکے کو تعلیم کی خاطر علیگڑھ جانے کی اجازت دیدی۔ مولوی عبدالحق کبھی منی آرڈر کے ذریعہ کبھی چیک کے ذریعہ ماہانہ پچاس روپیہ روانہ کرتے تھے۔ درسی کتابیں بھی مہیا کرتے تھے۔ ان کے ادبی ذوق کو دیکھتے

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ 'اردو' بھی اعزازی طور پر روانہ فرماتے تھے۔ ان کی والدہ بھی شب و روز سلائی کا کام کر کے اپنے اکلوتے لڑکے کے تعلیمی اخراجات کے لیے جو کچھ ممکن ہوتا تھا، روپئے روانہ کرتی تھیں تاکہ مستقبل کے متعلق جو سہانے خواب بوڑھی ماں نے بن رکھے تھے اِس کی تکمیل جلد ہو سکے۔ سید وحید صاحب کی اکلوتی بہن اور بہنوئی سید بدرالحسن بھی انھیں بہت چاہتے تھے۔ ان کے تعلیمی ذوق و شوق کو دیکھ کر بہنوئی ہمیشہ انھیں چاہتے تھے۔ ان سے علیگڑھ ملنے جاتے تھے اور آڑے وقت ان کی ہر ممکن مدد بھی فرماتے تھے۔

علیگڑھ میں انھوں نے بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کیں۔ بی اے اور ایل ایل بی میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اردو اور انگریزی ادب کا بڑا ہی صاف ستھرا ذوق تھا۔ انتہائی بردبار اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند تھے۔ روزانہ انگریزی میں ڈائری لکھنے کا شوق تھا۔ ان کی ڈائری کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظام الاوقات کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ فجر کی نماز چھوٹ جانے پر افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ کرکٹ کے ایک اچھے کھلاڑی تھے۔ کتب بینی کے سوا کوئی دوسرا فضول شوق نہ تھا۔ تعلیم سے حد سے زیادہ لگاؤ کو دیکھ کر اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر راس مسعود نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ اپنے ذاتی خرچ سے روانہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان کی دلکش شخصیت اور حسن سلوک سے ہر کوئی متاثر تھا۔ ہر ایک ان کی عزت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ پروفیسر حضرات بھی ان کو بہت چاہتے تھے۔ طلبا اور پروفیسر حضرات میں ان کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کئی سال تک علیگڑھ میگزین (اردو، انگریزی) کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس وقت علیگڑھ میگزین کے نگران خواجہ منظور حسین تھے۔ خواجہ صاحب ان کے طرز تحریر کو بہت پسند فرماتے تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلینڈ جانے والے تھے کہ وقت پر کاتب تقدیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ موت کے ظالم ہاتھوں گرفتار کر لئے گئے۔ ہر طالب علم ان کے اچانک انتقام پر زار و قطار رو دیا۔ پورے کالج میں صف ماتم بچھ گئی۔ ان کے انتقال سے ہر طالب علم نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے ان کا کوئی عزیز جدا ہو گیا۔ ادھر طلبا کی یہ حالت تھی لیکن اُدھر اس بوڑھی ماں کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ جس نے اپنے بیٹے کے خوش آئند مستقبل کے لئے دن رات سلائی کر کے آنکھوں کی بینائی گنوا دی۔ جس امید پر مصائب جھیلے۔ اب وہ امید ٹوٹ چکی تھی۔ بوڑھی ماں کے سہانے خواب روتے رہ گئے۔ اور آج تک بوڑھی ماں اپنے عزیز بیٹے کی موت کا غم لئے اپنے سہانے خوابوں کو سینے میں دفن کئے اپنی عزیز بیٹی کے گھر گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہی ہے۔ آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جب بھی بیٹے کی یاد آتی ہے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو جاتا ہے۔

سید وحید علیگڑھ میں دفن کئے گئے۔ وہ ایک اچھے نثر نگار، نقاد اور مترجم تھے۔ ددھیال آگرہ کا ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ اکبرآبادی لکھتے تھے۔ ان کے مضامین علی گڑھ میگزین کے علاوہ لاہور کے ادبی رسائل میں بھی شائع ہوتے تھے۔ سید وحید اکبرآبادی مرحوم نے اردو زبان و ادب کی کیا خدمات انجام دیں اس موضوع پر ان کے ہم عصر پروفیسر آل احمد سرور، ابو ظفر انصاری وغیرہم تفصیلاً روشنی ڈال سکتے ہیں۔ سید وحید اکبرآبادی مرحوم کے حالات زندگی اور ادبی ذوق سے متعلق جو کچھ

معلومات ان کے بہنوئی جناب سیّد بدرالحسن اور حقیقی بھانجے سیّد ضیاء الحسن ٹیچر اینگلو اردو ہائی سکول جلگاؤں کے ذریعہ مجھے ملی۔ اسے اپنے ٹوٹے پھوٹے انداز میں بیان کر رہا ہوں۔ جنھیں پڑھکر ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب نے واقعی ایک ایسے نادار اور غریب طالب علم کی مدد فرمائی جو مستقبل میں آسمان ادب کا ایک درخشندہ آفتاب بن کر چمکتا۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ان کے تعلیمی و ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں ہر ممکن امداد فرمائی۔ اس کا بیّن ثبوت وہ چند خطوط ہیں جو انھوں نے سید وحید اکبرآبادی مرحوم کو لکھے۔ ان خطوط کے ہر لفظ سے خلوص اور محبت ٹپکتی ہے۔ جنھیں پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ بابائے اردو کو غریب اور نادار طلباء سے کتنی ہمدردی تھی۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ ان کی راہ میں حائل مشکلات کو ہر ممکن دور کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ اور ہر وقت ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے لیکن افسوس کہ سید وحید اکبرآبادی مرحوم کے نام جتنے خطوط بابائے اردو نے لکھے۔ ان میں سے صرف ۵ خطوط ہی مل سکے ہیں جنھیں ان کے حقیقی بھانجے سیّد ضیاء الحسن نے محفوظ کر رکھا تھا۔ ضیاء الحسن صاحب کے شکریے کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب کے تحریر کردہ خطوط میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

(۱)

اس خط پر مقام اور تاریخ درج نہیں ہے۔

عزیزمن سلمہٗ

تمہارا خط پہنچا۔ مجھے تمہارے علمی شوق اور ادبی ذوق سے بے حد مسرت ہوئی۔ میں نے ایک سال کا چندہ تمہاری طرف سے انجمن کو ادا کر دیا ہے۔ ’اردو‘ برابر تمہارے پاس پہنچتا رہے گا۔

تمھارے حالات پڑھ کر مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی ہے بے شک تمھارے رستے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ لیکن اگر تمہارا شوق سچا ہے تو سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی ہمت نہ ہارو اور کام کیے جاؤ۔ طالبعلموں کو اس سے زیادہ مصیبتیں پیش آتی ہیں لیکن ہمت اور محنت ہمیشہ ان پر غالب آتی ہیں۔

تمھارا خیر طلب

عبدالحق

(۲)

بنجارہ روڈ حیدرآباد دکن

۱۰ اپریل ۱۹۳۱ء

عزیزمن ۔

تمہارا خط پہونچا۔ خوش ہوں کہ تم خیر و عافیت سے ہو اور اپنی تعلیم میں مصروف ہو۔ ماہانہ رقم تم کو برابر پہنچتی رہے گی ۔ اطمینان سے اپنی تعلیم جاری رکھو۔ ۲۰ر اپریل کو اورنگ آباد جاؤنگا اور وہیں چند روز قیام کرکے شملہ یا اس کے آس پاس کہیں چلا جاؤں گا۔ وہاں سے تم کو خط لکھونگا

عبدالحق

(۳)

اس خط پر صرف تاریخ درج ہے۔ ماہ اور سن نہیں ۔

انجمن ترقی اردو
بنجارہ روڈ حیدرآباد دکن

مورخہ ۱۰

عزیزمن

میں اس سے قبل ایک خط لکھ چکا ہوں۔ آج ـــــہ کا منی آرڈر بھیجتا ہوں۔ آجکل غیر معمولی اخراجات کی وجہ سے زیادہ رقم نہیں بھیج سکا ۔ ایام تعطیلات میں تم اسی پر اکتفا کرو۔

عبدالحق

(۴)

اورنگ آباد دکن
۱۷ر دسمبر ۳۱ء

عزیزمن سلمہٗ

تمہارا خط پہنچا۔ میں آجکل سفر میں ہوں ۔ کل دلی جا رہا ہوں ۔ اس کے بعد وطن جاؤنگا۔ وہاں تین دن ٹھہر کر ..... بعجلت چلنے کا ارادہ ہے ۔ علی گڑھ بھی آؤنگا ۔ ۵، ۶ جنوری تک ۔ حیدرآباد ۱۴، ۱۵ر جنوری تک واپس ہو جاؤں گا ۔

اسی وقت تمہاری کتابوں کے لئے نیز دیگر اخراجات کے لئے رقم بھیجوں گا ۔

عبدالحق

۵

اورنگ آباد دکن
۶ر جولائی سنہ ۳۲ء

عزیز من۔

میں یہاں ۳ر جولائی کو پہنچا۔ تمھارا خط ملا۔ میں نے کوئٹہ سے تمہارے نام سو کا چیک بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے پہنچنے سے پہلے چل پڑے۔ اگر اس چیک کا روپیہ نہ ملا ہو تو واپس کر دو۔ میں پرسوں حیدرآباد جا کر رقم بھیج دوں گا۔ بہرحال اس خط کے پہنچنے یا نہ پہنچنے کے متعلق ضرور اطلاع دو۔

عبدالحق

تقویم سنہ ہجری و عیسوی

تحقیقی کام کرنے والوں کو ہمیشہ ایسی تقویم کی ضرورت رہتی ہے جس سے ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت معلوم ہو سکے انجمن نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ جنتری شائع کی ہے اس سے صحیح سنہ، تاریخ اور دن معلوم کیا جا سکتا ہے۔

قیمت:۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

اشاریہ مضامین اردو

یہ رسالہ "اردو" کے بیالیس برسوں کے مضامین کی مکمل فہرست ہے اس اشاریئے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ "اردو" میں کن کن موضوعات پر مضامین شائع ہوئے اور وہ کن مصنفین کے لکھے ہوئے تھے۔ ہر مضمون کے مندرجات کی وضاحت کی گئی ہے ایسا مفصل اور جامع اشاریہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے۔ (زیر طبع)

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھا

حافظ بشیر احمد غازی آبادی

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق برصغیر پاک و ہند کی ایک جانی پہچانی اور مشہور و معروف شخصیت تھے۔ ان کا وطن مالوف ہاپوڑ تھا جو اتر پردیش کے ضلع میرٹھ میں غلّے کی ایک مشہور منڈی ہے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج سے بی اے کیا۔ اور اس کے بعد تادم واپسیں اردو کے فروغ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ ۱۹۱۱ء میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد مقرر ہوئے اور پھر اس انجمن میں ان کی حیثیت ایک میر مجلس کی سی ہوگئی۔ اس کے باوجود کہ انجمن ترقی اردو کے تقریباً کرتا دھرتا وہی تھے انہوں نے اپنی تمام ذمہ داریوں کو کمال خوش اسلوبی سے انجام دیا اور یہ ثابت کیا کہ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ ادیب اور صف اوّل کے اہل قلم ہیں بلکہ ایک ایسے شریف النفس، اور مرنجان مرنج انسان بھی ہیں جو حسنِ اخلاق اور کردار عظیم سے بہرہ ور ہے، ان کی رواداری وسیع القلبی، فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی کا یہ عالم تھا کہ اپنی ذات سے ایک انجمن بن کر رہ گئے تھے۔ شعر و ادب، تاریخ و سیاست فلسفہ و نفسیات غرض کہ ہر علم اور فن میں وہ نہ صرف دخل رکھتے تھے۔ بلکہ ارباب علم و فن کے نزدیک نہایت ہی قابل احترام شخصیت تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کے علم و معلومات کے اعتراف میں انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ بابائے اردو نے اپنی تنقید نگاری سے خدا جانے کتنے ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، اخبار نویسوں اور اصحاب نگارش کے افکار و خیالات اور احساسات و جذبات میں علم و عرفان، حکمت و دانش، وجدان صحیح اور مذاق سلیم کی خوبیاں پیدا کیں، وہ اردو ادب کی ایک مجسم تحریک تھے۔ جب سے ہوش سنبھالا اور جب تک زندہ رہے، اردو سے ان کو گہری وابستگی رہی اور اسی زبان کی توسیع و ترقی ان کی زندگی کا مشن بن کر رہ گئی۔

قیام پاکستان سے پہلے صرف ایک مرتبہ ۱۹۴۲ء میں احقر کی دہلی میں ان سے سرسری ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ سر اور داڑھی کے بال اس وقت بھی سفید تھے لیکن صحت قابل رشک تھی۔ اور لباس سے بھی نفاست اور سلیقہ مندی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرنے کے عادی تھے اور نیچی آواز سے بولتے تھے۔ ملاقات سے مقصد محض ایک بڑے آدمی سے ملنا نہ تھا بلکہ غرض و غایت یہ تھی کہ چونکہ ایک پرانا ادیب جس کی طہارت فکر، پاکیزگی خیال اور تقدیس ذہن مسلّمہ تھی نئے لکھنے والوں کی اچھی طرح رہنمائی کر سکتا ہے۔ لہذا کیوں نہ اس

کی ذات گرامی سے فائدہ اٹھایا جائے۔

چنانچہ مختصر سی ملاقات میں اس خیال کا اظہار کیا گیا فرمایا کسی ماہنامے یا ہفت روزے میں تمہارا کوئی مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ مطالعہ جس قدر کر سکتے ہو کرو! اور علمی و ادبی صحبتیں جس قدر میسر آئیں ان کو غنیمت سمجھو اور ان میں شرکت کرو! اور ہمیشہ زبان کی بے احتیاطی۔ مزاج کی ناہمواری اور عبارت کی مبالغہ آرائی سے پرہیز کرو۔

بابائے اردو نے شہید ملت لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے پاکستان میں کچھ سال یوں بھی گزارے جب ان جیسی صاحب کردار اور عظیم شخصیت کو سنگ دلانہ مخزے پن غیر صحت مندانہ تنقید اور تعریض اور غیر صالح رویے کا سامنا کرنا پڑا یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں بابائے اردو کے ارد گرد کچھ ایسے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے کہ جن کو اردو کی فلاح و بہبود اور ملکی و قومی مفادات و مصالح سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ محض اپنی ذاتی و نجی مصلحتوں کی تکمیل کے لیے ان کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے! لیکن یہ معمولی لغزش ہرگز اس سلوک کی مستحق نہ تھی کہ اس پیکر علم و عرفاں کی تحقیر جائز سمجھ لی جاتی بے شک بشری کمزوریوں سے بابائے اردو بھی مستثنیٰ نہ تھے اور وہ بعض لوگوں کے ساتھ اس قدر مروت اور نرم مزاجی سے پیش آتے تھے جس سے لغو اور بے معنی الزام تراشی کا دروازہ کھلتا تھا لیکن ان کو ہدف تضحیک بنانا ہوش مندی اور دیانتداری کے سراسر خلاف تھا!

خدا کا شکر ہے کہ جب اس ملک کی باگ ڈور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے ہاتھ میں آئی تو حق بحقدار رسید کے مطابق ان کے اوصاف حمیدہ کی قدر ہوئی۔ اور وہ لوگ متاثر و مرعوب ہی نہیں بلکہ پسپا و مغلوب ہوئے جو بابائے اردو کی دیانت امانت ایثار اور للہیت پر فقرے کستے تھے اور جو قومی زبان کے اس مبلغ و منادا اور نقیب کی مذمت و تنقیص اور ہجو و اہانت میں لطف اٹھاتے تھے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صحافی بھی تھے انھوں نے سب سے پہلے ایک رسالہ "افسر" جاری کیا۔ اور اب سے کم و بیش نصف صدی پہلے "اردو" آپ کی ادارت میں شائع ہوا جو اب بھی شائع ہو رہا ہے انھوں نے آکسفورڈ ڈکشنری کے نمونے پر اردو اور انگریزی ڈکشنری ترتیب دی۔ اس ڈکشنری سے ہزاروں ایسے مترجم پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے اردو کے اخبارات میں ترجمے کی شاندار خدمات انجام دیں۔ اب سے کچھ سال پہلے اور شاید اب بھی یہ قطعی ممکن نہ تھا کہ کسی روزنامے کے دفتر میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی ڈکشنری ترجمہ کرنے والوں کے پاس نہ ہو اور یوں بابائے اردو کی ذات گرامی سے اردو صحافت کا معیار بلند ہوا۔

کراچی میں بابائے اردو سے ملنے میں بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ ملاقات کا سبب یہ ہوا کہ احقر کراچی میونسپل کارپوریشن کا ممبر تھا اور مسٹر محمود ہارون میئر تھے! میں نے ایک روز بر سر اجلاس (۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے) پوچھا کہ بابائے اردو کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے کیا اس سے کراچی کے شہریوں کی نمائندہ میونسپل کارپوریشن واقف ہے۔ میئر نے جواب دیا کہ اس سوال کا کارپوریشن کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے!

خدا جانے یہ بات کس طرح بابائے اردو تک پہنچ گئی! چنانچہ ایک صاحب جو کراچی میں تجارت کرتے ہیں میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ کو بابائے اردو نے یاد کیا ہے۔ میں حاضر ہو گیا۔ دیکھا تو انجمن ترقی اردو کی سب سے اونچی منزل پر (جس میں لفٹ نہیں تھا) یہ محسن اردو تشریف رکھتے تھے! اس زمانے میں راقم الحروف روزنامہ انجام میں قطعات بھی لکھا کرتا تھا۔ اور یوں بابائے اردو غائبانہ طور پر اس کم علم سے واقف تھے۔ فرمایا "ارے بھئی تم حافظ غازی آبادی ہو" عرض کیا جی ہاں! میں نے تو صرف دو لفظ کارپوریشن میں کہہ دیے تھے۔ اس حسن اخلاق اور کردار عظیم سے بہرہ ور عظیم شخصیت نے تقریباً بیس منٹ تک مجھے کلمات تحسین سے نوازا، اور پھر وہ تمام واقعات سنائے کہ کس طرح میرے کتب خانے پر تالا ڈال دیا گیا ہے اور کس طرح کم ظرف لوگ اس خطا کو ہنر سمجھ رہے ہیں اور بجائے شرمانے کے فخر محسوس کر رہے ہیں۔

اس کے بعد کچھ ایسا معمول ہو گیا کہ جب جی چاہا چلے گئے اور مل لئے! میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ بابائے اردو کو جہاں اچھا کھانے اچھا پہننے، صحت کی حفاظت کرنے، صبح کو چہل قدمی وغیرہ کا شوق تھا۔ وہاں خوش طبعی بھی بہت عزیز تھی! نصیحت ایسے ہلکے پھلکے انداز میں کرتے تھے کہ بات ناگوار بھی نہ گزرے۔ انجمن ترقی اُردو اور اردو کی تحریک سے ایسا والہانہ تعلق تھا کہ [illegible] کے لگ بھگ۔ ہزار روپے کی رقم اُن کو پراویڈنٹ فنڈ میں ملی۔ اس فنائے جاہ اور فنائے انانیت کے مجسمے نے وہ ساری رقم انجمن کو دے دی اور اعلان کر دیا کہ میرا سب کچھ اردو اور انجمن ترقی اردو ہے۔ میں ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا۔

جہاں تک ان کی تالیفات، تصنیفات، خطبات، اور تنقیدوں کا تعلق ہے ان کی تعداد بہت کثیر ہے۔ انھوں نے طویل عمر اور اچھی صحت پائی۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ اور نشاط و غم خوب دیکھے۔ فرصت و عافیت کا زمانہ بھی گزارا، اور رنج و تاسف کا دور بھی دیکھا۔ لیکن علمی و ادبی خدمت اور قلمی جہاد میں ایک لمحے کو فرق نہیں آیا۔ بابائے اردو دیانت فکر اور پاکیزگی تخیل کا جیتا جاگتا شاہکار تھے۔ انھوں نے اخلاقی و انسانی قدروں کی تجارت اور ضمیروں کا مول تول کرنے والوں سے کبھی سودے بازی نہیں کی۔ انھوں نے انسانی ضمیر کی پاکیزگی کا وہ مظاہرہ کیا جس سے بلا امتیاز مذہب ملت اور بلا تفریق رنگ و نسل ہر وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو انسانیت کے حقوق ادا کرنا چاہتا ہو۔ انھوں نے تاریخی واقعات و حقائق اور ناقابل تردید دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا کہ اردو زبان اس کی مستحق ہے کہ اس کو قومی زبان بنایا جائے۔ وہ جو کچھ اپنے نصب العین کی تکمیل کے لیے کر سکتے تھے۔ انھوں نے کیا اور باقی کام ان محبان اردو کے ذمے چھوڑ گئے۔ جن کو قومی زبان سے والہانہ عقیدت ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی یادگار منانے اور ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ سب مل کر انجمن ترقی اردو کو ہر حیثیت سے وہ ترقی دیں جس سے اردو کے فروغ میں آسانیاں ہوں۔ مرحوم نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اگر ہم واقعی اس کو پسند کرتے ہیں تو ہمیں اردو کے لیے بھی کوئی نہ کوئی ایثار منظور کرنا چاہیے۔ بابائے اردو نے ساری عمر بڑی دل سوزی اور یکسوئی کے ساتھ اردو کو وہ مقام دلانے کی کوشش کی جو دنیا کی اعلاترین زبانوں کو حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ع

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

لہٰذا اس کو سنوارنے کے لیے ہمیں بھی ہر وہ مخلصانہ جدوجہد کرنی چاہیئے جو امکان بشریت میں ہے۔ بابائے اردو کو ہم سے جدا ہوئے ابھی سات سال ہی کا عرصہ ہوا ہے۔ کیوں نہ محبان اردو اپنے ضمیر کا محاسبہ کریں کہ اردو کے مستقبل کو پائدار بنانے میں ہم نے کوئی کسر تو باقی نہیں چھوڑی ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی زندگی سے ہمیں ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ کسی بھی اچھی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کچھ ایسے حالات بھی سامنے آتے ہیں جو بعض اوقات ہمت شکن ہوتے ہیں لیکن جن کو پروردگار عالم عمل پیہم اور یقین محکم کی سعادت سے نوازتا ہے وہ نامساعد حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ وہ آندھیوں میں چراغ جلاتے ہیں اور تیز و تند طوفانوں کے باوجود اپنی کشتی کو ساحل پر لا کر چھوڑتے ہیں۔ اصل چیز ہے کسی مقصد سے دلی لگاؤ۔ اور بابائے اردو جیسے لوگوں کی زندگی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ لوگ کبھی ناکام نہیں ہوتے جن کے مقاصد میں ملت کی بقا اور قومی ہمدردی شامل ہوتی ہے۔

نیا ادب
پنڈت کشن پرشاد کول

آں جہانی پنڈت کول نے ۱۹۲۵ء کے بارے میں جو مضامین وقتاً فوقتاً لکھے تھے، انہیں اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے فاضل مصنف نے جدید ادب کی نمایاں خصوصیات اور جدید ادیبوں کے ذہنی رجحانات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

——— نیا ادب (تفصیلی جائزہ)
——— نیا افسانہ
——— نئے ادب کے افسانہ نگار
——— نئی شاعری

محمد حسین آزاد
ڈاکٹر اسلم فرخی

یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو کراچی یونیورسٹی نے پی-ایچ-ڈی کی سند عطا کی ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں مولانا آزاد کی زندگی اور ادبی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔

قیمت جلد اول۔ آٹھ روپے
قیمت جلد دوم۔ پندرہ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

بابائے اردو کے ساتھ پانچ سال

سید صلاح الدین

سنہ ۳۸ء میں جبکہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں کانگریسی حکومت کا دور دورہ تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب ایک اردو کانفرنس کی صدارت کے سلسلے میں ناگپور تشریف لائے تھے۔ میں اس زمانے میں ایک جدی جائداد کے مقدمے کے سلسلے میں جو ناگپور چیف کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ ناگپور ہی میں مقیم تھا۔ مکرمی جناب حکیم اسرار احمد کریوی صاحب کے ذریعے میرا تعارف بابائے اردو سے ہوا۔ یہ مولوی صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ گاندھی جی نے زبان کے مسئلے میں جس ناانصافی سے کام لیا تھا اس نے مولوی صاحب کو گاندھی جی اور کانگریس سے سخت بیزار کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کی خواہش تھی کہ صوبہ متوسط و برار میں مسلمانوں کی ذات ثقافت اور سرکاری ملازمتوں اور سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں حقوق نمائندگی پر کانگریس جو ضربیں لگا رہی ہے اس کے کچے چٹھے سے دنیا کو روشناس کیا جائے اس کے لئے ضرورت تھی کہ سارے صوبہ متوسط و برار کا دورہ کر کے مستند اعداد و شمار اور واقعات فراہم کئے جائیں۔ حکیم اسرار احمد صاحب کی تحریک پر یہ ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی۔ میں نے تقریباً چھ ماہ تک سارے صوبہ متوسط و برار کا دورہ کیا۔ اور مطلوبہ اعداد و شمار اور کانگریسی جبر و استبداد کے واقعات فراہم کر لئے۔ اسے ایک رپورٹ کی صورت میں مرتب کر کے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ تھی میرے اور مولوی صاحب کے درمیان ایک دوسرے سے واقف ہونے کی پہلی تقریب۔ خدا کا شکر ہے کہ مولوی صاحب کے حکم کی یہ پہلی تعمیل ممدوح کو بہت پسند آئی۔ اس زمانے میں بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق مرحوم تھے۔ انھوں نے جناب عبدالرحمان صدیقی مرحوم سے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا کہ اگر اس طرح کی کوئی رپورٹ مرتب ہوتی تو وہ اسے اپنے ذرائع سے چھپوا دیں گے۔ صدیقی مرحوم نے یہ اطلاع مولوی صاحب تک پہنچا دی۔ مولوی صاحب نے مجھے دہلی طلب کیا اور رپورٹ کے مسودے کے ساتھ مجھے کلکتے لے گئے۔ نامعلوم اسباب کی بنا پر وزیر اعظم بنگال اپنے وعدے ٹالتے رہے اور آخر یہی رائے قائم کرنی پڑی کہ اس معاملے میں ان کا ارادہ بدل گیا ہے۔ بعد میں یہ رپورٹ "سی۔ پی۔ میں کانگریس راج" کے نام سے شائع ہوئی اور حکیم اسرار صاحب کریوی نے اس کی طباعت و اشاعت اپنے ذرائع سے کام لیکر تکمیل تک پہنچائی۔ چونکہ اس رپورٹ کی تحریری ترتیب و تکمیل جناب حکیم اسرار احمد صاحب کریوی کا خاص حصہ تھا۔ اسلئے وہی اس کے مرتب قرار پائے۔ اس رپورٹ کی تیاری کی بدولت میری استعداد کارکردگی اور بری بھلی صلاحیتوں کا علم مولوی صاحب کو ہوا۔ مولوی صاحب کو اس زمانے میں انجمن ترقی اردو

کے صدر دفتر کے لئے ایک منیجر کی ضرورت تھی۔ اس موقع پر بھی حکیم اسرار احمد کریوی کے توسط سے میرا نام اس اسامی کے لئے زیر بحث آیا اور مولوی صاحب نے انجمن کی انتظامیہ کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی یہاں سے مجھے مولوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا اور ان کے مشاغل، عادات اور مزاج کے قریبی مشاہدے کا موقع ملا۔ ان کی نجی زندگی کے بہت سے واقعات بھی بلا تحسین سامنے آتے گئے۔ جہاں تک میرے مشاہدے اور مطالعے کا تعلق۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کم از دور قیام دہلی یعنی تقسیم سے قبل تک مولوی صاحب کی نجی زندگی میں کوئی بھی ایسا راز یا ایسی خاص بات نہ تھی جو بعد میں معلوم ہونے پر لوگوں کو محو حیرت کر دے۔ مولوی صاحب کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ ان کے انداز و اطوار میں خلوت و جلوت کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نمایاں نہ تھا۔ صبح سو کر اٹھنے سے رات کو سونے تک ایک باقاعدہ نظام عمل کے پابند تھے۔ صبح کاذب کے وقت اٹھتے تھے اور اندھیرے میں سیر کو نکل جاتے تھے۔ کم از کم ڈیڑھ گھنٹے مسلسل چہل قدمی کرتے رہتے تھے۔ پو پھٹے واپس ہوتے تھے اور معمول کے مطابق ٹھنڈے باسی پانی سے جو سرِ شام اس مقصد کے لئے الگ گھڑے میں رکھ دیا جاتا تھا غسل کرتے تھے۔ اس ٹہلنے اور نہانے کے معمول میں سوائے سفر و علالت، نہ کڑکے کی سردی آڑے آتی تھی۔ نہ طوفانی بارش۔ غسل کے بعد ناشتے سے فارغ ہو کر انجمن کے معاملات پر گفتگو، ملاقاتیں، مطالعہ، مراسلت اور تحریر کے مشاغل شروع ہو جاتے تھے۔ ان کے کھانے کے بعد جو عموماً بہت ہی ہلکا ہوتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کسی کی دعوت ہو تھوڑی دیر آرام سے حقہ پیتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی خصوصاً گرمیوں میں کچھ دیر سو بھی جاتے تھے۔ اس کے بعد شام کی چائے تک پھر وہی مشاغل۔ سہ پہر کی چائے کے بعد البتہ موجود یا مدعو لوگوں کے ساتھ خوش گپی کر کے دماغی تکان کو ہلکا کر لیتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد سونے سے پہلے گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی طبیعت نفاست و لطافت کی حامل تھی ہر استعمال کی چیز بہت قیمتی نہ تھی لیکن معیاری ہوتی تھی۔ کھانا مختصر کھاتے تھے جو سادہ اور اچھے قسم کا ہوتا تھا۔ دعوتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں ضرورتاً اور مصلحتاً بھی اور بلا ضرورت بھی (ضرورتاً صرف انجمن کے مفاد اور بہتری کے سلسلے میں) دعوتوں میں کھانا بہت معیاری ہوتا تھا۔ قومی اور سیاسی کاموں میں حصہ لینے کے شوق کے طفیل مجھے اچھے اچھے دسترخوانوں پر کھانے کے کافی مواقع ملے ہیں۔ لکھنؤ اور حیدرآباد کے چند چیدہ دسترخوانوں پر بھی لذت کام و دہن سے مستفید ہوا ہوں۔ لیکن تعلقداران اودھ اور نوابان حیدرآباد (دکن) کے دسترخوانوں پہ تمول اور طباخی کی عجائب کاری کا اظہار زیادہ نمایاں نظر آتا تھا۔ برخلاف اس کے مولوی صاحب کے دعوتی دسترخوان کے کھانے خوش ذائقہ اشتہا انگیز ہونے کے ساتھ ایسے ہوتے تھے کہ آدمی سیر ہو کر کھا سکے۔ یہ نہیں کہ سیر بھر سویوں میں سولہ سیر شکر جذب کر کے طباخی کی کاریگری کا عجیب نمونہ تو سامنے آ گیا۔ مگر مٹھاس کی فراوانی کے سبب چکھنے سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ جن لوگوں نے مولوی صاحب کی میز پر شرف ہم طعامی حاصل کیا ہے۔ انھوں نے اکثر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ بہت ہی صحیح اور معیاری دسترخوان ہوتا تھا۔ مولوی صاحب کھانے کے سلسلے میں اپنے خاص باورچی بشیر احمد کو اکثر کوئی نئی چیز ایجاد کرنے کی ہدایت بھی دیتے تھے، یعنی ایسی چیز بناؤ جس میں یہ خصوصیت ہو اور وہ خصوصیت ہو اور جس میں یہ بات نہ ہو اور وہ بات نہ ہو۔ ایک مرتبہ مجھے بھی ایک ایسی ہی ہدایت کی تعمیل کرنی پڑی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس میں پورے

طور پر کامیاب رہا۔ دوپہر کے کھانے پر قائداعظم مدعو تھے۔ دیگر مدعوئین نواب زادہ لیاقت علی خاں، سر ضیاء الدین، سید حسین امام اور نواب صدیق علی خاں عاہان تھے۔ دعوت سے ایک روز پہلے مولوی صاحب اس فکر میں غلطاں تھے کہ روٹی کی کونسی قسم شریک خوان کی جائے۔ مغلئی روٹیاں، شیرمال، تافتان سے لیکر گاؤزبان اور گاؤدیدہ تک اپنی روغنیت اور ثقالت کے سبب پسندیدہ نہ تھیں۔ انگریزی ہوٹلوں کے بریڈ رول ایک عام سی چیز تھی پھر کیا کیا جائے۔ مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ "کیوں جی کوئی ایسی روٹی تیار نہیں ہوسکتی جو لطیف و سبک ہونے کے ساتھ ساتھ روغنیت اور ثقالت سے پاک ہو۔ میں نے بھی سوچ کر عرض کیا کہ دیکھئے کوشش کرتا ہوں۔ ہمارے ایک کرم فرما دہلی کی انسائیکلوپیڈیا تھے خصوصاً اس اجڑے ہوئے عالم انتخاب شہر کے تمام منتخب ہنرمندوں کاریگروں اور پیشہ وروں کی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ میں نے ان سے عرض مدعا کی۔ وہ مجھے ساتھ لیکر محلہ چتلی قبر کے ایک پرانے باورچی کے پاس پہنچے۔ اس نے ساری تفصیل سننے کے بعد نہایت اطمینان سے کہا کہ مطمئن رہیئے تیار ہوجائے گی۔ میں نے موقع کی نزاکت اور واضح کرنے کے لیے قائداعظم کی دعوت کا حوالہ دیا اور بتایا کہ وہ ہلکے پھلکے انگریزی کھانوں کے عادی ہیں۔ اس نے جواب میں کہا کہ قائداعظم اگر پوری روٹی نہ کھا جائیں تو میرا سر اور آپ کا جوتا سامان جو اس نے بنایا۔ اس میں گھی کا نام نہ تھا۔ اس کی جگہ مکھن استعمال کیا گیا تھا۔ اور کچھ کھویا بھی تھا۔ ایک بجے دن کو دعوت تھی۔ دوسرے دن گیارہ بجے میں باورچی کے پاس پہنچا۔ اس نے روٹیاں جو کلچوں سے بڑی اور شیرمال سے چھوٹی تھیں رنگ سفید تھا اور مخمل کی طرح ملائم تھیں میرے حوالے کردیں۔ میں نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے ایک روٹی میں سے ایک ٹکڑا توڑ کر چکھا اور پھر اپنی طبیعت پر قابو نہ پاسکا اور ایک پوری روٹی دکان پر کھڑے کھڑے کھا گیا۔ قائداعظم نے واقعی ایک پوری روٹی کھائی۔ دسترخوان پر تمام چیزیں اتنی لطیف اور عمدہ تھیں کہ شرکائے دعوت کا بیان ہے کہ ان کے علاوہ قائداعظم نے بھی اس روز اپنے معمول سے کچھ زیادہ کھایا۔ مولوی صاحب کے دسترخوان پر جو کچھ بچتا تھا اور کافی بچتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ نوکروں کے ہاتھ لگتا تھا اور مولوی صاحب نے کبھی یہ بات درخور اعتنا نہ سمجھی کہ دریافت کریں کہ فلاں چیز جو اس قدر زیادہ بچی تھی کہاں گئی۔ لیکن وہ روٹی مولوی صاحب کو اس قدر پسند آئی کہ مہمانوں کے جانے کے بعد نوکروں سے پوچھا کہ پانچ چھ روٹیاں جو بچ گئی تھیں کہاں گئیں اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ چار روٹیاں صحیح سلامت موجود ہیں۔ ہدایت کی کہ انھیں رکھ دیا جائے۔ رات کو کھانے میں کام آئیں گی۔ اس ایک موقعے کے علاوہ میں نے کبھی مولوی صاحب کو بچے ہوئے سامان خوردنی، پھل فواکہات، سبزی وغیرہ کے متعلق ملازموں سے دریافت حال کرتے نہ دیکھا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح مولوی صاحب پر بھی حالت بست و کشاد دونوں کیفیتیں طاری ہوتی تھیں۔ کشاد زیادہ اور بست کبھی کبھی مگر حالت بست میں مولوی صاحب کے الفاظ و انداز کافی ناموزوں اور غیر متوازن ہوجاتے تھے اور مولوی صاحب کے روپ میں کوئی دوسری ہستی نظر آتی تھی۔ باوجود ملنساری اور تواضع کے مولوی صاحب کی طبیعت میں امرائیت اور آمریت کی جھلک نمایاں طور پر موجود تھی۔ آمریت کا انداز فطری تھا یا شاید سرسید کی صحبت و خیالات کا پیدا کردہ تھا۔ امرائیت غالباً حیدرآباد دکن کے طویل قیام کی مرہون منت تھی۔ لیکن تواضع اور ملنساری

ن پر غالب رہتی تھی۔ مولوی صاحب سب سے زیادہ حالی سے متاثر تھے اور غالباً حالی کی زندگی کا قریبی ذاتی مطالعہ اور ان سے عقیدت مندانہ لگاؤ نے باوجود امیریت اور امرائیت کے جراثیم کی موجودگی میں۔ انھیں متواضع اور منکسار بنائے رکھا تھا۔ مولوی صاحب یل جول میں طبقاتی امتیاز کو مطلق دخل نہ دیتے تھے ہر طبقے کے افراد سے یکساں طور پر ملتے تھے۔ اور ہر شخص کی ذاتی خوبیوں اور خامیوں کے لحاظ سے اس کے مقام کا تعین کرتے تھے۔ چند ہم عصر میں سر سید، محمد علی جوہر، راس مسعود کی صف میں نامدیو مالی اور نور خاں کو لا بٹھانا اس کا ثبوت ہے۔ مولوی صاحب کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی وجاہت، تمول یا ناموری سے مجرد اس کی ان صفات کے باعث کبھی متاثر نہ ہوئے اور ایسی ہستیوں سے ملاقات و گفتگو میں اپنی انفرادیت کا انداز ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ لیکن اگر کسی درمیانی درجے کے آدمی کے متعلق بھی مولوی صاحب کو یہ اُمید قائم ہو جاتی تھی کہ اس کے ذریعے انجمن کو خاصا فائدہ پہنچے گا۔ تو مولوی صاحب کا انداز اس شخص کے ساتھ کبھی کبھی اتنا منکسرانہ ہو جاتا تھا کہ بس لجاجت اور خوشامد کی سرحد کو چھونے کے قریب! انجمن کے مفاد کا نشہ ان کی انا پر چھا جاتا تھا۔

میں تقریباً پانچ سال ۴۰ء سے ۴۵ء تک ہند انجمن ترقی اردو دہلی کی انتظامیہ کا ذمہ دار رہا۔ یہ پورا زمانہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اس دور میں حسب ضرورت سامان طباعت و جلد سازی وغیرہ کی فراہمی بے حد مشکل کام تھا۔ لیکن یہ بھی ایک فضل خداوندی کا نمونہ تھا کہ اس پنجسالہ دور میں انجمن نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ کتابیں شائع کیں اور اسی پنجسالہ دور میں انجمن کا میزانیہ (بجٹ) آمدنی و مصارف دونوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ رہا۔ جنگ کے دوران میں اتنی زیادہ کتابوں کی بروقت اشاعت کا کام کس طرح میں نے انجام دیا۔ یہ ایک الگ اور نفس مضمون سے غیر متعلق داستان ہے۔

مولوی صاحب کی یہ فطرت تھی کہ جس پر اعتماد کرتے تھے، دل کھول کر اعتماد کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی اس سخاوت اعتماد سے بعض لوگوں نے خوب فائدے اٹھائے۔ بہر حال یہی کیفیت میرے ساتھ بھی تھی کہ جو چاہوں اور جیسے چاہوں کروں، کام ہونا چاہیئے۔ اور الحمد اللہ کہ میں نے مولوی صاحب کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگنے دی۔ جنگ کے دوران تمام سامان طباعت و جلد سازی کا فی ذخیرہ رکھنا بے حد ضروری تھا خصوصاً کاغذ۔ میں نے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مولوی صاحب سے تذکرہ کیا کہ اگر کافی رقم کے ذخائر فراہم کرلیے جائیں تو بہتر ہوگا کیونکہ سامان اکثر بازار سے غائب ہو جاتا ہے اور قیمتیں زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مولوی صاحب نے حکم دیا کہ تفصیلی حساب بنا کر لاؤ کہ کتنی کتنی رقم کس کس مد کے لئے چاہیئے۔ میں نے دو روز دوڑ دھوپ کر کے تمام ضروری اشیا کی قیمتیں دریافت کیں، مقامات دستیابی کا پتا چلایا اور چار فل اسکیپ صفحوں پر ساری تفصیلات مرتب کرلیں۔ کل مطلوبہ رقم کی میزان پینتیس ہزار روپے تھی اور یہ ساری رقم بصورت نقد رکھنی تھی۔ کیونکہ تقریباً سارا سامان ”چور بازار“ سے خریدنا تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ چور بازاری خرید کے باعث اسناد خرید بھی درست نہ ہوتی تھیں۔ سناد خرید پر تو خریدی ہوئی چیز کی اصل مقدار سے نصف مقدار درج ہوتی تھی اور نرخ اور قیمت تو واقعی ادا کردہ رقم کی ایک تہائی ہوتی تھی اور انجمن کا حساب و کتاب محاسبے کا پابند تھا۔ یہ تمام باتیں احاطۂ تحریر میں لاکر شامل مسل بھی نہ کی جا سکتی تھیں۔ اور زبانی ہی سمجھایا جا سکتا تھا۔ اور کسی ”حیلۂ شرعی‘

ہی کے ذریعے اس تمام حساب کو جواز کی حدود میں لایا جا سکتا تھا۔ میں سوچے ہوئے تھا کہ اس اسکیم پر مولانا کی رضامندی حاصل کرنے میں بہت کچھ کہنا سننا پڑے گا۔ شاید مولوی صاحب یہ مصلحت آمیز بے ضابطگی پسند نہ کریں اور یہ بھی فکر تھی کہ اتنی خطیر رقم کی تحویل کچھ کم اندیشہ بات نہ تھی۔ بہر حال جب میں مولوی صاحب کے سامنے تمام تفصیلات لے کر حاضر ہوا تو مولوی صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو کہا "آیا! آئیے تشریف لائیے! ہاں بھائی کتنی رقم کی ضرورت ہے؟" میں نے کاغذ بڑھا کر سامنے رکھ دیا اور عرض کیا۔ میزان پینتیس ہزار آتی ہے۔ اور نقد رقم ساتھ رکھ کر خریداری کرنی ہے۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ چیک بک لائے ہو۔ میں نے چیک بک حوالے کر دی۔ مولوی صاحب نے چار صفحوں پر مشتمل تفصیلات کو الٹ کر نہ دیکھا اور پینتیس ہزار کا سلف بیئرر چیک لکھ کر حوالے کر دیا۔ اور اس کے بعد بھی کبھی نہ پوچھا کہ کیا کیا سامان لائے ہو۔ کہاں رکھا ہے۔ کتنا خرچ ہوا کتنا باقی ہے۔ یہ تھا مولوی صاحب کی فراوانی اعتماد کا ایک نمونہ؛ اس کے برعکس ایک مرتبہ جبکہ کیفیت بست میں تھے دفتر میں آدھمکے۔ میری میز پر کاغذات کا جائزہ لیا۔ اتفاق سے تین چار بے حد غیر ضروری اور غیر اہم خطوط پڑے ہوئے تھے جنہیں آئے ہوئے ہفتہ بھر ہو گیا تھا۔ کہنے لگے ان کے جوابات گئے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ بس ان خطوں کی غیر معمولی اہمیت پر جواب نہ دینے کے جرم کی سنگینی پر دس منٹ تک بولتے رہے اور اس غلطی کو ایسی غلطی قرار دیا جیسی کہ ابلیس سے آدم کو سجدہ کرنے کی غلطی کہ جس غلطی کے باعث تمام پچھلی خدمات ملیامیٹ، کفارہ نا ممکن اور عقوبت لازمی۔ اسی وقت اتفاق سے میری میز پر روز مرہ کے حساب اور نرخ کا رجسٹر دستخطوں کے لئے رکھا ہوا تھا۔ اس کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس میں ایک خرچ جس کی رقم دو روپے تین آنے تھی، درج تھا۔ اس وقت ٹھیک یاد نہیں آرہا کہ یہ خرچ کس مد میں ہوا تھا۔ شاید کسی اہل کار انجمن کو کسی کام سے نئی دہلی بھیجا گیا تھا اور اسے کرایہ تانگہ آمد و رفت دیا گیا تھا۔ اس خرچ پر بہت برہمی کے ساتھ معترض ہوئے اور کہنے لگے کہ ایسا ہی ضروری تھا تو میری موٹر پر بھیج دیتے۔ اتفاق سے میری زبان سے نکل گیا کہ اس وقت موٹر کی آپ کو خود ضرورت تھی۔ اس پر اور زیادہ تیز ہو گئے۔ اپنی ضرورت سفر اور موٹر کو جہنم کے حوالے کر دیا۔ اور اس "سراسر غیر ضروری اور ناجائز" خرچ کو انجمن کی تباہی کا پیش خیمہ قرار دیا۔ یہاں تک کہہ گئے کہ یہ خرچ "نہ صرف تمہیں بلکہ ہمیں بھی جیل تک پہنچا سکتا ہے۔" تجربے نے یہ سکھا دیا تھا کہ ایسی حالت جذب کے وقتی دوروں کے موقع پر مولوی صاحب سے بحث کرنا یا الجھنا انھیں اور مشتعل اور حالات کو ناخوشگوار تر بنا دیتا ہے۔ اس لئے خاموش رہا۔ آدھ پون گھنٹے کے بعد اٹھ کر چلے گئے۔ اس موقع کے دو ہی گھنٹے بعد مجھے ایک ضروری کاغذ لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ اس وقت تک طبیعت اعتدال پذیر ہو چکی تھی۔ اس وقت وہی پہلے جیسے عبدالحق تھے۔ اسی توجہ اور تبسم کے ساتھ گفتگو کی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اگرچہ یہ کیفیت جذب طویل عرصوں کے وقفے سے مختصر وقت کے لئے ہوا کرتی تھی پھر بھی ان سے قربت رکھنے والوں میں سے ہر شخص کو ان وقتی بگولوں کا چند بار سامنا کرنا ہی پڑتا تھا۔ جناب رفیق الدین صاحب (انجمن کے پندرہ روزہ اخبار "ہماری زبان" کے ایڈیٹر اور کتب خانۂ انجمن ترقی اردو کے مہتمم تھے۔ (آجکل انگریزی روزنامے مارننگ نیوز سے منسلک ہیں) موصوف کے منصبی سرکاری فرائض کے علاوہ

مولوی صاحب کے تمام نجی کام سپرد تھے۔ باورچی خانہ اور دیگر ذاتی اخراجات کا حساب و کتاب ملازموں کی تنخواہ۔ دعوت اور پارٹیوں کا انتظام، سفر کا اہتمام اور مولوی صاحب کی نجی ضرورت کی تمام اشیا کی فراہمی کی ذمہ داری رفیق صاحب پر تھی۔ اس لحاظ سے دارالسلام دریا گنج دہلی کے تمام مکینوں کے مقابلے میں وہ مولوی صاحب سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ اور انھی کو سب سے زیادہ مولوی صاحب کے سامنے آنا پڑتا تھا۔ مدت رفاقت کے لحاظ سے بھی وہ میری نسبت مولوی صاحب سے زیادہ قریب تھے۔ مجھ سے بہت پہلے سے انجمن اور مولوی صاحب کے ساتھ وابستہ تھے اور میرے الگ ہونے کے بعد بھی وابستہ رہے۔ اسی لئے رفیق صاحب کو میری بہ نسبت مولوی صاحب کی کیفیت بست کی ژالہ باری سے زیادہ مستفیض ہونے کا موقع ملا۔

مولوی صاحب طنز و مزاح کے بھی ماہر تھے اور برمحل طنز کرنے سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صحبت میں ایک دو مولانا بھی موجود تھے۔ انداز گفتگو سطحی علمیت اور بے مائیگی فکر کا پردہ چاک کئے دے رہی تھی۔ بابائے اردو اس وقت بڑے موڈ میں تھے گفتگو کا رخ کسی طرح زبانوں کی تدریج و ترقی میں مسلمانوں کی نمایاں خدمات کی طرف ہو گیا۔ بابائے اردو نے مولانا کو چھیڑنے کے لئے کہا کہ "وہ زبان جو صرف مسلمانوں کی بدولت وجود میں آئی، مسلمانوں ہی نے جس کی پرورش و پرداخت کی اور اس لحاظ سے جسے خالص اسلامی زبان کہا جا سکے صرف اردو ہے۔ ظاہر ہے مولانا بھڑک اٹھے اور تیزی کے ساتھ بول پڑے کہ خالص اسلامی زبان تو عربی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا "مولانا آپ کیا فرما رہے ہیں؟ نعوذ باللہ! کفار قریش اور دوزخیوں کی زبان، ابوجہل اور ابی لہب کی زبان کو آپ خالص اسلامی زبان کہہ رہے ہیں۔" مولانا سے اس طنزیہ جملے کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔

مولوی صاحب بہت ہی با اصول انسان تھے۔ ہر کام نظام و اصول کے تحت انجام دیتے تھے اور اس میں مشکل ہی سے لچک پیدا ہوتی تھی۔ مولانا کی اصول پرستی کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب متعدد جامعات کے بعض پرچوں کے ممتحن بھی تھے۔ بشمول جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ ایک صاحب جو حکومت آصفیہ کے سررشتہ ملازمت سے منسلک تھے، کسی امتحان میں شریک ہوئے اور فیل ہو گئے۔ دوسرے سال پھر امتحان دیا۔ مگر ایک پرچے میں ناکام رہے جس کا امتحان اگلے سال دینے کی اجازت مل گئی۔ صاحب موصوف کی ترقی اور مستقبل کا دارومدار اسی امتحان پر تھا اور یہ سال آخری موقع تھا۔ بدقسمتی سے عین امتحان کے روز سخت بیمار پڑ گئے۔ آخری موقع اور مستقبل کے خیال سے مجبور ہو کر گرتے پڑتے تیز بخار کی حالت میں امتحان میں شریک ہوئے اور جیسا کچھ بھی ہو سکا پرچا کیا۔ ظاہر ہے کہ پرچا ایسا نہ ہوا تھا کہ پاس نہ ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ اتفاق سے اس پرچے کے ممتحن مولوی صاحب تھے۔ مستقبل کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر دوڑ دھوپ کر کے کئی صاحب اثر اصحاب کے ذریعے مولوی صاحب تک سفارش پہنچائی کہ تیز بخار کی حالت میں پرچا کرنے کے سبب پرچا اچھا نہیں ہوا ہے۔ ورنہ کامیابی یقینی تھی۔ مولوی صاحب خود امتحان کا پرچہ دیکھ لیں۔ مگر مولوی صاحب نے نمبر بڑھانے سے انکار کر دیا۔ پاس ہونے کے لئے شاید سات آٹھ نمبر ہی کی کمی تھی۔ مولوی صاحب کا جواب یہ تھا کہ ان کے علاوہ کیا معلوم کن کن ناکام شرکائے امتحان کو ان سے زیادہ مجبوریوں میں امتحان دینا پڑا ہوگا

اور یہ ممکن ہے کہ بعض ناکام شرکائے امتحان کا مستقبل تو دور رہا، شاید حال ہی کا انحصار اس امتحان پر ہو۔ اس سلسلے میں ان کے نمبر بڑھانے کے معنی ایسے ناکام شرکائے امتحان کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہوگی۔ صاحب غرض نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور کسی طرح نواب منظور جنگ بہادر کو جو مولوی صاحب کے بہت ہی خاص اور محبوب ترین احباب میں سے تھے، سفارش کرنے پر آمادہ کر لیا۔ پہلے تو مولوی صاحب انکار ہی کرتے رہے مگر جب نواب منظور جنگ بہادر نے روٹھ جانے کا انداز اختیار کیا تو مولوی صاحب کچھ کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ دوست نوازی اور اصول پسندی میں ٹکراؤ کا موقع آ گیا۔ آخر مولوی صاحب نے دونوں سے روبراہ ہونے کا راستہ نکال ہی لیا۔ مولوی صاحب نے یہ کیا کہ تمام شرکائے امتحان کی کاپیوں میں سات سات نمبروں کا اضافہ کر دیا۔

مولوی صاحب کے نزدیک سادہ لوح اور حد سے زیادہ نیک انسان کا وجود زمین پر ایک بار سے کم نہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے کسی بزرگ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بہت ہی نیک اور مرنجان مرنج انسان ہیں، نہ کسی کے برے میں نہ بھلے میں۔ مولوی صاحب کہنے لگے۔ "ہمارے کمپاؤنڈ میں یہ سامنے جو درخت نظر آ رہا ہے بہت ہی نیک مرنجان مرنج ہے نہ کسی کے برے میں نہ بھلے میں۔ بے چارہ چپ کھڑا رہتا ہے۔ لوگ شاخیں اور پتیاں توڑ لیتے ہیں کچھ نہیں کہتا۔ کوئی کاٹ کر رکھ دے تب بھی کچھ نہ کہے گا۔ میاں ایسا نیک اور مرنجان مرنج انسان ایک بے کار تودۂ خاک ہے اور اس کا وجود اپنے لیے اور سوسائٹی کے لیے نقصان رساں ہوتا ہے۔"

مولوی صاحب کی طبیعت میں لطافت اس قدر تھی کہ اسے مجروح ہوتے دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے۔ چائے بہت ہی لطیف و نفیس پیتے تھے۔ قیام دہلی کے دوران جناب فضل احمد کریم فضلی صاحب جو اس زمانے میں کرسیونگ (آسام) میں کلکٹر تھے مولوی صاحب کے لیے اس باغیچے کی چائے بھجواتے تھے جس باغیچے کی چائے شاہ انگلستان کے لیے بکنگھم پیلس بھیجی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک چائے پارٹی میں جس میز پر مولوی صاحب تھے ایک اور صاحب بھی تھے۔ ان صاحب نے مکھن لگے ہوئے توس کا ٹکڑا اپنی چائے کی پیالی میں ڈبو دیا۔ مولوی صاحب سے برداشت نہ ہو سکا اور فوراً اٹھ کر دوسری میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ فرمانے لگے چائے تو وہ لطیف شے ہے کہ گندے آدمی کے سائے سے گندی ہو جاتی ہے۔ چہ جائے کہ مکھن لگے توس کا غلیظ ٹکڑا اس میں ڈبو دیا جائے۔

بلاشبہ مولوی صاحب کی شخصیت فقید المثال تھی۔ بہت ہی سلجھا ہوا دماغ پایا تھا۔ خلیق، ملنسار اور متواضع تھے۔ مولوی صاحب میں تکبر نہ تھا مگر تمکنت تھی۔ تبختر نہ تھا، مگر وقار تھا۔ اکڑ نہ تھی مگر استقامت تھی۔ دبدبہ نہ تھا، مگر شان تھی۔ ان کی خامیوں کے مقابلے میں ان کی خوبیاں بے انتہا زیادہ تھیں اور ان کے کارنامے یقیناً جریدۂ عالم پر ثبت دوام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میری زندگی کے پانچ سال جو انجمن کی خدمت اور مولوی صاحب جیسی عظیم شخصیت کی رفاقت میں گزرے ہیں۔ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہیں کہ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

تلخیص الاُردو

سید ہاشمی فرید آبادی

یہ انجمن کے مشہور جریدے سہ ماہی "اردو" کے تیس سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل علمی و ادبی مقالات شامل ہیں۔

اصول وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم
ہجو سلطان محمود	حافظ محمود شیرانی
کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ	مولوی عبد الحق
بنگالی زبان و ادب کی نشو و نما	دنیش چندر سین
ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ انکی زبانی	مرزا فرحت اللہ بیگ
عماد الملک بلگرامی	عبد الحلیم شرر
بنگالی اور اُردو	محمد اجمل خاں
رومی، نطشے اور اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم
اردو میں دخیل الفاظ	مولوی عبد الحق
ولی کے سن وفات کی تحقیق	مولوی عبد الحق
پرانی اردو میں کتبے	مولوی عبد الحق

قیمت:- پانچ روپے پچاس پیسے

سعادت یار خاں رنگینؔ

ڈاکٹر صابر علی خاں

یہ کتاب سعادت یار خاں رنگینؔ کے حالاتِ زندگی اور جائزہ تصانیف پر مشتمل ہے فاضل مصنف کو اس تحقیقی کارنامے پر پنجاب یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی

قیمت:- پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

یادش بخیر

محمود الرحمان

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے نام سے میں بچپن ہی میں آشنا ہو گیا تھا۔ میرے والد[۱] نے اپنے بڑے[۲] اور چھوٹے[۳] بھائیوں کے ساتھ مل کر آبائی گاؤں کاکو (ضلع گیا) میں ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اس میں برصغیر کے تمام رسائل نہایت پابندی کے ساتھ آتے تھے۔ ان میں دکن سے نکلنے والا پرچا "اُردو" بھی شامل تھا۔ میں اس وقت تعلیم کے نہایت ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا۔ مگر حیدرآباد سے آنے والے رسالے کے سادہ اور پرکشش ٹائٹل پیج پر "اُردو" اور "عبدالحق" ضرور پڑھ لیتا تھا۔ یہ دونوں نام کچھ ایسے تھے کہ ہمیشہ کے لئے ذہن میں محفوظ رہ گئے۔

میں جب سن شعور کو پہنچا تو بابائے اُردو کا ذکر اپنے گھر میں برابر سنتا رہا۔ صوبہ بہار میں، جہاں ہندی بولنے والوں کا تعصب بڑھتا جا رہا تھا۔ اُردو کے فروغ و ارتقا کے لئے جب "انجمن ترقی اردو" کی شاخ قائم کی گئی تو اس کے سکریٹری میرے پھوپھی زاد بھائی قاضی محمد سعید[۴] منتخب ہوئے۔ اُردو کو گوتم و اشوک کے دیار میں اس کا صحیح مقام دلانے کی جو کوششیں قاضی صاحب نے کی ہیں۔ ان سے کسی حال میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سعید بھائی جب بھی پٹنہ سے کاکو آتے، والد صاحب سے مسلسل اُردو کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ اس دوران "بابا" کا نام بار بار آتا۔ میرے والد بذات خود مولوی صاحب سے بے حد متاثر تھے۔[۵]

---

[۱] شاہ منظور الرحمان اختر کاکوی۔

[۲] شاہ ولی الرحمان ولی کاکوی مرحوم

[۳] پروفیسر شاہ عطاء الرحمان عطا کاکوی

[۴] اُردو کے مشہور و معروف محقق قاضی عبدالودود کے چھوٹے بھائی۔ سعید صاحب سے چھوٹے پروفیسر قاضی فرید مرحوم، صدر شعبہ معاشیات کراچی یونی ورسٹی تھے۔

ان کے عظیم کارناموں کا ہمیشہ ذکر کرتے رہتے۔ قاضی سعید کے سامنے بھی بابا کے لائحۂ عمل، ان کی لگن، ان کے بے کراں خلوص اور ان کی اُردو دوستی کا ذکر کرتے رہتے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں قاضی محمد سعید نے بہار جیسے ستم رسیدہ صوبے میں اُردو زبان کی خدمت کا جذبہ بابائے اُردو سے ہی حاصل کیا ہے۔ جب ہی تو انہوں نے اس عظیم مقصد کے لئے اپنی تمام زندگی وقف کر دی جرمنی میں ڈاکٹر محمود حسینؒ کے ساتھ اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود ایک دن بھی ملازمت نہیں کی بلکہ عبدالودود سبحانیؒ کی طرح اسی کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ حتیٰ کہ شادی بھی "اردو زبان" ہی سے رچالی۔ اور میں ابتدا سے ہی اپنے خاندان پر بابائے اردو کے اثرات دیکھتا چلا آرہا تھا۔

جب کالج پہنچا تو بابائے اُردو کے ان گنت مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی گراں قدر تصنیف کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ رسالہ "اردو" کا اقبال نمبر جسے مولوی صاحب مرحوم نے بہت محنت اور جاں فشانی کے ساتھ مرتب کر کے دکن سے شائع کیا تھا۔ میرے مطالعے میں برابر رہا۔ امتحانات میں بھی اس ضخیم و جلیل نمبر نے میری مدد کی۔ علامہ اقبال پر اس قسم کے مبسوط اور مدلل مضامین یکجا دیکھنے کا مجھے پھر اتفاق نہیں ہوا۔

میں اپنی تعلیم کے دوران بابائے اُردو کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی اعلیٰ ادبیت کا قائل ہو چکا تھا۔ ان کی عظمت کے نقوش ذہن و دل پر خود بخود مرتسم ہوتے چلے گئے۔ ان کا اسلوب بیان، ان کا انداز تحریر، ان کی پرخلوص اردو دوستی، ان کا عملِ مسلسل، ان کا جذبِ دروں۔ ان کا ایثارِ گراں مایہ غرض کہ ہر چیز مجھے اپنا گرویدہ بنا چکی تھی۔

جب پاکستان آکر "نقوش" کے شخصیات نمبر میں محترمی ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مضمون" جو بابا پر لکھا گیا تھا، پڑھا تو عقیدت کا جذبہ اور بھی امنڈ پڑا۔ عزت و احترام کا احساس اور بھی فزوں ہو گیا۔ اسی دوران ان کی ایک کتاب "چند ہم عصر" ہاتھ لگ گئی۔ شروع سے آخر تک اسے پڑھ گیا۔ نہ پوچھئے کہ اس کتاب نے کیا کیا اثرات میرے ذہن و دل پر مرتب کئے وہ بلند پایہ ادیب اور یگانۂ روزگار شخص جس کی رسائی بڑے بڑے درباروں میں ہو۔ جس کے حلقۂ احباب میں مشاہیر ہند و پاک شامل ہوں، "نام دیو" جیسے ایک ادنیٰ اور حقیر انسان کو بھی اپنی مستقل تحریر کا عنوان بنا دے، ایک بے مایہ شخصیت کے اندر بھی سرفرازی و سربلندی کے نشان ڈھونڈ نکالے۔ خود مصنف کی عظمت کا سبب نہیں تو اور کیا ہے؟ ـــ "چند ہم عصر" پڑھنے کے بعد یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اس عظیم المرتبت انسان سے ملاقات کا موقع میسر ہوتا۔ کاش سر سیدؒ کے جانشین کی دلنشین گفتگو بھی سن سکتا۔ مگر میرے دل کی آرزو برسوں دل میں رہی۔

یہ ۲۳؍ دسمبر ۱۹۵۸ء کی صبح تھی۔ میں ان دنوں سکھر میں مقیم تھا۔ میرے عزیز دوست آفاق صدیقی[2] نے خبر دی کہ

---

[1] صدر شعبۂ تاریخ عمومی، کراچی یونیورسٹی

[2] سیکرٹری رائٹرز گلڈ پاکستان سکھر ریجن

آج شام بابائے اردو سکھر تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے اعزاز میں رات کے آٹھ بجے اسلامیہ کالج میں ایک جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ مولوی صاحب اس میں تقریر فرمائیں گے۔ میں جلسے میں ضرور شرکت کروں۔

یہ خبر سن کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میری تمنا بر آنے کی ساعت آ گئی تھی۔ میں بچپن سے جس شخص کی عظمت و بزرگی کا تذکرہ سنتا چلا آ رہا تھا۔ اسے قریب سے دیکھنے اور اس کی گفتگو سننے کا شرف نصیب ہونے والا تھا۔

بابائے اردو شام کے وقت سکھر تشریف لے آئے تھے۔ انہیں کالج سے قریب ہی ایک مکان میں ٹھہرایا گیا تھا۔ میں شوق دیدار لیے مقررہ وقت سے پہلے ہی اسلامیہ کالج پہنچ گیا۔ آفاق صدیقی جلسے کے انتظام میں بے حد منہمک تھے۔ انہیں اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ مجھے بابا کے پاس لے چلتے۔ مگر میرے اشتیاق کو ٹھکرا بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے محمد احمد[1] صاحب سے درخواست کی کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ بابائے اردو کی قیام گاہ لیتے جائیں۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اسلامیہ کالج کے پرنسپل نعیم ندوی[2] صاحب پر میری نظر پڑی۔ اس کے بعد ایک ضعیف انسان دکھائی دیا۔ بالکل سفید داڑھی، سر پر ٹوپی نہ تھی۔ اس لیے بال صاف نمایاں تھے جو داڑھی کی طرح سفید نظر آ رہے تھے۔ بڑی اور فکرمند آنکھوں پر ایک عینک لگی ہوئی تھی، نہایت سنجیدگی، متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھے ہوئے جو یہ معمر بزرگ نظر آئے ——— یہی بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق تھے، سرسید کے شاگرد، اسلامی تہذیب و روایات کے علمبردار، اردو کے حامی و مددگار، ادب کے روح رواں، قوم کا سرمایۂ افتخار!

میں نے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ نعیم ندوی صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔

“حال ہی میں صدر پاکستان نے انہیں ایک تصنیف پر انعام دیا ہے۔”

بابا یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فوراً ہی پوچھا:

“تم نے کونسی کتاب لکھی تھی؟”

“بنیادی جمہوریت” میں نے بڑے ادب کے ساتھ جواب دیا۔

بابائے اردو اور بھی خوش ہوئے اور شاباشی دینے لگے۔ معاً انہوں نے سوال کیا۔

“کس زبان میں لکھی تھی؟”

“جی انگریزی میں” میں نے رک رک کر جواب دیا۔

“انگریزی میں؟” انہوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ پھر وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے پر مسرت کی جو لہر دوڑی

---

[1] سابق لیکچرار انگریزی، حال پرنسپل اسلامیہ کالج سکھر، نوجوان افسانہ نگار اقبال فرحت اعجازی کے بڑے بھائی۔

[2] حال استاد شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد

تھی۔ وہ سرد پڑگئی۔ انگریزی کے ذکر سے انہیں اتنی مایوسی ہوئی۔

مجھے بابا کا افسردہ چہرہ دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ انہیں اُردو سے کیسی والہانہ محبت ہے۔ وہ اس کے سامنے بدیسی زبان کا ذکر تک نہیں سننا چاہتے۔ وہ ہر جگہ اردو ہی کا سکہ رواں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کی یہی تمنا ہے کہ ملک میں اردو ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ عوام اسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنائیں۔ اسی میں لکھیں اور اسی کو پڑھیں۔ جب ہی تو انہیں انگریزی زبان میں میری کتاب کے لکھے جانے کا حال معلوم ہو کر بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ اگر یہ سُن لیتے کہ یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے تو ان کی خوشی نہ جانے کس قدر بڑھ جاتی۔

بابائے اُردو انگریزی کے مقابلے میں اردو کو ہر طرح کا حق دلانا چاہتے تھے۔ وہ انگریزی میں کوئی تحریر دیکھنے کے متمنی نہ تھے۔ اس سلسلے کا ایک اور واقعہ مجھے یاد آگیا ہے۔ جب میں نے "اُردو میں بچوں کا ادب" پر تحقیقی کام شروع کیا تو اس ضمن میں معلومات حاصل کرنے کے لئے برصغیر کے مشاہیر ادب کو خطوط لکھے جن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید امتیاز علی تاج، بیگم شائستہ اکرام اللہ، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، عشرت رحمانی، راجا مہدی علی خاں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ تمام لوگوں نے مجھے نہ صرف جواب دیا۔ بلکہ اہم معلومات بہم پہنچائیں مفید مشورے عنایت کئے۔ مگر بابائے اُردو نے رجسٹری سے بھیجے جانے والے خط کی رسید سے بھی مطلع نہیں کیا۔ اس کی وجہ دراصل ان کی ناراضگی تھی جس کا پتا مجھے بعد میں چل گیا۔ میں نے جس کاغذ پر انہیں خط لکھا تھا۔ اس پر میرا نام انگریزی زبان میں چھپا ہوا تھا ، لفافے پر بابائے اردو کا نام اور پتا بھی میں نے انگریزی میں لکھا تھا ـــ اُردو زبان میں تحقیق اور انگریزی سے دلی لگاؤ ـــ بھلا یہ بات بابائے اردو کو کیونکر برداشت ہوتی۔ اور میں جواب سے محروم کر دیا گیا۔ مجھے اپنی اس غلطی پر آج تک ندامت ہے۔

اسلامیہ کالج کے اربابِ حل وعقد نے جلسے کا انتظام چوتھی منزل کی کھلی چھت پر کیا تھا۔ بابائے اُردو کو اس بات کا علم نہ تھا۔ مقررہ وقت پر وہ کالج پہنچے اور مسلسل سیڑھیاں چڑھتے رہے۔ سینکڑوں زینے طے کرکے جب وہ بالائی منزل پر پہنچے تو بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ان سے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ جب تقریر کرنے کے لئے مائکروفون ان کے قریب کیا گیا تو وہ اراکین انتظامیہ پر برس پڑے۔ کہنے لگے کہ "آپ لوگوں نے میری ضعیفی پر بھی ترس نہ کھایا۔ اگر تقریر ہی کرانی تھی تو اس کے لئے آسمان تک کیوں لائے۔" اسی درمیان کوئی محترمہ جو کسی بڑے افسر کی اہلیہ تھیں تشریف لائیں۔ سارا مجمع بابا کی تقریر سے بے توجہ ہو کر آنے والی خاتون کو دیکھنے لگا۔ بلکہ کالج کے بعض حضرات ان کے استقبال کے لئے جلسہ گاہ میں کھڑے بھی ہو گئے۔ بابا کو یہ بات بہت کھلی۔ ان کے غصے کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ قریب تھا کہ وہ ناراض ہو کر بیٹھ جائیں۔ اسی وقت کالج کے ذہین سیکرٹری، جو موقع کی نزاکت کو تاڑ گئے تھے، اٹھے اور انتظامیہ کی طرف سے اردو یونیورسٹی کے لئے روپے کی ایک تھیلی پیش کردی۔ معاً بابائے اُردو کی آنکھیں چمک اٹھیں

ان کے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ ساری کدورت آنِ واحد میں ختم ہو گئی۔ اُردو یونی ورسٹی کے لئے۔ وہ اہالیٔ سکھر کا جذبۂ خلوص دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھے۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ ۹۰ سال کا یہ سن، ضعیفی کا یہ عالم، مضمحل اعضا ـــــ اس کے باوجود اُردو کی محبت نے بابائے اُردو کو سکون و آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ اُردو یونیورسٹی کی لگن نے انہیں سندھ کے دور افتادہ علاقوں کا سفر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس عمر میں تو لوگ پلنگ توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں۔ لیکن بابائے اُردو، اُردو کے فروغ و ارتقا، استحکام و عروج اور سرفرازی و سربلندی کی خاطر شہر شہر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ایک عزم اور ارادہ لئے ـــــ بلند ہمتی و مستقل مزاجی کی جلو میں ـــ!

ایک عظیم الشان علمی کارنامہ

قاموس الکتب

کتابوں سے متعلق یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہو گی۔ پہلی جلد جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے۔ شائع ہو چکی ہے۔ یہ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مکمل فہرست ہے جس میں تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق بنیادی معلومات دی گئی ہیں۔

یہ کتاب $\frac{۲۰\times۳۰}{۸}$ تقطیع کے چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

قیمت:۔ چالیس ۴۰ روپے

انجمن ترقی اُردو

بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

اردو تھیٹر

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

ڈاکٹر نامی نے اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ مرتب کی ہے جس میں ڈراموں، ڈرامانگاروں، اور ڈراماکمپنیوں وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ یہ کتاب دراصل ڈرامے کی انسائیکلوپیڈیا ہے — جو چار جلدوں پر مشتمل ہے ان میں سے تین چھپ چکی ہیں اور چوتھی زیر طبع ہے

سید احمد خاں۔ حالات و افکار

بابائے اردو

ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار سید احمد خاں کی شخصیت اور علمی کارناموں کا جائزہ جس میں بابائے اردو نے سرسید کے حالات اور افکار کے بعض پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو مولانا حالیؔ کی کتاب "حیات جاوید" کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے

قیمت :۔ چار روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

رسالہ "افسر" اور مولانا حالی

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۱۸۹۶ء میں نواب افسر الدولہ نے حیدر آباد دکن سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ جس کا نام "افسر" رکھا۔ ۱۸۹۹ء کے آخر میں نواب صاحب نے مولوی عبد الحق صاحب کو جو اس وقت ریاست میں ملازم تھے۔ اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ مولوی صاحب نے ایڈیٹر ہوتے ہی مولانا حالی کے نام اعزازی طور پر پرچہ بھیجنا شروع کر دیا اور ان سے اس پر ریویو کی درخواست کی۔ مولانا نے اس رسالے پر مختلف اوقات میں پانچ مرتبہ اپنے خیال کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ پانچوں مرتبہ کی تحریریں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

(۱)

"افسر" کا پہلا[۱] نمبر موصول ہوا۔ اس وقت دو تین میگزین ملک میں اچھے نکل رہے ہیں۔ جیسے "معارف" اور "ادیب"[۲]۔ وغیرہ۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اپنے میگزین کو سب سے فائق کر دو۔ مگر یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس نمبر کی جان نواب عماد الملک کا مضمون ہے۔ یہ مضمون انگریزی میں کس مرتبے کا ہوگا؟ جبکہ اردو میں اس میں اس قدر لطافت باقی ہے۔ ترجمہ بھی نہایت عمدہ کیا گیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ پبلک کے مذاق کے موافق کس قسم کے مضامین ہونے چاہئیں؟ اگر میرے نزدیک ایسے پانچ سات مضمون آپ کے رسالے میں نکل سکے' تو اس رسالے کی بہت شہرت ہو جائے گی۔ میں جب تک کہ سرسید کی لائف سے فارغ نہ ہو لوں (اس رسالے کے لئے) کچھ نہیں لکھ سکتا۔

الطاف حسین حالی از پانی پت ۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۰۰ء

(۲)

"افسر" کا پانچواں نمبر پہنچا۔ نہایت افسوس ہے کہ (اس میں) صحت کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا۔ اول تو صحت ہر مضمون میں ضروری ہے۔ اور خاص کر ایسے مضامین میں جو ایک بڑے گروہ کے مذہبی خیالات کے برخلاف شائع ہوتے ہیں۔ صحت کا نہ ہونا نہایت قابل

---

[۱] مولانا کی پہلے نمبر سے مراد ہے مولوی عبد الحق کی ادارت میں شائع ہونے والا پہلا شمارہ (اسماعیل)

[۲] "معارف" پانی پت سے نکلتا تھا اور "ادیب" فیروز آباد سے۔ (اسماعیل)

اعتراض ہے۔ مولوی چراغ علی مرحوم کے مضمون "استرقاق اور تسری" میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ بیان نہیں ہوسکتیں (اس نم میں بہتر تو یہ ہے کہ اس مضمون کو ازسرِ نو صحیح کر کے چھپوایا جائے۔ ورنہ کم سے کم آئندہ مضامین میں صحت کا زیادہ اہتم کیا جائے۔ اگر صحت کا اچھا انتظام نہ ہوگا تو آپ کا رسالہ بدنام ہوجائے گا۔

الطاف حسین حالی
۶ر مئی ۱۹۰۰ء

(۳)

"افسر" کا چھٹا نمبر پہنچا (رسالہ) "جدید اردو کے مشہور مصنفین" پر جو ریویو آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کو میں نے بہت غو سے پڑھا۔ شیخ عبدالقادر صاحب بی اے[1]۔ ایڈیٹر (اخبار) "پنجاب آبزرور" (لاہور) نے یہ ایسّے[2] میرے پاس بھی بھیجا تھا۔ مگر چونکہ و انگریزی میں تھا۔ اس لئے میں اس کے مضمون سے مطلع نہیں ہوسکا۔ ہاں سرسری طور پر اس زمانے میں جب کہ یہ مضمون "پنجاب آبزرور" میں چھپ رہا تھا۔ میں نے یہ سنا تھا کہ یہ انہوں نے فلاں فلاں اشخاص کے لٹریری ورکس[3] پر کچھ لکھا ہے۔ اور جو کچھ میری نسبت ہے مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ اس کا بھی کسی دوست نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔

شیخ عبدالقادر صاحب تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ممتاز شخص ہیں۔ اور میرے دوست ہیں۔ ان کو نہ صرف انگلش لٹریچر سے بلکہ اردو لٹریچر سے بھی ایک خاص مناسبت ہے۔ اور اس کا ثبوت یہی ایسّے ہے جو انہوں نے جدید اردو لٹریچر کے مصنفین پر لکھا ہے۔ اور اس باب میں شمال مغربی اضلاع[4] کے لوگوں پر جو کہ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں اپنی فوقیت ثابت کر ہے۔ کیونکہ آج تک دلی سے لکھنؤ تک کسی شخص نے (کبھی) اس مضمون پر قلم نہیں اٹھایا۔

رہی یہ بات کہ بعض جزئیات میں آپ نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ سو یہ اپنا اپنا مذاق اور اپنا اپنا ٹیسٹ ہے۔ مجھے کم ان کی رائے سے کسی قدر اختلاف ہے۔ نہ اس نظر سے کہ ان کی رائے میری نثر کی نسبت اچھی نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ ا لٹریچر کے ہیروز کا انتخاب جو انہوں نے کیا ہے وہ نہ جامع ہے اور نہ مانع۔

میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے (رسالہ افسر میں) میری نثر کی نسبت کئے ہیں۔ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر

---

[1] یہی صاحب ہیں جنہوں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں اردو کا مشہور ترین پرچہ "مخزن" نکالا۔ اور بعد میں بہت اعلیٰ سرکاری مناصب فائز رہے۔ گورنمنٹ انگریزی سے "سر" کا اعزاز اور "خان بہادر" کا خطاب پایا۔ (اسماعیل)

[2] ایسّے یعنی مضمون یا مقالہ (اسماعیل)

[3] لٹریری ورکس۔ یعنی ادبی کام (اسماعیل)

[4] یعنی صوبجات آگرہ و اودھ (اسماعیل)

(بات) یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں۔ قائم نہیں ہو سکتیں۔ مگر خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کونسی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے ؎

می آریم واز گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام است

(آپ) اس رسالے کے ترقی دینے میں جہاں تک ہو سکے کوشش کیجئے اور نہایت استقلال کے ساتھ اس کو برابر جاری رکھئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آخر کار خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔

الطاف حسین حالی از پانی پت ۹ر جون سنہ ۱۹۰۰ء

(۴)

مئی اور جون (سنہ ۱۹۰۱ء) کا "افسر" پہنچا (اس میں) "حیات جاوید" پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بہ تقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ اگرچہ میں اپنے تئیں اس کا مستحق نہیں سمجھتا۔ لیکن بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہلِ ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چپڑک چپڑک کر جینا کہتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور اپنے تمام مقاصد میں کامیاب کرے

مئی کے پرچے میں "تعدد ازدواج" پر جو مولوی محمد اختر صاحب کا مضمون چھپا ہے۔ اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف میں نے بلکہ جس شخص نے (بھی) اُس کو دیکھا حد سے زیادہ پسند کیا۔

حیات جاوید پر آپ کے ریویو کی تعریف کرنی مجھ کو زیبا نہیں ہے۔ ورنہ مثل وہی ہوگی "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"

الطاف حسین حالی ۲۸ر نومبر سنہ ۱۹۰۱ء

(۵)

کیا "افسر" بالکل بند ہو گیا؟ (افسوس ہے کہ) ہندوستان میں کوئی عمدہ رسالہ نہیں چل سکتا۔ "معارف" "ادیب" "حسن" اور دیگر عمدہ عمدہ میگزین چند روزہ دنیا کی ہوا کھا کر نوبت بہ نوبت راہی ملکِ عدم ہو گئے۔ پھر "افسر" کے چلنے کی کیا امید ہو سکتی تھی؟[1]

(بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں) جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا۔ اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم؟

الطاف حسین حالی ۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۰۲ء

---

[1] مولانا حالی کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ افسر سنہ ۱۹۰۲ء کے شروع میں بند ہوا ہے یعنی اس کی عمر قریباً پانچ برس کی ہوئی (اسمٰعیل)

نصرتی

بابائے اردو

یہ کتاب ملک الشعرائے بیجاپور مُلا نصرتی کے
حالاتِ زندگی اور جائزہ کلام پر مشتمل ہے
اس میں بابائے اردو نے بڑی تحقیق و جستجو سے
نصرتی کے حالات جمع کئے ہیں نیز نصرتی کے غیر
مطبوعہ کلام کا انتخاب مع شرح و حواشی شامل کیا ہے

قیمت :- پانچ روپے

مرحوم دہلی کالج

بابائے اردو

مرحوم دہلی کالج کا شمار ہند و پاکستان کے ان علمی اداروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اس برصغیر میں اشاعت علم کی خدمت صحیح معنوں میں انجام دی۔ دہلی کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور تمام علوم و فنون کی تدریس اردو کے ذریعے ہوتی تھی۔ بابائے اردو نے اس کالج کی تاریخ اس کتاب میں بیان کی ہے۔

قیمت :- چار روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

رسالہ "نورس" کالج ڈے نمبر

سخاوت مرزا

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے اورنگ آباد میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج قایم کیا تھا اور ہر سال ختم سال فصلی پر کالج ڈے منایا کرتے تھے، جس میں ریاست حیدرآباد دکن کے مشاہیر اور امرا بھی مدعو ہوتے تھے۔ جو رقمی امداد بھی دیا کرتے تھے۔ تمہید میں مولوی صاحب مرحوم نے اپنے معاونین کا اس طرح شکریہ ادا کیا ہے:

" ہمارے کالج ڈے میں جو حضرات تکلیف فرماکر اور دور دراز مقامات سے آکر شریک ہوئے ہیں ہم ان سب کی ہمدردی اور عنایت کے تہِ دل سے ممنون ہیں۔ لیکن جن صاحبوں نے ہمارے کاموں میں عملی حصہ لے کر ہمارا ہاتھ بٹایا اور جن عالی حوصلہ اصحاب نے رقم امداد فرمائی ان کا کالج پر بڑا احسان ہے اور ان کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔ جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر نواب حیدر نواز جنگ بہادر کالج کے بڑے مربی اور سرپرست ہیں۔

اس مرتبہ بھی آپ نے امداد دی	۴۰۰ روپے نقد۔ سو روپیہ کی تصویر
۲۔ ڈاکٹر نواب سرامین جنگ بہادر۔ برائے غریب و ہونہار طلبہ	۳۰۰ روپے
۳۔ نواب مسعود جنگ بہادر وظائف طلبہ	۱۲۰ "
۴۔ میر ہاشم علی خاں ناظم عدالت ناندیڑ	۱۲۰ "
۵۔ قمرالدین طیب جی (بمبئی)	۱۰۰ "
۶۔ مسٹر بینرجی رئیس تمغۂ طلائی	۳۵ "
۷۔ بیگم حیدری صاحبہ	۳۵ "
۸۔ مولوی سید احمد مہتم فارماسے آیجنٹا۔ تمغۂ طلائی	۳۵ "
	وغیرہ

جشن یوم کلیہ کی کیفیت۔ از مولوی غلام طیب لیکچرار

قدامت پسندی کو چھوڑ دینا چاہیئے، ہماری زندگی کا عالم بدل گیا ہے، پرانی ٹی کی آڑ قائم نہیں رہ سکتی۔

آج کل کانفرنسیں اور جلسے عام ہوگئے ہیں ۔ مگر ان میں تصنع کی وجہ سے لطف اجتماع نہیں پایا جاتا نہ یکجہتی ہوتی ہے ہمارے کالج کے سالانہ جشن میں ہر بات میں خلوص ہے ، بڑے بڑے لوگ آتے ہیں ، ان کی قدر کی جاتی ہے ، مگر بھگتی نہیں کی جاتی ۔ نہ کھانے پینے میں تکلف ، نہ گفتگو میں رکاوٹ ، نہ رکھائی نہ خوشامد گویا ایک برادری کے لوگ ہیں ۔ اور ایک ہی باغ کے مالی ہیں ، مہمانوں کی خاطرداری ۔ کام میں انہماک ، اتحاد و یکجہتی ، نمایاں ۔

مولوی عبدالحق کا خطبۂ استقبالیہ : مولوی صاحب نے اورنگ آباد کی تاریخ پر اس طرح روشنی ڈالی :-

اس کی شان اور عظمت ، اس کے بیک گراؤنڈ (پس منظر) جس کا دلفریب جلوہ اس گئی گزری حالت میں بھی مسافروں سیاحوں کو لبھانے والا ہے ، یہی وہ مقام ہے جو ایک زمانے میں یادھو راجاؤں کی راجدھانی تھی ، یہی وہ مقام ہے جو ایک زمانے میں سارے ہندوستان کا دارالحکومت تھا ۔ آپ حضرات (تاریخ کے دلدادہ) محمد تغلق کو خبطی اور دیوانہ کہیں مگر میں اس کی اس ادا کی داد دیتا ہوں ، وہ نرا بادشاہ ہی نہ تھا بلکہ شاعر بادشاہ تھا ، شاعر سے میرا مطلب غزل گو شاعر نہیں بلکہ اس کا دماغ شاعرانہ واقع ہوا تھا ، جب تک ویسا ہی دماغ نہ ہو اس کا سمجھنا مشکل ہے ، پھر یہیں وہ مقام تھا جہاں بہمنی حکومت کی بنیاد قائم ہوئی ، یہی خطہ ملک عنبر جیسے باتدبیر وزیر اور سپہ سالار کی اصلاحوں اور رزم آرائیوں کا جولان گاہ رہا یہی شہنشاہ اورنگ زیب کی رزم و بزم کا مستقر تھا ، جب کہ ہندوستان کے بڑے بڑے راجا مہاراجا ، اپنے اپنے پوروں (محلوں) میں شہر کی حفاظت کرتے تھے ، جن کی جاگیریں اور محلے اب تک یہاں موجود ہیں ، اور ان کی یاد دلاتے ہیں ۔ یہیں آصف جاہ (اول) نے اپنے خاندان کی بنیاد ڈالی ، جو اب تک اس خطے پر حکمراں ہے ، آصف جاہ کی گدی اب تک یہاں موجود ہے ، اور اس جگہ سے چند قدم پر ہے ۔

حضرات :

آپ میں سے اکثر صاحب ، ایک بڑے اور نئے شہر سے آئے ہیں ، اور آپ کو یہاں والوں کی صورتوں میں ، ان کی باتوں میں ، ان کی چال ڈھال میں انوکھا پن نظر آتا ہوگا ، یہی حال قدیم شہر والوں کا ہوتا ہے ، جب وہ کسی نو دولتے شہر میں جا پہنچتے ہیں اس لیے بہت ممکن ہے کہ اگر ہمارے کاموں میں قدامت کی بو ہو اور آپ کو جدت نظر نہ آئے تو آپ ہمارے پرانے پن کو غالب کا یہ شعر پڑھ کر معاف فرما دیں گے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

لیکن آپ ایک ایسے گرد و پیش میں ہیں ، جو تاریخی خزانوں سے مالا مال ہے ، اور جس کا ہر گوشہ اور ہر کونا آپ کے اسلاف کی مقدس نشانی ہے ، اور جہاں ہر قدم پر آپ کے لیے مسرت خیز عبرت کا سامان موجود ہے ۔ ایسی حالت میں اگر ہمارے کاموں میں جو آپ ملاحظہ فرمائیں گے اس کی جھلک ہو تو ہم حق بجانب ہیں ۔"

اس کے بعد مولوی صاحب نے نواب حیدر نواز جنگ کے کارناموں کو سراہتے ہوئے ۔ صدارت کی تحریک فرمائی ۔

سلسلۂ روز و شب

(حیات عبدالحق - سنہ وار واقعات)

محمد حبیب اللہ رشدی

یہ حالات انجمن کی پنجاہ سالہ تاریخ اور رسالہ "اردو" اور رسالہ "قومی زبان" کے "بابائے اردو نمبروں" اور بعض دوسری کتابوں سے مرتب کئے گئے ہیں۔ (مرتب)

سنہ	مولوی صاحب کی عمر	معاصر حالات (سیاسی و علمی)	مولوی صاحب کا قیام	مولوی صاحب اور انجمن ترقی اردو
۱۸۶۹ء		لارڈ میو وایسرائے وفات غالب		
۱۸۷۰ء			ہاپڑ	۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء مولوی صاحب کی ولادت بمقام ہاپڑ
۱۸۷۱ء				
۱۸۷۲ء		(لارڈ نارتھ بروک وایسرائے)		
۱۸۷۳ء		سید حسین بلگرامی (عماد الملک) حیدرآباد آئے۔		
۱۸۷۴ء		سید حسین بلگرامی نے "مخزن الفوائد" جاری کیا (میر انیس کی وفات)		
۱۸۷۵ء	۵ سال	(وفات مرزا دبیر)		
۱۸۷۶ء		(لارڈ لٹن وائسرائے) نواب سالار جنگ مع سید حسین بلگرامی انگلستان گئے۔		
۱۸۷۷ء				
۱۸۷۸ء				

۱۸۷۹ء				
۱۸۸۰ء	۱۰ سال	(لارڈ رپن وائسرائے)		
۱۸۸۱ء				
۱۸۸۲ء				
۱۸۸۳ء		وفات سر سالار جنگ		
۱۸۸۴ء		(لارڈ ڈفرن وائسرائے) حضور نظام میر محبوب علی خاں کو اختیارات حکومت ملے ، کی صدارت میں کونسل آف اسٹیٹ مقرر ہوئی۔ نظام نے اپنے استاد سید حسین بلگرامی کو کونسل آف اسٹیٹ کا معتمد (سکریٹری) مقرر کیا اور "علی یار خاں" بو حسن جنگ کے خطابات د نظام نے سالار جنگ مرحوم کے بیٹے لائق علی خاں کو اپنا دیوان مقرر کیا۔	پنجاب	(ریاست حیدرآباد میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار دی گئی ۔)
۱۸۸۵ء	۱۵ سال	انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ میر عثمان علی خاں کی ولادت	پنجاب	
۱۸۸۹ء		محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی سید حسین بلگرامی کو حضور نظام نے "عماد الدولہ" خطاب دیا۔	پنجاب	
۱۸۸۷ء		(لارڈ لینسڈون وائسرائے)	پنجاب	مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم پنجاب میں ہوئی۔ مڈل پاس ہونے کے بعد علیگڑھ بھیجے گئے ۔
۱۸۸۸ء		حیدرآباد میں "دائرۃ المعارف" کا قیام ۔	علیگڑھ	
۱۸۸۹ء		عماد الدولہ سید حسین بلگرامی نظام کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے ۔	علیگڑھ	
۱۸۹۰ء	۲۰ سال	نظام نے سید حسین بلگرامی کو "عماد الملک" کا خطاب دیا ۔	علیگڑھ	

۱۸۹۱ء		وفات حکیم محمود خاں	علیگڑھ	
۱۸۹۲ء			علیگڑھ	
۱۸۹۳ء				
۱۸۹۴ء	۲۴ سال	(لارڈ ایلجن وائسرائے) مجلس ندوۃ العلما لکھنؤ میں قائم ہوئی	علیگڑھ	مولوی عبدالحق نے علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔
۱۸۹۵ء	۲۵ سال	عمادالملک نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی (بار اوّل) ۱۵ جون، وفات مولوی چراغ علی بمقام بمبئی	ہاپڑ بمبئی	مولوی عبدالحق کی شادی بمقام ہاپڑ (؟) مولوی صاحب بمبئی گئے۔
۱۸۹۶ء			بمبئی	شاید اسی سال مولوی صاحب بمبئی سے حیدرآباد پہنچے۔
۱۸۹۷ء		موسیٰ خاں رئیس دتاولی نے علیگڑھ سے رسالہ "معارف" جاری کیا۔ ایڈیٹر سلیم پانی پتی		افسر جنگ نے غالباً مولوی صاحب کو پہلے اپنے بریگیڈ آفس میں ملازمت دی اور پھر مدرسہ آصفیہ کا ہیڈ ماسٹر بنادیا
۱۸۹۸ء		(۱۹ مارچ — وفات سرسید)	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ۔ ملک پیٹھ۔ حیدرآباد
۱۸۹۹ء		(لارڈ کرزن وائسرائے)	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰۰ء	۳۰ سال	عمادالملک نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس رام پور کی صدارت کی (بار دوم) (وفات سید محمد مرتضیٰ بیان و یزدانی میرٹھی)	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰ء			حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰ء		مہاراجا کشن پرشاد دیوان مقرر ہوئے لارڈ کرزن کا دورۂ حیدرآباد (کرزن نے دباؤ ڈال کر نظام سے برار کا دوامی پٹہ حاصل کیا) عمادالملک لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ وہ دوسرے عہدوں سے سبکدوش ہوکر صرف ناظم تعلیمات رہے۔ (وفات پنڈت رتن ناتھ سرشار بمقام حیدرآباد)	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰ء		حکومت ہند نے سر جارج کیسن واکر کو حیدرآبا		

		کا وزیر فینانس بنا کر بھیجا حیدری صاحب سکریٹری فینانس بنے	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰۴ء			حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰۵ء	۳۵ سال	(لارڈ منٹو وائسرائے) وفات داغ بمقام حیدرآباد	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰۶ء		آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰۷ء		عماد الملک انڈیا کونسل کے ممبر ہوئے۔	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰۸ء		موسیٰ ندی کی طغیانی شہر حیدرآباد کی تباہی (وفات مرزا غلام احمد قادیانی)	حیدرآباد	ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ
۱۹۰۹ء		عزیز مرزا، ظفر علی خاں، شرر وغیرہ ریاست بدر کئے گئے۔ واکر کی جگہ وزارت فینانس پر آر۔ آئی۔ آر گلانسی کی آمد، حیدری صاحب کی معتمدی فینانس سے معتمدی امور داخلہ پر منتقلی		مترجم ہوم آفس (ظفر علی خاں کی جگہ مولوی عبدالحق مترجمی کی خدمت پر مامور ہوئے۔)
۱۹۱۰ء	۴۰ سال	(لارڈ ہارڈنگ وائسرائے) (وفات عزیز مرزا۔ وفات محمد حسین آزاد وفات سرور جہان آبادی۔	حیدرآباد	مترجم ہوم آفس
۱۹۱۱ء		میر محبوب علی خاں کی وفات میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی عثمان علی خاں نے مہاراجا کشن پرشاد کو دیوانی سے الگ کر کے سرسالار جنگ کے پوتے یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کو دیوان بنایا اور نواب عماد الملک کو ان کا مشیر (مشیر المہام) مقرر کیا	حیدرآباد	۲ر فروری کو مولوی صاحب مسٹر گوبندراجیندر کالے کی جگہ تین مہینے کیلئے مہتمم تعلیمات (حیدرآباد) مقرر ہوئے۔ کالے صاحب نے چھ مہینے کی اور رخصت لی۔ پھر ان کا تبادلہ اورنگ آباد کر دیا گیا۔ اس لئے مولوی صاحب کو بہ حیثیت مہتمم اورنگ آباد جانا پڑا۔
۱۹۱۲ء	۴۲ سال		اورنگ آباد	مہتمم تعلیمات اورنگ آباد۔ اس سال دسمبر کے مہینے میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے منعقدہ لکھنؤ میں مولوی صاحب انجمن ترقی اردو کے معتمد منتخب ہوئے

۱۹۱۳ء			اورنگ آباد	مہتمم تعلیمات۔ معتمد انجمن۔ انجمن ترقی اردو کے کام کا آغاز ہوا۔ نواب عماد الملک کو انجمن کا مستقل صدر بنایا گیا ان کے اثر سے حکومت حیدرآباد نے انجمن کے لئے بارہ سو روپیہ سالانہ امداد منظور کی ۔
۱۹۱۴ء		پہلی جنگ عظیم کا آغاز عثمان علی خاں نے سالار جنگ کو دیوانی سے علیحدہ کردیا اور وزارت کا کام خود کرنے لگے ۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام ۔ (وفات مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد)	اورنگ آباد	مہتمم تعلیمات و معتمد انجمن۔ مولوی صاحب نے انجمن کی شاخیں قائم کیں۔
۱۹۱۵ء	۴۵ سال	سید راس مسعود ناظم تعلیمات مقرر ہوئے ۔ فروری میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا سالانہ جلسہ شہر حیدرآباد میں ہو ۔	اورنگ آباد	مہتمم تعلیمات۔ انجمن کی کتابوں کی ایجنسی الناظر پریس لکھنؤ کو دی گئی۔ دو سال کی مدت میں مولوی صاحب نے انجمن کیلئے آٹھ ہزار روپیہ جمع کیا۔ مولانا عبدالماجد کی کتاب "فلسفہ اجتماع" الناظر پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی ۔ مولوی صاحب نے اردو میں تعلیم دینے والی یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے سر اکبر حیدری کو آمادہ کرلیا۔ مولوی صاحب نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں عملی حصہ لیا۔
۱۹۱۶ء		(لارڈ چیمس فورڈ وائسرائے) انڈین نیشنل کانگریس نے ہوم رول کا مطالبہ پیش کیا۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ شہر اورنگ آباد میں ہوا۔		— ناظم تعلیمات راس مسعود کے ماتحت دارالترجمہ قائم ہوا۔ مولوی عبدالحق ناظم دارالترجمہ مقرر ہوئے ۔ — انجمن کو حکومت حیدرآباد سے پانچ ہزار سالانہ کی امداد منظور ہوئی ۔ — حکومت بھوپال نے انجمن کے لئے چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد منظور کی ۔ — مولانا عبدالماجد کا مترجم فلسفہ کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ وہ یکم ستمبر کو حیدرآباد پہنچے اور اسی روز سے کام شروع کردیا۔

			۔ مولوی صاحب نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ جلسے میں بھی عملی حصہ لیا۔
۱۹۱۷ء	حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کو بتدریج حکومت خود اختیاری دینے کا اعلان کیا۔ گاندھی جی نے چمپارن اور ضلع کیرا میں مقاومت مجہول کی تحریک چلائی۔ حیدرآباد کے اخباروں میں فلسفہ اجتماع پر اعتراضات شائع ہونے لگے	حیدرآباد	ناظم دارالترجمہ ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی مولوی صاحب کی لکھی ہوئی عرضداشت حضور نظام کے ملاحظے میں منظوری کے لئے بھیجی گئی۔ علمی اصطلاحات کی تیاری کے لئے حکومت حیدرآباد نے انجمن ترقی اردو کو تین ہزار روپیہ منظور کیا۔ ۔ ۳۱ جولائی کو گیارہ ماہ کی ملازمت کے بعد مولانا عبدالماجد دارالترجمہ کی ملازمت سے استعفا دے کر لکھنؤ چلے گئے۔
۱۹۱۸ء	مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان ہوا۔ کانگریس کی بڑی اکثریت نے اس کو ناکامی قرار دے کر رد کر دیا۔ ۔ اکتوبر میں ترکی نے شکست قبول کی ۔ ۱۱ نومبر کو جرمنی نے التوائے جنگ کے معاہدے پر دستخط کئے۔ (پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا) ۔ علیگڑھ کے یوروپین اسٹاف نے استعفے دیا ۔ فلسفہ اجتماع پر اعتراضات جاری رہے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر میں ہوا ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا فرمان نافذ ہوا۔		مولوی عبدالحق کو شہر حیدرآباد میں قیام کی ممانعت کر دی گئی اور اللہ بخش صدر مہتمم تعلیمات کے وظیفے پر علاحدہ ہونے پر اورنگ آباد کے صدر مہتمم کی خدمت پر اورنگ آباد بھیجے گئے۔
۱۹۱۹ء	مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ کے مطابق قانون حکومت ہند بابت ۱۹۱۹ء کا نفاذ ہوا۔ ۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی مدت ختم ہونے پر رولٹ بل پیش کیا۔ ۔ گاندھی جی نے ستیاگرہ شروع کی۔	اورنگ آباد	عثمانیہ یونیورسٹی کے افتتاح کے بعد مولوی صاحب اورنگ آباد کی صدر مہتممی پر چلے گئے۔

		۔ خلافت کمیٹی کا قیام ۔ حیدرآباد میں باب حکومت کا قیام۔ سید علی امام صدر اعظم مقرر ہوئے۔ ۔ سر اکبر حیدری، سر گلانسی کی جگہ وزیر فینانس بنے۔ ۔ ۲۸ اگست کو عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح ہوا۔ راس مسعود جاپان میں تھے۔ ان کی جگہ معتمد ناظم تعلیمات مہدی یار جنگ عارضی پرنسپل بنے۔		
۱۹۲	۵۰ سال	انڈین نیشنل کانگریس نے عدم تعاون کی تحریک چلائی۔ انگریزی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ ۔ عنایت اللہ صاحب ناظم دار الترجمہ مقرر ہوئے	اورنگ آباد	صدر مہتمم تعلیمات۔ مولوی صاحب نے کھدر پہننا شروع کیا۔ انجمن کی (۴۰) شاخیں
۱۱۹۲		(لارڈ ریڈنگ وائسرائے) گاندھی جی کی سیاسی طاقت کا عروج حکومت نے گاندھی جی کو جیل بھیج دیا۔ ۔ سر علی امام نے حیدرآباد کی صدر اعظمی سے استعفا دے دیا۔	اورنگ آباد	صدر مہتمم تعلیمات۔ (مدرسہ فوقانیہ علوم مشرقیہ کے صدر مدرس ملا شیخ داؤد تھے اور انگریزی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر کرک پیٹرک تھے)
۱۹۲		مارچ میں راس مسعود دوبارہ جاپان گئے۔ سر اکبر حیدری چند ماہ کے لئے برطانی ہند کی اپنی خدمت پر واپس گئے۔ وہاں سے پنشن لے کر پھر حیدرآباد کے وزیر فینانس کی خدمت پر آگئے۔	اورنگ آباد	صدر مہتمم تعلیمات
۱۹۲			اورنگ آباد	صدر مہتمم و پرنسپل اورنگ آباد انٹر کالج (مدرسہ فوقانیہ مشرقیہ اور انگریزی ہائی اسکول کو ملا کر انٹر کالج قائم کیا گیا۔)

۱۹۲۴ء			اورنگ آباد	صدر مہتمم و پرنسپل اورنگ آباد کالج
۱۹۲۵ء	۵۵ سال	ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا آغاز	اورنگ آباد	پرنسپل اورنگ آباد کالج
۱۹۲۶ء		(لارڈ اردن وائسرائے) ۔ وفات نواب عماد الملک بہ عمر ۸۲ سال۔ راس مسعود ان کی جگہ صدر انجمن بنائے گئے ۔ وفات عبد الحلیم شرر	اورنگ آباد	پرنسپل اورنگ آباد کالج
۱۹۲۷ء		(وفات حکیم اجمل خاں)	اورنگ آباد	پرنسپل اورنگ آباد کالج (شاندار کالج ڈے۔ یادگار مشاعرہ)
۱۹۲۸ء		کانگریس نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ ۔ نہرو کمیٹی کا قیام۔ ۔ راس مسعود نے ایکہزار ماہوار پنشن پر حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی	اورنگ آباد	پرنسپل اورنگ آباد کالج
۱۹۲۹ء		سر راس مسعود علیگڑھ کے وائس چانسلر بنے	اورنگ آباد	مولوی صاحب نے اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی۔ وظیفہ (پنشن) لیا۔
۱۹۳۰ء	۶۰ سال	سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ ۔ ۶ر اپریل کو گاندھی جی نے قانون نمک کی خلاف ورزی کرکے سول نافرمانی کا آغاز کیا۔ ۔ نومبر میں پہلی گول میز کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ ۔ دنیا میں عالمی معاشی بحران طاری ہوگیا	حیدر آباد	صدر پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ ۔ حکومت حیدر آباد نے اردو لغت کی تیاری کے لئے انجمن کو بارہ ہزار سالانہ امداد کی منظوری دی
۱۹۳۱ء		(لارڈ ولنگڈن وائسرائے) ۴ر مارچ کو گاندھی جی نے حکومت سے صلح کرلی۔ ستمبر میں دوسری گول میز کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی، گاندھی جی نے شرکت کی۔ (وفات اکبر الہ آبادی)	حیدر آباد	پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔

۱۹۳۲ء		گاندھی جی نے تامرگ فاقہ کرنے کا اعلان کر کے اچھوتوں کو سمجھوتے پر راضی کیا۔ تیسری گول میز کانفرنس نومبر میں ہوئی۔	حیدرآباد	پروفیسر جامعہ عثمانیہ
۱۹۳۳ء		(وفات نظم طباطبائی)	حیدرآباد	پروفیسر جامعہ عثمانیہ
۱۹۳۴ء			حیدرآباد	پروفیسر جامعہ عثمانیہ
۱۹۳۵ء	۶۵ سال)	(لارڈ لنلتھگو وائسرائے) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ۔ — اصلاحات کے تحت ہندوستان میں عام انتخابات۔ (وفات آغا حشر)	حیدرآباد	پروفیسر جامعہ عثمانیہ
۱۹۳۶ء		جنوری۔ وفات جارج پنجم۔ ایڈورڈ ہشتم کی تخت نشینی۔ ۲۴ر اپریل کو ناگپور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہندی ہندوستانی کی تجویز منظور کی گئی۔ — نومبر میں ایڈورڈ ہشتم کی تخت سے دست برداری۔ جارج ششم کی تخت نشینی۔ — حیدرآباد میں سیاسی بیداری کا آغاز۔ (انجمن اتحاد المسلمین سیاسی جماعت بن گئی) (وفات اصغر گونڈوی)	حیدرآباد	پروفیسر جامعہ عثمانیہ — علیگڑھ کانفرنس کے ۲۴ر و ۲۵ر اکتوبر کے اجلاس میں انجمن ترقی اردو کی دہلی کو منتقلی کی تجویز منظور کی گئی۔
۱۹۳۷ء		برطانی ہند کے چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ (سر راس مسعود کی وفات)	حیدرآباد	پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔
۱۹۳۸ء		حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس ممنوع جماعت قرار دی گئی۔ (وفات اقبال - ۲۱ اپریل)	دہلی	انجمن کا دفتر دہلی منتقل ہوا۔ حکومت حیدرآباد نے انجمن کیلئے (۲۵) ہزار روپے سالانہ کی مزید امداد اس شرط پر منظور کی کہ انجمن ہر سال (۲۰) بیس کتابیں شائع کرے گی۔

۱۹۳۹ء		دوسری جنگ عظیم کا آغاز یکم ستمبر کو ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کیا۔ ۳ ستمبر کو انگلستان اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔	دہلی	معتمد انجمن حیدر یار جنگ کی صدارت میں دہلی میں کل ہند اُردو کانفرنس کا جلسہ ہوا۔
۱۹۴۰ء	۷۰ سال	(وفات آغا شاعر)	دہلی	معتمد انجمن
۱۹۴۱ء		(وفات فانی) ۲۲ جون کو ہٹلر نے روس پر حملہ کیا ۷ دسمبر کو جاپان جنگ میں شریک ہوا۔	دہلی	معتمد انجمن
۱۹۴۲ء		حکومت ہند نے نیشنل کانگریس کو خلاف قانون قرار دیا۔ کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری۔ کرپس مشن کی آمد۔ جاپان نے برما اور جنوب مشرقی ایشیا کا علاقہ فتح کر لیا۔	دہلی	معتمد انجمن۔ مولوی صاحب نے اپنا سارا اندوختہ (تقریباً پچاس ہزار روپے) انجمن کی نذر کر دیا۔
۱۹۴۳ء		(لارڈ ویول وائسرائے) بنگال میں قحط	دہلی	معتمد انجمن
۱۹۴۴ء		انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈروں کی رہائی ۔ جاپانی فوجیں پیچھے ہٹنے لگیں۔	دہلی	معتمد انجمن
۱۹۴۵ء	۷۵ سال	۷ اور ۸ مئی کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یورپ میں دوسری جنگ عظیم کا اختتام	دہلی	معتمد انجمن۔ حکومت حیدرآباد شش سالہ امداد کی مدت ختم ہوئی۔ یہ امداد جاری نہیں رہی
۱۹۴۶ء		کیبنٹ مشن کی آمد۔ مرزا اسماعیل صدر اعظم حیدرآباد ہوئے۔ کیبنٹ مشن کی ناکامی۔ جاپان کو شکست ہوئی۔	دہلی	معتمد انجمن
۱۹۴۷ء		(لارڈ مونٹ بیٹن وائسرائے) تقسیم ہند۔ ۱۴ اگست قیام پاکستان۔ جولائی میں حیدرآباد کانگریس سے امتناع برخاست ہوا۔ ۷ اگست سے کانگریس نے ریاست کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔ مرزا اسماعیل کی حیدرآباد کی صدر اعظمی سے سبکدوشی	دہلی	تقسیم ہند کے بعد فسادات کا آغاز۔ دہلی میں انجمن کے دفتر کا لٹنا۔

۱۹۴۸ء		وفات قائداعظم محمد علی جناح ریاست حیدرآباد پر انڈین یونین کی فوجوں نے قبضہ کرلیا ۔ نظام کی حکومت کا خاتمہ ۔ ۲۱ر جون کو ماونٹ بیٹن کی واپسی ۔ راج گوپال چاری گورنر جنرل ۔ (وفات سر تیج بہادر سپرو ۔ وفات ڈاکٹر ضیاء الدین	کراچی	دہلی کے ہنگاموں کے بعد مولوی صاحب کراچی آگئے ۔
۱۹۴۹ء			کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۰ء	۸۰ سال	(وفات سر عبدالقادر ۔ ۹ر فروری)	کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۱ء			کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۲ء		وفات حکیم شمس اللہ قادری ۔ ۲۲ر اکتوبر)	کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۳ء		(وفات حسرت موہانی) (وفات سید سلیمان ندوی بمقام کراچی ۲۲ر نومبر) وفات ضیا یار جنگ ضیا بمقام حیدرآباد)	کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۴ء			کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۵ء	۸۵ سال		کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۶ء			کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۷ء			کراچی	صدر انجمن
۱۹۵۸ء		(وفات محمد امین زبیری ۔ ۵ر ستمبر)	کراچی	صدر انجمن
۱۹۶۰ء	۹۰ سال		کراچی	صدر انجمن
۱۹۶۱ء		(وفات عمر یافعی ۔ مولوی صاحب کی وفات کے ایک ہفتے بعد بتاریخ ۱۲ر ربیع الاول)	کراچی	۱۶ر اگست کو مولوی عبدالحق نے وفات پائی ۔

اُردو کالج کی تعمیر میں حصہ لے کر
اردو تحریک کو آگے بڑھائیے

انجمن کی ایک نئی کتاب

تاریخ سلطنتِ مسلمانانِ رُوس

از

مزمل الیسین

رُوسی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں نے شروع سے آخر تک بغور پڑھی۔ یہ بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور مطالب کا احاطہ پورے طور پر کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ روسی علاقے میں جو تُرک آباد ہیں ان کی سیاسی جدجہد اور نشاۃِ ثانیہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی سے لے کر ۱۹۱۷ء تک کے اِنقلاب کا نقشہ اِس میں پیش کیا گیا ہے۔ انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ کتاب پڑھتے وقت ذہن پر بوجھ ڈالنے کی بجائے ناول کی سی کشِش پیدا کرتی ہے۔” (سید حسام الدین راشدی)

آفسٹ کی طباعت ۔ سفید عمدہ کاغذ
متعدد تصاویر اور نقشے ۔ قیمت دس روپے

انجمن ترقیِ اُردو پاکستان بابائے اُردو روڈ۔ کراچی

حیات عبدالحق

(سوانحی خاکہ)

غیور عالم

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہندو پاکستان کی ایک عظیم المرتبت شخصیت تھے ان کے علمی و ادبی کارنامے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے لفظوں میں لکھے جائیں گے۔ اردو زبان و ادب کی پوری تاریخ میں ہمیں ان سے زیادہ باثر نثر آفریں شخصیت نظر نہیں آتی۔ ان کی کہانی عزم و استقلال، ہمت و محنت، ہمدردی اور خلوص سے بھرپور ایک سادہ مگر دیو پیکر شخصیت کی سرگزشت ہے۔

بابائے اردو کی نثر نے غالب، سرسید اور حالی کے بعد اردو نثر کو ایک نیا مزاج دیا۔ بابائے اردو نے سرسید کے نثر کے انداز کو اپنی تخلیقی قوتوں کی مدد سے شاداب اور شگفتہ کر دیا ان کی تنقید نے اردو ادب میں صالح اور توانا تنقیدی روایات کو بڑھنے میں مدد دی ان کی تحقیق نے اردو ادب کے شہ پاروں کو منظر عام پر لاکر اردو کی تاریخ کو کئی سو سال پیچھے سے شروع کیا اور اس طرح اردو زبان کو کئی سو سال کی زندگی بخشی۔ انھوں نے ایک بالغ نظر محقق کی حیثیت سے اردو کے لسانی مسائل پر نظر ڈالی اور تحقیق کی راہیں تلاش کیں۔ غرض وہ اردو زبان و ادب کی ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء میں ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۱ء میں کراچی میں انتقال کیا۔ اس طرح ان کی عمر ۹۱ سال ہوتی ہے جو ایک طویل عمر کہی جا سکتی ہے لیکن ان کی موت پھر بھی کچھ قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ تقریباً پون صدی تک ہمارے زبان و ادب پر چھائے رہے، ان کے علمی و ادبی کاموں نے اردو زبان و ادب کو مالا مال کر دیا تھا اور اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایک باب ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا وہ یقیناً اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایک باب تھے ان کا علمی و ادبی کام اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک شاندار باب ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو ہاپوڑ میں پیدا ہوئے ہاپوڑ ان کے آباو اجداد کی سرزمین تھی

ان کے اسلاف ہندو کائستھ تھے اس کائستھ خاندان میں دو بھائیوں میں سے ایک نے اسلام قبول کرلیا لیکن دوسرے اپنے مذہب پر قائم رہے جن بھائی نے اسلام قبول کیا تھا انھوں نے اپنا نام صادق علی رکھا اور ہاپوڑ سے تقریباً ۳ میل دور ایک گاؤں صادق پور آباد کیا۔

ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں ایک قدیم قصبہ ہے شاید کسی زمانے میں امرا اور جاگیردار طبقہ یہاں آباد تھا چھوٹی اینٹوں کی عالیشان عمارتیں مضبوط اور وزنی پتھروں کے بلند و بالا دروازے، وہ کھنڈر جن سے عظمت رفتہ کا نشان ملتا ہے اپنے ماضی کا اعلان کرتے ہیں لیکن ہاپوڑ کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں ہے اس سے پیشتر میں کہہ چکا ہوں کہ بابائے اردو کے آباد اجداد ہاپوڑ کے قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے مولوی عبدالحق کے اسلاف کے سپرد ہمیشہ "عہد سلطنت مغلیہ" میں محکمۂ مال کی اہم خدمات رہیں اور یہ لوگ موروثی "قانون گو" کہلاتے تھے اور شاید اسی لیے ہاپوڑ میں اس محلے کا نام "قانونگویاں" ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خاندان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا روایتیں کمزور ہیں ہاں صرف ان کے جدِّ اعلیٰ صادق علی کے نام کا پتا چلتا ہے لیکن درمیانی کڑیاں غائب ہیں اور ہمیں ان کے خاندان کا سلسلہ ان کے دادا شیخ صفدر بخش سے شروع کرنا پڑتا ہے، شیخ صفدر بخش کے دو بھائیوں کے نام بھی مجھے اپنی ذاتی تحقیق کے دوران معلوم ہوئے ان میں ایک کا نام شیخ بشارت علی اور دوسرے کا نام شیخ ضامن علی تھا۔ ان میں شیخ صفدر بخش ہی سب سے بڑے تھے، شیخ صاحب نے دو شادیاں کیں اُن میں پہلی بیوی سے شیخ امام بخش وغیرہ تھے جن کے خاندان کے افراد آج بھی ہاپوڑ میں موجود ہیں دوسری بیوی سے شیخ علی حسن تھے جو مولوی عبدالحق کے والد تھے شیخ علی حسن کے بھائیوں یا بہنوں کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا، خاندان کے بعض قریبی لوگوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے والد کا نام شیخ علی حسن تھا بعض حضرات نے ان کا نام شیخ علی حسین لکھا ہے جو میری معلومات کے مطابق صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ شیخ احمد حسن نے بھی اپنے مضمون میں "شیخ علی حسین" لکھا ہے لیکن بعض مستند شہادتوں کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا صحیح نام "شیخ علی حسن" تھا۔ شیخ صاحب کی شادی ہاپوڑ کے قریب ہی ایک موضع "سراوے" میں ہوئی۔ شیخ صاحب ایک خوشحال گھرانے کے فرد تھے اور ان کی اپنی جائداد کافی تھی۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ "وہ بڑے زندہ دل اور خوش مزاج انسان تھے" وہ مفتی صدرالدین کے مدرسے کے فارغ التحصیل تھے اور شیفتہ کے شاگرد تھے" اس سے زیادہ معلومات ان کے بارے میں مجھے حاصل نہ ہو سکیں شیخ احمد حسن نے اپنے مضمون میں زیادہ روشنی نہیں ڈالی انھوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ وہ (شیخ علی حسین) محکمۂ بندوبست پنجاب میں ملازم تھے۔ شیخ علی حسن کی ملازمت کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب انگریزوں نے پنجاب پر مکمل قبضہ کرلیا تو محکمۂ مال کے لیے تجربے کار ملازمین کی ضرورت پڑی اس میں ضلع میرٹھ سے

نیغ علی حسن کے سالے بھی ملازمت پر طلب کیے گیے کیونکہ شیخ علی حسن کی بیوی اپنے بھائیوں کی تنہا بہن تھیں اور بھائی ان ے بہت زیادہ محبت کرتے اس لیے شیخ علی حسن کو بھی پنجاب بلا لیا گیا اور "انسپکٹری مال" پر ان کا تقرر ہوگیا اور پنجاب ی مردم خیز زمین پر "مڈل" تک مولوی عبدالحق نے تعلیم پائی ۔

شیخ علی حسن کے ۷ اولادیں تھیں ان میں سب سے بڑے شیخ ضیاء الحق دوسرے شیخ عبدالحق تیسرے احمد حسن ورچھوٹے محمود تھے ان کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا ۔ بعض حضرات نے جب بابائے اردو کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی انھوں نے ان کے صرف ۳ بھائیوں کا ذکر کیا شیخ احمد حسن نے بھی اپنے چھوٹے بھائی محمود کا ذکر نہیں کیا انھوں نے شاید ں وجہ سے کہ وہ بچپن میں انتقال کر گئے تھے اہمیت نہیں دی لیکن میں نے یہ ذکر ضروری سمجھا اس لیے کہ آیندہ تحقیقی اعتبار سے لطی کا امکان نہ رہے دوسرے یہ کہ حالات کی گرد جب عبدالحق کے خاندانی حالات پر دبیز ہو جائے گی تو یہ غلطی ایک نیقت بن جائے گی اور ان کے خاندانی حالات لکھنے والے تحقیق اور یقین کے ساتھ صرف ان کے دو بھائیوں کا ذکر کریں گے اس یے میں نے زیادہ اختصار بہتر نہ سمجھا بابائے اردو کے ۳ بھائیوں کا تو میں ذکر کر چکا ہوں اس کے علاوہ ان کی تین ہنیں تھیں ۔

مولوی عبدالحق کے بھائیوں میں سے میں صرف ان کے سب سے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں بات قابل غور ہے کہ ان کے خاندان میں "ضیاء الحق" اور "عبدالحق" کے نام ہی حق پر رکھے گئے اس کے لیے شیخ احمد حسن نے لکھا ہے کہ "والد صاحب کے پیر و مرشد نے فرمایا کہ اپنے لڑکوں کے نام "حق" پر رکھنا اور والد نے اپنے پیر کے ارشاد کے طابق اپنی پہلی دو اولادوں کے نام حق پر رکھے جو بڑی حد تک مبارک ثابت ہوئے"

شیخ ضیاء الحق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے ادب نواز شخص تھے اور ایک اخبار نکالا کرتے تھے جس کا نام "حیرت انگیز" تھا ۔ یہ مولوی عبدالحق سے بالکل مختلف طبیعت اور فطرت کے انسان تھے خاندان کے لوگ اور ہاپوڑ کے ہنے والے ان کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے بعض حضرات کا تو کہنا ہے کہ ہاپوڑ میں ان کا شاید ہی کوئی رشتے دار و جس سے انھوں نے مقدمے بازی نہ کی ہو ان کے متعلق اور بھی بعض باتیں اور روایتیں سنائی گئیں کہ وہ "جاسوسی" کیا رتے اور اس سلسلے میں حکومت ان پر نظر رکھتی تھی ان کے تمام خطوط پہلے "سینسر" کئے جاتے تھے ۔

شیخ ضیاء الحق کی ان مقدمے بازیوں اور خاندانی حالات کی وجہ سے مولوی عبدالحق بھی ان سے زیادہ خوش نہیں ھے لیکن وہ ان سے ملنے کے لیے ہاپوڑ برابر آیا کرتے تھے ۔

شیخ ضیاء الحق نے کافی عمر میں شادی کی تھی ۔ ان کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی بس کا نام تھا "میں نے ایک لاکھ روپیہ کس طرح کمایا" ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سات "مختلف خط" بلا تکلف لکھ سکتے ھے وہ اپنے پیر کی انگلیوں میں قلم پکڑ کر نہایت آسانی سے لکھ سکتے تھے ہندوستان کے "نوابین" اور "راجا" انھیں ہمیشہ مالی

امداد دیا کرتے تھے ہاپوڑ ہی میں ایک صاحب نے مجھے ان کا ایک لطیفہ سنایا کہ وہ ہمیشہ " فرسٹ کلاس " میں سفر کرتے تھے لیکن ٹکٹ نہیں لیتے تھے ایک ٹکٹ چیکر نے انھیں ایک بار بلا ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑ لیا انھوں نے کہا کہ بھئی ہم سے ٹکٹ نہ لو لیکن ٹکٹ چیکر انھیں مانا انھوں نے روپے دے کر ٹکٹ بنوا لیا لیکن اسی رسید کے دستخط کے مطابق اس ٹکٹ چیکر کا استعفا لکھ کر بھیج دیا۔ معلوم نہیں کہ اس ٹکٹ چیکر کا کیا حشر ہوا لیکن وہ اسی قسم کے کام کیا کرتے تھے اور لوگ ان سے خوف زدہ رہا کرتے تھے۔

شیخ علی حسن نے پنجاب میں ملازمت اختیار کر لی تو مولوی عبدالحق مع اپنے بھائی اور بہنوں کے پنجاب پہنچ گئے یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ مولوی صاحب کس سنہ میں فیروز پور گئے اور وہاں انھوں نے کس درجے سے تعلیم شروع کی بعض حضرات کے خیال کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم " ہاپوڑ " " سراوے " اور مڈل اسکول پنجاب میں ہوئی اور اسی مڈل اسکول پنجاب سے انھوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔

بعض اہلِ علم حضرات نے ان کی ابتدائی تعلیم کو صرف ہاپوڑ تک محدود بتایا ہے جو صحیح نہیں " سراوے " کی تعلیم کا ذکر بھی مشتبہ ہے " سراوے " کی تعلیم کا حال کہیں نہیں ملتا مولوی عبدالحق کے بھائی شیخ احمد حسن نے لکھا ہے کہ " بھائی عبدالحق مرحوم کی تعلیم میٹرک تک پنجاب میں ہوئی " شیخ احمد حسن کا بیان تحقیقی اعتبار سے درست نہیں بعض نے ان کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کہی بعض نے کہا کہ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ہاپوڑ میں مکمل کی اور اس کے بعد علی گڑھ چلے آئے ان واقعات کی روشنی میں کئی قسم کے خیالات سر اٹھاتے ہیں اور غلط فہمی کا امکان ہے تحقیقی انداز سے بات کا جہاں تک تعلق ہے وہ یہ ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم ہاپوڑ اور اس کے بعد ۱۸۸۸ء سے پیشتر فیروز پور (پنجاب) میں رہی اور اس کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے۔

قیاس غالب یہ ہے کہ مولوی عبدالحق ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ میں اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ کے طالب علم ہوئے اور ۱۸۹۴ء میں بی اے کیا[۱] اس کے علاوہ سید ہاشمی فرید آبادی نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب کا لڑکپن پنجاب میں بسر ہوا اور مڈل تک یہیں تعلیم پائی اس کے بعد علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں داخل کیے گئے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی ذاتی تحقیق کے دوران یہ بات معلوم ہوئی کہ مولوی صاحب نے میٹرک کا امتحان علی گڑھ سے ہی پاس کیا۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر سید محمد کا مضمون " بیسویں صدی کا سر سید " میری نظر سے گزرا جس میں پروفیسر موصوف نے یہ بتایا ہے کہ:

> " ابتدائی تعلیمی مراحل اپنے وطن اور فیروز پور علاقہ پنجاب میں طے کیے ۱۸۸۹ء میں
> علی گڑھ آئے اور بالکل ابتدائی دور چھ برس تعلیم پا کر سر سید ہی کی زندگی ہی میں بی اے
> پاس کیا ان کے امتیازی مضمون فلسفہ اور ریاضی تھے "

۱۸۸۸ء میں مولوی عبدالحق نے علی گڑھ میں اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا اور اپنی تعلیمی زندگی کے دوران وہ ایک ۱۰۱

، کے قریب ہوگئے جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی، سرسید کی برگزیدہ شخصیت، ان کی علمی و ادبی
ات، ان کی عملی صلاحیتیں اور قوتیں، ان کا غیر معمولی ذہن جس نے اپنے عہد کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ عبدالحق نے اس
لم اعظم کی آنکھیں دیکھیں، ان کی صحبت سے فیض اٹھایا ان کے رہن سہن، طرز معاشرت، کھانے پینے کے آداب، لباس و گفتار
ر غرض ہر چیز کا اثر عبدالحق کے جوان ذہن پر پڑا اور انھوں نے سرسید کے زیر اثر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور اس
فریں شخصیت سے بھرپور فیض اٹھایا۔

ماحول سے ہمیں جو کچھ ملتا ہے وہ ایمان کی حیثیت رکھتا ہے، لڑکپن سے جوانی کے شعور تک اور جوانی کے شعور سے
لی کی سنجیدہ حدوں تک جو کچھ ہم پاتے ہیں وہ آیندہ زندگی میں بیشتر نصب العین کا کام دیتا ہے۔

سرسید کی جامع حیثیات شخصیت نے جس طرح عبدالحق کو متاثر کیا اس کا نقش ہمیں ان کی پوری زندگی میں نظر آتا ہے
کام کی لگن، علم و ادب کا ذوق و شوق، وہی سادگی، اندازِ نثر، کردار و گفتار لباس و آداب زندہ دلی، عزم و استقلال ضبط و
جرأت اخلاق، فرض شناسی۔ دیانت و صداقت رواداری اور انصاف ہمدردی اور محبت انسانی غرض عبدالحق کی
لی پر سرسید کی اتنی گہری چھاپ ملتی ہے کہ ہم پہلی نظر میں پہچان لیتے ہیں کہ یہ کس کے فیضِ صحبت کا اثر ہے۔

ابھی جن خصوصیات کا ذکر میں نے عبدالحق کے بارے میں کیا یہ تمام خصوصیات تو مولوی عبدالحق نے خاص طور پر سرسید کی
یت میں تلاش کیں۔ ان کی کتاب "سرسید احمد خاں حالات و افکار" کے چند اقتباسات سے میری بات پر روشنی پڑ سکے گی۔
نظ فرمایئے :

"زندہ دلی ان کی فطرت میں تھی ـــــ یہ زندہ دلی ان کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی۔

ص - ۸

"قومی لباس کا انھیں بڑا خیال"

ص - ۲۵

"سرسید کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا"

ص - ۴۰

"ان کی زندگی سے ہمیں بہت سے بے بہا سبق مل سکتے ہیں۔ ان کا اپنے نصب العین پر آخر تک جمے رہنا اس
کے لیے ہر جائز ذریعے کو کام میں لانا۔ مخالف قوتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا محنت و مشقت سے کبھی جی نہ
چرانا، دن رات کام میں لگے رہنا، تساہل اور کاہلی کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دینا"

ص - ۸۷

"سرسید بڑے فیاض اور سیر چشم تھے غریبوں اور مستحقوں اور مفلوک الحال شرفا کی ہمیشہ مدد کی"

"جب کسی طالب علم سے اخلاقی جرات یا خودداری کا فعل صادر ہوتا دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔"

ص ۹۴

یہ تمام مختصر اقتباسات "سر سید احمد خاں، حالات و افکار" سے لیے گئے ہیں اس میں جہاں سرسید کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے وہاں میری رائے ہے کہ ان اقتباسات کی مدد سے عبدالحق کی سوانح و سیرت میں بھی مدد ملتی ہے۔ مولوی صاحب کی زندہ دلی، ان کا لباس اور عزت نفس جیسے نواب دکن کی ناراضگی کی پروا نہیں، ان کا علمی و ادبی ذوق جو زندگی بھر ان کے ساتھ رہا وہ آخر وقت تک اپنے نصب العین پر جمے رہے انھوں نے اپنی تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جو اردو کو مٹانے پر تلی ہوئی تھیں، وہ اردو کے لیے شب و روز محنت، طلبہ اور ہنر کی امداد، کیا یہ تمام باتیں سرسید احمد کے فیض صحبت کا نتیجہ نہیں تھیں ان کی زندگی پر اس دیو زاد شخصیت کا نقش بہت خاصا تھا۔

سرسید احمد خاں بھی مولوی صاحب سے گھر کے افراد کی طرح سلوک کرتے۔ ان کی محبت کا واقعہ خود مولوی صاحب کی زبانی سنئے "سید صاحب کو بہت دنوں سے یہ دھن تھی کہ کالج میں قومی لباس (جو انھوں نے اپنے لیے بھی تجویز کیا تھا) رائج کیا جائے چنانچہ اس خیال سے فرمائش کر کے کانپور کے کسی کارخانے سے ایک نیلگوں سیاہ (بلو بلیک) سرج کا ایک تھان تیار کرایا جب یہ کپڑا آیا تو اس میں سے ایک ترکش کوٹ اپنے لیے ایک میرے لیے اور ایک سید راس مسعود کے لیے جو اس وقت بچہ تھا سلوایا اس سے پہلے وہ دلی سے سیاہ کپڑوں کے ٹکڑوں پر "کلابتوں" سے "مدرستہ العلوم" کڑھوا لائے تھے کالر پہ "مدرستہ" ایک طرف اور "العلوم" دوسری طرف ٹکا ہوا تھا جب کالر کا ہک لگاتے تو پورا دارالعلوم آجاتا جس وقت درزی میرا کوٹ لایا تو میں اس وقت سید محمود کے پاس دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، بلایا، درزی نے مجھے کوٹ پہنایا وہ پہنا ہی چکا تھا کہ جھٹ سید صاحب اٹھے اور مجھے سلام کیا انھوں نے مجھے سلام کرنے میں تقدیم کی اس سے مجھ پر اس قدر شرم غالب ہوئی کہ میں ایک لفظ نہ کہہ سکا۔"

دوسرا واقعہ خود مولانا بیان کرتے تھے کہ سرسید احمد خاں نے مجھ سے فرمایا کہ میری کتابیں بے ترتیب پڑی ہیں انھیں ٹھیک کر دو، مولانا فرماتے تھے کہ میں کتابیں ٹھیک کر رہا تھا اور سید صاحب دوسری طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے، مسعود ان کی بغل میں لیٹا تھا اتنے میں سید صاحب نے اپنی بھاری اور گنگھیلی آواز میں مسعود کو لوری سنانا شروع کی، مجھے ان کی آواز سن کر اس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کر سکے اور چپکے سے دوسرے کمرے میں بھاگ گئے۔ اسی قسم کی داخلی شہادتیں ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیتی ہیں کہ عبدالحق کی زندگی میں سرسید کے گہرے اثرات بالکل اس طرح آئے جس طرح ایک خاندان کا فرد یا ایک سماج کا فرد اپنے خاندان یا معاشرے سے متاثر ہوتا ہے، عبدالحق بالکل اسی طرح سرسید کی شخصیت سے متاثر ہوئے تھے۔

علی گڑھ میں ایک اور شخصیت حالی کی تھی جس نے عبدالحق کو بحیثیت انسان اور ادیب کے متاثر کیا، وہ حالی کی

انسانیت کے بے پناہ قائل تھے۔ ادبی انداز میں حالی کی سادہ مگر پرکار نثر اُن کا انداز تنقید عبدالحق کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ تنقید کے سلسلے میں عبدالحق کے تنقیدی خیالات بہت کچھ حالی کی دین ہیں وہ تقریباً حالی کے خیالات سے متفق ہیں۔ اسلوب بیان کا دبیز پردہ جس سے شخصیت چھپ جاتی ہے فنکار کے ساتھ ہمدردی، اپنی ذات سے بلند ہو کے فن پاروں کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرنا ایک متوازن اور سلجھانے والا انداز تنقیدات میں ٹھہراؤ اور بڑی بڑی باتوں کو اسلوب کے پردے میں نہایت آہستہ اور سادگی سے کہنا۔ تنقید کی متوازن نثر اور سادگیٔ انداز کا سبق مولوی عبدالحق نے حالی سے پڑھا۔

علی گڑھ میں عبدالحق چھ سال رہے۔ دورانِ تعلیم کالج کے سنجیدہ اور پڑھنے لکھنے والے لڑکوں میں شمار کئے جاتے تھے کھیل کود سے انھیں کبھی دلچسپی نہیں ہوئی خود کہا کرتے تھے کہ زمانہ طالب علمی میں کھیل کے معاملے میں "ڈل" تھے۔ پڑھا زیادہ کرتا تھا اپنے زمانہ طالب علمی میں نماز کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ داڑھی ان کی طالب علمی کی یادگار تھی کالج میں سینٹ پال کے نام سے مشہور تھے نماز کے مانیٹر تھے اور لڑکے انھیں پیش امام بنا لیا کرتے تھے۔

علی گڑھ میں انھیں اپنی طالب علمی کے دور میں ہی اردو سے خاصا لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں اردو کے بہترین مضمون پر ایک تمغہ انعام دیا جاتا تھا اس انعامی مقابلے میں عبدالحق کو وہ تمغہ جس کا نام "لارڈ لینس ڈاؤن" تھا انعام میں دیا گیا۔ ان کی ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر سرسید احمد خاں نے ان سے "تہذیب الاخلاق" میں کام لینا شروع کر دیا تھا اور یہیں سے ان کی اس ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جس نے انھیں ایک طویل محنت و مشقت کے بعد اردو کا سب سے جلیل القدر ادیب بنا دیا۔

علی گڑھ میں انھوں نے سرسید کے اس ادارے سے ۱۸۹۴-۹۵ء میں بی اے کیا۔ یہ ہاپوڑ کے پہلے نوجوان تھے جنھوں نے اپنے خاندان کی شدید مخالفت کے باوجود داخلہ لیا اور علی گڑھ کی ادبی فضا میں پروان چڑھے۔

علی گڑھ میں اپنی تعلیمی زندگی مکمل کرنے کے بعد تلاش ملازمت کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کو بمبئی جانا پڑا یہاں وہ نواب محسن الملک کے "انگریزی مراسلت و مضمون نگاری" کے کام پر مامور ہوئے کچھ دن تک نواب محسن الملک کی غیر معمولی اور "پارس پتھر" جیسی شخصیت کے ساتھ کام کیا یہاں کرنل افسر الملک کمانڈر اعلیٰ افواج آصفیہ کی نظر مولوی عبدالحق پر پڑی اور انھوں نے مولوی صاحب کو مدرسۂ آصفیہ کا صدر مقرر کر دیا یہاں سے ان کی حیدرآباد میں ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے یہاں انھوں نے کم وبیش چالیس سال اپنی عمر عزیز کے بسر کئے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آئے اور تقریباً سوسال تک صدر مدرسۂ آصفیہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن جب نواب سربلند جنگ حمید اللہ خاں جب "سررشتۂ عدالت وتعلمات" کی معتمدی پر مامور ہوئے تو انھوں نے مولوی صاحب کو "صیغۂ تعلیمات" میں منتقل کر لیا اور مولوی صاحب ایک عرصے تک "دارالترجمہ" میں کام کرتے رہے ۱۹۱۱ء میں انھیں انسپکٹر آف اسکولز صوبہ اورنگ آباد مقرر کیا گیا اور چند سال بعد جب اورنگ آباد میں جامعۂ عثمانیہ کے لیے کالج قایم کیا گیا

تو وہ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے اور آخر میں پنشن ۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم کے بعد وہ شعبہ اردو میں پروفیسر رہے لیکن جب ” اردو ہندی قضیہ “ ایک اہم صورت اختیار کر گیا اور مولانا نے محسوس کیا کہ حیدرآباد میں رہ کر اردو کی حفاظت نہیں کی جا سکتی تو انھوں نے استعفا دے دیا اور ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی لے آئے ۔

قبل اس کے کہ میں زمین دکن پر مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ذکر کروں مجھے ان کی زندگی کے ایک نہایت اہم واقعے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر عبدالحق کے حالاتِ زندگی کے بارے میں جو بھی مضامین اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں تقریباً یہی بات کہی جاتی رہی ہے کہ مولانا بیوی بچوں کی فکر سے آزاد تھے انھوں نے کبھی شادی نہیں کی ۔ ان کے قریبی دوستوں نے بھی تقریباً یہی بات دہرائی ۔ واقعہ کچھ عجیب سا ہے مجھے اپنی ذاتی تحقیق کے دوران پہلی بار یہ پتا چلا کہ مولانا کی شادی ہوئی تھی لیکن وہ شادی کے سخت خلاف تھے ۔ ہاپوڑ میں مجھے بعض بزرگوں نے بتایا کہ مولانا نے شادی کی شروع ہی سے سخت مخالفت کی تھی لیکن والدین نہیں مانے اور خصوصاً ان کی والدہ نے بہت اصرار کیا تو مولوی عبدالحق چپ ہو گئے لیکن ادھر دلہن رخصت ہو کر گھر میں آئی ادھر مولانا دوسرے دروازے سے نکل کر چلے گئے اور حیدرآباد سے طلاق لکھ کر بھیج دی ۔

اس واقعے کو سن کر میرے ذہن میں مختلف شبہات و سوالات نے سر اٹھایا جب میں نے ایک بزرگ سے ہاپوڑ ہی میں پوچھا کہ وہ شادی کرنا کیوں نہیں چاہتے تھے تو کہنے لگے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ” میری اور میری بہن کی شادی بدلے میں مت کرو “ میں نے کہا کہ اس کے سوا بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہنے لگے مجھے نہیں معلوم میں نے ” بڑی بوڑھی عورتوں سے یہی سنا ہے “ میں نے اسی قسم کا سوال مولانا مقتدا خاں شیروانی سے کیا کہ آپ تو مولوی صاحب کے کافی قریب رہے ہیں آپ کچھ روشنی ڈالئے کہنے لگے ایسا تو نہیں تھا کہ وہ بیوی کا خرچ برداشت نہ کر سکتے ہوں، دوسری بات اس کی وجہ آزادی بھی نہیں تھی کیونکہ اکثر کہا کرتے تھے کہ پابندی سے میرا جی الجھتا ہے کیونکہ لوگ شادی کے بعد بھی کافی آزاد رہتے ہیں آخر میں کہنے لگے کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں بیوی کے ” حقوق “ ادا نہ کر سکوں گا ۔

بعض انسانی کمزوریاں زندگی کے دھارے اور رخ موڑ دیتی ہیں بعض نفسیاتی الجھنیں زندگی کے مختلف گوشوں کو تاریک یا منور کر دیتی ہیں کوئی نفسیاتی گرہ زندگی بھر زندگی کو عذاب بنائے رکھتی ہے کوئی نفسیاتی کجی پوری زندگی کو اپنے مطابق ڈھال لیتی ہے یہ ذہنی دباؤ جس نے عبدالحق کی زندگی کو سادہ و پرسوز بنا دیا ۔ زندگی کی بعض مسرتوں سے محرومی انھیں زندگی سے فرار کے راستوں پہ لے گئی جہاں انھوں نے علم و ادب کی چھاؤں میں پناہ لی اور زندگی بھر وہ اپنی بے پناہ تشنگی اور مسرت کی پیاس کو علم و ادب سے بجھاتے رہے ان کی زندگی بظاہر کوئی بڑی محرومیوں کی داستان نہیں پھر بھی ان کے اندر ایک ایسا انسان ضرور تھا جو اپنی تسکین چاہتا تھا وہ زندگی بھر اپنے کارناموں کی مسرت میں غرق رہے انھیں کسی محبوبہ کا پیار نہیں ملا انھیں وہ محبت نہیں ملی جو ایک مرد کو پگھلا دیتی ہے ان کی زندگی میں یہ ایک بڑا خلا تھا جسے وہ لوگوں سے چھپا کر پُر کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔ اپنی بڑی سے بڑی تکلیف کا بھی کبھی انھوں نے اظہار نہیں کیا دوسروں کا سہارا دینا بھی انھیں کچھ

ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ یہ ان کی زندگی کی اندرونی محرومی ہی تو ہے کہ کسی کو شادی شدہ دیکھتے تو فاتحہ درود پڑھتے اور اگر کسی نوجوان کو غیر شادی شدہ پاتے تو خوش ہوتے۔

بہرحال مولوی عبدالحق کا یہ فرار ادب کے لیے بہت ہی مبارک ثابت ہوا اور اردو کو ایک ایسی شخصیت مل گئی جو زندگی بھر اردو کے لیے زندہ رہی۔

دکن میں قیام کے دوران ان کی فطرت پسند طبیعت نے "مقبرۂ رابعۂ دورانی" جو دکن کا تاج محل کہلاتا ہے رہنے کے لیے پسند کیا۔ خود کہا کرتے تھے کہ جب میں کچھ کتابوں کی تلاش میں حیدرآباد کے قرب و جوار کا دورہ کر رہا تھا اور پہلی بار مقبرۂ رابعہ دورانی کو دیکھا تو سوچا کہ کون خوش قسمت ہوگا جو اس میں رہے گا۔ یہ کیا معلوم تھا کہ کچھ مدت کے بعد میں خود ہی اس میں آکر رہوں گا۔

دکن میں قیام کے دوران انھوں نے اپنے علمی و ادبی ذوق کی تسکین کی خاطر ایک پنڈت سے ہندی پڑھی اور اس کے بعد ریاست جے سنگھ پور کے نائب کی مدد سے جو اورنگ آباد میں رہا کرتا تھا ہندی زبان و ادب کا وسیع تر مطالعہ کیا۔

فارسی زبان و ادب سے مولوی عبدالحق کا ذوق حیدرآباد سے بہت پہلے سے تھا۔ حافظ اور سعدی کے عاشق تھے حافظ کا کلام ان کی روح کو تسکین پہنچاتا تھا۔ اپنے فارسی ذوق کی استطاعت میں اضافے کے لیے انھوں نے علامہ شمسی سے استفادہ کیا۔

قیام حیدرآباد میں ان کا ایک نہایت اہم کارنامہ "جامعہ عثمانیہ" کے قیام میں مدد اور اس میں اردو ذریعہ تعلیم تھا۔ مولانا جہاں بھی رہے اردو کی تعلیم سے غافل نہیں رہے اردو سے انھیں عشق تھا ان کے ذہن میں اردو یونیورسٹی کا قیام بہت پہلے سے تھا لیکن حالات کی وجہ سے کوئی صورت عمل میں لانے کی نظر نہیں آتی تھی۔ بعض حیدرآباد کے با اثر حضرات یہ مزید چاہتے تھے کہ ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں تمام علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان میں دی جائے، سر راس مسعود مولانا کے اس خیال سے بہت زیادہ متاثر تھے کیونکہ ان کے ذہن میں جاپان کا نظام تعلیم تھا لیکن آہستہ آہستہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے حالات سازگار ہوتے گئے اور یہ ہوا کہ نواب محمد اکبر نذر علی حیدری (سر اکبر نواب حیدر نواز جنگ بہادر) اعلیٰحضرت کے ہوم ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری مقرر ہوئے اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کی ابتدا کیسے ہوئی خود مولوی عبدالحق کی زبان سے سنئے:-

> "ہوا یہ کہ ایک بار سر اکبر اورنگ آباد آئے میں نے ان کی صدارت میں
> ایک تقریر "مروجہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم" پر کی اس سے وہ بہت متاثر ہوئے
> اس زمانے میں دارالعلوم کے پرنسپل مولوی حمیدالدین مرحوم تھے انھوں نے میری
> متواتر اصرار پر یہ عہدہ قبول کیا تھا میں نے انھیں اپنا ہم خیال بنایا اور ان سے

> کہا کہ آپ بحیثیت پرنسپل یہ تحریک کیجئے انھوں نے کہا کہ تم لکھ کر دے دو میں دستخط کردوں گا
> میں نے ہوم سکریٹری کے نام چند سطریں لکھ کر درخواست پیش کردی ہوم سکریٹری اس
> وقت سر اکبر حیدری تھے اب بموجب انگریزی محاورے کے گیند لڑھکنا شروع ہوئی مجھے
> اورنگ آباد سے اسپیشل ڈیوٹی پر بلایا گیا کام دھیرے دھیرے شروع ہوا عرض داشت
> جو اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں منظوری کے لیے پیش کی گئی وہ میری ہی لکھی ہوئی تھی "

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ ہی اردو میں کتابوں کا مسئلہ درپیش تھا جیسا کہ جامعہ کے قیام سے پہلے یہ بات کہی جاتی تھی کہ اردو میں کتابیں کہاں ہیں کہ انھیں نصاب میں شامل کیا جائے اس لیے جامعہ کا قیام کتابوں کے ترجمہ ہونے تک ملتوی رکھا جائے لیکن اکبر حیدری نے ان اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ ہی ایک " دارالترجمہ " قایم کیا۔

حیدرآباد کے ادبی انقلاب میں مولوی عبدالحق کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے سر اکبر حیدری کے ایما پر انھوں نے دارالترجمہ کا کام سنبھالا اور اس کے انتظام اور تشکیل میں انتہائی خلوص و محنت کا ثبوت دیا علوم و فنون کی بیشتر کتابیں جو نصاب میں ضروری تھیں ان کا نہ صرف انگریزی زبان کی کتابوں سے ترجمہ کرایا بلکہ عربی اور فرانسیسی زبان کی بھی بعض کتابوں کا اردو ترجمہ کرایا۔

حیدرآباد میں ان کی ان علمی و ادبی خدمات کا جہاں اہل علم نے اعتراف کیا وہاں ان کے مخالفین کی تعداد بھی بڑھنے لگی اور بقول انہی کے وہ آدمی کیا جس کے کچھ مخالف نہ ہوں لوگوں نے ان کے خلاف ملکی و غیر ملکی کی تحریک شروع کردی لیکن وہ ان تمام قوتوں کا مقابلہ نہایت استقلال سے کرتے رہے ۔

مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے بھی انھوں نے اردو کی گراں قدر خدمات انجام دیں وہ اسکولوں کا دورہ کرتے مدرسوں کا معائنہ کرتے اردو کے اچھے استادوں کا تقرر کرتے اور ان کو طریقۂ تعلیم کی تعلیم دیتے وہ ایک مدت تک اس خدمت کو نہایت جوش اور خوش معاملگی سے انجام دیتے رہے لیکن " درد قولنج " کی بنا پر انھیں اپنے دوروں میں کمی کرنا پڑی اور انھوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ وہ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوجائیں ۔ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوجانے کے بعد انھوں نے اردو کی خدمت کو جاری رکھا اردو کی کلاسیں خود لیا کرتے ۔ کالج میں اردو سے طلبہ کا ذوق بڑھانے کے لیے انھوں نے ایک رسالہ " نورس " جاری کیا۔

اورنگ آباد کی حسین اور پرفضا جگہ میں وہ اپنے علم و ادب کی پیاس بجھا رہے تھے کہ ۱۹۲۹ء میں مولوی وحیدالدین سلیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ کا انتقال ہوگیا ۔ شعبۂ اردو کی اس جگہ کے لیے سلیم مرحوم کے بعد کوئی شخصیت نظر نہیں آتی تھی اور مولوی صاحب اورنگ آباد کے پرسکون ماحول کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن مہاراجا سرکشن پرشاد اور سر اکبر حیدری کے اصرار نے انھیں مجبور کردیا اور وہ ایک مدت تک " بحیثیت پروفیسر شعبۂ اردو " کے کام کرتے رہے اور آخرکار ۱۹۳۷ء میں اردو کی حفاظت و بقا کے لیے انھوں نے پروفیسر شپ سے استعفا دے دیا اور اپنی زندگی کی سب سے عزیز شے

انجمن ترقی اردو" جو ان کی تمام زندگی کا سرمایہ تھی اس کا دفتر مولانا کو مجبوراً دہلی لانا پڑا اور وہ دہلی میں آ بسے۔

اب تک میں نے بابائے اردو کے قیام دکن کے دوران علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی لیکن میں نے انجمن ترقی اردو ذکر بعد میں کرنا مناسب سمجھا کیونکہ بابائے اردو کا یہی کارنامہ ان کی زندگی کا سب سے بیش قیمت اور قابل فخر کارنامہ ہے ور یہی وہ ادارہ ہے جس نے بابائے اردو کو بابائے اردو بنا دیا وہ خود کہا کرتے تھے کہ میرے حالات زندگی اگر دیکھنا ہیں انجمن ترقی اردو کے حالات دیکھو۔ وہ انجمن کو اپنی ذات سے علیحدہ ادارہ نہیں سمجھتے تھے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہو گیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا اور انشا اللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے یسا ہی قایم رہے گا خواہ میں اس کا سکریٹری رہوں یا نہ رہوں"۔

انجمن ترقی اردو کے بانی بھی سرسید مرحوم ہی تھے مجھے اجازت دیجئے کہ میں انجمن ترقی اردو کے حالات تفصیل سے پیش کروں کیونکہ اختصار کے ساتھ بات نامکمل اور ادھوری رہ جائے گی دوسرے انجمن کے ساتھ بابائے اردو کا تعلق ی کچھ زیادہ واضح نہ ہو پائے گا اس لیے میں انجمن کے حالات کے سلسلے میں تھوڑی تفصیل سے کام لوں گا۔

مولوی مقتدا خاں شیروانی نے مجھے بتایا کہ کانگریس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی اور سرسید اپنی قوم دوستی کی بنا پر س بات کو ناپسند کرتے تھے کہ مسلمان ناکافی تعلیم کے ساتھ سیاست میں حصہ لیں اس لیے انھوں نے "ایجوکیشنل کانفرنس" بنیاد ڈالی اور اس ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے وہ ہمیشہ کانگریس کے جلسوں کے ساتھ کرتے۔ سرسید خود اردو کے بہت بڑے حامی تھے اور اردو زبان کی جلا و بقا کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے سرسید کے ہاتھوں ڈالی ہوئی اس مبارک تحریک کے جلسے ہوتے رہے سرسید کے بعد نواب محسن الملک نے اس میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور ۱۹۰۳ء میں دہلی میں ل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ایک "شعبۂ علمی" کا اضافہ ہوا اور یہی ادارہ آگے چل کر انجمن ترقی اردو ہلایا تو اس کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی مقرر ہوئے وہ دو سال تک انجمن کے کام کو انجام دیتے رہے لیکن جیسا ان کے تعلق مشہور رہے کہ وہ تیز مزاج واقع ہوئے تھے کسی سے دبنا ان کی کسر شان تھا مولانا کے اختلافات علی گڑھ سے بیزاری نے آخرکار "ندوۃ العلما" میں جا کر پناہ لی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے علی گڑھ کے اجلاس ۱۹۰۵ء میں علان کر دیا کہ مولانا شبلی نے اس سال اپنی معروفیات کی وجہ سے انجمن سے استعفا دے دیا ہے۔

مولوی شبلی کے بعد مولوی حبیب الرحمان خاں شیروانی کو سکریٹری بنایا گیا مولانا سے جہاں تک ہو سکا انجمن کے کام کو چلانے کی کوشش کی کتابوں کو شائع کرایا مؤلفین اور مترجمین سے تقاضے کئے لیکن انجمن بے بسی کا شکار رہی سرمائے کی کمی اور اراکین کی کمی کی بنا پر مولانا نے انجمن سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور تب مولوی عزیز مرزا کو منتخب کیا گیا لیکن موت نے جلد ہی انھیں چھین لیا۔

۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق کو انجمن کا سکریٹری بنایا گیا اور ایک پرانا صندوق "جو بوجہ بوسیدگی رسی سے

کسا ہوا تھا ایک قلم دوات " یعنی کل انجمن کا سرمایہ مولانا کے سپرد کر دیا گیا۔ ان حوصلہ شکن حالات میں کوئی دوسرا ہوتا تو شاید ہی اس کی ہمت کرتا لیکن وہ خود کہتے تھے کہ " میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس بارِ گراں کو اپنے ذمے لیا ہے کیونکہ یہ کام جس قدر ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی۔ اردو زبان میں علوم و فنون لانے کے لیے ایسے اصحاب کی ضرورت ہے جو علوم مشرقی و مغربی دونوں میں ماہر ہوں۔ دوسری مشکل اس کام میں سرمایہ بہم پہنچانے کی ہے۔"

جن حالات میں بابائے اردو کو انجمن کا سکریٹری بنایا گیا اس وقت انجمن کے تین قسم کے ممبران تھے پہلا نمبر " سرپرست " صاحبان۔ یہ وہ لوگ ہو سکتے تھے جو انجمن کو ایک ہزار روپے کی رقم عطا کریں دوسرا نمبر ارکان دوامی کا تھا جو یک مشت پانچ سو روپے عنایت کریں۔ ظاہر ہے ان دو قسموں میں سے انجمن کی قسمت میں کوئی ممبر نہیں تھا ہاں ارکانِ شوریٰ کی خاصی تعداد تھی۔

جس وقت مولانا کو انجمن کا سکریٹری بنایا گیا وہ اس وقت اورنگ آباد میں مہتمم تعلیمات تھے اپنے انہی سرکاری دوروں کے ساتھ ساتھ مولانا نے انجمن کے کام پر بھی توجہ دینا شروع کی وہ اپنے انہی سرکاری دوروں کے دوران لوگوں کو انجمن کا ممبر بنانے چندہ وصول کرتے اور اردو کا ذوق و شوق پھیلاتے ہوئے انھوں نے معمولی گاؤں تک کے دورے کیے۔ اپنے دوستوں کو انجمن کا ممبر بنایا جس سے تعلقات ہوتے اس سے چندہ بھی وصول کرتے غرض اس سرگرم محنت و مستعدی نے انجمن کی حالت سدھارنے میں بڑی مدد کی انھوں نے اپنے ذاتی اثر سے کام لے کر مختلف اخبارات کے ایڈیٹر حضرات کو انجمن کا ہمدرد بنایا ان حضرات نے انجمن کی تائید میں بڑے پرجوش و پرزور مضامین لکھے ان میں ہمدرد، زمیندار، وکیل، مشرق ۔ خطیب ۔ عصر جدید ۔ نیر اعظم ۔ مساوات ۔ صداقت ۔ ذوالقرنین ۔ دلگداز ۔ ظل السلطان ۔ الناظر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالحق انجمن کے لیے تمام حفاظتی کام کر رہے تھے کہ بعض حالات کی بنا پر ایجوکیشنل کانفرنس نے انجمن کی امداد بند کر دی لیکن مولانا نے بغیر پروا کیے انجمن کا کام زیادہ مستعدی سے شروع کر دیا۔ انھوں نے انجمن کو اس کی تقدیر کے حوالے نہیں کیا بلکہ استقلال سے تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ انھوں نے فراہمی سرمایہ کے ساتھ ساتھ ہی نواب عماد الملک کو انجمن کا صدر بنایا نواب صاحب کے صدر ہونے سے انجمن کو بڑی مدد ملی نواب صاحب کی تحریک پر انجمن ترقی اردو کو بارہ سو روپے ماہانہ کی امداد منظور کی گئی۔ لیکن انجمن کو سب سے زیادہ مدد نواب دکن کی سرپرستی نے عطا کی نواب صاحب نے اپنے ایک فرمان میں کہا " میں انجمن ترقی اردو کا سرپرست ہونا نہایت خوشی سے قبول کرتا ہوں۔"

والیٔ دکن کی سرپرستی نے انجمن کی ساکھ قایم کر دی تھی اور اس سرپرستی کے ساتھ ہی محمد اکبر حیدری (نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ) کی کوشش سے نواب دکن سے ازراہِ علم پروری انجمن کو مستقل پانچ ہزار روپے کی سالانہ

امداد منظور کی اس امداد نے انجمن کو بڑی حد تک مضبوط و مستحکم کر دیا تھا دوسرے مولانا نے انجمن کے لیے ایسے ممبران بھی بنانا شروع کر دیے تھے جو انجمن کو باقاعدہ چندہ ادا کرتے تھے ۔

انجمن کے کام کے پیش نظر بیگم بھوپال نے پچاس روپے ماہانہ کی امداد منظور کی اور ایک عرض داشت جو زیر تالیف کتابوں کے اخراجات کے سلسلے میں پیش کی گئی اس پر تین ہزار روپے منظور کیے ۱۹۱۵ء تک انجمن کی حالت مولانا کی بدولت بڑی مستحکم ہو چکی تھی اردو کی بیشتر کتابیں جن میں علمی کتابیں زیادہ تھیں انجمن سے ترجمہ و تصنیف ہو کر عوام کے سامنے آ چکی تھیں اور انجمن مختلف علوم اور اصطلاحات کا کام شروع کر چکی تھی ۔

۱۹۲۱ء تک انجمن کی حالت میں استحکام پیدا ہو چکا تھا اور اب وہ اس قابل ہو چکی تھی کہ ایک خالص علمی رسالہ نکال سکے ۔ ۱۹۲۱ء میں مولوی عبدالحق نے " اردو " کا مشہور رسالہ نکالنا شروع کیا مولانا وحیدالدین کا اس رسالے کو خالص ادبی رکھنے پر اعتراض تھا لیکن مولوی صاحب نے اس کو خالص ادبی رسالہ ہی رکھا اور اس رسالے کے مقاصد میں یہ بھی بتایا کہ اس میں تحقیق طلب الفاظ اور محاوروں کے بارے میں تحقیق ہوگی ۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں لکھا جائے گا جو واقعی تعارف کے محتاج ہیں اور جن کا " کلام بساط قدردانی تک نہیں پہنچا " ایسی کتابوں کے بارے میں تفصیلات درج کی جائیں گی جو گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شائع ہوتے ہی ناپید ہو گئیں ' رسم الخط املا انشا کی بہت سی " اصلاح طلب " اور " مشورہ طلب " باتوں پر غور کیا جائے گا اردو زبان و ادب کی تاریخی نشو و نما کا بھرپور جائزہ لیا جائے گا ۔ زبان کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جائے گا اور سوچا جائے گا کہ اردو اور اس کی بہنیں کس خاندان کی ہیں اور ان میں آپس میں کیا تعلق ہے ' ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ہی اردو زبان کی ترقی اور اشاعت کے بارے میں بھی سوچا جائے گا اردو تنقید کو آگے بڑھانے میں مدد دی جائے گی اور اردو کے مصنفین کے حالات شائع کیے جائیں گے ۔ غیر زبانوں کی انمول کتابوں کو اردو لباس پہنایا جائے گا غرض یہ رسالہ اردو زبان و ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالامال ہوگا کہ شائقین ادب اس کو غور سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں اہل ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو " یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ رسالہ اردو کے ایڈیٹر کو اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی لیکن ہاں بقول پریم چند " اردو رسالہ تمام اردو رسالوں کا قافلہ سالار بن گیا " اور اپنے عظیم ایڈیٹر کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۷ء تک نہایت کامیابی اور پابندی سے سہ ماہی رسالے کی صورت میں نکلتا رہا اور ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان سے ۱۹۶۱ء تک مولوی صاحب نے اس رسالے کو قدیم روایات کی طرح نہایت شان سے زندہ رکھا ۔

انجمن کے پیش نظر اردو رسالے کے بعد ایک رسالہ سائنس کے متعلق نکالنا تھا تاکہ اہل علم حضرات کو بیرونی سائنسی انکشافات سے روشناس کرایا جائے انجمن نے ایک رسالہ " سائنس " نکالنا شروع کیا لیکن بدقسمتی سے وہ زیادہ دن نہ چل سکا کچھ تو لکھنے والوں کی کمی دوسرے خریدار ناپید ' یہ رسالہ تقریباً گیارہ سال تک نکلتا رہا اور اس کے بعد بند ہو گیا ۔

انجمن کے رسالوں نے اردو زبان و ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دیں اس سے اردو والے انکار نہیں کر سکتے

انجمن کا رسالہ اردو ۔ معاشیات ۔ ہماری زبان ۔ قومی زبان یہ وہ رسالے تھے جنھوں نے اردو میں صاف ستھرے مذاق کو رواج دیا۔ ان رسالوں نے اردو کے بنیادی مقاصد کو ادا کرنے میں بڑا اہم حصہ لیا۔ انجمن کے رسالوں نے اردو ادب میں مختلف اسالیب بیان ہی پر زور نہیں دیا بلکہ اردو ادب میں ان صالح تنقیدی روایات کو بھی بڑھنے میں مدد دی۔ تحقیقی مضامین نے اردو والوں تحقیق کا صحیح ذوق و مذاق پیدا کیا۔ اردو زبان کے ارتقا پر سنجیدگی سے نظر ڈالی گئی۔ عملی تنقید کی راہیں روشن کی گئیں۔ ذات سے بلند ہو کر ادب پاروں کی پرکھ اردو رسالے کے تبصروں میں نظر آئے گی۔ تحقیقی مضامین نے دکن کی بہت سی ایسی ہستیوں کو روشناس کرایا جو ادب میں اپنا مقام رکھتی تھیں۔ تنقیدی انداز نے ان ہستیوں کے کلام کی قدر و قیمت متعین کی۔ تنقید اور تحقیق کا اس طرح چولی دامن کا ساتھ ہمیں انجمن کے رسالوں سے پہلے نظر نہیں آتا ۔

بابائے اردو کے ایک اور رسالے "افسر" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے خود تو جاری نہیں کیا تھا لیکن ۱۸۹۵ء میں وہ اس رسالے کے ایڈیٹر تھے، اس کی کوئی بڑی ادبی قدر و قیمت تو نہیں لیکن یہ ان کی زندگی کا سب سے پہلا رسالہ تھا۔

میں پچھلے صفحات میں کہہ چکا ہوں کہ مولوی عبدالحق کی زندگی انجمن کی تاریخ ہے، وہ اور انجمن علیحدہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنی تصانیف سے کوئی مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ جتنا بھی مناسب انجمن کو دے ڈالتے، اپنی بڑی بڑی رقمیں انجمن کو بطور امانت عطا کیں۔ غرض جو کچھ کرتے انجمن اور اردو کے لیے کرتے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ انجمن کے سکریٹری ہوئے اور ۱۹۳۶ء تک انھوں نے انجمن کو ایک مضبوط ادارہ بنا دیا تھا لیکن ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں کانفرنس کے دوران یہ طے پایا کہ انجمن کا دفتر دلّی لایا جائے۔ مولوی صاحب نے پروفیسر اردو شعبۂ عثمانیہ کی حیثیت سے استعفا دیا اور ۱۹۳۸ء میں انجمن کو میر و غالب کی سرزمین پر لے آئے اور یہیں سے انھوں نے پھر اردو کی تبلیغ و تحفظ کا کام انتہائی تیزی سے شروع کر دیا۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء تک ملک بھر میں طوفانی دورے کئے اور اردو کی تحفظ و بقا کے لیے انھوں نے ہندوستان کا بعض اہم اور بڑی با اثر شخصیتوں کی کھلم کھلا مخالفت کی اور ۱۹۱۲ء میں انھوں نے جو خدمت اپنے ذمے لی تھی اور جسے وہ ۳۵ سال سے زائد نہایت جوش اور خلوص سے کرتے چلے آ رہے تھے وہ دلّی کے ۹ سال قیام کے دوران اور تیز ہو گئی یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو گئے اور انجمن ترقی اردو اور کتب خانہ لٹ گیا۔

مجھے ۱۹۴۷ء کے فسادات کی تفصیل کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا اور نہ بہت زیادہ تفصیل سے انجمن کے حالات کا جائزہ لینا ہے ۔

۱۹۴۷ء کے بعد جیسے ہی فضا کچھ معمول پر آئی، مولوی صاحب دہلی آئے، انجمن کے باقی ساماں کو دیکھا، حالات سے مجبور و مایوس ہو کر کراچی چلے گئے۔ ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو دوبارہ دہلی واپس آئے، مختلف با اثر حضرات سے انجمن کے بارے میں مشورے کئے لیکن مولانا ابوالکلام نے کہا کہ آپ کا ہندوستان میں رہنا مناسب نہیں، آپ کو افیون وغیرہ برآمد کر کے گرفتار کر لیا جائے گا، بہتر ہے کہ آپ انجمن کا کام اب پاکستان میں شروع کریں۔ مولوی صاحب کے ذہن میں یہ صورت آ گئی اور آخر کار ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء

کردیا ہے اب ان بوڑھے ہاتھوں کی لاج آپ کے ہاتھ ہے۔"

انھوں نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بلند اور جوان حوصلے کے ساتھ کہا تھا۔ "یہ میرا عہد ہے کہ جب تک قلم میں طاقت اور زبان میں سکت ہے اردو یونی ورسٹی کی اس پاک مہم کو جاری رکھوں گا ملک کے چپے چپے کا دورہ کروں گا اور سب سے اپنا درد دل بیان کروں گا کیونکہ یہ میرا ایمان ہے کہ نونہالانِ قوم کی دماغی اور ذہنی نشو ونما اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک ان کی تعلیم کا ذریعہ ان کی قومی زبان نہ ہوگی" آگے چل کر انھوں نے کہا "کراچی میں اردو یونیورسٹی وقت کا ایک اہم تقاضا ہے' اردو یونی ورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے" اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی کتاب "پاکستان میں اردو کا المیہ" میں کہا "یہ یونی ورسٹی اپنی نظیر آپ ہوگی" یہ قومی زبان اور قومی تہذیب و روایات کو زندہ رکھے گی اور فروغ دے گی۔ اس کا سنگ بنیاد ایک ایسے شخص کا دست مبارک رکھے گا جس کے آنے کا انتظار ہے۔"

انجمن میں جب کہ ان کے خلاف ہنگامہ برپا تھا اور انھیں بے بس اور مجبور بنا دیا گیا تھا' پاکستان کے فوجی انقلاب نے بابائے اردو کی مشکلات دور کردیں اور انجمن کو خود غرض لوگوں سے پاک و صاف کردیا اب انھیں ایک بار پھر اطمینان سے کام کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۲۰ء میں ان کے علمی و ادبی کاموں کے پیش نظر الہ آباد یونی ورسٹی نے انھیں "ڈاکٹر آف لٹریچر" کی اعزازی ڈگری دی اور اس کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی نے انھیں اعزازی ڈگری دی لیکن وہ ان تمام باتوں سے بلند تھے ان کی حیثیت ایک عظیم مجاہد کی سی تھی جو حالات سے بے پروا ایک طویل مدت تک اردو کا پرچم ہاتھ میں لیے لڑتا رہا۔ جس زمانے میں وہ اردو کے حقوق منوانے کی جدوجہد کررہے تھے اس وقت ان کا قلم علمی و ادبی سطح پر اعلا تحقیقی تاریخی اور تنقیدی مقدمات' خطبات و مضامین کو ترتیب دے رہا تھا جن کی ادب میں مستقل حیثیت ہے۔

انھوں نے دکن کے شاعروں اور نثر نگاروں کو گوشۂ گمنامی سے نکالا اور ان کے کلام پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈال کر ان کی قدر و قیمت متعین کی' انھوں نے تذکروں پر مقدمے لکھ کر ان کی اہمیت کو واضح کیا مقدموں میں تحقیق اور تنقیدی انداز نے علمی و ادبی کتابوں کی قدر و قیمت متعین کی انھوں نے نصرتی اور مرحوم دلی کالج لکھ کر اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ان کے مقدمات کے علاوہ ان کی اردو قواعد صرف و نحو ان کی انگلش اردو ڈکشنری۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر' اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام' قدیم اردو' سید احمد خاں' مستقل اور اہم تصانیف ہیں۔ ان کی چند ہم عصر اردو میں فن سوانح و سیرت کے سلسلے میں حالی کے بعد دوسری سب سے بڑی اور اہم کتاب ہے' مرقع نگاری کا یہ فن ہمیں اردو ادب میں کہیں نہیں ملتا ہے۔ ان کے مضامین جو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ۔ رسالہ حسن۔ دکن ریویو۔ ماہ نو۔ افکار۔ ہماری زبان' قومی زبان' الناظر وغیرہ میں چھپے ہیں' ان کے علاوہ ان کے تنقیدی تبصروں اور مضامین کی تعداد ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔

اپنے ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "حالات بہت افسوس ناک صورت اختیار کر گئے ہیں، انجمن میں کچھ ایسے لوگ آ گئے ہیں جنھوں نے سازش کا جال بچھا رکھا ہے تخریب کا شوق زیادہ ہے تعمیر سے نفرت ہے"

بنام مولوی سخاوت مرزا - ۱۷ر اپریل ۱۹۵۰ء

اپنے ایک خط میں انجمن اور اپنی بے بسی کا حال اس طرح لکھا ہے "انجمن کی حالت تباہ ہے چند نا اہل و خود غرض لوگوں نے میرے کتب خانے اور انجمن پر قبضہ کر لیا ہے علمی و ادبی کام معطل ہے پارٹی بازی اور سازش کا بازار گرم ہے میں بے بس اور لاچار اوپر کی منزل پر بیٹھا رہتا ہوں"

بنام مس آمنہ مختار - ۲۴ر مارچ ۱۹۵۹ء

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "آج کل انجمن میں بدعنوانیوں، سازشوں، تفرقہ پردازی انجمن کے سرمایے کی بربادی کا بہت اہم کام ہو رہا ہے مجھے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جا رہی ہیں اور تخریبی کارروائیاں جاری ہیں۔ اس سے پریشان رہا اور زندگی سے بیزار ہوں - زندہ رہا تو سب حالات شائع کرا دوں گا"

بنام قطب النسا - ۲۲ر جون ۱۹۵۹ء

اپنے ایک اور خط میں ڈاکٹر قطب النسا کو لکھتے ہیں "انجمن ایسے نا اہل تخریب پسند غدار اشخاص کے ہاتھ میں آ گئی ہے جو علم و ادب سے بے بہرہ ہیں سارا روپیہ برباد کر دیا اصل کام صفر ہے"

۱۵ر جولائی ۱۹۵۹ء

ان خطوط کے اقتباسات سے ان کے دلی صدمے اور رنج کا اظہار ہوتا ہے وہ انجمن جس کے لیے انھوں نے زندگی بھر بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں جس کے ذریعے انھوں نے اردو ادب کے خزانے میں لازوال دولت کا اضافہ کیا تھا - انجمن کے ترجموں اور تالیفات اور تصانیف نے اردو والوں کے ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔

مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے مختلف تحقیقی کتابیں لغات یہ سب چیزیں اردو زبان میں انقلاب لے آئیں انھیں کبھی "جوربیاں" اور فکر معیشت نے نہیں ستایا لیکن ان کی راتیں اردو کی محبت میں جاگتے بسر ہوئیں۔ انجمن کا کام انھیں زندگی سے عزیز تھا لوگوں نے ان کی زندگی کا یہی عزیز سرمایہ چھیننا چاہا - جس طرح حیدر آباد میں ان کے خلاف ملکی اور غیر ملکی مسئلہ اٹھایا گیا تھا اسی طرح انھیں کراچی میں انجمن کے سلسلے میں پریشان کیا جا رہا تھا لیکن ایک بوڑھے کے خلوص عزم و استقلال کے سامنے دشمنوں کی قوتیں جواب دے گئیں، انھوں نے حالات سے مایوس ہو کر اردو سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی بلکہ اپنے مقصد زندگی کو حاصل کرنے کے لیے اور زیادہ مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا کراچی میں اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے جد و جہد شروع کر دی انھوں نے ایک بار کہا تھا میں نے اللہ کا نام لے کر اردو یونیورسٹی کی پاک مہم کو شروع

کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتے ہوئے جہاز میں سوار ہو گئے ؎

رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بے خزاں رہ چکے تیرے بہت دن ہم بے بسی مہماں

پاکستان آنے کے بعد انھوں نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی لیکن مولانا ہندوستان کی مرکزیت نہیں چھوڑنا چاہتے تھے آخر حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے مستقل طور پر پاکستان میں انجمن کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ انجمن سے ایک رسالہ "قومی زبان" نکالنا شروع کیا۔ رسالہ "اردو" وغیرہ اسی آن سے نکالنا شروع کئے۔ انجمن کی کتابوں کا کام تیزی سے شروع کر دیا۔ وہ ادارہ جو ہندوستان میں اردو زبان کے سلسلے میں سب سے زیادہ گراں قدر خدمات انجام دے چکا تھا۔ انھوں نے پاکستان میں اسے اسی شان سے برقرار رکھنا چاہا اور اسے ملک کا سب سے مضبوط علمی و ادبی ادارہ بنانا چاہا لیکن کچھ دن بعد حالات بدل گئے۔ ہندوستان میں "ہندی اردو" جھگڑا تھا یہاں "اردو بنگالی" مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہنگامہ آرائیوں کا سلسلہ تھا جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن اپنی پیرانہ سالی کے باوجود وہ ان تمام اردو دشمن قوتوں کا مقابلہ نہایت استقلال سے کرتے رہے، خود کہا کرتے تھے کہ "میری تمام عمر لڑتے گزری، ہندوستان میں غیروں سے لڑتا رہا یہاں اپنوں سے لڑائی ہے" اردو زبان ان کا ایمان بن گئی تھی وہ اس کے لیے سب کچھ کر گزرتے تھے جب انھیں معلوم ہوا کہ حکومت پاکستان اردو زبان کے علاوہ بنگالی کو بھی سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے تو وہ بے چین ہو گئے۔ اگر تفصیلی حالات دیکھنا ہیں تو ان کی کتاب "پاکستان میں اردو کا المیہ" دیکھئے۔ انھوں نے ہمت نہیں ہاری عوام کا ہزاروں کا نہیں بلکہ لاکھوں کا جلوس لے کر وہ پارلیمنٹ کے سامنے مظاہرہ کرنے پہنچ گئے۔ انجام سے بے پروا ہو کر انھوں نے ہر اس شخص کو برا بھلا کہا جو اردو دشمنی پر آمادہ نظر آیا۔ غرض وہ اردو کے لیے آخر وقت تک لڑتے رہے۔

انجمن ان کی زندگی کا سب سے عزیز سرمایہ تھی۔ پاکستان میں انجمن کے پہلے صدر سر شیخ عبدالقادر تھے لیکن ۱۹۵۰ء میں ان کے انتقال کے بعد صدارت کا عہدہ خود مولوی صاحب کو سنبھالنا پڑا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں وہ اس ادارے کے ذریعے اردو ادب کی خدمت اسی طرح انجام دیں گے جس طرح انھوں نے ہندوستان میں دی تھی لیکن حالات نے رخ بدل دیا۔ ان کی عزیز انجمن پر غیروں نے قبضہ کر لیا۔ وہ ادارہ جس کی وہ ۱۹۱۲ء سے خدمت کرتے چلے آرہے تھے، اس سے انھیں محروم کر دیا گیا۔ ان حالات نے انھیں پریشان کر دیا۔ ان کے خطوط کے اقتباسات دیکھئے جن سے ان کی روح کی بے چینی ظاہر ہوتی ہے کہ انجمن کے حالات سے انھیں کتنا صدمہ تھا۔

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "میری صحت اچھی نہیں، انجمن کی حالت ناقابل اطمینان ہے، پارٹی بازی نے کام خراب کر رکھا ہے۔ اس سے بہت پریشان ہوں اور لاچار۔ انجمن کے مقاصد پس پشت جا پڑے ہیں اقتدار حاصل کرنے کے لیے آپس کے جھگڑے پیش پیش ہیں۔ پچاس برس تک شب و روز محنت کرنے اور جان کھپانے کا حاصل یہ ہے کہ جو کچھ کیا تھا اس پر پانی پھر گیا اور آئندہ کوئی امید نہیں۔ حکومت غافل، پبلک بے حس، زبان کا مسئلہ قابل اعتنا نہیں رہا۔" (خط بنام [illegible] ۱۸ فروری ۱۹۵۵ء)

ان کے خطبات تاریخی و تنقیدی اور تحقیقی لحاظ سے ایک قابل قدر کارنامے ہیں۔ ان میں انھوں نے اردو زبان و علم زبان کے سلسلے ہی میں بحث نہیں کی ہے بلکہ ان میں انھوں نے اپنے عہد کی تمام لسانی کش مکش کو بھی سمیٹ لیا ہے اور اردو زبان کی نشو و نما پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔

وہ اردو ادب کی ایک دیو پیکر شخصیت تھے جو تقریباً پون صدی تک اردو ادب پر چھائی رہی۔ انھوں نے ہر جگہ اردو کی تبلیغ کی اور اردو کے حقوق کے لیے آخر دم تک لڑتے رہے۔ پاکستان میں اردو کالج اور بی اے تک اردو ذریعہ تعلیم ان کے خوابوں کی تعبیر ضرور ہیں اور جب ان کے خوابوں کے پورا ہونے کا وقت آیا تو ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کی صبح کو موت کے ہاتھوں نے اس عظیم شخصیت کو ہمیشہ کے لیے چھین لیا اور اردو تاریخ کا ایک باب ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ وہ اردو تاریخ کا ایک باب ہی تو تھے۔

سب رس
ملا وجہی

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے۔ اُردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت محنت اور تحقیق کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے، شروع میں بابائے اردو کا محققانہ مقدمہ اور آخر میں فرہنگ الفاظ بھی شامل ہیں۔

قیمت :- چھ روپیے

مثنوی پھول بن
ابن نشاطی

یہ کتاب عشقیہ دکنی مثنوی ہے جو ابن نشاطی جیسے عظیم شاعر کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔ شیخ چاند ابن حسین نے اسے مرتب کیا ہے مفصل مقدمہ اور فرہنگ بھی شامل ہے۔

قیمت :- چار روپے

مثنوی من لگن
قاضی محمود بحری

یہ قاضی محمود بحری کی مشہور دکنی مثنوی ہے جسے سخاوت مرزا نے مرتب کیا ہے۔ مع مقدمہ و فرہنگ۔

قیمت :- تین روپے

مثنوی گلشن عشق
ملا نصرتی

ملک الشعرائے بیجاپور ملا نصرتی کی اس معرکہ آرا مثنوی کو بابائے اردو مرحوم نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں مقدمہ اور آخر میں فرہنگ الفاظ بھی شامل ہیں۔

قیمت: چار روپے پچاس پیسے

[illegible]

[redacted]

۳۶۴ دنوں کا حساب

احفاظ الرحمان

آج بابا کی برسی ہے؟

۱۶ راگست کا اخبار میرے سامنے پڑا تھا!

آج بابا کی برسی ہے؟

"بابا ایک عظیم انسان تھے، اردو دنیا کی سب سے پیاری زبان ہے۔ میں بابا سے محبت کرتا ہوں، میں اردو سے محبت کرتا ہوں، میں ....."

اور اچانک احساس کے بھیانک دیو نے میرے دل کو اپنی بھاری مٹھی میں جکڑ لیا۔

تم جھوٹے ہو۔ پچھلے سال بھی تم نے یہی کہا تھا، اور پھر ۳۶۴ دن گزر گئے، تم اپنی خاطر جیتے رہے اور اپنی خاطر مرتے رہے۔ تمھیں یاد تک نہیں رہا کہ تم نے کیا کہا تھا، تمھارے سامنے صرف ایک اپنا چہرہ تھا، تم سفید بالوں والے اس مقدس بوڑھے کو بھول گئے جو اپنی آخری سانس تک تمھاری جنگ لڑتا رہا۔ پچھلے ۳۶۴ دن تمھارے اپنے دن تھے، ان کا ایک لمحہ بھی اس جدوجہد کا حصہ نہ بن سکا جس نے اس مقدس بوڑھے کی زندگی کو روشن کر رکھا تھا۔

میں نے چپکے چپکے ان ۳۶۴ دنوں کا حساب لگایا،

ہر دن پر خود غرضی اور غفلت کی مہر لگی ہوئی تھی اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی جو اس مہر کو توڑتا۔

میں اردو کالج کے احاطے میں داخل ہوا۔

مجھے وہ دن یاد آگیا جب میں تہی دامن اس عمارت میں داخل ہوا تھا اور اس نے میرے بوسیدہ دامن میں علم کے رنگ برنگے پھول ٹانک دیئے تھے۔

سامنے ایک بینر لگا ہوا تھا۔

اردو آپ کی ہے۔

اردو کالج آپ کا،
اس کی عمارت میں ایک اینٹ آپ بھی رکھیئے !

میں بینر پڑھ رہا تھا، اردو کالج کی عمارت اپنے سابق طالب علم کے آگے دامن پھیلائے ہوئے تھی "میرے پھول مجھے لوٹا دو!"

" اس عمارت کے ستون میں میرے احساسات کی اینٹیں لگی ہوئی ہیں !"

" بے حس ! مجھے سیمنٹ کی اینٹیں چاہئیں - سیمنٹ کی اینٹیں، جو پیسے سے بنتی ہیں اور پیسے تمہاری جیب میں ہیں !"

میں ایک دم چونک پڑا اور میرا ہاتھ خود بخود جیب میں چلا گیا -

" نہیں ! نہیں !! میں تم سے محبت ضرور کرتا ہوں لیکن مجھے ان پیسوں سے ایک نئی قمیص خریدنی ہے "

" تمہارے پاس پہلے ہی درجن بھر قمیصیں ہیں !"

" ہیں تو سہی لیکن اب جو قمیص خریدنی ہے، وہ نئے فیشن کی ہے اور میں قدامت پسند نہیں کہلانا چاہتا - ویسے میں تم سے محبت ......"

احساس کا دیو ایک بار پھر میرے سامنے آ کھڑا ہوا !

میں مجرموں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا -

سامنے ایک مصرع لکھا ہوا تھا -

" گیسوئے اردو ابھی منت پزیر شانہ ہے"

اس سے ذرا اوپر، بالکنی پر، میں نے پہلی بار سفید بالوں والے اس بوڑھے کو دیکھا تھا، سردیوں کے دن تھے اور وہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا دھوپ لے رہا تھا -

اردو کا سپاہی !

اک مجنوں، اک دیوانہ، جو زخم کھاتا رہا اور مسکراتا رہا - اپنے ناتواں، بوڑھے جسم کے ساتھ اس نے کتنی لمبی مسافت طے کرلی تھی -

" بابا عظیم شخص تھا، وہ صدیوں زندہ رہے گا ....."

" اگر اس وقت میرے جسم پر وہ نئی قمیص ہوتی تو میں کتنا اسمارٹ لگتا "

انجمن کے صدر جناب اختر حسین، معتمد اعزازی جمیل الدین عالی، بلدیہ کراچی کے ضیا اللہ اور اردو کالج کے بہت سے لکچرار اور طلبہ بابائے اردو کے مزار پر پھول چڑھا رہے تھے -

" میں جلدی میں پھول نہ لاسکا - میرے پاس پھول نہیں ہیں بابا، ایک دل کا پھول ہے سو تمہاری نذر ہے، میں تمہارے

آگے سر جھکاتا ہوں!"

"تم تو اکثر یہاں آتے رہے ہو اور ہمیشہ گردن اکڑائے اس مزار کے سامنے سے گزر جاتے ہو، اتنی دور سے کہ تمھارے دل کے پھول کی مہک مجھ تک نہیں پہنچتی"

میں نے اختر حسین کی طرف دیکھا۔ یہ شخص کتنا بے لوث اور مخلص ہے، یہ چاہے تو اپنے وسائل سے اپنے ذاتی مفادات کی توسیع کرتا رہے لیکن ......

"پچیس روپے میں ایک اینٹ خریدیئے!"

اچانک میں نے دیکھا کہ اختر حسین میری ہی طرف دیکھ رہے ہیں، میرا ہاتھ خود بخود جیب پر چلا گیا۔

کہیں اس شخص کی نظر نہ پڑ جائے!

یہاں وہ بوڑھا اپنی آخری آرزو کے ساتھ منوں مٹی تلے سو رہا ہے، اردو یونی ورسٹی کی آرزو!

اس آرزو کی تکمیل میں سب سے اہم کردار ان افراد کو انجام دینا چاہیئے جو کسی نہ کسی وقت میں اردو کالج سے وابستہ رہے ہوں۔

اوپر انجمن کے دفتر میں قرآن خوانی ہو رہی تھی۔

..... اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "محنت کرو مراد پاؤ گے!"

اس بوڑھے نے اپنی تمام زندگی اردو کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ ہر دم متحرک اور رواں دواں رہا۔ اسے اپنے نصب العین سے محبت تھی۔ اس کے چراغ سے ہر دل کا چراغ روشن ہے۔

..... اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "مدد کرو ان لوگوں کی جو نیک کام کرتے ہیں!"

میرا ہاتھ اب تک جیب پر تھا!

اردو آپ کی

اردو کالج آپ کا

شام کے جلسے کے لئے شامیانے لگ چکے تھے اور اب انجمن ترقی اردو کے اربابِ متعلقہ کرسیوں کی قطاریں بنا رہے تھے۔ اردو کالج کے بہت سے طالب علم بھی ان کی مدد کر رہے تھے۔

میں، سابق طالب علم باہر نکل آیا۔

شام کو جب میں وہاں پہنچا تو رنگ برنگے شامیانے کے نیچے، اسٹیج پر مہمانِ خصوصی قدرت اللہ شہاب، اختر حسین، جمیل الدین عالی، سبطِ حسن، سید محمد تقی، شوکت سبزواری اور رجمیل نقوی بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے سینکڑوں خواتین و حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کو بابا سے عقیدت تھی اور وہ ان کی دیوانگی کی قدر کرتے تھے، اور اپنے اسی جذبے

کے اظہار کے لیے وہاں جمع ہوئے تھے۔

میں بھی بابا سے بہت عقیدت رکھتا ہوں اور ان کی دیوانگی کی قدر کرتا ہوں، تبھی اتنا طویل فاصلہ طے کرکے وہاں پہنچا تھا۔ میں سب سے پچھلی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جلسے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ بابا کی باتیں کر رہے تھے تو وہ ان لوگوں میں سے تھے جو لوحِ وقت کی تحریر ہو جاتے ہیں"۔

"اس بوڑھے نے اپنے سینے میں کتنی صدیاں سمیٹ لی تھیں"

"انھوں نے جو جگہ خالی کی ہے وہ کبھی پُر نہیں ہو سکتی"

"ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا . . . ."

میں کیا بات کرتا، میرے پاس بابا کی ایک بھی بات نہیں تھی، ایک بھی یاد نہیں تھی۔ وہاں ایک تنہا میں ہی مجرم تھا شرمسار اور خجل! اُجلی اُجلی شیروانیاں، دھنک کے رنگوں میں ڈوبے ہوئے دوپٹے، تمام چہرے مطمئن تھے شاید وہ سب اپنا اپنا حصہ ادا کر چکے تھے، ان کے پچھلے ۳۶۴ دن احساس اور عمل کی روشنیوں میں جگمگا رہے تھے، ان کے قہقہے جاندار تھے، باتیں پُر وزن تھیں۔ کتنی ہی اینٹوں پر ان کے نام نقش ہیں۔ ان میں وہ دانشور تھے جن کے چراغ بابا کے چراغ سے جلے تھے، وہ طلبہ بھی تھے جن کی آنکھوں میں بابا کے افکار کی چمک تھی، وہ خواتین بھی تھیں جن کے آنچلوں پر بابا کی شفقت کے سائے تھے۔ اور وہ سب مطمئن تھے کیونکہ ان کے چراغوں سے وہ اندھیرے دور ہو رہے تھے جو بابا کی اردو کے اردگرد چھائے ہوئے ہیں، ان کی آنکھوں میں مستقبل کی کامیابیاں جھلک رہی تھیں، ان کے آنچلوں کے پرچموں پر اردو کی عظمت کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔

سب چہرے مطمئن تھے، سب نے اپنا اپنا حصہ ادا کر دیا تھا۔ ۳۶۴ دنوں کا حساب بے باق تھا۔

اور ان میں ایک تنہا میں ہی مجرم تھا، شرمسار اور خجل! لیکن میرا سر جھکا ہوا نہیں تھا کیونکہ یہاں ایسے معاملوں میں سر جھکانے کا رواج نہیں ہے بلکہ میں اس انداز سے بیٹھا جیسے وہاں کا سب سے اہم آدمی میں ہی ہوں۔

تمھارا حصہ کہاں ہے؟

۳۶۴ دنوں کا حساب دو؟

میں حساب میں ہمیشہ کمزور رہا ہوں!

جمیل الدین عالی نے اعلان کیا۔

اسٹیج پر اختر حسین کھڑے ہوئے تھے۔

"پچیس روپے میں ایک اینٹ خریدیئے!"

اینٹوں کا بیوپاری، جس کی نظریں میری جیب پر ہیں۔ اب تو میں سب سے پچھلی کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔

"اردو کی خدمت کرنے والے کل اداروں کو حکومت صرف آٹھ دس لاکھ روپے کی سالانہ امداد دیتی ہے۔ آپ

یہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ معمولی رقم سارے اداروں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور کوئی ادارہ بھی زبان کی خاطر خواہ خدمت کرنے کا ہل نہیں رہتا“

اینٹوں کے بیوپاری نے اپنا بیوپار شروع کر دیا تھا۔

”جو عظیم مقصد بابائے اردو کے پیش نظر تھا، ہم نے اسے حاصل کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی ہے ...... عمیر کا یہ کام صرف خدا کے بھروسے اور آپ حضرات کے تعاون کی امید پر شروع کیا گیا ہے ....“

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی کرسی نہیں تھی!

” ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ ہر اردو دوست اپنے نام کی ایک اینٹ ضرور عطا کرے اور اس ایک اینٹ کی قیمت پیس روپے رکھی گئی ہے ....“

پچیس روپے کی ایک اینٹ،

اور ایک قمیص، بھڑک دار، نئے فیشن کی .... ؟

میں حساب میں ہمیشہ کمزور رہا ہوں!

عالی صاحب نے پھر کوئی اعلان کیا،

یہ شخص اپنی افسری چھوڑ کر ایسے تھرڈ کلاس کاموں میں کیوں الجھا رہتا ہے؟

”اردو ہماری تہذیب کی امین ہے، اسے نظر انداز کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ماضی سے کٹ جائیں گے“ یہ سید محمد تقی ھے ”اور پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا!“

اردو ہماری تہذیب کی امین ہے۔

اردو یتیم ہے، اس کا بابا نہیں رہا، ہم اردو کے امین بنیں گے، ہم اردو کی حفاظت کریں گے۔ ہم اردو .....“

اینٹوں کے بیوپاری کا چہرہ ایک بار پھر نظروں کے سامنے لہرا گیا،

”پچیس روپے میں ایک اینٹ خریدیئے“

اردو آپ کی،

اردو کالج آپ کا!

سب نے اپنا اپنا حصہ ادا کر دیا تھا۔ ضرور کر دیا ہوگا کیونکہ سب کے چہرے مطمئن تھے۔ ایک تنہا میں ہی مجرم تھا!

سبط حسن نے بڑے جوش سے کہا ”اردو کالج کو یونی ورسٹی بنا دینا چاہیئے!“

بڑا متاثر کن انداز تھا، بڑے بچے تلے الفاظ تھے۔

واقعی اردو کالج کو اردو یونی ورسٹی بننا چاہیئے یہ وہی ادارہ ہے جس نے میرے بوسیدہ دامن میں علم کے رنگ گے پھول ٹانکے تھے، [illegible]

اور آج میری جیب میں اتنے پیسے ہیں کہ میں جدید فیشن کی ایک نئی قمیص خرید سکوں،

" اردو کالج کی عمارت میں ایک اینٹ آپ بھی رکھئے!"

"یہ اینٹ کتنے کی ہے؟ "

"صرف پچیس روپے کی!"

" لیکن میں جدید فیشن کی قمیص خریدنا چاہتا ہوں، میں قدامت پرست نہیں کہلانا چاہتا، میں اردو سے محبت کرتا ہوں اسی لیے تو...... "

" بابائے اردو انگریزی کی حاکمیت کی جگہ اردو کی حاکمیت چاہتے تھے!" اسٹیج پر، ممتاز حسین اپنا مضمون پڑھ رہے تھے۔

" ہاں، ہم آزاد ہیں، اس لیے ہماری زبان کو بھی آزاد ہونا چاہیئے - اور آزادی کیسے ملتی ہے؟ ہمیں احساس ہے - اور احساس کے ساتھ ساتھ عمل پر بھی ہمارا ایمان ہے - ع.....م.....ل.... لیکن اس لفظ کا کوئی تعلق میری جیب سے تو نہیں ہے؟"

مہمانِ خصوصی مائک کے سامنے آچکے تھے،

" ذاتی طور پر وہ مسلمانوں کی اس نشاۃ ثانیہ کی آخری شمع تھے جو سرسید کے ہاتھوں فروزاں ہوئی وہ ان درخشاں روایات کا جیتا جاگتا مرقع تھے جن میں ہر ذاتی آرام، مفاد اور خواہش خدمت کے جنون، کام کی لگن اور دیانت داری کی دھن پر قربان ہو جاتی ہے....."

اور وہ اسی عمارت میں اپنی آخری آرزو کے ساتھ منوں مٹی تلے دفن ہیں، جہاں تمھارے قدم اکثر آتے رہتے ہیں - ان میں سے کوئی قدم ایسا ہے جو اس آرزو کا ایک حصہ بن سکا ہو؟

سب چہرے مطمئن تھے، وہاں ایک تنہا میں مجرم تھا!

شہاب صاحب کہہ رہے تھے " میں اپنے سارے خاندان کے لیے اردو کالج کی اینٹوں کی رسید جمع کر لینا چاہتا ہوں....."

عالی صاحب ایک بار پھر مائک پر آئے،

اب یہ شخص اعلان کرے گا " اگر آپ کو اردو سے محبت ہے اور یقیناً ہوگی تو اقامتی اردو کالج کی تعمیر میں حصہ لیجیے، انجمن کے کارکن آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں!"

لیکن وہ اختتامی الفاظ کہہ رہے تھے -

بابا کی ساتویں برسی ہو چکی تھی - اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا - اب یہ دن ۳۶۴ دن کے بعد آئے گا -

میری آنکھوں میں آنسو آگئے -

میں بابا سے محبت کرتا ہوں،

تم جھوٹے ہو، تمھارے چہرے پر صاف لکھا ہوا ہے، تم کمینے ہو، ہر سال یہاں آتے ہو اور اندھیرے کے ساتھ واپس چلے جاتے ہو،

کل میں جدید فیشن کی نئی قمیص خریدوں گا!

بابائے اردو کی یادیں

انجمن ترقی اردو خواتین کے جلسے کی روداد

آنسہ اختر اخلاق

مورخہ ۱۰ راگست ۱۹۶۸ء بروز ہفتہ بوقت ۳ بجے سہ پہر انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان کے دفتر میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی ساتویں برسی زیر صدارت ام الاردو بیگم محمد شریف صاحبہ (صدر انجمن) منائی گئی سب سے پہلے قرآن خوانی ہوئی اور مرحوم کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا گیا۔

جلسے کی ابتدا تلاوت قرآن پاک سے ہوئی۔ تلاوت غزالہ روحی نے کی، اس کے بعد اردو زبان کے متعلق ایک نظم محترمہ بیگم مسرت جہاں صدیقی صاحبہ نے نہایت موثر انداز میں پڑھی۔ بعد ازاں محترمہ بیگم نواب صدیق علی خاں صاحبہ نے بابائے اردو کے متعلق اپنے گراں مایہ خیالات کا اظہار فرمایا اور بہنوں سے درخواست کی کہ اردو کالج کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور پچیس روپے کی ایک اینٹ کے حساب سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس طرف ترغیب دلائیں۔ اس کے بعد محترمہ بیگم عرفان اللہ صاحبہ نے اپنے خیالات سے نوازا اور اپنے قیام روس کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا "جب میں روس گئی تو میری ملاقات روس کے وزیراعظم سے ہوئی انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ میں نے سنا ہے کہ پاکستان کی قومی زبان انگریزی ہے اس پر شرم سے میری گردن جھک گئی لیکن میں نے اپنے ملک کے وقار کی خاطر جھوٹ بولا اور کہا کہ آپ نے غلط سنا ہے ہماری قومی زبان اردو ہے" اس واقعے سے سب بہنیں بہت متاثر ہوئیں۔ بیگم عرفان اللہ صاحبہ کی تقریر کے بعد مقالات کا انعامی مقابلہ شروع ہوا جس کا عنوان تھا "مولوی عبدالحق اور جامعۂ اردو" سب سے پہلے ناظر فیض صاحبہ نے مقالہ پڑھا انھوں نے بابائے اردو کی خدمات پر بڑے مدلل انداز میں روشنی ڈالی اور بتایا کہ بابائے اردو کی جامعۂ اردو کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ اس کے بعد شمیم رحمان صاحبہ نے نہایت جامع اور واضح مقالہ پڑھا اور بابا کی اردو نوازی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد آنسہ ریحانہ احسن صاحبہ نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا "مولوی صاحب، سر سید، حالی اور شبلی کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے تھے اور اس زنجیر کی آخری کڑی تھے آپ نے اردو کو اس کا جائز حق دلانے میں انتھک کوششیں کیں۔ اس کے بعد خورشید گرلز کالج کی سابق طالبہ اور انجمن ترقی اردو کی نائب معتمد اعلیٰ آنسہ اختر اخلاق نے اپنا مقالہ

پڑھا اور بتایا " اردو زبان میں بڑی جامعیت اور وسعت ہے اور اس میں وہ تمام خصوصیات بیک وقت موجود ہیں جو ذریعہ تعلیم بننے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں " آگے چل کر بتایا کہ " اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے کئی کامیاب تجربے ہو چکے ہیں مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اہتمام صوبہ بمبئی میں دہلی کالج میں اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں تمام علوم و فنون کا ذریعۂ تعلیم اردو ہی تھا" اس کے بعد محترمہ مسرت جہاں صدیقی صاحبہ (آفس سکریٹری) نے اپنا مقالہ پڑھا اور بابائے اردو کی خوبیوں اور ان کی قوت عمل اور اردو کی لگن پر روشنی ڈالی۔ سب سے آخر میں انجمن کی معتمد اعلیٰ محترمہ بیگم سیدہ عثمانی صاحبہ نے اپنا مقالہ پڑھا جو نہایت وقیع دلائل پر مبنی تھا انھوں نے جامعہ اردو کے قیام پر زیادہ زور دیا انھوں نے بتایا کہ " بابائے اردو نے ہندستان میں رہتے ہوئے جامعہ اردو کا خیال ظاہر کیا تھا اور اس کے قیام کے لیے بے انتہا کوششیں کیں جو بالآخر جامعہ عثمانیہ کی شکل میں سامنے آیا وہاں تمام جدید علوم و فنون اردو میں پڑھائے جاتے ہیں اور اعلیٰ معیاری کتابوں کے تراجم کے لیے دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا "۔ انھوں نے بتایا " دراصل ہر زبان اپنے معاشرے کی ترجمان ہوتی ہے۔ اور ہمارے معاشرے کی صحیح ترجمانی ہماری زبان اردو ہی بہتر طور پر کر سکتی ہے " اور انھوں نے ان دشواریوں کا بھی ذکر کیا جو اردو کے خیر خواہوں کی تنگ نظری اور نادان دوستوں کی دشمنی کی وجہ سے اردو زبان کی ترقی میں حائل ہیں۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ " جامعہ اردو کے سامنے دو مسئلے آئیں گے ایک اساتذہ کی تدریسی تربیت اور دوسرا نصابی کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ۔ دونوں مسئلے اہل علم اور دانشوروں کے تعاون سے حل کیے جا سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دارالتراجم کھولے جائیں اور جدید علوم و فنون کی اصطلاحات وضع کرائی جائیں ان تمام منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمارے عزم راسخ اور قوت عمل کی ضرورت ہے۔ اور اسی طرح ہم بابائے اردو کے خواب جامعہ اردو کو شرمندۂ تعبیر کر سکیں گے۔

مقالات کے انعام کے فیصلے کے لیے تین خواتین بیگم نواب صدیق علی خاں صاحبہ۔ بیگم وحیدہ نسیم صاحبہ اور بیگم ڈاکٹر نسیم طاہر مرزا صاحبہ مقرر کی گئیں۔ ان کے متفقہ فیصلے کے مطابق " بابائے اردو کپ " بہترین مقالے پر بیگم سیدہ عثمانی صاحبہ کو ملا لیکن سیدہ عثمانی صاحبہ نے مقابلے میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا اس طرح یہ کپ دوسرے نمبر پر آنے والی طالبہ آنسہ اختر اخلاق کو بیگم شریف صاحبہ نے عنایت فرمادیا۔ دوسرا انعام بیگم نواب صدیق علی خاں صاحبہ کی طرف سے آنسہ ریحانہ احسن صاحبہ کو دیا گیا اور تیسرا انعام بیگم سیدہ عثمانی صاحبہ کی جانب سے بیگم ناظمہ فیض صاحبہ کو دیا گیا اس طرح یہ نشست بخیر و خوبی انجام پائی۔

اس کے بعد تیسری نشست منعقد ہوئی جو مشاعرے پر مشتمل تھی۔ اس کی صدارت محترمہ بیگم نواب صدیق علی خاں نے کی۔ شاعرات نے اردو پر نظمیں پڑھیں۔ اس مشاعرے میں محترمہ وحیدہ نسیم، اختر بیگانہ، سیدہ ناز، عزیز بدایونی، رعنا ظریف، مسرت جہاں صدیقی، اور آخر میں بیگم صدیق علی خاں نے اپنا کلام سنایا۔

مشاعرے کے بعد صدر انجمن محترمہ بیگم محمد شریف صاحبہ نے تقریر کی اور اپنے بیش بہا خیالات سے نوازا آپ نے بابائے اردو

کی خدمات پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ ۔ ہندوستان میں بابائے اردو نے اردو کے پرچم کو بلند رکھا، بابائے اردو نے اپنی زندگی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کر دی بہت سی کتابیں لکھیں ترجمے کیے تنقید و تبصرہ کیا - بابائے اردو کو خواتین پر بہت اعتماد تھا آخری جلسے میں بابا نے مجھے اور میری انجمن کو اس بات پر مبارک باد دی کہ ہم نے خواتین میں بیداری اور اردو کا ذوق پیدا کیا ہم نے نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں اردو کی ترقی کے لیے کام کیے اور اب بھی کر رہے ہیں بابائے اردو چاہتے تھے کہ جامعہ اردو قائم ہو“ بیگم شریف صاحبہ نے بہنوں سے پرزور اپیل کی کہ اردو کالج جو بن رہا ہے جو آگے چل کر اردو جامعہ بھی ہو سکتا ہے اس کی تعمیر میں حصہ لیں، اینٹیں خریدیں اور یہی طریقہ ہے بابا کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کا۔

قدیم اُردو

بابائے اردو

یہ کتاب بابائے اردو کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو کے قدیم مصنفین اور کتب سے متعلق ہیں قدیم اردو کی ادبی اور لسانی خصوصیات کا اندازہ کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں :۔

بیجاپور کے اولیا اللہ کا ایک شاعر خاندان گجری یا گجراتی زبان
حیدرآباد دکن کا ایک شاعر خاندان پرانی اردو میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں
دکنی اردو میں شاہنامے کی داستانیں اردو زبان کا ایک قدیم کتبہ
کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ مثل خالق باری شرح تمہید ہمدانی مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ
سب رس از ملا وجہی سب رس منظوم

قیمت :۔ پانچ روپیہ پچاس پیسے

انجمن ترقی اُردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی

سہ ماہی "اردو"

عجائب القصص	ڈاکٹر گیان چند
خلیق کی مرثیہ گوئی	ڈاکٹر مسیح الزماں
انعام اللہ خاں یقین کا غیر مطبوعہ کلام	محمد اکرام چغتائی
حالی اور سماجی انصاف	ڈاکٹر فاطمہ شجاعت
معراج نامہ ناسخ	رشید حسن خاں
انسانی اجتماعی زندگی کا ارتقاء	ڈاکٹر نذیر احمد
نئی کتابیں	ڈاکٹر شوکت سبزواری
	ڈاکٹر گیان چند

قطعہ منتخب	تصنیف :۔ عبدالغفور خاں نساخ ترتیب :۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر
تمہ ء سپول بن	تصنیف :۔ محمد حیدر ابن جعفر ترتیب :۔ شیخ چاند ابن حسین
تذکرۂ ہمیشہ بہار	تصنیف :۔ کشن چند اخلاص ترتیب :۔ ڈاکٹر وحید قریشی
لغت کبیر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قیمت فی پرچہ ۔ تین روپے پچاس پیسے
قیمت سالانہ بارہ روپے

نقد عبدالحق

سید معین الرحمان

سید معین الرحمان نے بابائے اردو کے ادبی و علمی کارناموں سے
متعلق ایک مجموعۂ مقالات مرتب کیا ہے۔ ذیل میں اس مجموعے کا دیباچہ
اور مضامین کی فہرست شائع کی جا رہی ہے (ادارہ)

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنے تئیں طویل لیکن اپنے چاہنے والوں کی آرزو سے کم تر عمر پائی۔ ان کی "طویل" زندگی کا کوئی لمحہ بے مصرف نہیں گزرا۔ ان کی خدمات کا سلسلہ بہت وسیع اور نتائج کے اعتبار سے بے حد وقیع ہے۔ انھوں نے اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں قد و قامت ہر اعتبار سے قابلِ ستائش اضافہ کیا۔ زندگی بھر وہ برابر زبان کی اشاعت و مدافعت کے لئے معرکہ آرا رہے۔ اور جہاں کہیں اس پر آنچ آتی دیکھی وہ ایک ذمہ دار وکیل اور جاں باز محافظ کی طرح اس محاذ پر سینہ سپر ہو گئے۔ ہر جگہ دلوں کو گرمایا، حوصلوں کو بڑھایا۔ اور زبان کی موثر وکالت اور مؤثر حفاظت کی۔

عبدالحق بلا مبالغہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک اردو کا مقدمہ لڑتے پھرے۔ اس کا سفیر بن کر دور دور اس کا پیغام پہنچایا۔ خطابت کے سہارے اسے دلوں میں اتارا اور انشا پردازی کے بل پر اس پیغام کو ذہنوں میں جمایا۔ زبان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اصول و قواعد صرف و نحو، کتب حوالہ اور لغات کی تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کی۔ قدیم ادبی تذکروں اور نادر و معدوم مخطوطوں کو گمنامی سے نکال کر اصحاب علم کو ان سے روشناس کرایا اور تحقیق و تنقید کی راہوں پر نت نئے چراغ روشن کئے۔

عبدالحق کی شخصیت متفقہ طور پر عظیم تھی اور خوش قسمتی یا بد قسمتی سے عظیم شخصیت کی نشانی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا احاطہ ایک کوشش یا ایک زمانے میں نہیں کیا جا سکتا۔ بابائے اردو کی پہلودار اور عظیم شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے کارنامے بھی اتنے زیادہ اور متنوع ہیں کہ ایک مضمون، ایک نمبر یا ایک کتاب میں بیان نہیں ہو سکتے۔ بیان کئے جا بھی نہیں سکتے کہ بڑی شخصیت کا متحمل ہونا آسان نہیں۔ اس کے لئے بجائے خود بڑی شخصیت کا حامل ہونا ضروری ہے اور یہ خود اختیاری بات نہیں۔ عبدالحق کی بلند اور غالب شخصیت اپنے بھرپور احاطے اور یادگار تجزیے کے لئے کسی حالی کی منتظر ہے۔ یہ حکیم اسرار احمد کریوی بھی ہو سکتے ہیں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی۔

عبدالحق اپنی زندگی ہی میں مداحوں، محققوں اور طالبان علم کے لئے ایک شاندار موضوع بن چکے تھے۔ جمیل الدین عالی کے لفظوں میں عبدالحق بہت دن سے اردو کے ایک کارکن کا نام نہیں رہا تھا۔ اس کے معنی بدل گئے تھے اور ان معنی کا حلقہ بھی بہت وسیع ہو گیا تھا۔ آج یہ حلقہ اور بھی وسیع ہے۔ آج "عبدالحق" ایک تحریک ہے۔ ایک ایسا مضمون ہے جس پر اور جس کے لئے بے شمار کام کرنے والے کام کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

بے شمار کام کرنے والوں کے باوجود عبدالحق کے بارے میں لکھا بہت کچھ گیا ہے لیکن "کام کا مواد" کم ہے۔ کچھ چھپا اور جیسا کچھ لکھا بھی گیا ہے، وہ مختلف رسالوں میں بکھرا پڑا ہے اور یہ سب کا سب کم و بیش ایسے رسالوں میں ہے جن کی بوجوہ عام اشاعت نہیں ہوئی۔ اس مختصر مواد کی بازیافت ایک اہم لیکن کٹھن کام ہے۔ پیش نظر کتاب "نقد عبدالحق" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

عبدالحق میرا محبوب و مرغوب موضوع ہیں۔ ان پر لکھتے پڑھتے ہوئے بارہا میں نے ایک ایسی جامع کتاب کی ضرورت محسوس کی جو ان کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح حاوی ہو کہ طالبان علم کو اس موضوع پر اخبارات و رسائل کی فراہمی اور ان کی ورق گردانی کے صبر آزما اور وقت طلب کام سے بے نیاز کر دے۔ یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہے۔ گو اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اس ضرورت کو پورا بھی کرتی ہے۔

یہاں دو صراحتیں بے محل نہ ہوں گی۔ کتاب میں شامل بعض مضامین عبدالحق کی زندگی میں لکھے گئے تھے۔ اس لئے جہاں تہاں بات اس صیغے میں کہی ہوئی بھی ملے گی گویا مولوی عبدالحق بقید حیات ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ترتیب میں اہل قلم اصحاب کے حسب مراتب کا سختی سے لحاظ نہیں رکھا جا سکا کہ کتاب کا مقصود اصلی عبدالحق کے فکر و فن کو صحیح سیاق و سباق میں پیش کرنا تھا۔ امید ہے اس "شتر گربگی" سے صرف نظر کیا جائے گا۔

کتاب میں شامل مضامین، پاک و ہند کے مختلف علمی و ادبی رسائل کے مضمون نگار اصحاب کی اجازت اور بعض صورتوں میں ان کی اپنی نظر ثانی کے بعد شریک انتخاب کئے گئے ہیں۔ جہاں یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ وہاں مدیران رسائل سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں ان تمام اہل قلم کا منت کش اور شکر گزار ہوں جن کے نتائج فکر اس انتخاب کی زینت ہیں۔

یہاں خصوصیت کے ساتھ مجھے ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جن کے گراں قدر مضامین کی شمولیت سے کتاب کا وزن و وقار بڑھ گیا ہے۔ خطبات پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون میرے حال پر ان کی برادرانہ اور مشفقانہ عنایت ہے۔ وقار عظیم صاحب کا دامن ہمیشہ "زمانے کے طوفانی حوادث میں میرا مامن و مسکن رہا ہے۔" اس موقع پر انھوں نے محض اپنے مضمون ہی سے مفتخر نہیں کیا بلکہ اپنے مرتب کردہ رسالہ "اردو" کے بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء سے بعض دوسرے نہایت اہم اور مفید مضامین کے انتخاب کرنے کی اجازت بھی عطا فرمائی۔

کتاب کا بیشتر مواد مجھے برگ گل (مجلہ اردو کالج، کراچی) کے بابائے اردو نمبر ۱۹۶۳ء سے میسر آیا جس کے لئے م

اس رسالے کی مجلس ادارت کے اپنے دو رفقا اعزاز طارق اور برادرم متین الرحمان مرتضیٰ کا خاص طور پر ممنون ہوں۔

آخر نہ کر آخیر مجھے محبت اور احسان مندی کے ساتھ مکرمی ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، محبی ایس۔ ایم شفیق اور عزیزہ خورشید زہرا کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جن کا پیہم خلوص کتاب کے ابتدائی منصوبے سے اشاعت کی آخری منزل تک میرا دمساز رہا۔

ترتیب

۱۳

سوانحی خاکے

بابائے اردو — ایک نظر میں بابائے اردو	خورشید زہرہ	۱۷
تحقیقات بابائے اردو	ڈاکٹر ابوسعید نورالدین	۱۹
مولوی عبدالحق اور دکھنیات	نصیرالدین ہاشمی	۲۹
اردو قدیم اور بابائے اردو	خواجہ حمیدالدین شاہد	۳۵
ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے۔	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	۴۷

مقدمات

مقدمات عبدالحق کا مرتبہ	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۵۵
مقدمات کی تنقیدی اہمیت	ڈاکٹر احسن فاروقی	۸۳
مولوی صاحب کے مقدمات	آمنہ صدیقی	۹۵
مقدمات عبدالحق پر ایک نظر	ڈاکٹر محمود الٰہی	۱۰۱
مقدمات ایک اہم دستاویز	مولوی محمد بیگ	۱۰۳

تنقیدات

اردو تنقید اور عبدالحق	متین الرحمان مرتضیٰ	۱۰۹
عبدالحق پر حالی کا اثر	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۱۲۹
عبدالحق کے تنقیدی تصورات	ڈاکٹر سیدہ جعفر	۱۵۱

خطبات

خطبات عبدالحق کی خصوصیات	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۶۱
خطبات عبدالحق کی اہمیت	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۱۶۷
مولوی صاحب کے خطبات	آمنہ صدیقی	۱۸۱
خطبات میں مزاح	کنیز فاطمہ اشرف	۱۸۷

خطبات عبدالحق کا اسلوب	سید شبیر علی کاظمی	۱۹۱

سیرت نگاری :-

مولوی صاحب کی سیرت نگاری	سید وقار عظیم	۱۹۹
مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری	اسلوب احمد انصاری	۲۲۷
ڈاکٹر عبدالحق کی شخصیت نگاری	ڈاکٹر محمود الٰہی	۲۳۹
"چند ہم عصر" کا تنقیدی جائزہ	سید معین الرحمان	۲۴۵

اسلوب :-

مولوی عبدالحق کا اسلوب	نثار احمد فاروقی	۲۷۱
مولوی عبدالحق کا اسلوب بیان	ڈاکٹر ثمینہ شوکت	۲۹۱
غالب سے عبدالحق تک ۔ اسلوب کا ارتقا۔	سید قدرت نقوی	۲۹۷

مجموعی جائزہ :-

تصانیف عبدالحق	خواجہ تہور حسین	۳۱۵
مولوی عبدالحق ۔ ایک مطالعہ	آفتاب زبیری (علیگ)	۳۴۱
مولوی عبدالحق ۔ ایک تاثر	جمیل متین الرحمان	۳۴۹
مولوی صاحب کے کارنامے ۔	عذرا کیفی	۳۵۷
مولوی صاحب کا مرتبہ	آمنہ صدیقی ۔	۳۶۹
مولوی عبدالحق کی خدمات	سید معین الرحمان	۴۰۱

اردو آپ کی
اردو کالج آپ کا
اس کی تعمیر میں ایک اینٹ آپ بھی لگائیے

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماھنامہ

قومی زبان

اکتوبر ۱۹۶۸ء

28/8/68

جلد ۳۳ شمارہ ۴

اس شمارے کے لکھنے والے

- سید وصی احمد بلگرامی
- ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
- سید قدرت نقوی
- محمد علی صدیقی
- مینا زبیری
- رخشاں ابدالی
- اکرام چغتائی
- ابو سلمان شاہجہان پوری

قیمت فی پرچہ - ایک روپیہ
قیمت سالانہ - دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ - کراچی
فون :- ۲۳۳۷۸۴

فہرست

عطیات برائے اردو کالج ۳
پروفیسر نجیب اشرف ندوی ۴
نیرنگیٔ تقدیر بچشم غالب — سید قدرت نقوی ۵
فراسو: دو تہذیبوں کا سنگم — محمد علی صدیقی ۱۳
افادات مہدی — ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ۱۱
پروفیسر عبدالمجید قریشی — مینا زبیری ۳۱
کلام یقین کا قدیم ترین مخطوطہ — محمد اکرام چغتائی ۴۵
سس شش مں — سید وصی احمد بلگرامی ۷۰
گردو پیش — ادارہ ۹۵
نئے خزانے — ابوسلمان شاہجہان پوری ۱۰۳

اس شمارے کا سرورق

اس شمارے کے سرورق کا ڈیزائن، مصورِ مشرق جناب عبدالرحمان چغتائی کا عطیہ ہے، جس کے انجمن ترقی اردو موصوف کی شکر گزار ہے

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
مشفق خواجہ

زیر تعمیر اُردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ تین لاکھ اکتالیس ہزار آٹھ سو سڑسٹھ روپے ستائیس پیسے (۳،۴۱،۸۶۷٫۲۷) جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ مہینے جو رقوم موصول ہوئیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

ذاتی عطیہ

جناب رئیس احمد صاحب۔ کراچی۔	ایک سو پچیس روپے تیس پیسے

عطیہ بذریعہ فروخت رسائل

ڈاکٹر فیروز عباسی صاحب کراچی	سات سو تین روپے

اینٹوں پر نام کندہ کرانے والوں کے عطیات

۱۔ حاجی منصور الزماں صاحب۔ کراچی	پانچ سو روپے
۲۔ جناب آغا ایم جعفری صاحب کراچی	پانچ سو روپے
۳۔ جناب جمیل جالبی صاحب۔ کراچی	ایک سو روپے
۴۔ جناب حبیب احمد صاحب۔ حبیب آٹوز کراچی	ایک سو روپے
۵۔ جناب انیس اے۔ کے لودھی صاحب۔ کراچی	ایک سو روپے
۶۔ جناب ایس۔ اے کرمانی صاحب۔ کراچی	پچاس روپے
۷۔ جناب منظر صدیقی صاحب کراچی	پچیس روپے
۸۔ جناب ملک خاں آفریدی صاحب کراچی	پچیس روپے
۹ جناب سید حسین صاحب۔ کراچی	پچیس روپے
۱۰ جناب شمس الحق صاحب۔ نوگاؤں۔ راج شاہی	پچیس روپے

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی رحلت

اردو دنیا میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۵ ستمبر ۶۸ء کو پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۶۷ سال کی تھی۔

پروفیسر ندوی کی ذات علمی و تحقیقی دنیا میں ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتی تھی۔ انہوں نے گزشتہ نصف صدی میں نہ صرف یہ کہ خود کئی علمی و تحقیقی کام انجام دیئے بلکہ بہت سے محققین کی رہنمائی بھی کی۔ سنہ ۱۹۳۱ء سے وہ بمبئی میں مقیم تھے اور سالہا سال تک وہ درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۹ء سے وہ مشہور علمی ادارے انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور مجلہ "نوائے ادب" کے مدیر تھے۔ وہ اردو تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ تقسیم ہند قبل انجمن ترقی اردو کی شاخ بمبئی کے روح رواں وہی تھے۔ تقسیم کے بعد بھی وہ اردو تحریک سے گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی رحلت سے اردو زبان کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔

نیرنگیٔ تقدیر بچشم غالب

سید قدرت نقوی

گردش خواہ آسمان کی ہو یا زمین کی، سورج کی ہو یا چاند کی، کواکب کی ہو یا ذرات کی۔ اسی کی بدولت حیات کا ظہور ہے۔ اس حرکت کا منبع حقیقی عقل سے ماورا، بس تمثیلاً کہہ دیتے ہیں۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اور اسی حرکت کی بدولت کائنات میں حسن و ارتقا کی نشاندہی کا ذریعہ، اشیاء کا عروج و زوال ہے۔ اس عالم میں حسن و دلکشی تغیر ہی کا سبب ہے اور کائنات تغیر ہی کی وجہ سے منازل ارتقا طے کر رہی ہے۔ ذرات سے لے کر اشرف المخلوقات تک ہر شے اس تغیر کا شکار ہے۔ درحقیقت یہی حرکت جس کو تغیر کہا جاتا ہے حیات کا موجب ہے۔ حرکت کے سبب ایک قطرۂ آب عمل تغیر کی بدولت بحر بیکراں کی پہنائیوں سے جدا ہوتا ہے۔ حرکت اس کو اضطراب مسلسل میں مبتلا کرتی ہے۔ یہ اضطراب پیہم جو حرکت ہی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہوتا ہے اس کو کبھی طوفان ابر و باراں کے توسل سے آغوش زمین میں جذب کر دیتا ہے۔ کبھی شبنم کی صورت میں درخشاں کرتا ہے تو کبھی کسی صدف کے بطن میں پہنچا کر در یتیم کی صورت عطا کر کے شہنشاہوں کے تاج کی زینت یا حسینان عالم کے گلے کا ہار بنا دیتا ہے۔ کبھی سیلاب کی شکل میں تخریب کا موجب بنتا ہے اور کبھی دریا کی صورت میں گل پوش وادیوں کی سیرابی کی خدمت بخشتا ہے۔ یا ریگ زاروں کی پیاس بجھا کر اپنی ہستی مٹا دینا شعار مقرر کرتا ہے۔

یہی منازل، دلیل حیات و کفیل بقا ہیں اور انہی کا نام تقدیر ہے۔ خواہ یہ گردش محوری ہو یا دوری، بالذات ہو یا بالواسطہ، بفحوائے کلام ایزدی تقدیر ہے۔

"والشمس تجری لمستقر لها ذالک تقدیر العزیز العلیم۔ والقمر قدرنہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم۔" اور یوں تو کائنات کی ہر شے پابند تقدیر ہے کیونکہ "وخلق کل شیء فقدرہ تقدیراً" لیکن تقدیر کی تعیین، مولا کا کام نہیں۔ حیات انسانی میں جہاں تدبیر کا دخل نہیں وہاں تقدیر کا عمل ہے۔ گویا "عرفت ربی بفسخ العزائم" کی منزل

ہی حقیقتاً تقدیر سے تعبیر کی جاسکتی ہے ۔ اسی لئے جب ارادے اور خواہشات، شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتے تو ہر نقش، شوخیٔ تحریر کا فریادی بننے کے لئے اپنا پیرہن کاغذی بنا لیتا ہے لیکن اس فریاد سے حاصل ؟ تقدیر کا علم کسے ؟ لاکھ زائچے تیار کرو بے سود، کیونکہ :۔

لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود   کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

احکام طالع مولود، ستاروں کی چال دیکھ کر لکھے جاتے ہیں اور ستارے چالبازی سے کام لیتے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

حقیقت یہ ہے کہ ہر شے کی تقدیر روز ازل مقرر ہو چکی ہے ۔ غالب نے ازل میں تقدیر کی ترقیم کا ذکر ایک قصیدہ میں اس طرح کیا ہے ۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے   صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں، بہ کلکِ قضا   مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش   لکھ دیا عاشقوں کو دشمنِ کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں ؟   گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں   خال کو "دانہ" اور زلف کو "دام"
آتش و آب و باد و خاک نے لی   وضع سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز   ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"

لیکن یہ تقدیر، ہر شے کی ہمت و استعداد پر موقوف ہے ۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے، وہ قطرہ، کہ گوہر نہ ہوا تھا

اور یہ ہمت، اگر ہمت عالی ہو تو کیا کہنا ! اس کے ہوتے ہوئے ہر شے ہیچ ۔ آپ ہی اپنا، ماسوا سے مستغنی ۔

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم   لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

اور جب اسی صاحب ہمت کو وجہ تکوین عالم قرار دیکر کائنات کا امیر بنایا جاتا ہے تو یہی "ہمت عالی" اس کو بھی ناکافی سمجھتی ہے گویا صاحب ہمت، الی اپنا مقدر اس سے بھی زیادہ خالی کرتا ہے ۔ مگر خالق کی عطا کو انعام سمجھ کر تکرار سے گریز کر جاتا ہے ۔

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا   یاں، آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اتنے مراتب کے باوجود ۔

نیرنگیٔ تقدیر کا تماشائی ہے زمانہ ۔

اور غالب نے اسی "نیرنگیٔ تقدیر" کا تمثیلی فسانہ، بصورت مثنوی فارسی میں پیش کیا ہے ۔ جس میں "توفیق باندازۂ

ست ہے انل٭ کی تفسیر پیش کی۔ حکایت کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے عـہ

ایک کسان، فلاکت و افلاس کا مارا۔ پیداوار سے محروم، نحوست طالع کا صید زبوں، کثرت مصائب جنوں انگیز، نیا میں تنہا، صرف بوڑھے ماں باپ ساتھ، جن کی خدمت کو وہ سعادت سمجھتا۔ آخر کار تنگ آکر، ترک وطن کا ارادہ کیا۔ ماں پ کو ساتھ لے۔ بیاباں کی راہ لی۔ کچھ منزلیں طے کی تھیں کہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں پہنچ گئے۔ اس ہولناک دشت میں صائب کا خاتمہ تھا۔ اس بیابان کا لالۂ خودرو، خون شہیدے سے تھا اور اس کا ہر ذرہ یزید کی تیغ کے جوہر سے تھا۔ افتاں و یزاں اس بیاباں میں چلتے رہے۔ اور راستہ طے کرتے رہے۔ مگر پیاس کی شدت نے ان کا حال بے حال کر دیا۔ ان کو آگے دم بڑھانا محال ہو گیا۔ ان کے چھالے، پیالے بنے، مگر پیالے نہ بن سکے۔ پتا پانی ہوا۔ مگر پیاس نہ بجھا سکا۔ آخر کار ان دور، ایک سیاہی سی نظر آئی۔ کچھ آس بندھی۔ امید نے حوصلہ بڑھایا۔ ان مصیبت زدوں نے بھی آگے قدم اٹھایا۔ بحال تباہ وہاں نچے تو دیکھا کہ ایک مرد خدا رسیدہ کا تکیہ ہے۔ اندر داخل ہوئے۔ اور اشارے سے پانی مانگا۔ اس اللہ کے بندے نے انہیں یراب کیا۔ جان میں جان آئی۔ ہوش بجا ہوئے۔ اس مرد بزرگ سے اپنی داستان بیان کر کے عنایت کے طلبگار ہوئے۔ اس مرد باصفا و رحم آیا۔ درگاہِ ایزدی میں سجدہ بجا لا کر ان بیکسوں پر رحم کرنے کی استدعا کی۔ بندۂ مقرب کو تینوں کی قسمت دکھائی گئی، جس ں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف مصیبتیں اور تکلیفیں تھیں۔ اس صاحب دل نے بارگاہِ رب العزت میں رحم کی درخواست کی۔ ہاتف نے ندا دی کہ ان تینوں کی ایک ایک دعا مستجاب ہے۔ اس نیک انسان نے یہ خوش خبری ان تینوں کو سنائی، اور رخصت کر دیا نوں نے گھر کی راہ لی۔ راستے میں امتحان کی غرض سے بڑھیا نے دعا مانگی کہ اے خداوند عالم! میں نے ساری عمر مصیبت یں بسر کی۔ نہ جوانی کا مزا اٹھایا اور نہ دنیا کا عیش۔ میرے شوہر کو مال و دولت کی ہوس ہے۔ وہ صرف دولت دنیا کی دعا مانگے ا جب مالدار ہو جائیگا تو مجھے فراموش کر دیگا۔ اور دوسروں کے ساتھ داد عیش دے گا۔ پس مجھے حضرت زلیخا کے مانند سن و جوانی عطا فرما۔ دعا مقبول ہوئی اور وہ کریہہ المنظر بڑھیا، جوان رعنا بن گئی۔ جب بڈھے نے اس کو اس ہیئت میں یا۔ ہزار جان سے قربان ہوا، مگر اس زنِ حرافہ نے اپنے دل میں کچھ اور ہی خیال باندھا۔ اتفاقاً ایک شہزادہ شکار کھیلتا ہوا۔ ساتھیوں سے بچھڑ کر گھوڑا دوڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ اس بدبخت، بے وفا عورت نے، تریا چلتر سے کام لیا۔ اور رونے چلانے شہزادے نے جو ایسی حسین و جمیل عورت دیکھی تو ہزار جان سے عاشق ہوا اور اس کا احوال دریافت کیا۔ اس قطامہ نے کہا کہ ن دونوں نے میرا مال و زیور لوٹ لیا ہے۔ مجھے قافلے سے بے ہوش کر کے لے آئے ہیں۔ مجھے ان سے بچاؤ! شہزادے نے ے گھوڑے کی پیٹھ پر اپنے پیچھے بٹھایا اور چلتا بنا۔ یہ دونوں باپ بیٹے حیران و پریشان دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ عورت کی وفائی پر بڈھے کو بڑا طیش آیا، غصے میں پیچ و تاب کھا کر درگاہِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور اس ناشدنی، بدذات اور بے وفا کے حق میں بددعا کی کہ اس عورت کو مادہ خنزیر بنا دیا جائے۔ دعا مقبول ہوئی اور وہ زن بے وفا مادہ خنزیر بن گئی

عـہ اردو میں مثنوی "درد و داغ" نام۔ کلیات نظم فارسی صـ۱

شہزادے نے اپنے پیچھے ایک بلا سی محسوس کی۔ مڑ کر دیکھا تو ڈرا اور اس کو گھوڑے سے گرا بے تحاشا بھاگا۔ جب عورت نے اپنی یہ حالت پائی تو اپنے شوہر اور بیٹے کے پاس آئی اور اپنا منہ دونوں کے پاؤں پر ملنے لگی بیٹے کو ماں کی حالت زار پر رحم آیا اور اس نے درگاہِ قاضی الحاجات میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور اپنی ماں کے اصلی حالت پر لوٹ آنے کی التجا کی۔ یہ دعا بھی درجہ قبولیت پر پہنچ کر مستجاب ہوئی۔ اس کی ماں پھر اپنی اصلی ہیئت پر لوٹ آئی۔"

یہاں آکر تمثیل ختم ہوتی ہے۔ غالب نے اس تمثیل کا حسب ذیل نتیجہ نکالا ہے۔

"اگر کوئی حقیقت کا محرم ہو تو تسلی کے لئے یہ کافی ہے کہ جب تک بخت بلند بھی موافق نہ ہو علاج عیسیٰ بھی بے سود ہے۔ نگاہِ مرد مومن سے تقدیریں بدلیں۔ رحمت حق جوش میں آئی۔ دعا کی تاثیر کے متعلق شک بھی دور ہوا۔ یقین کی منزل بھی حاصل ہو گئی۔ لیکن ان کی قسمت کی خرابی تھی کہ ان کی ہمت ان کو پستی کی طرف لے گئی۔ تین دعائیں قبول ہوئیں۔ مگر بلاؤں کے دور کرنے میں صرف ہوئیں۔ ان تینوں کو تنگ و دو کے علاوہ اور کچھ نہ مل سکا۔ عالم تقدیر اسی طرح سے ہے۔"

غالب کی اس فارسی مثنوی کا خلاصہ ہم نے پیش کیا ہے۔ اصل میں جو فنی خوبیاں اور لطف بیان ہے اور وہ منتقل نہیں ہو سکتا۔ لیکن نفس مضمون اور نتیجہ میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اس سے تقدیر پر جو روشنی پڑتی ہے اسی خیال کو اردو میں مختلف انداز سے نظم کیا ہے۔ مثلاً۔

غالب کچھ اپنی سعی سے لینا نہیں مجھے ؎
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

یعنی ہم کوشش کرتے ہیں، کھیتی کی، بار آور ہوئی، ٹڈی نے بھی نہیں اجاڑا، فصل کو کاٹ کر کھلیان میں لے آئے۔ قسمت میں نہیں ہے تو کھلیان میں آگ لگ جائے گی۔ دوسری جگہ اسی خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے، اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا، ہے خون گرم دہقاں کا

غالب کے کلام میں تقدیر سے متعلق اظہار رائے موجود ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور حالات کو پیش نظر رکھ کر تقدیری اثرات و نتائج کو پیش کیا ہے۔ ہم بنظر سہولت ان کو چار موضوعات میں تقسیم کئے لیتے ہیں۔ ہر موضوع پر کلام غالب سے روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حسب موقع کچھ تشریح بھی کر دی جائیگی۔

(۱) عام معاملات میں تقدیر کا دخل اور اس کی شکایت پر مشتمل اشعار کافی ہیں چند ملاحظہ فرمایئے۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں ؎
چرخ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سر رشتۂ اوقات میں گانٹھ ؎
پہلے ٹھونکی ہے، بن ناخن تدبیر میں کیل

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایکدن

جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام — دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

(۲) اسی طرح مذہب و آخرت کے امور میں تقدیر کی عمل و دخل، اثر و نفوذ کے حامل اشعار میں سے چند پیشِ خدمت ہیں

یوں منحرف نہ کیوں؟ رہ و رسم ثواب سے — ٹیڑھا لگا ہے قط، قلم سرنوشت کو
شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو — جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم، کہ تکرار کیا کریں
آتا ہے یادِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(۳) وہ اشعار جن میں عشق و محبت کے معاملات، واقعات و حالات میں نیرنگیٔ تقدیر کی کرشمہ نمائیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہاں صرف چند نمائندہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا — اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے — میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالب — ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے
جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی — لکھ دیجیو یا رب! اسے قسمت میں عدو کی
سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر — مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی
حیف! اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
قضا نے تھا، مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت — فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

(۴) وہ اشعار جن میں غمِ دوراں کا سبب تقدیر ہی ہے۔ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ ہماری زندگی عدم سے وجود میں آتی ہے اور پھر عدم میں چلی جاتی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وجود میں بھی ہر آن عدم کا ظہور ہے۔ ایک حالت ختم ہوتی ہے۔ تو دوسری حالت وجود پاتی ہے۔ گویا۔

عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے۔

کی کیفیت ہے۔ ہم عدم ما قبل و ما بعد وجود کے حالات و کیفیات سے نابلد ہیں مگر غالب عدم ما قبل وجود کے

متعلق کہتے ہیں کہ عدم میں ہماری قسمت تھی۔ دنیا میں وہ نفس شماری بن گئے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہوئے۔

یہ عدم میں نالے کھینچے اور دہر میں سانس لینے والا بظاہر انسان ہے۔ مگر حقیقتاً انسان ہونے کی منزل ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی اس میں کسب کا دخل نہیں بلکہ یہ ایک وہبی امر ہے بقول کسے :۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یعنی انسان ہونا بھی تقدیری امر ہے۔

بسکہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

قدیم زمانے ہی سے بنی نوع انسان کا یہ عقیدہ ہے کہ سبع سیارگان سے تقدیر انسانی وابستہ ہے جن کی گردش سبب سعادت و نحوست ہے۔ غالب کے ہاں اس عقیدے کی تائید بھی پائی جاتی ہے اور تردید بھی۔ تائید کے ضمن میں یہ چند شعر ہیں۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا، غالبؔ دشمن آسماں اپنا

آسماں کی بے سبب دشمنی اتنی بڑھی کہ حرف مکرر کی طرح انسان کو مٹانے پہ تل گئی۔

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

کثرت مصائب و آلام، شدت رنج و غم، گردش مسلسل و پیہم سے قوت احساس کی بدولت انسان کا گھبرا جانا برحق ہے۔

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

مگر درد کا حد سے گزرنا ہے "دوا ہو جانا" کی جب منزل میں پہنچ جاتا ہے تو پھر طمانیت قلب حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ مستغنی ہو کر کہہ دیتا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

گردش افلاک و رفتار سیارگان سے انسانی مقدر وابستہ ہو یا نہ ہو۔ مگر ان سے انسان کو سکون و آرام، بہجت و مسرت، عیش و عشرت کی امید عبث و بے کار ہے۔ غالب آسمان کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کے پاس اوندھے جام ہیں جن میں کچھ بھی نہیں وہ دوسروں کو کیا دے سکتا ہے۔

مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام، واژگوں وہ بھی

ایام عیش و عشرت ختم ہو چکے ہیں۔ نکبت و ادبار کا دور دورہ ہے۔ ماضی کی رنگا رنگی یاد آتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ طالع کی نحوست دور ہو جائے اور خوش وقتی کا زمانہ آئے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ آسمان تو ایک چور کے مانند ہے وہ عیش و آرام لے تو
[illegible]

اور ایسا خیال کرنا صرف خوش فہمی ہے ۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

مقدر سویا ہوا ہو تو اس سے حقیقت میں تو کہاں، خواب کے عالم میں بھی خوشی اور وہ بھی ادھار، اس ڈر کی وجہ سے نہیں لے سکتے کہ ادا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے ۔

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ غالبؔ انفرادیت پسند تھے، انتہا یہ کہ وہ موت کے بارے میں بھی انفرادیت کے قائل تھے۔ اسی لئے وہ وبائے عام میں مرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ تقدیری امور میں بھی انہیں انفرادیت عزیز تھی ۔

نام کا میرے ہے، وہ دکھ، کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے، وہ فتنہ، کہ برپا نہ ہوا

اور جب یہ منفرد دکھ اور یہ یگانہ فتنہ کسی اور کے نام اور کام میں نہیں تو یہ خیال بجا ہے کہ دنیا میں جو رنج و غم انہیں نصیب ہوئے۔ وہ کسی کو نہ ملے، اس لئے یہ بے مثل و یگانہ ہوئے اور ان جیسا دنیا میں اور کوئی نہیں ۔

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا،
پھر غلط کیا ہے، کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

یہ تقدیر ہی کا چکر ہے کہ خواہ رنج و غم کا صید زبوں حال بننے کی وجہ سے، یا بے ثباتی و زوال و فنا کا شکار ہونے کے باعث انسان کہہ ہی اٹھتا ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کسی کی شوخیِ تحریر ہی سے اگر تقدیر تعبیر ہو تو تعجب نہیں ۔

داستانِ زبانِ اردو
ڈاکٹر شوکت سبزواری

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کے لسانی مسائل پر گراں قدر مقالے اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔ "داستانِ زبانِ اردو" میں انھوں نے اردو زبان کے لسانی سرمائے، مختلف نظریوں، مولد و منشا، صرفی نحوی نشو و نما، مزاج و منہاج اور ارتقاء کے مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اردو زبان کے بارے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

قیمت:- پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ـــ

کہ آپ جو الفاظ استعمال کریں انکے معنی سے آپ پوری طرح واقف ہوں

اس سلسلے میں

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

آپ کی بہترین معاون ہو سکتی ہے

آپ گھر میں ہوں
دفتر میں ہوں
یا سفر میں
ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی رفیق ہو گی

طلبہ، اساتذہ، وکلا، اطبا، مترجمین اور سرکاری کارکنوں کے لئے۔

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری بہترین تحفہ ہے۔!

خوبصورت طباعت اعلیٰ درجہ کا بائبل پیپر

ڈیڑھ ہزار صفحات۔ مضبوط جلد۔ قیمت صرف ۲۱ روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

فراسو

دو تہذیبوں کا سنگم

محمد علی صدیقی

فراسو، قوموں اور زبانوں کی تاریخ میں ایک منہ بولتا معجزہ ہے جس توانائی اور تناسب سے اس نے اردو شاعری میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کیا ہے وہ بہت ہی کم حضرات کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ آج بھی وہ ہرچند پور (میرٹھ) کے قبرستان سے ایک صدائے ناشنیدہ کی طرح ہم سے محاسبہ کر رہا ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے کہ اگر میں نے اتنا وقت اور استغراق اپنی مادری زبان جرمن کے حضور پیش کیا ہوتا تو صورت حال مختلف ہو سکتی تھی۔ جوزف کونرڈ (Joseph Conrad) پولینڈ کا باشندہ ہوتے ہوئے اگر اپنی عرق ریزی اور شدت مطالعہ کے باوصف انگریزی ادب کا بڑا ادیب بن سکتا ہے تو یہ کونرڈ کی طبعی خلاقی اور فنی بصیرت کے ساتھ انگریزوں کی فیاضی اور اعتراف پسندی پر بھی دال ہے کہ انھوں نے ایک غیر اہل زبان کی محنت و مساعی و خلاقی کا بھرم رکھ لیا۔ اور اسے وہ قبولیت دوام بخشی کہ آج اس کی مادر وطن اس کے ادبی وطن کے مقابلے میں ایک ضمنی کردار ہے

فراسو نے درحقیقت یہ ثابت کر دیا ہے کہ مشکل سے مشکل زبان بھی انسانی محنت کے سامنے سپر ڈال دیتی ہے اور خلوص سب سے بڑا متعارف و مونس ہے۔ جب بھی کسی سرپھرے نے کسی اور زبان میں قوت آزمائی کی بابت ٹھانی ہے تو پھر خیالات کی ترسیل جغرافیائی حد بندیوں کی رکاوٹوں سے مسدود نہیں ہو سکی ہے۔ اٹھارویں صدی کا ہندوستان غدر کے بعد کے ہندوستان سے بنیادی طور پر مختلف ملک تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخیر تک انگریزوں نے ملک گیری کو تجارت کے اعلیٰ تر قواعد کے تحت اپنایا تھا۔ غدر کے بعد ملک گیری ان کا مقصد بن گئی۔ جب تک تجارت ان کی قومی زندگی میں بنیادی شے رہی اس وقت تک وہ "روم میں رومیوں کی طرح" کے مصداق ہندوستانیوں سے زیادہ ہندوستانی بن کر دکھانا اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے تھے! اس لئے ہندوستانی شعر و ادب اور ثقافت کے دوسرے مظاہر میں دخل اندازی کو بھی کمال درجہ کی فنکارانہ حیثیت دیدی تھی۔ خود انڈونیشیا میں ولندیزیوں نے بھی یہی کیا تھا۔ اور اسپین، پرتگال اور فرانس نے اپنے مقبوضات میں ملک گیری سہ طرفہ جارحیت سے عبارت تھی ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے ہاتھ میں انجیل اور تیسرا عنصر مغربی تہذیب کی حرکیت پسندی۔ ہندوستان میں نوآبادیاتی زمانے میں علاقائی زبانوں کے ساتھ فیاضانہ کام ہوا ہے۔ جس میں عیسائیت کی

تبلیغ کو زیادہ اور ان کی دیسی زبانوں کی محبت کو کم دخل تھا لیکن خواہ نیتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں، آج سندھی، پشتو، مرہٹی، گجراتی تامل، تلگو، بنگالی اور کنڑی زبانوں کے مبادی اور سائنسی طریقہ ہائے تدریس تک کی منزل میں اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے پادریوں کی کوششیں صاف جھلکتی نظر آتی ہیں۔ اردو بھی مغرب کے اثر سے مبرّا و منزّا نہیں ہے۔ بآنکہ اور دیگر ہند و پاک کی زبانوں کی طرح اس کی جڑوں میں بھی عیسائی مبلغین اور سرکاری کارندوں کا پسینہ بہہ رہا ہے۔

کچھ قوم پرستی یک چشمی (جو انس کا قوم پرست بھی کانا ہے) روشنی کی بدولت ہم اپنی تاریخ کے ان مغربی استحصالی کوششوں کو زیادہ یاد رکھنے پر مجبور ہیں۔ جن کے پوشیدہ اور واضح حملوں کے سامنے ہمارے تہذیبی آثار و اقدار منہدم ہوتے چلے گئے ہیں۔ اور اس بہاؤ میں ہم ان ہستیوں کو بھول جاتے ہیں جنھوں نے ہماری زبانوں اور تہذیبوں کو مغربی دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ اور اس بے غرضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جو اپنے بنیادی مقصد کی متنازع شکل کے باوجود اتنی قابل ستائش کوششیں ہیں کہ کاش ہمارے یہاں بھی کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں جو اپنی زبانوں اور تہذیبوں کو اتنا وقت دے سکیں۔ ہمیں نکلسن، نیپیئر اور ہیولاک جیسے عالم یاد ہیں۔ لیکن وہ لوگ بہت کم یاد ہیں جنھوں نے گوئٹے، ایمرسن اور کارلائل جیسے دماغوں کو مشرق سے متعلق اپنی تحقیقات اور کاوشوں سے مسخر کر لیا تھا۔ سر ایڈون ارنالڈ سر رچرڈ برٹن، سر ایڈون ارنالڈ، جیمز اٹکنسن، ایم مانیئر ولیمس، اونسٹ ٹرمپ (سندھی ٹائپ کا موجد) اور پروفیسر اسٹوک هرگرد ج۔ اس بڑے مغربی قافلہ کے سرخیل ہیں۔ جنھوں نے مشرق کو متعارف کرانے کا بار اپنے کندھوں پر لیا تھا۔ اور ہماری پیہم سیاسی شکستوں اور معاشی و سماجی زبوں حالیوں کا غم اس طرح دور کرنے کی کوشش کی کہ ہم اپنے کرۂ ارض کی روشنی کے مقابل جب یوروپ کا گھٹا ٹوپ اندھیرا دیکھنے لگے تو ہمیں اس تاریخی چکر کا یقین آگیا جس کے مطابق قومیں زوال اور ترقی کے لامتناہی سلسلہ کی زد میں رہتی ہیں۔ اور آج کی زوال پذیر قومیں بننے کا خواب دیکھ سکتی ہیں۔

اردو خاص طور سے ڈاکٹر گلکرائسٹ، بیلی، جان شیکسپیئر، فیلن اور کرنل ہالرائڈ کی منت کیش ہے جن کی مساعی نے اس زبان کو ایک اطلاقی آلۂ اظہار و ترسیل بنانے میں انتھک محنت کی ہے۔

فراسو ۱۷۸۸ء میں بمقام سردھنا پیدا ہوا یہ وہ ریاست تھی جو اٹھارویں صدی کے اواخر میں مغربی تجار اور حکمران ٹولیوں کی مشرق پرستی کا علامتی اظہار تھی۔ ان مغربی حکمران خاندانوں کے نام بھی ہندوستانی تھے۔ نواب مظفر الدولہ، نواب ظفریاب خاں اور احتشام اور محتشم جیسے ناموں کے پیچھے آپ اینگلو سیکسن اور نیوٹانی سلسلے کس طور ڈھونڈیں گے؟ ان کے لباس بھی ہندوستانی ہوتے ہیں۔ ان کی غذائیں ان کے کھیل کود اور عیش کوشی کے ذرائع بھی ہندوستانی یہ لوگ خواب بھی مقامی زبانوں میں دیکھنے لگے تھے۔ جس سے آجکل کے مغرب زدہ ذہنوں کا مغربی زبانوں میں خواب دیکھنا سمجھ میں آتا ہے۔

فراسو کا بچپن سردھنا کے محل میں گذرا۔ اس کا باپ ایک پیشہ ور سپاہی تھا۔ فراسو کے سرپرست نے اس کو ہندوستانی

زبانوں میں اور ان زبانوں میں تعلیم دلوائی جو یہاں کے لوگوں کے علمی اور فکری اظہار میں مدد دیتی ہیں فراسو نے اُردو، فارسی اور عربی کی کماحقہ تعلیم پائی اور جوانی ہی سے شعرگوئی کو شعار بنایا اور قدردانوں سے داد و تحسین کا صلہ پایا اور اس طرح دریائے راین کی مٹی گنگا جمنا کی مٹی میں رل مل گئی۔

لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ اس پر بھی اردو تذکروں میں فراسو کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے اگر فراسو کا آبِ حیات میں ذکر نہیں کیا۔ تو خیر بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اور حضرات ان کا تتبع نہ کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ نصیر اور ذوق کی رسہ کشی کی وجہ سے بھی شاہ نصیر کے تمام یورپین شاگرد آبِ حیات میں جگہ پانے سے رہ گئے اور یہ ذاتی پرخاش کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہونے والی سب سے بڑی ادبی بددیانتی ہے کہ ایک تذکرہ نویس ایک بہت ہی ضروری دور ہی سے چشم گردانی کرے اس طرح نہ صرف یہ کہ اُردو کا مقدمہ کمزور ہوتا ہے۔ بلکہ بُری مثالیں قائم ہوتی ہیں۔ آبِ حیات کی بنیاد مجموعہ نغز پر رکھی گئی ہے۔ لیکن آزاد نے اس تذکرہ میں مندرج کسی بھی یورپی نسل کے شاعر کو آبِ حیات میں جگہ نہیں دی ہے۔ نواب ظفریاب خاں المتخلص بہ صاحب کے مشاعروں کی اس زمانہ میں دھوم تھی اور دور دراز سے شعراء ان میں شرکت کی غرض سے پہنچتے تھے۔ گلشنِ بے خار میں ان مشاعروں میں شریک ہونے والے شعراء کی بابت یہ درج ہے لیکن آبِ حیات میں تو نواب ظفریاب خاں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ ظفریاب خاں صاحب سردھنا (میرٹھ) ریاست کے سردار تھے۔ اور یورپی نسل کے آدمی تھے۔ اس دور کے دیگر ممتاز یورپین شعرا ڈانش سوبر، طوماس، امیر اور صاحب ہیں لیکن یہ چونکہ سب کے سب شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ لیکن اس لئے ان کا ذکر مولانا آزاد کے قلم سحر طراز سے کہاں ہو سکتا تھا۔ شور میرٹھی نے اپنی مثنوی میں "دہلی مرحوم" کے بیان میں شاہ نصیر کا بھی ذکر کیا ہے اور ایک شعر میں لکھا ہے۔

فراسو بھی شاگرد اُن کے ہوئے
تھے قوم فرنگی میں شاعر بڑے

ایک زمانے میں وہ مرہٹوں کی طرف سے علی گڑھ کے قلعدار کی حیثیت سے متعین بھی ہوئے۔ شور کا یہ شعر۔

فراسو کو ئیں تھے جو عالی وقار
مرہٹہ کی جانب سے تھے قلعدار

سردھنا ریاست کی سربراہ بیگم شمرو تھیں اور ۱۸۳۶ء میں سرکار انگریزی نے اس ریاست کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور شمالی ہندوستان کی یہ واحد یورپین نوابوں کی ریاست ختم ہو گئی۔ اب اس کے سابق حکمران جاگیرداروں کے روپ میں نظر آنے لگے۔ لیکن یہ خیال فرمائیں کہ جس شخص کی مندرجہ ذیل تصنیفات طبع ہو چکی تھیں وہ کس مطالعہ اور دقتِ نظری کا حامل ہوگا۔

نظم انشا مسمی نسیم دلکشا۔ منظوم خطوط کا مجموعہ۔
مجموعۂ قصائد ۔ چودہ قصائد کا مجموعہ
دیوانِ ہجویات

مجموعہ مثنویات ۔ ۱۴ ۔ مثنویات

نظم قطعات باوزان دوہرہ ۔ بوزن متدارک کم و بیش ۱۰۰۰ فردیات ہیں ۔

مثنوی ظفر الظفر (فارسی) ۔ یہ غدر کی بابت ہے ۔ اس میں آپ بیتی بیان کر کے انگریزوں کی فتح و کامرانی کا تذکرہ کیا ہے ۔

دیوان فارسی

دیوان غزلیات ۔ یہ دیوان اور قصیدہ مبارکباد و فتح قلعہ بھرت پور، اور ایک انتخاب شاعری کا جو مولانا حسرت موہانی نے طبع فرمایا ۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایک جرمن اور فرانسیسی نژاد شاعر نے کس طور پر اتنا سرمایہ ادب اکٹھا کیا ۔ یہ سرمایہ اعلیٰ ادب کے ذیل میں آئے یا نہ آئے ۔ لیکن اس سرمایہ نے ہر وقت کے اساتذہ سے داد کاوش ضرور چاہی ہے اور اب اس کلام کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ فراسو غالباً پہلا یورپی اردو شاعر تھا ۔ جس نے جرمن کلچر کی مددوں میں اور ہندوستان کی شعری داخلیت کا بڑا اچھا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی تھی ۔ اس کے باوجود کہ اسے یہ احساس دامن گیر رہا ۔ وہ غیر اہل زبان ہے ۔ اس لئے غالباً وہ زبان کے استعمال میں بڑے شعوری اور محاورہ اور روزمرہ کی بھرمار سے اپنا رتبہ منوانا چاہتا تھا ۔ لیکن پھر بھی اس نے دو براعظموں کی ثقافتی دوری کا احساس تک نہیں ہونے دیا ۔ اور یہ کچھ کم بات نہیں ۔ درج ذیل اشعار سے آپ اندازہ لگائیے کہ دریائے رائن اور گنگا کے کناروں سے ہم آمیز ہو کر جو آواز اٹھی ہے وہ کس قدر دلکش ہے ۔

اب کے جو ملے مجھ سے تو یار ہے اور میں ہوں
اس وعدہ خلافی کی تکرار ہے اور میں ہوں
وہ دل مرا مانگے ہے میں وصل کا طالب ہوں
انکار ہے اور وہ ہے اقرار ہے اور میں ہوں
وہ دن گیا جب تیرا دیدار تھا اور میں تھا
اب روبرو آنکھوں کے دیوار ہے اور میں ہوں

اس آخری شعر کو پڑھتے وقت شلر اور گوئٹے کی اوائلی دور کی شاعری کو مدنظر رکھئے تو شوخی اور نزاکت خیال کی مماثلت کا انعکاس ملتا ہے ۔

اور پھر جب وہ خالص روایتی انداز میں شعر کہتا ہے تو ایسے اشعار بھی سامنے آتے ہیں ۔

گل کھاتے کھاتے سینہ یہ رشک چمن ہوا
جو داغ دل اٹھا وہی لعل یمن ہوا

آباد ایک روز نہ دیکھا کبھو اسے
کیا ہے کہ میں کروں دل خانہ خراب کو
قصر تعمیر کر چکے ہیں بہت
منزل گور اب بنانی ہے
ہمارا یار ہم سے جب تلک باہم نہ ہووے گا
جو دل میں درد ہے ہرگز دوا سے کم نہ ہوویگا
غافل ہم اس سے وہ رہے ہم سے
عمر رفتہ کی قدردانی ہے

کیا آخری شعر صف اول کے اشعار میں جگہ نہ پائے گا۔ فراسو کے متعلق اس کے نواسے کی تصنیف بہت مددگار ثابت ہوتی ہے اس کے نواسے شور میرٹھی (جان شور)[۲] "وقائع غدر"[۲] کے مصنف بھی ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۶۴ء میں مطبع معدن فیض آگرہ میں چھپی۔ اس کتاب میں فراسو کے خاندان پر غدر کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک ایسے خاندان پر جس میں خالصتاً یورپی خون سے لیکر یوروپی اور ہندی مخلوط نسل والے غرضیکہ ہر قسم کے افراد تھے۔ یہ لوگ ہرچند پور میں رہتے تھے اور غدر میں انھوں نے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں۔ اس سے ملحق علاقوں کے محبان آزادی میں بڑا اضطراب پھیلا اور انھوں نے اس خاندان کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ فراسو اور اس کی راجپوت بیوی بائی صاحبہ، بمشکل تمام بچ گئے۔ لیکن بغیر گزند پائے نہیں رہے۔ ۱۷ جولائی ۵۷ء جاٹ سردار شاہ مل نے فراسو کا گھر لوٹ لیا۔ یہ لوگ میرٹھ منتقل ہو گئے اور پھر دو تین ہی سال بعد فراسو کا ۱۵ جولائی ۱۸۶۱ء میں انتقال ہو گیا۔ سر والٹر لارنس نے اپنی سوانح "میری زندگی کی کہانی" مطبوعہ ۱۹۲۸ء میں فراسو کا ذکر کیا ہے۔ جسے اس نے ۱۸۲۸ء میں میرٹھ اور دہلی کے درمیان کے گاؤں کے سردار کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ فراسو کی وفات کے بارے میں شور نے وقائع غدر میں تحریر کیا ہے: "ناگاہ ۱۵ جولائی ۱۸۶۱ء کو مسٹر فرانسس کوئنس صاحب نے باعث کرسی دنیائے دوں کو بدرود فرمایا۔ برکت و رونق خانہ فیض کاشانہ اپنے کو ایک قلم اٹھا لیا۔ اگرچہ مرنا سب کو برحق اور جینا بے یاد الٰہی ناحق ہے۔ ویسے ایک امیر کا انتقال فرمانا چشمۂ فیض کا بند ہو جانا ہے۔"

"صاحب مرحوم اپنے دم قدم سے مجموعہ سخا و کرم بالضرور تھے اور ملک الشعراء بھی مشہور تھے۔ قبل از وصال وفات اپنی کے تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ از ان خود کہ ایک لاکھ روپے کی تھی، مع چار دیہات دیگر عطیہ سرکار فیض آثار بائی صاحبہ زن غیر منکوحہ اپنی کو بذریعہ وصیت نامہ مصدقہ عدالت عطا فرما گئے۔ حق تلفی جمیع وابستگان اپنے کی کر گئے، دس بارہ آدمی حق القائم ہیں، غرض کہ ان کو خاک میں ملا گئے۔"[۳۰]

دل و دیدہ اپنے تھے آشنا سو وہ دردِ غم میں پھنسا گئے
ہمیں جن سے چشمِ امید تھی وہی صاف آنکھیں چرا گئے

یہ تو تھا فراسو کی زندگی کے بارے میں مختصر بیان اب ہم ذرا اس کی شاعری کے محاسن و عیوب کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس کی شاعری روایتی ہے اور اس کا لہجہ بے باک اور بالواسطہ۔ وہ اپنے خاندان کے پڑھے لکھے باذوق حضرات کی صحبت میں جرمنی اور انگلستان کی رومان پسند تحریکوں سے کماحقہ واقف ہے۔ ویسے بھی اسے پتہ تھا کہ انقلاب فرانس نے رومانیت کی ترویج میں کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اس تحریک کی قدح میں کچھ اس انقلاب نے حصہ لیا۔ وڈزورتھ کی انقلاب فرانس کے وقت کی نظم اور پھر اس انقلاب سے مایوسی اور اضطراب ہویدا ہونے کے بعد کی نظم امید و بیم کے دو نقطے ہیں۔ فراسو اپنے برعظم کے باہر اپنے برعظم کا بڑا اچھا مطالعہ فراہم کرتا ہے۔

آج ہم فراسو کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اس پر مولانا حسرت موہانی، شاکر میرٹھی اور رام بابو سکسینہ نے کچھ لکھا ضرور ہے لیکن ابھی تک اس پر کوئی جامع کتاب یا مطالعہ نہیں آیا۔ فراسو کی زندگی ہم پر منکشف کرتی ہے کہ انیسویں صدی کے ایک یوروپی اور بیسویں صدی کے A PASSAGE TO INDIA کے کرداروں میں کتنا بعد پیدا ہوا ہے اور اس کے کیا عوامل ہیں۔

آج کے قارئین کی خدمت میں فراسو وہ نقطۂ عروج ہے جو بلند ہمت لوگوں کو مل سکتا ہے اور تہی دامنی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ جو خلوص اور ہمت کے فقدان کی وجہ سے خود اپنے ہی ماحول میں اجنبی بن کر حاصل ہوتا ہے۔

ماخذ

۱۔ تاریخ یوروپی شعرائے اردو، از رام بابو سکسینہ
۲۔ گلشن بے خار، از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
۳۔ دی اسٹوری آف مائی لائف۔ مطبوعہ ۱۹۴۸ء از سر والٹر لارنس
۴۔ جرمن نسل کا ایک اردو شاعر (سالنامہ ادبی دنیا ۱۹۳۹ء) از پیارے لال شاکر میرٹھی۔
۵۔ انتخاب دیوان فراسو مرتبہ مولانا حسرت موہانی۔

اردو کا قاعدہ
آسان قاعدہ جس سے بچے بہت جلد الفاظ اور جملوں کا لکھنا پڑھنا سیکھ جاتے ہیں
قیمت: پچیس پیسے۔
انجمن ترقی اردو پاکستان باباے اردو روڈ کراچی

[redacted]

افادات مہدی

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

مہدی حسن نے جو کچھ لکھا ہے اس کا شمار "ادب عالیہ" میں ہوتا ہے۔ ان کے مختصر مجموعہ مضامین "افادات ہدی" میں محض علم کی عظمت ہی نہیں ہے بلکہ وہ ذوق ادب، طرز نگارش اور ادبی رنگ کا ایک بے مثال نمونہ بھی ،۔ مہدی حسن کے معاصرین نے خود ان کی ادبی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ "کاش شعرالعجم کے مصنف ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے"[1] علامہ شبلی ایک دوسرے مقام پر ان کے طرز نگارش کی تعریف ان الفاظ کرتے ہیں: "مضمون دیکھا۔ نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزاپوری دوست ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا رہا اور احباب کو دکھلاتا رہا"[2]

مہدی افادی انشا پرداز ہیں ان کے یہاں پھول کا حسن، پری وش کا جلوہ، گلاب کی پنکھڑی کی نزاکت اور تحریر میں مہ کی سی روانی ہے۔ فکر میں بصیرت اور عبارت میں ذوق ادب کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تنقید کرتے ہیں مگر قاموسی نہیں، بلکہ ردو ادب کے بنیادی خلا کو پر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تنقیدی بصیرت کم اور ادبی مسرت زیادہ ہے۔

ان کے یہاں خوبیاں بھی ہیں اور کچھ عیوب بھی۔ جن کا ذکر میں آخر میں کروں گا۔ مہدی حسن نے اردو میں بہت کم لکھا ہے ا بدا تنے کم سرمایہ سے آج تک کسی کو اتنا بلند مقام نہیں ملا۔ یہ ان کی قسمت اور عظمت ہے وہ حسن کے پرستار اور بزم نگاراں کے دلدار ہیں۔ وہ حسن میں کھو جاتے ہیں، عورت ان کی فکر کا ایک اہم عنصر ہے۔ اور ادیب ہونے کے ساتھ اس بارے میں اس سے زیادہ تعرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شوخیوں کا رُخ دراصل اسی جنسیت کی جانب ہے۔ اس طرز فکر کا آغاز پہلے علے سقراط سے لے کر متعدد بار اور مختلف انداز سے ملتا ہے۔ خصوصاً وہ مضامین جو افسانوی انداز کے ہیں وہ صرف حسن زار زلا ہیں اور کچھ نہیں۔ افادات مہدی ان کے ذہنی افکار، محرکات ادبی و تنقیدی صلاحیت کی آئینہ دار ہے۔

---

[1] مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۵۹

[2] 〃 ص ۲۲۸

مہدی حسن کے اسلوب کے بنیادی عناصر مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) ظرافت و شوخی،

(۲) حسن پرستی ، رومانیاتی عنصر

(۳) تنقیدی بصیرت،

(۴) جدت و ندرت،

(۵) نئی اصطلاحیں،

(۶) صحت الفاظ کے ساتھ ساتھ زبان میں لطف پیدا کرنا

(۷) زبان میں سادگی نہیں بلکہ توازن کے ساتھ رنگینی

(۸) تشبیہہ و استعارہ میں نہایت ندرت ۔ جس سے پڑھنے والا ایک خاص تاثر قبول کرتا ہے ۔

(۹) انگریزی ادب سے وہ استفادہ کرتے ہیں، ان کے اسلوب میں انگریزی ادب کا اثر، فکر میں بھی ہے اور الفاظ میں بھی۔ وہ کبھی کبھی انگریزی لفظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ مگر عموماً وہ نہایت مناسب ترجمہ پیش کرتے ہیں

(۱۰) زبان میں رنگینی کے باوجود بے تکلفی ہے اور روزمرہ کا عمدہ استعمال ہے ۔ ابھی ان کے جذبات حسن پرستی کا ذکر گذر چکا ہے ۔ یہ جذبہ ان کے خمیر میں تھا ۔ وہ بات کسی موضوع پر کریں کہیں نہ کہیں حسن کا موضوع جا نکلتا ہی ہے۔ ۔ یعنی حسن و شوخی در اصل وہ طنز نگار اور مزاحیہ نگار نہیں مہدی کے ادب میں دلکشی پیدا کرنے والے دو اہم عناصر ہیں ۔ یعنی حسن و شوخی در اصل وہ طنز نگار اور مزاحیہ نگار نہیں ہیں، بلکہ اس حسن کی شوخی کو ہم ان کے اسلوب کی شوخی یا مزاحیہ انداز قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کی حسن پرستی کے جذبے کی شدت ہے جو شوخی بن کر ادب کے بے خانہ کو لالہ زار بنا تی ہے ۔ ان کی عبارتیں جذبہ حسن میں ڈوبی، رنگینیوں سے بوقلموں اور امنگوں سے بھرپور ہوتی ہیں۔ ان کی عبارتوں میں یاس کی جھلک دور دور نظر نہیں آتی بلکہ ایک توانائی اور کیفیت جمال ان کے ادب کو زعفران زار بنا دیتا ہے ۔ اس طرز کے چند جملے ملاحظہ ہوں ۔

" میری عذرا تو نظم زندگی یعنی پوری شاعری ہے اس کی آواز کامل موسیقی اس کا تبسم میرا عنصر حیات ہے ۔ وہ قطعاً تو بہ شکن ہے تو بہ شکن اور کافر ایمان ! نا ممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اس پر قابو حاصل کرنے کو جی چاہے ۔ جہاں آنکھیں ملیں بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام جسم میں بجلی دوڑ گئی . . .

مہدی حسن کے اسلوب میں مزاح و ظرافت کی کارفرمائی ہر جگہ نظر آتی ہے ۔ خصوصاً مکاتیب میں یہ نشاطیہ طرز نگارش بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے ۔ چنانچہ مولانا عبد الماجد دریا آبادی رقمطراز ہیں کہ " ارباب ذوق کے لئے مضامین سے بڑھ

---

[1] افادات ص ۱۵۰ — ۱۵۹

کران کے خطوط ہوتے تھے۔ ایک ایک سطر ادب و انشا، کی جان ہوتی تھی۔ اپنی بصیرت و علم کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ دور موجودہ کے ادیبوں میں شاید بلا استثنا کسی کے بھی خطوط اس قدر دلچسپ و پرلطف نہیں ہوتے تھے۔ جن خوش نصیبوں سے سلسلۂ مراسلت قایم تھا وہ شوق و اشتیاق کے ساتھ جدید مکتوب کے منتظر رہتے اور پچھلے گرامی نامے سے ہفتوں لطف اندوز ہوا کرتے۔ [1]

ان کی انشا، پردازی کی جان حسن میں شوخی ہے۔ اس کیفیت کو مولانا دریابادی نے پیش کیا ہے۔ مزاح ایک خاص انداز نظر ہے۔ عام مزاح نگاروں سے اس طرز کو کوئی نسبت نہیں اور نہ اس کو پڑھ کر کوئی ہنس ہی سکتا ہے ہاں ایک تبسم اور بس۔ البتہ اس انداز کے مزاحیہ جملے دل میں بس ضرور جاتے ہیں اس لئے کہ ان کے اندر ادیب کی ذہانت شوخی اور شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس طرز کے کچھ جاندار، شوخ اور رنگین جملے ملاحظہ ہوں۔

" غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی ہمدردی سے خاصہ کی داد ملتی۔ جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس قابل کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانیوں پر آئی ہوئی پگلی نہیں بیٹھ سکتی ہو مدتوں شعرا سے گاڑھا اتحاد رہا۔ با استغنائے حسن بڑی طرح کھل کھیلی۔ ملک کے منچلے یعنی ناول تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس نئی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔ . . لیکن اب وہ مقدس علما کی کنیزوں میں ہے اور سنا گیا ہے کہ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے " [2]

قاموس الاسلام، نقد شعر العجم، حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک، شبلی سوسائٹی اردو ادب کے عناصر خمسہ اور اس طرز کے دوسرے مضامین قاری کو تنقیدی بصیرت بخشتے ہیں۔ اس کو معلومات کے ساتھ ساتھ ادبا کی شخصیت کا عکس بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً اسی تنقید پر غور کیجئے:-

" سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں اسی لئے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے ہیں قصص (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں " افسانہ یاران کہن " سمجھئے " [3]

یہ صحیح تو نہیں مگر بقول آل احمد سرور کے دلچسپ ضرور ہے اس میں ادباء کے بنیادی رجحانات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

---

[1] افادات مہدی۔ سلطان بکڈپو حیدرآباد سنہ ۱۹۵۶ء ص ۳-۴

اردو کے عناصر خمسہ اور حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک جاندار و بصیرت افروز مضامین ہیں۔ یہاں مثالاً چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ وہ نذیر احمد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "جس طرح ناولوں اور تراجم میں بہ رعایت فن یہ اپنی قادر الکلامی سے بڑا ثبوت دے سکے۔ لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے، مثلاً فلسفہ، تاریخ وغیرہ جن میں وسعت نظر کے سب نقد تحقیق و تنقید، قوت استقرا، تفریعی مسائل اور فلسفیانہ استخراج نتائج کے ساتھ غیر منقطع انضباط خیال کی ضرورت ہے یہ قصداً اس طرف نہیں آتے۔ یہی وہ فاصل ہے جو شبلی کے قلمرو سے ان کے دائرہ کمالات کو جدا کرتی ہے"

شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں "شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشافات و نکتہ آرائیوں سے اسے ایک مستقل فن بنا دیا۱؎

حالی کے بارے میں لکھتے ہیں "طبیعت میں ایک جچا تُلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو و زوائد سے غرض نہیں رکھتا۔ اور ساتھ ہی کسی موضوع بحث میں ان نکات متعلقہ کی طرف نہایت خوب صورتی سے فوری انتقال ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اس بحث کی جان ہوتے ہیں۔

لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں۔ یہ سلاست و نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مہدی افادی اپنے فکر کے لحاظ سے تنقید نگار ہیں۔ اگر وہ زندہ رہتے تو اس میدان میں ان کو عظمت نصیب ہوتی۔ ان کی تنقیدوں میں ادبی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ جو ایک عمدہ تنقید کا خاصہ ہے۔ ان کی تنقیدیں صرف معاصرین تک محدود رہیں۔ ان کے اسلوب میں تنقیدی عناصر، وزن، سنجیدگی، پائندگی اور زندگی پیدا کرتے ہیں۔ اگر ان کے سارے مضامین "فلسفہ حسن و عشق" کی طرز کے ہوتے تو شاید ان کو ادب میں یہ بلندی مقام نصیب نہ ہوتی۔ جو کہ تنقیدوں کی عظمت سے ان کو ملا۔

مہدی کے بات کہنے کا انداز نہایت دلکش اور نرالا ہے وہ عام باتوں کو ایک عجیب کیفیت، حسن و رعنائی سے ادا کرتے ہیں جس سے پڑھتے وقت قاری کے ذہن کو وہ اپنی جانب پوری طرح متوجہ کر لیتے ہیں۔ ذیل میں اس طرز کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

مولانا روم کی لائف جس کے لیے مدت سے آنکھیں فرش راہ تھیں، گھونگھٹ سے باہر آئی اور اس طرح کہ "عروس جمیل اور لباس حریر یورپ میں جہاں مذاق حسن پرستی یعنی ایک طرح کے تناسب اجزا کی رعایت قریب قریب ہر شخص کا خمیر ہو رہی ہے۔ جہاں شہ نشین [illegible] کہربائی روشنی میں بیٹھی جاگتی زہرہ ہائے شب کے مقیاس الشباب اور اس کے برہنہ حصہ افقی کے جائزے کے لیے وقف

۱؎ افادات ص ۱۷۲ ـ ۱۲۳ ـ ۲۲۱۔

رہتی ہیں، ایک سنجیدہ طبقہ ایسا بھی ہے جو کتابوں کو علمی حرم کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اور ان کا دلدادہ ہے [1]

وہ زبان میں لطف پیدا کرتے ہیں جو الفاظ اور معانی کے حسن سے عبارت ہے۔ حسب موقع وہ بات بڑے لطیف و پرکیف انداز سے کہہ جاتے ہیں جس میں جرات اور عظمت دونوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً

"اس کے (مذکورہ طبقہ کے) خیال میں کسی کتب خانہ کا ایک گوشہ جہاں اس کی منظورِ نظر نازنینوں کا جھرمٹ ہو اور جو ہمیشہ اس کی فرصت اور مرضی کی منتظر رہتی ہوں اس شاہی محل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جس کے لوازم عیش صرف دور سے دیکھنے کی چیز ہیں"[2]

وہ نئی اصطلاحیں ایجاد کرتے ہیں۔ یہ معمولی ذہن کا کارنامہ نہیں۔ ان کی ذہانت اور اُپج کا کرشمہ ہے انھوں نے ان مضامین میں بہت سی دلچسپ اور جاندار سی اصطلاحیں پیش کی ہیں ان کو اردو میں قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ ترجمے جو انگریزی سے انھوں نے اصطلاح کے طور پر اردو میں رائج کرنے چاہے۔ ان میں سے بعض کو بڑی مقبولیت ہوئی جیسے ادب عالیہ وغیرہ اس طرز کے چند اصطلاحوں کا ذکر اس مضمون میں آگے قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔

اب جہاں تک عبارت کی رنگینی کا سوال ہے تو اس میں بہت سے عناصر کارفرما ہیں۔ الفاظ، حسن تالیف اور حسن تخیل سب ہی نظر کو رنگ و نور کی دنیا عطا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو؛

نور جہاں کے بارے میں لکھتے ہیں، "جہانگیر ایک روز اس کے کمرے میں جا نکلا جو ضیائے حسن سے شیش محل ہو رہا تھا۔ حور وش کنیزوں کے حلقہ میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے۔ فطرت کی لاڈلی ہمہ غمزہ، ہمہ عشوہ ہمہ ناز نہایت سادے باریک سفید لباس میں تھی۔ لیکن شیشے کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا۔

کلائی وہ نازک سی ہیرا تراش وہ محرم میں سربستہ یک راز فاش

مقیاس الشباب کی سرکشی بتا رہی تھی کہ وہ دستانے کی طرح چپکی ہوئی محرم سے زیادہ اودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے۔ اس پردہ کافوری میں برہنہ حصہ انگی! خیال کے لئے کیا باقی رہا!"

اسی طرح مہدی افادی کی عبارتوں میں باوجود ادبی شان اور بلند اسلوب کے تکلف نام کو نہیں۔ عبارت میں دلکشی، سادہ جاندار اور بامحاورہ الفاظ تراکیب اور جملے استعمال ہوئے ہیں۔ علمی و تنقیدی مسائل پر بھی جو وہ لکھتے ہیں اس میں بھی بے تکلفانہ رنگ نمایاں رہتا ہے۔ ان میں وہ ایسے طرز اظہار کو جنم دیتے ہیں جو ایک طرف حسن خیال کی خوبی کا حامل ہوتا ہے، اور دوسری طرف حسن زبان کی عظمت بھی اس میں نمایاں ہوتی ہے۔

اگرچہ مہدی افادی لکھنو اور دلی کے نہ تھے۔ مگر علما اور اہل زبان کی صحبتوں کی کتابوں نے ذہن و فکر کو ٹکسالی زبان کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ خود مولانا شبلی مذکورہ دبستانوں سے وطنی نسبت نہ رکھتے تھے، گر سرسید نے المامون کے مقدمہ میں ان

---

[1] افادات ص ۹۱

کی زبان کو اہل دلی و لکھنو کے لیے باعث رشک قرار دیا۔ اسی طرح شبلی کے ادبی معتقد اور فریفتہ مہدی بھی با محاورہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اور روزمرہ کو بھی بڑی خوبی و مہارت سے اپنی تحریروں کی زینت بناتے ہیں ۔

یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ ان کے ہر فکر کی تان عورت پر ٹوٹتی ہے ۔ وہ عمر خیام کے فلسفہ کے قائل ہیں اور جتنی تشبیہ و استعارے ہیں سب عورت کے حسن سے مستعار ہیں۔ ان کے اسلوب پر اس حسن کی رنگینی ایسی چھا گئی ہے جیسے آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں۔

افادات کے مطالعہ سے جو چیز محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہیں معلومات ۔ افادات کو ہاتھ میں لیتے ہی انسان اپنے اندر کچھ نئی چیزوں کا علم محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ شروع میں "سقراط" پر ایک عمدہ مضمون شامل ہے ۔

افادات میں اردو صحافت کے بارے میں بھی مواد ملتا ہے۔ اور ان کے دور کے اہم رسالوں کا ذکر ان کے ایڈیٹروں سے خط و کتابت اور ان میں مضامین شائع کرانے کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے۔

اس میں نہ تحقیق ہے نہ کسی نئے مضمون پر خامہ فرسائی ہے جو اردو میں ان سے قبل نہ لکھا گیا ہو۔ بلکہ مذکورہ بالا عناصر اس انداز و ترتیب سے اس میں جلوہ گر ہیں کہ وہ اس کی عظمت کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ ورنہ اسلوب محض اپنے اندر اتنی قوت حیات نہیں رکھتا یہ معنوی حسن بھی اس کتاب کی زینت ہے ۔

علمی و تنقیدی مواد :۔

افادات مہدی کی اہمیت اس کے مضامین اور مواد کے اعتبار سے اس کے اسلوب سے کم نہیں۔ اس میں مہدی نے نہایت اہم موضوعات پر قلم کے گوہر لٹائے ہیں۔ افادات مہدی کا اہم مواد کے لحاظ سے مندرجۂ ذیل عناوین کے تحت مطالعہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ ادبی تنقید :۔

افادات مہدی میں سب سے اہم اور بصیرت افروز مواد ادبی تنقید پر ہے خصوصاً عملی تنقید پر۔

۲۔ ادب معاصر :۔

دوسرا اہم مواد ہم کو مہدی کے دور کے اہم ادبائے اردو اور کتابوں کے بارے میں ملتا ہے

۳۔ حسن پرستی اور خیال آرائی :۔

افادات مہدی میں تیسرا اہم رجحان حسن پرستی اور نسوانی حسن کے بارے میں ملتا ہے ۔ اور مہدی افادی کبھی کبھی فرائڈ کے نظریہ جنسیت کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں ۔

۴۔ ترقی اردو کے لیے سوز دروں :۔

افادات کو پڑھ کر قاری کے دل پر معاً یہ احساس ہوتا ہے کہ مہدی کا دل اردو کے لیے مضطرب تھا۔

اس کتاب کا سب سے بڑا اور اہم عنصر اس کی تنقیدی بحثیں ہیں۔ یہ تنقیدی بحثیں بڑی حد تک معاصرین سے متعلق ہیں۔ ان

ت کئی باتوں کا احساس ہوتا ہے اولاً تو یہ کہ واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مصنف نے سرسید، حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد کے ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اور ان کی شخصیتوں کے بارے میں رائیں قائم کی ہیں۔ شبلی کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ انھوں نے ۵ ہزار صفحات لکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان عددی باریکیوں تک وہی جا سکتا ہے جس کی زندگی میں ان ادیبوں کی ذہنی کاوشیں رچ بس چکی ہوں۔ وہ نذیر احمد کی علمیت کو دیکھ کر انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ وہ قاموس الاسلام لکھیں۔

اردو زبان میں جو خلا تھے ان کو پر کرنے کے لئے وہ اپنے اندر ایک خلش محسوس کرتے تھے، انھوں نے پروفیسر براؤن کو لکھا کہ کسی زبان کو اعلیٰ معیار تک پہنچانے کے لئے بنیادی ضروری کتب دریافت کی تھیں یہ اسکیم نہایت شاندار ہے جو انھوں نے پروفیسر براؤن سے حاصل کی تھی، جس کا خلاصہ یہ ہے

(۱) جامع اللغات اردو (۲) محاورات (۳) لغات الاصطلاح (۴) لغات فارسی (۵) لغات عربی (۶) ادب الاساتذہ ۱۲ ضخیم جلدوں میں (۷) جامع القواعد (۸) عقلیات (فلسفہ و سائنس) (۹) اردو انسائیکلو پیڈیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کے اندر تنقیدی بصیرت تھی، مگر یہ روشنی ابھی ٹھیک سے پھیلی بھی نہ تھی کہ ہمیشہ کے لئے بجھ گئی

مہدی افادی نے بہت کم لکھا ہے مگر جو کچھ لکھا ہے وہ خوب ہے۔ ان کا انداز بیان بالکل اچھوتا تھا۔ اس میں مشرق و مغرب دونوں کی جلوہ گری ہے۔ وہ اپنے احباب میں مشرقی تھے مگر اپنی تعلیم میں مغربی۔ مطلب یہ ہے کہ مہدی کے اکثر احباب علما تھے، مولانا شبلی کے زبردست عقیدت مند تھے۔ حالی کی طرح وہ نثر میں انگریزی استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے مناسب ترجمے لکھتے ہیں۔ اس طرح ان کے اسلوب میں ایک جدت ملتی ہے۔

انھوں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی بلکہ افادات مہدی کے نام سے ان کے مقالات اور خطوط شائع ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مکاتیب مہدی بھی چھپی۔ ان دونوں کتابوں میں ان کا اسلوب نگارش پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ ایک مرصع زبان لکھتے ہیں۔ مگر اس میں بے تکلفی بھی باقی رہتی ہے۔ ان کے انداز تحریر میں الفاظ کی تراش و خراش، انگریزی الفاظ کے پرلطف ترجمے۔ محاورہ کا برمحل استعمال، بندشوں کی چستی طرز ادا کی شوخی پوری طرح پائی جاتی ہے ان کی شوخی بقول آل احمد سرور ان کو زندہ رکھنے میں مدد گار ہوگی۔[1]

ان کی وضع کردہ اصطلاحات یہ ہیں جو کہ انگریزی الفاظ سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔

کلاسکس کے لئے ادب عالیہ۔ ہائی کرٹسزم کے لئے تنقید عالیہ۔ ماسٹر پیس کے لئے اختراع نادرہ، ان ڈفرنس کے لئے بے رخی، لپ سروس کے لئے وظیفہ لب۔ ہنی مون کے لئے عہد زفاف اسی طرح کلاسیکل لٹریچر کے لئے ادب القدما۔ لٹریری آئیڈیل کے لئے ادبی تخیل، اسپشلسٹ کے لئے اختصاصی اور دوسرے عمدہ ترجمے انھوں

---

[1] تنقیدی اشارے مؤلفہ آل احمد سرور ص ۱۸

نے پیش کئے ہیں۔

انھوں نے حسین ترکیبیں بھی خوب وضع کی ہیں۔ جیسے سیاس الشباب، زہرۂ شب، شایق الادب، نقوشِ حرفی، پردۂ کافوری اور حسین گلوبند وغیرہ۔

تنقید بر افادات مہدی :-

تنقیدی نقطۂ نظر سے ناظرین کی توجہ چند اور گوشوں کی طرف منعطف کرانا اپنا فرض تصور کرتا ہوں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ علامہ شبلی اور ان کے نیاز مندوں نے مہدی افادی کی ادبیت کو اچھالا ہے؟ کیا شبلی نے مہدی کی تعریف میں مبالغہ سے کام نہیں لیا؟ کیا سیرت النبی، شعر العجم اور دوسری کتابوں میں مہدی حسن سے زیادہ رنگین پرکیف اور جاندار عبارتیں موجود نہیں؟ ایک علامہ زماں کا یہ ریمارک کہ کاش شعر العجم کے مصنف کو دو فقرے بھی ایسے لکھنے آجاتے، دراصل مہدی کے موجودہ ادب میں عظیم مقام کا باعث ہے۔ پھر تعجب ہے کہ بیگم مہدی کو یہ شکایت کیونکر ہوئی کہ شبلی تعریف تو ان کی اتنی کرتے تھے مگر انھوں نے ان کے خطوط کو محفوظ نہ رکھا۔ حق یہ ہے کہ خطوط وہ محفوظ بھی رکھتے مگر اتنے شاندار الفاظ سے مہدی افادی کا ذکر نہ کرتے تو شاید آج جو مقام ان کو ادب میں ملا ہے وہ نہ ملتا۔ علامہ شبلی کے تعلق سے ان کے تمام احباب سے بھی مہدی افادی کے تعلقات ہو گئے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مہدی حسن کو ادب میں لافانی مقام دلانے میں غیر معمولی مدد کی ہے اور ایسے مدحیہ فقرے لکھ دیئے ہیں جو درحقیقت ان کی عظمت سے آگے تھے۔ اب میں ان کے بعض انداز کے کچھ جملے نقل کرتا ہوں

ہر زبان کے بعض ادیب و انشا پرداز ایسے ہوتے ہیں جن کا رقبۂ تحریر ہو گو محدود سہی تاہم ان کا وجود اس زبان و ادب کے لئے مایۂ ناز ہوتا ہے۔ ہم مہدی حسن (افادی الاقتصادی) کے نام کے ساتھ "آہ مرحوم" لکھتے ہیں تو قلم کا جگر شق ہوا جاتا ہے اسی قبیل کے بزرگ تھے۔ اردو نثر نویسوں کی صف اول میں عموماً ایسے حضرات نکلیں گے جنھوں نے اپنا اصل موضوع تحریر تاریخ یا فلسفہ یا موعظت رکھا ہے۔ اور ادب سے چاشنی کا کام لیا ہے۔ لیکن مہدی مرحوم خالصۃً ادب کے شیدائی تھے ان کی تحریریں اس شے کا نمونہ ہوتی تھیں جس کے لئے انگریزی میں کوئی موزوں لفظ موجود نہیں البتہ فرنچ میں بیلے لیٹر کہتے ہیں۔ اردو میں خود مہدی مرحوم "ادب عالیہ" کہتے تھے۔

مرحوم اردو کے تمام مشاہیر سے تعلق ارتباط رکھتے تھے خصوصاً شبلی کے ساتھ یہ تعلق خاص طور پر گہرا تھا۔ ادھر حسرت بھی ان کے ساتھ دلی شیفتگی تھی فرمایا کرتے تھے کہ نثر لکھنے والوں میں ادبی حیثیت سے کوئی مہدی کا پاسنگ کے برابر بھی نہیں۔ [1]

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ اتنے عظیم اصحاب کسی کی اس طرح تعریف کریں تو یقیناً وہ اچھل جائے گا۔

---

[1] افادات مہدی مرتبہ مہدی بیگم ۱۹۵۲ء حیدرآباد ص ۱-۲-۳-

اب مولانا سید سلیمان ندوی کو لیجئے انھوں نے مکاتیب مہدی پر مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اردو میں اہل علم کے خطوط شائع ہوتے ہیں مگر آج ایک ایسے شخص کے خطوط منظر عام پر آرہے ہیں جو کسی علم میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر بھی اس کے خطوط ادب کی جان ہیں۔ بلکہ مقدمہ میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مہدی کی عظمت کو نمایاں کیا ہے اور ان کی انشاء پردازی کی داد دی ہے۔

ان تمام مدحیہ الفاظ کے بعد کس میں ہمت رہ جاتی کہ وہ ایک لفظ بھی ان زبردست ادیبوں اور عالموں کی آراء کے خلاف اظہار خیال کرے۔

یہی بنیادی سبب ہے کہ اردو کی اعلیٰ جماعتوں میں افادات مہدی عام طور سے شریک نصاب ہے اور اردو کی بنیادی کتاب تصور کی جاتی ہے۔ بہرحال ہر شخص تنقیدی معاملات میں اظہار خیال کا حق رکھتا ہے اگرچہ یہ بات ادبی حلقوں میں پسند نہ کی جائے گی۔ مگر میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) افادات مہدی نہ پورے طور پر انشائیہ کے ضمن میں آتی ہے کہ اس کو انشائیہ (Essay) کی صف میں شامل کیا جائے۔

(۲) نہ وہ تنقیدیں ہیں کہ سارے مضامین کو مجموعۂ تنقید ہی قرار دیا جائے۔ البتہ تنقید کا عنصر دوسرے عناصر پر غالب ہے۔

(۳) نہ وہ خطوط ہیں کہ انھیں مکاتیب کہا جائے

(۴) اسی طرح تخیلی مضامین میں بھی اس کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ صرف چند مضامین اس انداز کے ہیں۔

(۵) مجموعہ مضامین کہا جائے مگر اس میں خطوط شامل ہیں۔

بہرحال ہم اس کو انشا پردازی کا نمونہ کہہ سکتے ہیں مگر کسی ایک صنف نثر میں اس کا شمار مشکل ہے اس کو میں عیب تصور کرتا ہوں، ممکن ہے کسی کے نزدیک مستحسن ہو۔

(۶) بار بار علامہ شبلی کی تعریف اور عام طور سے ان کی عظمت تاریخ میں اتنی بار بیان کی گئی ہے کہ ذوق پر بار گزرتا ہے۔

(۷) معاصرین کی تعریف سے کتاب پُر ہے۔ شاید اسی بنا پر انھوں نے بھی مہدی کے احسان کو چکانے کی کوشش کی ہے۔

(۸) جوانی میں مہدی حسن کا انتقال خود سننے والے پر ایک کیفیت پیدا کرتا ہے پھر ان کی بیوہ کا مضامین کا شائع کرنا اس پر نہایت پُر درد۔ مولانا عبدالماجد مدظلہ العالی کا مقدمہ ان سب باتوں نے ان کو ان کے مقام سے اور اونچا کر دیا۔

(۹) ان کے مضامین میں حسن پرستی، معاصرین کا ذکر اور کچھ تنقیدی آراء ہیں جو محل نظر ہیں اور سب ہیچ ہیں۔ کیا شبلی کے پاس صرف تاریخ ہے؟ کیا انھوں نے شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر جیسی اعلیٰ تنقیدی کتابیں پیش نہیں کیں؟ کیا انھوں نے علم الکلام، الکلام اور الغزالی نہیں لکھا؟ یہ محض ایک دل خوش کن بات ہے کہ جس ادیب کے یہاں جو عنصر ذرا زیادہ نظر آیا اس کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ انہیں کا سارا سرمایہ یہی ہے۔ حالانکہ جن کے بارے میں انھوں نے یہ تنقیدی رائے پیش کی ہے، وہ

جامع علماء تھے، حتیٰ کہ شاعری پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

(۱۰) عورت کی جنسیت کو بار بار ابھارنا اور اس سے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا شوخی کہاں تک ہے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی مدظلہ العالی ان کی اس کیفیت کو اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ:

"حضرت مہدی معلم اخلاق نہ تھے ادیب و انشاء پرداز تھے، اور جب شاعر کے لئے برہنہ رقاصی کا جواز بڑے بڑے ثقات نے تسلیم کر لیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نثر کے شاعر پر انشائے عریاں" حرام رہے

جس نے اخباروں میں صحافیانہ انداز کے مضامین لکھ دیئے ہوں اس کو صف اول کے ادباء میں شمار کرنا ایک طرفہ تماشا ہے۔ اب یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ جنہوں نے جگر کاوی کی ہے ہزاروں صفحات علم، تاریخ، ادب اور تنقید پر لکھ کر اپنی عمر عزیز کو گھلایا ہے۔ ان کی صف میں وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں، جنہوں نے چند خطوط اور چند صحافیانہ مضامین لکھے ہوں اگر یہی معیار ہے، تو بے چارے وحیدالدین سلیم کو اردو نثر میں اتنی اہمیت کیوں نہیں دی جاتی وہ اہم انشا پرداز عالم اور شاعر تھا۔ جس کی گرد کو بھی مہدی نہیں پہنچ سکے۔

ان سطور سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں مہدی افادی کی انشا پردازی کا قائل نہیں ہوں میں نے خود پڑھی ہیں اور متاثر ہوں مگر جو خدا لگتی بات ہے وہ یہ کہ ان کو ان کی حیثیت و شخصیت سے بلند مقام اردو ادب میں مل گیا۔ وہ لوگ جو مہدی افادی سے زیادہ لائق، عالم اور شاعر تھے، جنہوں نے اردو کی ان سے زیادہ خدمت کی تھی، ان کو یہ مقام نہ ملا

جس نے بھی مہدی افادی پر قلم اٹھایا، اس نے یہی لکھا کہ وہ بڑے نفیس الطبع تھے، کتابوں کو بڑے سلیقہ سے رکھتے تھے۔ ان کا آرڈر کتب فروشوں تک پہلے پہنچ جاتا تھا۔ تمام رسالے خریدتے تھے، یہ تمام باتیں تسلیم کرتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان صفات سے کوئی صف اول کا ادیب تو نہیں بن جاتا؟ (۱) یہ تو عمدہ اضافی صفات ہیں اگر مشہور عراقی شاعر زہاوی الٹے سیدھے کمرے میں پڑا رہتا تھا اور اس کی کتابیں بکھری رہتی تھیں تو اس سے اس کی شاعری میں تو کوئی نقص واقع نہیں ہوا۔ بلکہ شعراء اور فلاسفہ تو اسی انداز سے عمر گزار دیتے ہیں۔

یہ میرے ذاتی تاثرات ہیں۔ ان سے اختلاف یا اتفاق کی گنجائش ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کسی مسلم نظریہ کے خلاف عوام تو عوام خواص تک چند جملے برداشت کرنا مناسب تصور نہیں کرتے۔ بہرحال میں نے یہ نظریہ مہدی افادی کے ادب کو باقاعدہ پڑھ کر اور ان کے متعلق دوسرے ادباء کی آراء کو مطالعہ کرنے کے بعد ہی قائم کیا ہے موجودہ زندہ آدمی پر تو اتنی جرأت بھی مشکل ہے

افادات مہدی میں جو سب سے بڑی کمی ہے، یہ ہے کہ اس میں منظر نگاری نہیں جس سے انشا پردازی کے جوہر کھلتے ہیں۔ اور فکر و فن کے جلوے نگاہوں کو حسن و کیف عطا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ان کو اردو کا رسکن قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دونوں میں لطافتِ خیال اور نزاکتِ الفاظ یکساں ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ رسکن درختوں، پہاڑوں

دریاؤں، جنگلوں کے بھی جا بجا نفیس مرقعے پیش کرتا ہے۔ اور افادات مہدی میں اس کا فقدان ہے۔[1] ڈاکٹر زور اس کے معترف ہیں کہ یہ مقالات موقتی ہیں اگرچہ ان کے مفید ہونے کے بھی قائل ہیں[2] بہرحال اگر اس میں مناظر کشی اور مرقع نگاری ہوتی تو بڑی آسانی سے اس کو انشائیہ میں جگہ دی جا سکتی تھی، مگر موجودہ صورت میں وہ عجیب نا موزوں موضوعات کا ایک مرکب ہے۔ جس کے بارے میں اظہار خیال کر چکا ہوں۔ میرے خیال سے وہ اگر زندہ رہتے اور اسی نہج پر مستقل کاوش کرتے تو ممکن تھا کہ ان کو یہ مقام دیا جاتا جو آج ان کو حاصل ہے۔ اردو کا معمولی سے لے کر اعلیٰ نثری انتخاب مفادات سے خالی نہیں ہوتا۔

افادات مہدی کی تحریروں کی پاکیزگی، نفاست اور حسن کا میں بھی قائل ہوں۔ مگر اسی حد تک جہاں تک کہ حق ہے باقی روایتی مدح و ستائش کے میں خلاف ہوں۔ میرے یہاں سے ان کو درجہ اول کے ادبا میں جگہ نہ دینی چاہیئے روایتی عظمت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اور احترام کا بت اتنا عظیم ہوتا ہے کہ کوئی ناقد اس بت شکنی کے لئے جرأت نہیں کرتا۔ مہدی کا دور اردو ادب کی عظمت کا ایک ایسا ابھرتا ہوا دور تھا جسے اردو کے عنفوان شباب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر افادات مہدی آج لکھی گئی ہوتی تو اس کو یہ مقام نہ حاصل ہوتا۔

بہرحال حسن و نفاست کا یہ شیش محل اب تو ایک ایسا ادبی گلدستہ ہے جو سدا بہار ہے، جس کے حسن سے رنگ و نور کا ایک نیا عالم پیدا ہوتا ہے۔ مجھے اعتراف حسن انشا پردازی ہے مگر مبالغہ آمیزی کی حد تک نہیں، مہدی کی تحریروں کا بانکپن، شوخی اور لطافت ان کو ایک اسلوب عطا کرتی ہے۔ جو ان کی شخصیت سے مستعار ہے مگر ان کے اسلوب میں دو باتیں قابل غور ہیں، اولاً اسلوب میں نشیب و فراز ہے[3] یکساں حسن نہیں، دوسرے ان کا طرز بیان مولانا آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی طرح اتنی انفرادیت کا حامل ہرگز نہیں کہ چند جملوں یا چند سطروں سے آپ اس کو شناخت کر سکیں مگر ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا دریا آبادی کی عبارتوں کو آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہے اور وہ اس قدر منفرد ہیں کہ دور سے تاڑ لی جاتی ہیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ مہدی کی تحریروں میں انفرادیت ضرور ہے، گہری نہ سہی۔ ان کے اسلوب بیان میں الفاظ حسن انتخاب، تخیل کی دلکشی، ذوق کی نفاست حسن کا جادو، بیان کی ندرت، جملوں کا نیا قالب، فکر کی روشنی اور تنقیدی بصیرت روز روشن کی طرح عیاں ہے

---

[1] اردو کے اسالیب بیان۔ چوتھا ایڈیشن ۱۹۵۵ء حیدرآباد۔ ص ۶۳

[2] 〃 〃 ص ۲۳

[3] یہ نشیب و فراز اکثر ادبا میں پایا جاتا ہے

سرشار کی ناول نگاری

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

رتن ناتھ سرشار اردو کے عظیم ناول نگار ہیں ان کی حیات اور کارناموں پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے ہیں اور وہ بھی نہایت تشنہ۔ ڈاکٹر ادیب نے بڑی محنت سے اس کتاب میں سرشار کے حالات زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالی ہے اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو الٰہ آباد یونیورسٹی نے پی۔ ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی۔

قیمت :۔ چھ روپے پچاس پیسے

غالب۔ فکر و فن

ڈاکٹر شوکت سبزواری

مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں۔ انہوں نے غالب کی شخصیت اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں، وہ اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہ مقالات حسب ذیل ہیں۔

غالب محقق کی حیثیت سے
میر و غالب
غالب کے اردو کلام کی اشاعت
غالب، خطوط کے آئینے میں
ذال معجمہ فارسی میں
غالب اور میرٹھ
غالب کی شخصیت

قیمت :۔ پانچ روپے

پروفیسر عبدالمجید قریشی

مینا زبیری

یونیورسٹی بننے سے قبل مدرسۃ العلوم علی گڑھ دو تعلیمی اداروں پر مشتمل تھا۔ ایک اسکول اور ایک کالج۔ اسکول کے لڑکے جو آٹھویں درجہ یا اس سے نیچے والے درجوں میں تھے وہ اپنے اساتذہ اور کالج کے پروفیسروں کو اس نظر سے دیکھتے تھے جیسے کہ یہ لوگ چلتے پھرتے دیو ہیں۔ ان کی شخصیات باجبروت اور بلند پایہ محسوس ہوتی تھیں اسی وجہ سے تمام بچوں پر محبت اور خوف کے ملے جلے اثرات انھیں دیکھ کر طاری ہو جاتے تھے۔ اور سب ان کا انتہائی احترام کرتے تھے، مگر نویں دسویں درجہ میں پہنچ کر احساسات میں حقیقت واضح ہونے لگتی تھی۔ جونیر اور سینیر پروفیسروں میں امتیاز محسوس ہونے لگتا تھا۔ اور غیر ارادی طور پر یہ سمجھنے لگتے تھے کہ اسکول کے اساتذہ کالج کے اسٹاف سے کم پڑھے لکھے اور کم قابل ہوتے ہیں۔ مجھے اسکول کے زمانے میں اسکول کے جن اساتذہ اور کالج کے جن پروفیسروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور جو مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہیں ان میں ایس کیو ایڈمنڈس۔ میر ولایت حسین۔ [illegible] الدین احمد۔ واجد علی سید۔ سراج الحق۔ قاضی جلال الدین۔ سید نور الحسن۔ عزیز بخش۔ حسن محمد حیات۔ ناظر حسن انصاری ماسٹر قاسم حسین۔ مولانا اسلم جیراجپوری۔ ایم این حسین صاحبان تھے۔ جن کا تعلق اسکول اسٹاف سے تھا۔ اور کالج اسٹاف کے اسی زمانے کے (یعنی بزمانہ طالب علمی اسکول) پرنسپل سول چکرورتی، (جن کی مصنفہ ارتھ میٹک کا نام ہی چکرورتی ہوگیا تھا۔) مولانا خلیل احمد اسرائیلی، مولانا عباس حسین، ڈاکٹر ولی محمد، ڈاکٹر منصوری، پروفیسر اللہ بخش، پروفیسر انعام اشر خاں، ڈاکٹر این کے حیدر، پروفیسر شریف وغیرہ آج بھی اچھی طرح یاد ہیں مگر کالج میں پہنچ کر جن صاحبان سے کبھی نہ کبھی سابقہ پڑا ان میں پروفیسر حمید خاں، اے بی اے حلیم، پروفیسر حبیب، پروفیسر ہادی، پروفیسر جلیل، پروفیسر شفیع، حمید الدین خاں، عزیز پوری، رشید احمد صدیقی، ولی محمد، غلام سرور، یعقوب بیگ نامی اور سب سے زیادہ ڈاکٹر ضیاء الدین اور پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحبان کے اسماء گرامی ذہن میں گھومتے رہتے ہیں۔ اسکول میں ہم لوگ سب سے زیادہ سمیع الدین صاحب اور سید نور الحسن صاحب سے ڈرتے تھے۔ اور کالج پہنچ کر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب کی صورت دیکھتے ہی دل کی حرکت تیز ہو جاتی تھی۔ . . معلوم نہیں کیوں

اسکول اور کالج کے ممبرانِ اسٹاف میں اکثر اچھے اچھے سوٹ پہننے کے عادی تھے، ہم لوگوں نے پروفیسر اے. بی. اے حلیم - پروفیسر شریف. ڈاکٹر ولی محمد - ڈاکٹر منصوری - ڈاکٹر ایل. کے حیدر. پروفیسر حیدر خاں کو شاید بغیر سوٹ کے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اسکول میں ناظر حسن انصاری بھی بہترین سوٹ پہنتے تھے۔ مگر اسکول میں حسن محمد حیات جو محض اپنے قیمتی سوٹوں اور فیشن کی وجہ سے لارڈ حیات کے لقب سے مشہور ہو گئے، اور کالج میں پروفیسر عبدالمجید قریشی جس قدر جامہ زیب تھے، ایسے دیگر ممبران اسٹاف نہ تھے۔ قریشی صاحب شیروانی بھی اسی اہتمام سے پہنتے تھے جس شوق سے سوٹ پہنتے تھے۔ ان دونوں حضرات کی سیاہ گھنی کھڑی سی مونچھیں، ان کے چہروں پر اس قدر شاندار اور بھلی معلوم ہوتی تھیں کہ الفاظ انھیں بیان نہیں کر سکتے۔

میں نویں درجہ میں تھا، ایڈمنڈس ہیڈ ماسٹر تھا، یہ انگریز ہیڈ ماسٹر علاوہ نالائق ہونے کے انتہائی بد اخلاق اور بد چلن بھی تھا، وہ اور انگلش ہاؤس کی سپرنٹنڈنٹ مس ہیلی ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور نویں درجہ کا ایک طالب علم تھا اسکول کے بورڈنگ میں رہتا تھا مگر دن اور رات کا بیشتر حصہ ایڈمنڈس کے ساتھ اس کے گھر پر گزارتا تھا۔ اور بورڈنگ میں آکر دوسرے لڑکوں پر بلاوجہ رعب گانٹھا کرتا تھا۔ اسکول بھر میں اس لڑکے کے خلاف ایک نفرت سی پھیلی ہوئی تھی۔ دسویں درجہ کے سالانہ امتحانات کی تیاری کی چھٹیاں ہوئیں اور نئے مانیٹروں کی فہرست شائع ہوئی تمام طلبا کو سخت حیرت ہوئی کہ ایڈمنڈس نے اپنے محبوب لڑکے کو سینئر ہاؤس مانیٹر، سینئر فوڈ مانیٹر اور گیمس سکریٹری تین سب سے بڑے عہدے دیدیئے تھے۔ ایک ہی لڑکے کو یہ تین عہدے دیئے جانے اسکول یا کالج کی روایات وقانون معروفوں کے خلاف تھے۔ طلبا نے اعتراض کیا تو جواب سخت دیا گیا اور انھیں دفتر سے نکال دیا گیا میرے ایک عزیز ابن حسن زبیری. ڈاکٹر ابن حسن زبیری مرحوم جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں ہسٹری کے چیرمین تھے، ڈاکٹر عترت حسین زبیری مرحوم اور مسرت حسین زبیری موجودہ سکریٹری جنرل آر. سی ڈی کے سب سے بڑے بھائی تھے) صاحب باغ میں رہتے تھے ان کے روم فیلو ڈاکٹر حسین خاں (موجودہ صدر انڈیا) تھے۔ میں ابن حسن صاحب کے پاس گیا اور ہیڈ ماسٹر کی ان حرکتوں کا ذکر کیا انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا۔ غرضکہ ڈاکٹر، ذاکر حسین خاں کے اصرار پر میں نے سب لڑکوں کو جمع کر کے ایک جوشیلی تقریر کی اور کہا کہ اگر آپ لوگوں میں غیرت کا شائبہ بھی موجود ہے تو آپ اس وقت تک اسکول نہیں جائیں گے جب تک ایڈمنڈس ہیڈ ماسٹر اور وہ طالب علم اسکول سے نکال نہ دیے جائیں۔ چنانچہ زبردست اسٹرائک ہوا اور لڑکوں نے کاشن منی طلب کی۔ کاشن منی نہیں ملی تو اکثر لڑکوں نے اپنا سامان فروخت کر دیا اور قریب نوے فیصدی لڑکے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ ہیڈ ماسٹر نے مجھے اور میرے تین ساتھیوں کو (ہمایوں شاہ (بلند شہر) ناصر (پنجاب) بشیر (میرٹھ) کو اسکول سے خارج کر دیا۔ ماسٹر سراج الحق صاحب نے ہیڈ ماسٹر کے یہ احکامات سنائے۔ اسپر اشتعال

اور زیادہ بڑھ گیا۔ ہم لوگ کالج کے ٹرسٹی صاحبان نواب صاحب چھتاری، شمشاد احمد خاں بیرسٹر اور رزاق بخش قادری صاحب بیرسٹر کے پاس گئے۔ ان تینوں حضرات نے نواب محمد علی سکریٹری کالج سے بات چیت کی اور ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا۔ ایک بات میں اوپر لکھنا بھول گیا۔ اسٹرائک کے ساتھ ساتھ ہیڈ ماسٹر کا محبوب لڑکا ہیڈ ماسٹر کے بنگلہ پر منتقل ہو گیا تھا۔ اگر وہ بورڈنگ میں رہتا تو ممکن تھا کہ بعض لڑکے اس کے ساتھ بے جا طور پر پیش آتے۔ چنانچہ لڑکوں نے جب گھر چلے جانے کا فیصلہ کیا تو اس لڑکے کے کمرے کا تالا توڑ ڈالا گیا تاکہ اگر کچھ روپیہ پیسہ ہو تو نکال لیں۔ بکس کی تلاشی سے انتہائی قابل اعتراض خطوط برآمد ہوئے۔ جو اس لڑکے کو کبھی ایڈمنڈس نے اور کبھی مس ہیلی نے لکھے تھے۔ یہ خطوط میرے قبضے میں آگئے تھے۔

چنانچہ کمیشن کی پہلی نشست میں ایڈمنڈس اور مس ہیلی کی موجودگی میں میری شہادت ہوئی میں نے اپنے بیان میں کل تفصیلات پیش کیں اور بورڈ پر لگا ہوا وہ اعلان بھی پیش کیا جس میں اس لڑکے کو ہر بڑا عہدہ دیا گیا تھا اور آخر میں وہ خطوط پیش کئے جو اس لڑکے کے کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔ نواب محمد علی نے ایڈمنڈس اور مس ہیلی اور اس لڑکے کو فوراً علی گڑھ بدر کر دیا۔ اسکول کی بگڑی ہوئی حالت کو سنبھالنے کے لئے کسی بہت قابل اور بڑے ایڈمنسٹر کی ضرورت تھی۔ متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ سوائے پروفیسر عبد المجید قریشی کے اس وقت کوئی شخص اس قابل نہیں ہے جسے اسکول کی ہیڈ ماسٹری پر مامور کیا جائے۔ چنانچہ قریشی صاحب کا تقرر ہوتے ہی تمام لڑکے اسکول واپس آگئے۔ ناصر احمد بشیر نے تو اپنے اپنے وطن میں داخلہ لے لیا تھا اور ان کے والدین نے انھیں پھر علیگڑھ نہیں بھیجا میں اور ہمایوں شاہ قریشی صاحب کے پاس داخلے کی درخواست لے کر گئے اور قریشی صاحب نے ہم لوگوں کو بلا پس و پیش فوراً داخل کر لیا۔ قریشی صاحب کی یہ تعیناتی اسکول کی قدیم روایات سے بالکل ہٹ کر ہوئی تھی۔ اس لئے کہ جب کبھی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کی جگہ خالی ہوتی تو میر ولایت حسین کو ہیڈ ماسٹر بنا دیا جاتا تھا۔ اور میر صاحب مرحوم کئی کئی سال ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے مگر وہ انتہائی نیک اور شریف النفس انسان ہوتے ہوئے پیچیدہ معاملات کو اپنی حکمت عملی سے سلجھانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اس لئے ہمہ صفت موصوف علی گڑھ میں صرف قریشی صاحب کی ذات تھی جنہیں ہر مشکل اور دشوار گذار راہوں کو ہموار کرنے کے لئے متعین کر دیا جاتا تھا۔ اور پھر کسی کو یہ احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ راہیں کبھی ناہموار بھی تھیں۔

قریشی صاحب ہیڈ ماسٹر تھے کہ یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا۔ ادھر ریاضی کے طلبہ بغیر قریشی صاحب کے اپنے آپ کو یتیم محسوس کرنے لگے تھے، ڈاکٹر ضیاء الدین اول تو اپنی مصروفیات کی وجہ سے ویسے بھی درجوں کو بہت کم پڑھاتے تھے، اور اب یونیورسٹی بن جانے کے بعد ان کے پڑھانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ قریشی صاحب یونیورسٹی چلے گئے اور میجر ڈین ولایت سے آکر ہیڈ ماسٹر ہوا۔ ہم لوگ دسویں درجہ میں تھے۔ کہ ڈیوک آف کنا

سے میڈل لڑکوں کو تقسیم کئے گئے۔ میں نے وہ میڈل جوتے کے فیتوں پر باندھ لیا۔ میری دیکھا دیکھی سب لڑکوں نے یہی حرکت کی۔ میجر ڈین نے مجھے بلایا اور انگریزی میں کہا:

تم نے میری، میری قوم کی، میرے ملک کی اور میرے بادشاہ کی توہین کی ہے۔

میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا:

ہم اپنے ملک میں سیاہ دل رکھنے والے سفید چہروں کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

اس پر اس نے کہا: بہت اچھا، تمھیں اسکول سے خارج کیا جاتا ہے۔

میں نے اس واقعہ کا کسی لڑکے سے کوئی تذکرہ تک نہیں کیا۔ اس لئے کہ اگر لڑکوں میں کوئی بے چینی پھیل جاتی تو میں اسٹرائک کرانے والوں میں ہمیشہ کے لئے بدنام ہو جاتا۔ میں خاموشی کے ساتھ اسکول چھوڑ کر چلا گیا۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار سید سجاد حیدر مرحوم میرے والد کے دوست اور کلاس فیلو تھے۔ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ میرا سال بے کار ہوا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم فارم بھر کر فیس جمع کر دو اور فارم مجھے دے جاؤ۔ غرضکہ میں نے ہائی اسکول پاس کر لیا۔ فرسٹ ایئر میں داخلہ کے لئے آیا تو انٹرمیڈیٹ کالج بن چکا تھا اور میجر ڈین ہی اس کا پرنسپل تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید وہ مجھے داخل نہ کرے مگر اس نے مجھے دیکھ کر کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور خاموشی کے ساتھ داخل کر لیا۔

میں فرسٹ ایئر میں تھا کہ یونیورسٹی کے لڑکوں اور پولیس میں شدید بلوہ ہوا۔ اس لڑائی میں علی مقصود کے سب سے زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ علی گڑھ میں مارشل اسمتھ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ اس نے یہ حرکت کی کہ تمام چوٹ کھائے ہوئے پولیس والوں کو یا تو چھٹی دے دی یا دیہات کے تھانوں پر تبدیل کر دیا اور وہیں علاج کا انتظام کر دیا۔ اور دیہات سے تازہ دم پولیس بلا کر پولیس لائن میں تعینات کر دی اور پولیس کے تمام ریکارڈ ایک ماہ قبل سے تبدیل کرا دئے اور یہ پوزیشن لی کہ یونیورسٹی کے لڑکوں اور پولیس والوں میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور نہ کسی پولیس والے کے بھی چوٹیں آئیں۔ مگر ڈاکٹر ضیاء الدین نے یوپی کے گورنر کو علی گڑھ بلا لیا۔ اس معاملہ میں پولیس کو زبردست شکست ہوئی اور یہ طے پایا کہ یونیورسٹی کیمپس کے اندر پولیس کبھی داخل نہیں ہوگی۔ یونیورسٹی والے اپنی پولیس خود بنائیں گے۔ اگر کوئی جرم ہوا تو یونیورسٹی پولیس خود گرفتار کرے گی اور وہی تحقیقات کرے گی اور یونیورسٹی کے فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ اس ملزم کے مقدمہ کی سماعت کر کے فیصلے صادر کریں گے اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ کون صاحب مقرر ہوئے تھے۔ یہ تھے جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ آیا قریشی صاحب نے کبھی اپنے اختیارات استعمال کئے یا نہیں۔

علی گڑھ کے ممبران اسٹاف میں ڈاکٹر ضیاء الدین ؒ بھی تھے۔ اور پھر انہیں سر کا خطاب بھی ملا۔ ان کے علاوہ

کسی دوسرے ممبر اسٹاف کو برٹش گورنمنٹ نے کوئی خطاب نہیں دیا۔ سوائے قریشی صاحب کے کہ انھیں خان بہادر کا خطاب ملا۔ یہ خطاب اس لئے نہیں ملا کہ وہ ریاضی کے بہترین پروفیسر تھے یا یہ کہ سائنس اور ریاضی کے پیچیدہ مسائل کو اردو ادب میں منتقل کرنے میں وہ منفرد شخصیت تھے۔ بلکہ انھیں خطاب ان خدمات کے اعتراف میں دیا گیا تھا جو انھوں نے اپنے فرائض منصبی کے علاوہ انجام دی تھیں اور بڑے بڑے نازک موقعوں پر یونیورسٹی اور طلبہ کو غیر متوقع حوادث سے محفوظ رکھا تھا۔

ہم طلبہ اپنے اساتذہ کے کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے، بولنے لکچر دینے، کپڑے پہننے غرضکہ ان کے ہر انداز کو غائر نظر سے دیکھتے تھے اور ہر شخص کے ہر انداز کے متعلق اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے۔ ایک زمانہ میں یونیورسٹی میں کسی پروفیسر کے پاس کار نہیں تھی ویسے بھی علیگڑھ بھر میں ایک یا دو کاریں تھیں۔

یونیورسٹی میں سب سے پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین جرمنی سے ایک کار لائے تھے۔ لڑکوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کوئی کہتا تھا دوسری کار شریف صاحب لائیں گے کوئی کہتا تھا کہ حیدر خاں صاحب کی موٹر سائیکل کار سے بدل جائے گی۔ کسی کا خیال تھا کہ ڈاکٹر بٹ کی موٹر سائیکل کار بن جائے گی۔ مگر ہم جیسے اکثر طلبہ کا خیال تھا کار رکھنے کی اہلیت صرف قریشی صاحب میں ہے چنانچہ یہی ہوا چند دن بعد نیلے رنگ کی اوسط سائز کی نئی چمکتی ہوئی کار قریشی صاحب کے پاس آ گئی۔ اور اسٹاف میں یہی پہلے پروفیسر تھے جنھوں نے کار خریدی تھی

فرسٹ ایئر پاس کرنے کے بعد جب سیکنڈ ایئر میں پہنچا اور کالج گیا تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی کالج کے پرنسپل قریشی صاحب تھے اور میں ڈن شعبہ جغرافیہ میں چلا گیا تھا۔

ہندی کی ایک "مثل" ہم عرصے سے سنتے آئے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ غلط ہے۔ مثل ہے

بن بھے نہیں ہوت ہے، پریت

یعنی بغیر ڈر یا خوف کے محبت نہیں ہوتی۔ مگر قریشی صاحب سے جتنا زیادہ ڈر لگتا تھا اس سے زیادہ ان سے محبت تھی۔ چنانچہ اس مثل کی صداقت محسوس ہو گئی، قریشی صاحب کی پرنسپلی کے زمانہ میں کالج میں کبھی کوئی غیر معمولی بات واقع نہیں ہوئی۔ اور پرنسپل کا یہی کمال ہے۔ کہ سب کام اتنی خاموشی سے اور سہولت سے ہوتا رہے کہ وقت کا اندازہ تک کسی کو نہ ہو سکے۔ مگر میری زندگی جو طوفانوں اور حوادث کی آماجگاہ رہی ہے قریشی صاحب کے زمانے میں بھی ایک حادثہ ہو گئی۔ سیکنڈ ایئر کا آخری دن تھا۔ یعقوب بیگ نامی صاحب لاجک کو گائیڈ کر رہے تھے اور طلبہ اپنی اپنی دشواریاں سوالات کی شکل میں حل کر رہے تھے۔ میں نے بھی ایک سوال کیا

مثال کے طور پر میں ایک سیاہ پرندے کو بہت بلندی پر اڑتے دیکھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کوا ہے لیکن میرا ایک دوست کہتا ہے کہ یہ کوئل ہے۔ جب یہ پرندہ زمین پر آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ

بالکل نہ دیکھنے کی غلطی تھی یا اشیاء کو نادرست دیکھنے کی غلطی تھی ۔

- یہ انتہائی معصوم سوال تھا۔ مگر سوال سنتے ہی نامی صاحب مرحوم کو یکایک طیش آگیا اور انھوں نے فرمایا ۔

تم نے مجھ پر یہ جملے بازی کی ہے کیونکہ میرا رنگ سیاہ ہے ۔ میرے پاس یہ ثابت کرنے کو ٹھوس دلائل ہیں کہ جس شخص کا رنگ سیاہ نہ ہو وہ خالص مغل نہیں ہوسکتا ۔

میں نے کہا کہ آپ کا محض خیال ہے ۔ میں نے آپ کے متعلق ہرگز کوئی بات نہیں کہی میرا نہایت صاف اور سیدھا سوال ہے ۔ مگر نامی صاحب مرحوم نے میری بات نہیں مانی اور مجھے کلاس سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میں نے کہا کہ میں کلاس سے باہر جانے کو ہرگز تیار نہیں، اول تو یہ کہ میں بہت سینیر طالب علم ہوں میں توہین ہرگز برداشت نہیں کر سکتا، دوسرے میں کلاس میں بیٹھنے کی فیس ادا کرتا ہوں مفت تعلیم حاصل نہیں کرتا۔ لہذا مجھے کلاس سے باہر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میرے اس جواب پر نامی صاحب قریشی صاحب کے پاس گئے اور میری شکایت کی۔ قریشی صاحب نے فرمایا کہ یہ لڑکا تو بہت مہذب ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کیا معاملہ ہوگیا۔ آپ جائیے میں انکوائری کرتا ہوں چنانچہ میرے نام پرچہ طلبی آیا اور میں حاضر ہوا۔ قریشی صاحب نے کہا بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا۔ پھر فرمایا کہ نامی صاحب سے کیا بات ہوئی میں نے من و عن پورا واقعہ بیان کر دیا۔ قریشی صاحب نے ایک حرف بھی نہیں کہا۔ اور کچھ سوچ کر فرمایا۔ تم جاؤ پھر بلا لیں گے۔ اب قریشی صاحب نے نامی صاحب کو بلایا اور میرا بیان ان سے تصدیق کرایا۔ انھوں نے اس کی تصدیق کی تو (جیسا مجھے سید محمد احسن صاحب سے معلوم ہوا تھا) قریشی صاحب نے فرمایا کہ اس میں آپ کو ناراض ہونے کا تو کوئی جواز نہیں پیدا ہوتا ہے۔ یہ سوال کہ آپ پر حملہ کیونکر ہوا۔ محض خام خیالی ہے آپ نے ایک معمولی بات کو اتنا طول دیدیا اور اسی وقت میری طلبی ہوئی۔ قریشی صاحب نے صرف اس قدر فرمایا کہ تم نامی صاحب سے معافی مانگو! میں ذرا رکا تو فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے اسلام میں استاد کا کتنا بڑا مرتبہ ہے۔ میرا حکم ہے کہ تم معافی مانگو۔ چنانچہ اب کیا مجال تھی کہ ایک لفظ زبان سے نکلتا میں نے نامی صاحب سے معافی مانگ لی۔ قریشی صاحب نے نامی صاحب سے کہا کہ آپ ہاتھ ملائیے ۔ چنانچہ ہم دونوں نے ہاتھ ملائے ۔ اور چلے آئے اگر یہ معاملہ اس طرح ختم نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم دونوں کے دلوں میں مدت تک غبار رہتا

میں نے ۲۳ء میں ایک ادبی ماہنامہ "ستارہ" محض یہ ثابت کرنے کے لئے جاری کیا تھا کہ "علی گڑھ میگزین" کی ایڈیٹری کی اہلیت صرف ڈگری کلاسز کے طلبہ ہی میں نہیں ہوتی بلکہ انٹرمیڈیٹ کے طلبا بھی اس کے اہل ہو سکتے ہیں ۔ تو کیا وجہ ہے کہ اس عہدے کے لئے صرف ڈگری کلاسز کے ہی طلبہ میں سے انتخاب ہو۔ جب پہلا پرچہ یکم اکتوبر ۲۳ء کو شائع ہوا تو میں سب سے پہلے ایک پرچہ لے کر قریشی صاحب کے دولت کدے پر سہ پہر کو حاضر ہوا۔ قریشی صاحب نے جس طرح

قریشی صاحب نے اپنی پرنسپلی کے زمانے میں کسی لڑکے کو امتحان میں بیٹھنے سے محض اس لئے محروم نہیں کیا کہ اس کی حاضریاں کم ہیں۔ اس زمانے کے میرے اکثر کلاس فیلو بلکہ سیکشن فیلو قریشی صاحب کے فیض تعلیم و تربیت سے اپنی آئندہ زندگی میں عالمگیر شہرت و قابلیت کے مالک ہوئے۔ میں اپنے ہم سبق اور قریشی صاحب کے شاگردوں میں اس وقت صرف تین نام ظاہر کرتا ہوں پریسیڈنٹ محمد ایوب خان جسٹس لاری اور ڈاکٹر ایم ایم احمد مرحوم سابق صدر شعبہ فلسفہ کراچی یونیورسٹی ان کے علاوہ بھی مجھے اپنا کوئی کلاس فیلو ایسا نہیں ملا جو اپنے ماحول میں کامیاب اور خوش قسمت نہ ہو۔ اور میں اسے قریشی صاحب کا تصرف باطنی و روحانی بھی سمجھتا ہوں۔ انٹرمیڈیٹ کالج چھوڑنے کے بعد بھی میں اکثر و بیشتر قریشی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا مگر علی گڑھ چھوڑنے کے بعد ایک طویل عرصہ تک میں قریشی صاحب کے الطاف کریمانہ سے محروم رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علیگڑھ نے جب اپنے پندرہ روزہ اخبار "علی گڑھ" کا مجھے ایڈیٹر منتخب کر لیا تو میرا یہ اخبار پھر قریشی صاحب تک رسائی کا وسیلہ بن گیا۔ گو میں علی گڑھ میں تھا اور قریشی صاحب سرگودھا میں تشریف فرما تھے، میں اکثر عریضہ ارسال خدمت کرتا تھا اور قریشی صاحب انتہائی شفقت سے بلا تاخیر جواب مرحمت فرماتے تھے۔ قریشی صاحب کے وہ تمام خطوط آج بھی میرے پاس ہیں جنہیں میں حرز جان سمجھتا ہوں

قریشی صاحب اب کراچی میں مقیم ہیں اور گو میں حاضری دینے سے ہمیشہ معذور رہا مگر

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

وضع اصطلاحات
مولوی وحید الدین سلیم

یہ کتاب اردو کے نامور انشاپرداز معلم مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے۔ یہ بالکل نیا موضوع ہے۔ اس میں اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہیں۔

قیمت: ر شات روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

اردو تھیٹر

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

ڈاکٹر نامی نے اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ مرتب کی ہے جس میں ڈراموں، ڈرامانگاروں اور ڈراما کمپنیوں وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں یہ کتاب دراصل ڈرامے کی انسائیکلوپیڈیا جو چار جلدوں پر مشتمل ہے ان میں سے تین چھپ چکی ہیں اور چوتھی زیر طبع ہے۔

قیمت فی جلد سات روپے

سید احمد خاں۔ حالات وافکار

بابائے اردو

ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار سید احمد خاں کی شخصیت اور علمی کارناموں کا جائزہ جس میں بابائے اردو نے سرسید کے حالات اور افکار کے بعض پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو مولانا حالی کی کتاب "حیات جاوید" کا ضمیمہ سمجھنا چاہیئے

قیمت:۔ چار روپے

[illegible]

یاسؔ بہاری

رخشاں ابدالی

حضرت یاسؔ بہاری (جناب حکیم سید شاہ محمد الیاس فردوسیؒ) ایک کہنہ مشق، قادر الکلام اور استادِ فن شاعر تھے۔ آپ بہ بہار کے ایک مقتدر، مایۂ ناز اور مشہور خانوادۂ فقر و تصوف کے رکن رکین تھے۔ یعنی حضرت "مخدوم الملک" "مخدوم جہاں" ِن الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ، صاحب "مکتوب صدی" و "شرح آداب المریدین"، "معدن المعانی" وغیرہ (سنہ ۶۶۱ھ ۱۲۶۳ء سنہ ۷۸۲ھ ۱۳۸۰ء) ۔ اولاد میں تھے اور بہار کے مخدوم زادے تھے۔

وطن، قصبہ بہار شریف تھا جو پٹنہ ضلع بہار کے سب ڈویژن کا مستقر ہے۔ آپ "جناب حضور" حضرت شاہ امین احمد فردوسی ہ اللہ علیہ شہاؔت و شوقؔ تخلص، سجادہ نشین خانقاہ حضرت مخدوم شرف الدین کے صاحبزادے تھے اور حضرت شاہ امیرالدین ردوسیؒ متخلص بہ مظلوم دو جد حضرت یاسؔ کے جدِ محترم تھے۔ اس طرح جناب یاسؔ کا ذوقِ شعرگوئی و سخن سنجی آبائی تھا۔

آپ کی تاریخ ولادت ۲۰ ذی قعدہ سنہ ۱۳۰۵ھ روز پنجشنبہ ہے اور ۴ ستمبر سنہ ۱۹۶۵ء کو آپ کا حادثۂ ارتحال ہوا۔ فارسی کی تکمیل اپنے والد ماجد سے کی اور عربی کی تحصیل بقدر ضرورت کی۔ طب کی تعلیم "تکمیل الطب" لکھنؤ میں ہوئی وادہ ضلع گیا میں مطب کرتے تھے اور یہی ذریعۂ معاش تھا۔

شاعری میں حضرت رُعبؔ سے، جو جلالؔ لکھنوی کے شاگرد تھے مشورۂ سخن کیا۔

بہار شریف سے ایک علمی و ادبی رسالہ "الامین" سنہ ۱۹۲۶ء میں نکلتا تھا۔ اس کے ایک مدیر آپ بھی تھے۔

چند برس ہوئے حضرت مخدوم شرف الدینؒ منیری کے مشہور و معروف مجموعہ مکاتیب "مکتوب صدی" کا اردو میں ترجمہ کر رہے تھے اور اس کی اشاعت کا اہتمام بھی ہو رہا تھا۔ مگر وہ منظرِ عام پر نہ آ سکا۔

حالات بیان کئے جا چکے صاحب کلام کی باری ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک مجموعہ منتخبات کے مولف نے آپ کے کلام پر جو رائے دی ہے۔ وہ پیش کی جاتی ہے۔

مذاقِ سخن سے فطرتاً مناسبت ہے ..... آپ کی شاعری یاسؔ کا مجسمہ ہے

اور کلام میں استاد کا رنگ دقت پسندی غالب ہے .... صفحہ ۵۶۰ ۔ "عطرِ سخن" (مولفہ ڈپٹی سید یوسف حسین چھپروی)

رنگِ تغزل کے عمومی اندازے کے لئے ایک غزل پیش کی جاتی ہے ؎

سیرِ عقل جو دشمن شکوۂ بیداد کرتے ہیں
تو کیا کیا دل میں وہ میری محبت یاد کرتے ہیں

ہماری نالہ پیمائی دلیلِ زندگانی ہے
جو ہم چپ بیٹھتے ہیں اقربا فریاد کرتے ہیں

ہوئی مدت کہ دیکھا تھا کرشمہ اُن نگاہوں کا
مگر دل پر وہ گزری ہے کہ اب تک یاد کرتے ہیں

مصیبت سے ہماری بدگمانی اُن کی بڑھتی ہے
کہ ہنگامِ تپش ہم کیوں خدا کو یاد کرتے ہیں

پسِ مُردن ہمارے ضبطِ غم کی داد ملتی ہے
وفا کا نام جب آتا ہے، ہم کو یاد کرتے ہیں

تپش کی راحت اندوزی کہ رہے زندگی میری
وہ کیسے لوگ ہیں جو درد سے فریاد کرتے ہیں

ہمیشہ ہم نے دیکھا اُن کو محوِ خود فراموشی
خدا جانے جنابِ یاسؔ کس کو یاد کرتے ہیں

دقت پسندی و مضمون آفرینی حسبِ ذیل اشعار سے ظاہر ہے ؎

منظرِ جلوۂ رنگیں ہوا حیراں ہونا
واہ وا آئینۂ دل کا گریباں ہونا

ہائے مٹی مری اور سرمۂ چشمِ اغیار!
پیستا ہے مجھے خاکِ درِ جاناں ہونا

راحت نصیبِ خواب ہے کیوں چشمِ پاسباں
یارب! مریضِ دردِ محبت کو کیا ہوا

ہو گیا اس کو یقیں آپ کی یکتائی کا
نہ سمجھنا مرا اب ناصحِ ناداں سمجھا

مجرمِ تحریکِ ادب ہوں ۔ دعوئ خوں درکنار
کیسی محشر کی خوشی، قاتل کا داماں دیکھ کر

مطلق ہو جب کہ حسن تو تقییدِ محل ہے کفر
منزل کی راہ پوچھتے ہیں گمرہی سے ہم

وہ طرزِ نگہ سرمۂ آغازِ فغاں ہے
محشر کی خوشی خاک ہو خونِ شہدا کو

یہ تو ہوئی دقت پسندی، نزاکتِ تخیل اور مضمون آفرینی ۔ اب لطافتِ زبان اور شگفتہ بیانی دیکھئے ؎

کچھ دل پہ اس طرح سے دعویٰ ہے آپ کا
نازوں کا یہ پلا ہوا گویا ہے آپ کا

مرنے کے بعد حسرت سے آنکھیں ملا کیا
جو زندگی میں والہ و شیدا ہے آپ کا

دورِ سپہر نے مجھے پیسا سہی ۔ مگر
دورِ سپہر بھی تو کرشمہ ہے آپ کا

جب یہ کہا کہ "جان بھی تم سے نہیں دریغ"
کہنے لگے وہ ہنس کے "یہ کہنا ہے آپ کا"

اُٹھتا ہے دردِ سینہ میں تعظیم کے لئے
دل میں کبھی خیال جب آتا ہے آپ کا

اس ظلم میں بھی منہ کبھی موڑا ہے آپ سے   شکوہ کبھی زباں پہ آیا ہے آپ کا

ضعفِ فغاں و فورِ قلق پر جنابِ یاس؛
یہ دل ہے آپ کا، یہ کلیجا ہے آپ کا!!

ایک اور غزل ہے ؎

اب خیر نہیں جان کی، شوخی کی ادا سے   ہم کہتے ہیں "مرتے ہیں" وہ کہتے ہیں "بلا سے"
پھر حشر خدائی اسی مستانہ ادا سے   پس جائے بلا سے کوئی مٹ جائے بلا سے
آپ اور کہاں پرسشِ بیمارِ محبت   اس درد کا بڑھنا کہیں بڑھ کر ہے دوا سے
ٹھوکر سے مٹانا ہے مری قبر مٹا دے   کعبہ یہ بنیگی ترے نقشِ کفِ پا سے
اللہ رے آہِ شرر انداز کی گرمی   پانی کی طرح آگ برستی ہے ہوا سے
آشوبِ جہاں ہو گیا آغازِ جوانی   شوخی تری کیا کہہ گئی کانوں میں حیا سے
چلتا ہوا مے خانہ ہے اس آنکھ کی گردش   ہم مست ہیں تیری نگہِ ہوش رُبا سے
پوچھا نہ ہمیں شانِ کرم نے سرِ محشر   کی سخت خطا، ہاتھ اٹھایا جو خطا سے
اس کوچہ کی یاد اور ستاتی ہے پسِ مرگ   دم اپنا اُلجھنے لگا جنت کی فضا سے
لایا ہے سرِ بزمِ ازل یاس کچھ امید
اک درد وہ یارب! کہ نہ اچھا ہو دوا سے

چند مطلعے ملاحظہ ہوں ؎

یہ اشکِ رنگیں تماشا نہیں ہے   جگر خون کرنا ہے رونا نہیں ہے
ذوقِ گردش سے ہے نعمت دوریِ منزل مجھے   کرتی ہے مشکور کیا کیا سعیِ بے حاصل مجھے
گردشِ چشم، گر آمادۂ بیداد ہے   دورِ گردوں کو نہ پھر کوئی سبق یاد ہے
تاب اے دل! کیا ہوئی وہ روئے جاناں دیکھ کر   غیر سے کچھ دیکھ کر اے دشمنِ جاں! دیکھ کر
جو مٹا تو شکر گزار ہوں کہ حریفِ دامنِ یار ہوا   میں اب ایک کوہِ وقار ہوں کہ غبار ہو کے میں غبار ہوا
خواہانِ قتل کیا ہوں تری نازکی سے ہم   وعدہ ہی کر کہیں کہ مریں اس خوشی سے ہم
تا چند اٹھائے نہ کوئی ہاتھ دعا کو   بدلیں گی جفائیں تری، آئینِ وفا کو

متفرق اشعار پیش کش ہیں ؎

کہے دیتی ہے اس کی ہنگامہ زائی   کہ محفل ہے بزمِ قیامت کسی کی

دمِ نزع وہ پرسشِ حالِ دل پر   کسی کا یہ کہنا "عنایت کسی کی"
زندگانی کا ذرا لطف بھی انساں میں نہیں   سوز اگر دل میں نہیں، درد اگر جاں میں نہیں
تنک اپنا شیشۂ دل سہی   مگر اس کے توڑنے کی خوشی
یہ پکار اُٹھے گی شکستگی   کہ ایسے میں ہزار ہوں
کبھی کوئی شکرِ مرض سہی   جب اسے چمن میں جگہ ملی
یہ سمجھتی نرگسِ حیرتی   کہ میں گل کی آئینہ دار ہوں
وہ برقِ تجلی ہے بیتاب اب بھی   مگر طور پر کوئی موسیٰ نہیں ہے
ترے حسن کی اُف بہار آفرینی   بہشت بریں ہے یہ دنیا نہیں ہے
ڈرا دے کچھ آشوبِ محشر انھیں کو   جنھیں یاد تیرا زمانا نہیں ہے
پسند آئی ہم کو محبت کی دنیا   محبت کی دنیا میں مرنا نہیں ہے
زخمِ سر سے کم نہیں پر لطف رنجِ خارِ پا   صُنعِ فطرت نے بنایا ہے سراپا دل مجھے
حیرتِ دل بھی کرے روشن فروغِ حسنِ بزم   سمجھے ایک تو دیں اگر آئینۂ محفل مجھے
ذرہ ذرہ راہ کا تھا اک تجلی زارِ حسن   ہر قدم پر سینکڑوں آئی نظر منزل مجھے

دیکھتا ہوں اُن کو بالیں پر جو وقتِ نزعِ یاس
کچھ تو جذبِ عشق کا ہونا پڑا قائل مجھے

آپ کی ایک قومی نظم کے ابتدائی تین بند یہ ہیں ؎

آفاق کی رُت بدلی، عالم کی فضا بدلی   آئینِ چمن بدلا، بلبل کی نوا بدلی
طبعِ عُلما بدلی، نظمِ شعرا بدلی   دو دن میں زمانہ کی کیا آب و ہوا بدلی
شق ہو گیا پتھر بھی مجبورِ اثر ہو کر
ہر ذرہ تڑپ اُٹھا صحرا میں شرر ہو کر

آساں نہیں مشکل ہے گو عقدے کا حل ہونا   وہ آج گرہ میں ہے جس عقدے کو ہے حل ہونا
تمہیدِ اجل سمجھو تم پاؤں کا شل ہونا   ہے رازِ حیاتِ دل، سرگرمِ عمل ہونا
اے مسلمِ خوابیدہ! بے خوفِ اجل ہو جا
تھا پھول سپر کا تو، اب تیغ کا پھل ہو جا

جینے کی تڑپ دیکھو، موجوں کی روانی میں   بادل کے گرجنے میں، بہتے ہوئے پانی میں

بجلی کی حیات آخر، بجلی کا تڑپنا ہے
شعلے کے لئے جینا، شعلے کا بھڑکنا ہے

اس نظم کا آخری شعر ہے ؎

وہ کام نہیں کرتا جو موت سے ڈرتا ہے
جینا تو اُسی کا ہے جو جینے پہ مرتا ہے

یہ رباعیات یاسؔ ہیں ؎

ساقی کا فلک غلام بن جاتا ہے   زندوں کا ہمیشہ کام بن جاتا ہے
مے خانہ میں محتسب کی پروا کیا ہے   ٹوٹا جو سبو تو جام بن جاتا ہے

ہو عقل کی جستجو تو دیوانہ بنو   گردش کی ہے آرزو تو پیمانہ بنو
جلنا ہے تو آتشِ محبت میں جلو   جب خاک بنو تو خاکِ مے خانہ بنو

مدہوشِ شرابِ ارغوانی کب تک   دیوانۂ نشۂ جوانی کب تک
مانا کہ بہارِ زندگی ہے ہستی   غافل! مگر آہ زندگانی کب تک

اندیشۂ انجامِ عمل کرنا تھا   یا خوف بہ ہنگامِ عمل کرنا تھا
توبہ بھی نہ کی یاسؔ! بس سوے عمل   کچھ تو ارے بدنام! عمل کرنا تھا

مضمون ناتمام رہے گا اگر فارسی کلام کا نمونہ نہ پیش کیا جائے، اس لئے فارسی کی ایک چھوٹی سی غزل آخر میں پیش کر دی جاتی ہے ؎

از غم و دردِ ہجرِ او ترکِ وفا نہ می کنم   مرگ اگر دوا شود رو بہ دوا نہ می کنم
راحتِ عاشقاں بود جور و جفائے دلبراں   زاں بہ غمِ تو آشنا لب بہ دعا نہ می کنم
از منِ زار اے صبا! عرضہ دہی بہ یارِ من   نیست شبے کہ تا سحر یادِ شما نہ می کنم
گفتمش از خرامِ ناز حشر بپا ہمی کنی   گفت کدام ادا ازو حشر بپا نہ می کنم
در رہِ خار زارِ عشق یاسؔ! نہادہ ام قدم
تا نہ رسم بہ منزلے رو بہ قضا نہ می کنم

○

نصرتی

بابائے اردو

یہ کتاب ملک الشعرائے بیجاپور ملا نصرتی کے
حالات زندگی اور جائزہ کلام پر مشتمل ہے
اس میں بابائے اردو نے بڑی تحقیق و جستجو سے
نصرتی کے حالات جمع کیے ہیں نیز نصرتی کے غیر
مطبوعہ کلام کا انتخاب مع شرح و حواشی شامل کیا ہے

قیمت :- ـــــ پانچ روپے

مرحوم دہلی کالج

بابائے اردو

مرحوم دہلی کالج کا شمار ہند و پاکستان کے ان علمی اداروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اس برصغیر میں اشاعت علم کی خدمت صحیح معنوں میں انجام دی دہلی کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور تمام علوم و فنون کی تدریس اردو کے ذریعے ہوتی تھی۔ بابائے اردو نے اس کالج کی تاریخ اس کتاب میں بیان کی ہے۔

قیمت :- ـــــ چار روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

کلام یقین کا قدیم ترین مخطوطہ

محمد اکرام چغتائی

کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور کے ذخیرۂ کیفی میں ایک قلمی بیاض موجود ہے جس میں کاتب نے "انتخاب دیوان یقین" کے عنوان کے تحت تقریباً سارا دیوانِ یقین نقل کردیا ہے ۔ اس 'انتخاب' میں یقین کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی درج کردیا گیا ہے[۱]۔ مطبوعہ دیوان یقین[۲] کا متن قلمی دیوانِ یقین (مکتوبہ ۱۱۹۸ھ[۳]) پر مبنی ہے ۔ لیکن مذکورہ 'انتخاب' کا سنہ کتابت ۱۱۶۹ھ ہے ۔ یقین کا سنہ وفات ۱۱۷۰ھ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا 'انتخاب' کی کتابت اس وقت ہوئی جب کہ یقین زندہ تھے ۔ پاک و ہند کے کسی کتب خانے میں دیوانِ یقین کا اتنا قدیم قلمی نسخہ موجود نہیں ۔

چونکہ کسی شاعر کے دیوان کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں دیوان کے قدیم ترین قلمی نسخہ کے متن کو ترجیح دی جاتی ہے اور اسی متن کو درست بھی سمجھا جاتا ہے ۔ اس لیے ہم نے مطبوعہ دیوانِ یقین اور مذکورہ 'انتخاب' کا موازنہ کرکے اختلافات نسخ دیئے ہیں ۔ تاکہ جب کبھی دیوانِ یقین دوبارہ طبع ہو تو قدیم متن کو پیش نظر رکھا جائے ۔ ان اختلافات نسخ سے ظاہر ہوگا کہ انتخاب کا متن مطبوعہ دیوان کے متن کے مقابلے میں بدرجہا بہتر اور قابلِ ترجیح ہے ۔

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۱ ۔	سر برآ اِس منہ سے ہو سکتی ہے کب نعتِ رسولؐ	سر برآہ . . . .
	یا ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ کی ثنا	. . . .
”	نام حمد و مدح کا لینا مجھے انصاف نہیں	نام حمد و مدح کا . . . .

---

[۱] یقین کے غیر مطبوعہ کلام کے لیے دیکھیے ۔ راقم کا مضمون "یقین کا غیر مطبوعہ کلام" رسالہ اردو کراچی بابت جولائی ۱۹۶۶ء ۔

[۲] مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ مطبوعہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء ۔

[۳] مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن ۔

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۱	کٹے ہے ساری عمر، ترکان ستمگر کی ثنا	. . . .
۲	طلا تجھ حسن کے شعلے کے آگے آب ہوجاتا	طلا اس حسن . . . .
	تجھے گر دیکھتا رو پا پگھل سیماب ہوجاتا	. . . .
،	اثر خوبانِ فندق زیب کی انگلیوں میں یہ دیکھا	. . . .
	کہ جو گرتا تھا اشکِ خوں وہاں عناب ہوجاتا	کہ جو گرتا تھا اشکِ خوں سو وہ عناب ہوجاتا
،	یقیں سوز و گداز اپنے کو گر اظہار میں کرتا	. . . .
	خدا شاہد ہے، آتش کا بھی زہرہ آب ہوجاتا	خدا شاہد کہ آتش . . .
۳	خدا دیتا مجھے گر میر سامانی خدائی کی	. . . .
	تو میں ان بلبلوں کو گلشنوں کا باغباں کرتا	تو میں ان بلبلوں کو گلستاں کا باغباں کرتا
،	نہ آیا سرفرو ایدھر یقیں کے فکرِ عالی کا	. . . .
	زمینوں کو وگرنہ ریختے کی آسماں کرتا	. . . . وگرنہ ریختے کا آسماں کرتا
،	اجل تھی کوہکن کی وہ جو صورت باندھ آئی تھی	. . . .
	وگرنہ یہ خبر کوئی بھی دشمن کو سنا سکتا؟	وگرنہ یہ خبر دشمن کو بھی کوئی سنا سکتا؟
،	اگر تیشہ نہ کرتا دستگیری اس بچارے کی	اگر کرتا نہ تیشہ دستگیری اس بچارے کی
	یقیں فرہاد تیغِ کوہ کے کب منہ پہ آسکتا	یقیں فرہاد تیغِ کوہ کے منہ پر کب آسکتا
۴ ۔	کسو کا بھی کبھو رکھا کرو دل، تم کو لازم ہے	کسو کا تو کبھو رکھا کرو دل . . . .
	وگرنہ دلرباؤں کا لقب دلدار کیوں ہوتا	. . . .
،	کبھو یہ تھا کہ ہم پر وہ بتِ مغرور رو دیتا	. . . .
	بُرا جب دیکھتا حالِ دلِ رنجور رو دیتا	برا جب دیکھتا یہ حال دلِ رنجور رو دیتا
،	ہمیشہ کھینچتا ہوں اشکِ خوں کو دارِ مژگاں پر	. . . .
	اگر سولی مری کو دیکھتا منصور، رو دیتا	اگر رونے مرے کو . . . .
۵ ۔	تیری جاگہہ اگر پتھر بھی ہوتا، آب ہوجاتا	. . . .
	یہی تپاق کو میری دیکھ کوہِ طور رو دیتا	. . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۴ ۔	سحر کے چاک پر روتا ہے جوں شبنم یقیںؔ میرا	سحر اس چاک پر روتے جوں ....
	جراحت دیکھتا گر مرہم کافور رو دیتا	....
	نہیں معلوم اب کی سال میخانہ پہ کیا گزرا	..... پیمانے ....
״	بہارِ توبہ کر لینے سے پیمانہ پہ کیا گزرا	.... میخانے ...... (دیگر قوافی کو بھی اسی طرح بدلا گیا)
״	مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے	.... ہے یہاں شہری غزالوں نے
	نہیں معلوم میرے بعد ویرانہ پہ کیا گزرا	....
״	پڑے ہیں چور میرے استخواں پتھروں سے لڑکوں کے	حیا لوگوں سے ہر جا پر غضب ہے اتنی ہوشیاری
	نہ پوچھا یہ کبھی تونے کہ دیوانہ پہ کیا گزرا	....
״	یقیںؔ کب یار میرا سوزِ دل کی داد کو پہنچے	یقیںؔ کب یار میرے ....
	کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانہ پہ کیا گزرا	کہاں ہے شمع کو یہ غم ....
۵	موجِ دریا کی طرح ضبط میں آ سکتا نہیں	....
	کوئی کیوں کر کہے احوالِ پریشاں میرا	کیونکر لکھے کوئی احوالِ پریشاں میرا
״	نہ ہو جیو دور میرے سر سے ظلِ عاطفت غم کا	نہ ہو جو سر سے میرے دور ظل ....
	نہ پڑیو داغ پر میرے الٰہی سایہ مرہم کا	....
״	سبھی مرتے ہیں خوش وقتی پہ جی دیتے ہیں شادی پر	....
	تکلف برطرف، یہ نوحہ گر بندہ ہے ماتم کا	تکلف برطرف، یہ تو جگر کشتا ہے ماتم کا
״	جب دین کے خزانے ہوں، تب کام چلے تیرا	جب دل کے ....
	دنیا کے یقیںؔ تجھ کو گنجینے سے کیا ہوگا	....
۶	گریباں پھاڑ ڈالے رشک سے ہر گلبدن اپنا	گریباں پھاڑ ڈالیں رشک سے یہ گلبدن اپنا
	نکالوں خاک سے جوں لالہ اگر خونیں کفن اپنا	نکالوں خاک سے جوں لالۂ پرخوں گر کفن اپنا
״	لگے گا ہاتھ پتھر اس طرح کی سعی ناحق سے	....
	پرائے دلبروں سے سر نہ چیرا کے کوہکن اپنا	بیگانے دلبروں .... [1]

---

[1] اس شعر کے بعد بیاض میں مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ شعر درج ہے: —

سجا سر پہ جو اک پیچا (؟) نہیں حاجت بتلانے کی
نگہہ کی تیغ دکھلا کر جتایا بانکپن اپنا

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۶	ہمارا جی نکل جاتا ہے جب یہ نوجواں ہم کو	ہمارا جی نکل جاتا ہے جب وہ نوجواں ہم سے
	دکھاتے ہیں بھوئیں، تیوری چڑھا کر، بانکپن اپنا	. . . . بھویں تیوری بنا کر . . . . .
″	کیوں نہ ہو تر دامنوں کو شست و شو کی آرزو	. . . .
	میکشاں پر سایۂ رحمت ہے باراں کی ہوا	میکشوں پر . . . .
″	سر پر سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا	سر پر سلطنت سوں . . . .
	ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا	ہمیں بالِ ہما . . . .
″	مجھے دکھ پھر دیا تو نے منڈا کر سبزۂ خط کو	مجھے پھر دکھ دیا تو نے . . . .
	جراحت کو مرے وہ مرہم زنگار بہتر تھا	. . . .
″	مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں	. . . . تھا بہاروں میں
	کہ گل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خار بہتر تھا	کہ ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے ہی خار بہتر تھا
″	ہمیں نے ہجر سے کچھ وصل میں دھڑکے بہت دیکھے	ہمیں نے . . . .
	ہمارے حق میں اس راحت سے وہ آزار بہتر تھا	خدا شاہد کہ اس راحت . . . .
″	میرا دل مر گیا جس دن کہ نظارہ سے باز آیا	. . . . دن سے نظارہ . . . .
	یقیں پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا	. . . . کرتا نہ یہ . . . .
۷	اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا	اتنا کبھو جہاں میں کوئی بے وفا نہ تھا
	ملتے ہی میرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا	ملتے ہی تیرے مجھ . . . .
″	ناصح جو یہ نصیحتِ بے جا نہیں سنی	. . . .
	معذور رکھ تو مجھ کو مرا دل بجا نہ تھا	معذور رکھیو مجھ کو . . . .
″	مرنے کی طرح میں نے جو یہ اختیار کی	مرنے کی طرف میں نے یہ جبر (؟) اختیار کی
	دیکھا تو زندگی میں مزا کچھ رہا نہ تھا	. . . .
″	اس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا	. . . .
	جب حنا سے ترے پاؤں کو سروکار نہ تھا	جب حنا کو تیرے ہاتھوں سے سروکار نہ تھا
۶	حسن کا جذب زلیخا ستی کچھ چل نہ سکا	. . . .
	ورنہ یہ پاک گہر قابلِ بازار نہ تھا	ورنہ وہ پاک . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۷	دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس	دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوائی ہیگی ہوس
	کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا	. . . .
″	تری خدائی میں کیا کیا جفا اٹھایا ہوں	. . . . . . کیا کیا جفا اٹھائے ہیں
	مرے جو پاس تو آتا وفا سے دور نہ تھا	. . . .
۸	مرے ان آنسوؤں نے کھو دیا نورِ بصر میرا	. . . . کھو دیا نور البصر میرا
	یہ یوسف بیچ کر اس کارواں کے ہاتھ کیا آیا	. . . .
″	اس کو جب خشم و رضا میرا برابر ہو گیا	اس کو اب خشم . . . .
	حیف مضموں رد کٹنے کا پھر مکرر ہو گیا	. . . . کا بھی مکرر ہو گیا
۹	کیا گرادی ایک تیشہ سے بنا فرہاد کی	کیا سر اوپر ایک تیشہ . . . .
	کر دیا کس گھر بسی نے خانۂ شیریں خراب	. . . .
″	کس کے آگے جا کے سر پھوڑیں کہ کر دیتا ہے آہ	. . . . کر دیتا ہے ہائے
	خاطروں کے شیشہ خانے وہ دلِ سنگیں خراب	خاطروں کے شیشۂ خالی کو دلِ سنگیں خراب
۱۰[1]	جہاں دل گم ہوئے واں کون جا سکتا ہے کیا قدرت	. . . . . . گم ہوا وہاں کون . . . . . .
	خبران یوسفوں کی کون لا سکتا ہے کیا قدرت	. . . .
″	یہ جس نے بت تراشے ہیں وہ ہی سمجھا بغیر اس کے	یہ بت جنے تراشے ہیں اوسے پوچھو خبر اوس کی
	کہیں یہ صورتیں کوئی بنا سکتا ہے کیا قدرت	کبھو یہ صورتیں . . . .
″	یقیں تائیدِ حق سے شعر کے میداں کا رستم ہے	. . . .
	مقابل آج اس کے کون آ سکتا ہے کیا قدرت	. . . . اس کے کوئی آ . . . . . .
″	حق کو کب پہنچے نہ باندھے جب تک ان زلفوں سے دل	حق کو کب پہنچے بندھے جب تک نہ ان زلفوں میں دل
	کیوں کہ ہو زنجیریں ایسے دیوانے کا علاج	. . . .
″	گر طہارت چاہتا ہے تو خدا کے واسطے	. . . .
	کاٹ سر تو ہو سے اپنے کر نہانے کا علاج	کہات پر تو پی.ی تو ہو میں نہلنے کا علاج

---

[1] اس صفحہ کی غزل ۱۰ کے شعر ۲ کے بعد مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ شعر درج ہے ؎

یہ آہو رام تھے مجنوں کے سب لیلیٰ کی خاطر سے
وگرنہ ان پری زادوں کو دیوانے سے کیا نسبت

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۱۱	تصور کرکے لیتا ہوں مزا میں اس کی باتوں کا	....
	مرے اس چپکے رہنے کا ہے وہ شیریں دہن باعث	.... کا وہ ہے شیریں .....
؍؍	خوش آتی کب ہے قیدِ زندگی مجھ کو یقیںؔ لیکن	....
	مرے اس دام میں پھنسنے کا ہے وہ منہرن باعث	.... پھنسنے کا وہ ہے .....
۱۲	روٹھ کر دل سامنے خوباں کے جاوے کس طرح	.... آوے کس طرح
	پھٹ گیا جی اس کا اب آنکھیں ملاوے کس طرح	....
؍؍	رنگ سے مہندی کے ہوجاتے ہیں آنسو لعل تر	....
	رکھ کے اُن پاؤں پہ کوئی سر اٹھاوے کس طرح	...... سر کوئی ......
؍؍	فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھتے کیا ہو یقیںؔ	....
	اب کے چلتا ہے جنوں پر دل ہمارا بے طرح	اب کے چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے طرح
۱۳	سو جگہ سے دل گریباں پھاڑ دیوانے کی طرح	ہو چکا دل سے گریباں ....
	زلف کی زنجیر میں آخر پھنسا شانے کی طرح	....
؍؍	جی نکل جاتا ہے میرا جب کبھی آتی ہے یاد	...... جب کبھو آتی .....
	وہ قسم کھاکر اسی ساعت مکر جانے کی طرح	....
؍؍	گر یقیںؔ تو چاہتا ہے یار ہو شمعِ مزار	....
	کود جا گیر آتشِ سوزاں میں پروانے کی طرح	گور پر چل آتشِ سوزاں ....
۱۴	چاہتا تھا میں کہ سارا غم ہو میرے ہی نصیب	.... سارا غم ہووے میرے نصیب
	آہ! غم نے بھی نہ دی اس خاطرِ محزوں کی داد	ہائے غم ....
؍؍	کیا خزاں نے کر دیا ویراں گلستاں، العیاذ	....
	کس طرح سے بلبلیں پھرتی ہیں نالاں العیاذ	کس طرح یہ بلبلیں ....
؍؍	لوگ اسی وادی میں اب کرتے ہیں آہو کا شکار	لوگ اس وادی ....
	بعد مجنوں یوں ہوئے بیکس غزالاں العیاذ	....
؍؍	جب مرے گرتے ہیں آنسو زہرہ ہوجاتا ہے آب	....
	آہ یہ عقدِ گہر یوں ہو پریشاں العیاذ	ہائے یہ عقدہ گہر ہووے پریشاں العیاذ

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۱۴	چاک کر ڈالا ہے تونے اپنا سینہ بھی یقیں	چاک کر ڈالا ہے اپنا تونے سینہ بھی یقیں
	پھاڑتا نہیں اس قدر کوئی گریباں العیاذ	پھاڑتا ہے اس طرح کوئی گریباں العیاذ
۱۵	باغباں کو جان کر مانع نہیں ہوتا یقیں	. . . .
	ورنہ سبب ہے گل کو بلبل کے ستانے کی خبر	ورنہ کب ہے گل . . . .
،،	جو تو ہا جس نہ دے اس کو لگا نا ہاتھ کیا حاصل	. . . .
	بہت کی تونے اس تیشہ کی خدمت کوہکن بس کر	. . . . کوہکن بس کر
۱۶	یہ زمیں سیلاب سے ہوتی نہیں ہے چاک چاک	. . . .
	دشت کی چھاتی پھٹے ہے سن کے دیوانے کا شور	. . . . چھاتی پھٹتی ہے . . . .
،،	کیا جنوں کو بے طرح شورش میں لاتا ہے یقیں	. . . . لایا ہے یقیں
	فصلِ گل میں بلبلوں کے باغ میں جانے کا شور	. . . . آنے کا شور
،،	کیا مری مژگانِ ترکے ابر نے ڈالا ہے شور	. . . .
	آج بادل بے طرح امڈے ہیں یہ برسیں گے زور	. . . . امڈے ہے مینہ برسے ہے زور
،،	خالِ گورے مکھ کا میرے دل کو لیتا ہے چرا	خال گورے مونہہ کا لیتا ہے میرے دل کو چورا
	اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پڑتے ہیں چور	. . . .
۲۲	جی نکلتا ہے میرا اس پر کہ کب آوے گا ہاتھ	. . . . اوس پر کہ کب آوے . . . . .
	یار کے پاؤں پہ سر کو رکھ کے مرجانے کا خط	. . . . سر کوں . . . .
،،	پوچھتا ہے خوب کیفیت نظارہ کی یقیں	. . . . نظارے . . . .
	اس نگاہ مست سے لیتا ہے میخانے کا خط	. . . .
،،	نہیں ہمیں فرصت کہ اب کے سال باندھیں آشیاں	نہیں ہمیں رخصت کہ . . . .
	باغباں کا حکم یوں ہے اے گلستاں الوداع	. . . .
۲۳	اہلِ نور، آہن دلوں سے بسکہ شرماتے ہیں سخت	اہل نور، موم دل آہن دلوں کو دیکھ شرماتے
	دیکھ کر گلگیر کی صورت کو کٹ جاتی ہے شمع	دیکھتے گلگیر کی صورت کو چھپ جاتی ہے شمع
،،	موت کا مرہم خدا جانے کہ کب آوے گا ہاتھ	. . . .
	کیونکہ جاوے جان، تجھ بن اے مرے [illegible] باغ	[illegible]

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۲۳	خاکساری محو کر ڈالے ہے سب دل کا غبار	. . . .
	دور خاکستر سے ہی ہوتا ہے آئینے کا داغ	دور خاکستر سے ہوتا ہے آئینے کا داغ
″	ہم تو اب مرتے ہیں اور بجھتا ہے الفت کا چراغ	. . . .
	دیکھئے کب ہووے روشن پھر محبت کا چراغ	دیکھئے کب پھر ہو روشن اس محبت کا چراغ
″	آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب	. . . .
	رات دن جلتا ہے یکساں داغ حسرت کا چراغ	. . . . ہے اک اس داغ . . . . . .
″	جائے کب میری یہ سرگرمی کسی کی سعی سے	جائے کب میری تیری گرمی . . . .
	کب حسد کی باد سے بجھتا ہے دولت کا چراغ	. . . . الفت کا چراغ
″	خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقیںؔ	. . . .
	ہے میرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ	. . . . محبت کا چراغ
۲۴	دل نہیں کھنچتا ہے بن مجنوں بیاباں کی طرف	دل نہیں کھنچے ہے . . . .
	خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف	. . . .
″	فصلِ گل کی ہم اسیروں کو خبر کب ہے ولے	. . . . ولیک
	ان دنوں میں شور سا کچھ ہے گلستاں کی طرف	. . . .
″	سالہا سوزِ محبت کو چھپایا تھا یقیںؔ	سالہا شورِ محبت کو چھپایا میں یقیںؔ
	ہاتھ آخر ہو گیا میرے گریباں کا حریف	. . . .
۲۵	رو دیا ہوں یہاں تلک کہ اب آنکھوں میں نم نہیں	رو دیا یہاں تلک کہ اب آنکھوں میں نم نہیں
	بے آب ہو گئے گہر آب دار حیف	. . . .
″	کوئی بلبل ان دنوں میں نہ پھنسیو چمن میں	. . . .
	جب تک کہ چھوٹوں ہو گئی آخر بہار حیف	جب تک چھٹوں کہ ہو چکی آخر بہار حیف
″	اس دکھ میں دیکھ مرگ بھی مجھ سے سرک گئی	. . . . مجھ کو سرک گئی
	کیا غم نے کر دیا مجھے زار و نزار حیف	. . . .
″	مجھے معذور رکھو ہمصفیروں نالہ کرنے سے	مجھے معذور رکھیو . . . .

[illegible]

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۲۵	ملوں کیونکر نہ ان شیریں لبوں سے میں کہ دوری سے	. . . . کہ دوراں سے
،،	نہیں پاتا مرا دل زندگانی کا مزا مطلق	. . . .
،،	مرا مرتا ہے جی آخر کو کیا ہوگا کئی دن سے	. . . .
	مرے بیمار دل کو نہیں اثر کرتی دوا مطلق	مرے بیمار دل پر نہیں . . . .
،،	نہ رہ ہرگز مقید مہربانی کی توقع کا	. . . .
	یقیں اس قوم میں دیکھی نہیں ہم نے وفا مطلق	یقیں اس قوم میں ہم نے نہیں دیکھی وفا مطلق
،،	عجب نہیں خوش نگاہاں کا اگر دشوار ہو ملنا	ملیں گے خوش نگاہاں مجھ سے دیوانے سے تا ہے
	ہر ایک کا صید ہو جانا غزالاں کے نہیں لائق	. . . .
۲۶	جنوں کے ہاتھ سے محفوظ ایک دم رہ نہیں سکتا	جنوں کے ہاتھ سے ایک دم نہیں محفوظ رہ سکتا
	رفو کرنا یقیں میرے گریباں کے نہیں لائق	. . . .
۲۷	رات دن دل کو لگا رہتا ہے خوباں کا خیال	رات دن دل کو ہی لگا رہتا ہے یہ خوباں کا خیال
	بلبلوں سے چھوٹتا کب ہے گلستاں کا خیال	. . . .
،،	اوس کے منہ دیکھنے کی کب ہے ان آنکھوں کو تاب	اوس کے منہ دیکھنے سے کب . . . .
	سامنے ہو حسن کے اس خورشیدِ تاباں کا خیال	. . . .
،،	ہاتھ گر لگتا زنانِ مصر کو یہ آفتاب	ہاتھ لگتا گر زناں . . . .
	خواب ہو جاتا انھیں اس ماہ کنعاں کا خیال	. . . .
،،	سنبلستاں ہو رہا ہے آج اے ناصح دماغ	سنبلستاں ہو رہا ہے اوس سے ناصح کا دماغ
	کیونکہ جاوے سر سے اس زلف پریشاں کا خیال	کیونکہ سکئے اس سر سے زلف پریشاں کا خیال
،،	کیوں عبث سیتا ہے اے ناصح یقیں کا چاک جیب	سیوتا کیوں ہے عبث ناصح یقیں . . . .
	ہاتھ اس کا چھوڑتا کب ہے گریباں کا خیال	. . . .
۲۸	زیارت باغ کی کرتی ہے آنسو سے وضو کر کے	. . . .
	جنابِ گل میں رکھتی ہے عجب صدق و صفا بلبل	جنابِ گل سوں رکھتی . . . .
،،	جفائیں باغبانوں کی یقیں کیا کیا اٹھاتی ہے	جفا ان باغبانوں کا یقیں . . . .
	وفا یوں چاہیئے شاباش بلبل مرحبا بلبل	وفا موں مرگئے شاباش . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۲۸	چمن میں مجھ سے دیوانے کے لے جانے سے کیا حاصل	.... سے جانے کا کیا حاصل
	دکھا کر گل جنوں کو شور میں لانے سے کیا حاصل	.... جنوں کو شور پر لانے کا کیا حاصل
〃	جنھیں بالوں کی پھانسی دی وہ ہرگز جی نہیں سکتے	جنھیں بالوں کی پھانسی دی ہو وے ہرگز نہیں جیتے
	جو زلفوں میں پھنسا دل اس کے غم کھانے سے کیا حاصل	جو زلفاں میں ....
〃	نگہ تیر سے ہے جیسے عکس آئینہ کا چینی میں	نگہ تیری ہے جیسے عکس آئینہ کا ہے روشن
	یہ سب باتیں سمجھ کر، جان، شرمانے سے کیا حاصل	....
〃	قد ترا از بسکہ رکھتا ہے لٹک جوں شاخِ گل	....
	باد کے چلنے سے جاتا ہے لہک جوں شاخ گل	باد کے صدمے سے ....
〃	ہوں جفا سے خوش کہ کرتی ہے تری شمشیر تیز	....
	نقشِ غم کو صفحۂ خاطر سے حک جوں شاخِ گل	.... سے شک جوں ....
〃	ہار مت پہنا کر اے پیارے کہ نازک قد ترا	ہار مت پھرا کر ....
	بوجھ سے پھولوں کے کھاتا ہے لچک جوں شاخِ گل	....
〃	دفن کیجو مجھ کو آہستہ کہ میرے استخواں	....
	ہو رہے ہیں مارے زخموں کے تنک جوں شاخِ گل	ہو رہے ہیں بار زخموں سے تنک ....
۲۹	نے ہوئی آخر رہی تدبیر غم کی ناتمام	....
	کس سے دل خالی کریں اب ہو چکا مینا تمام	کس سے خالی کریں اب ہو چکا مینا تمام
〃	آبرو دی ہے دوانوں نے جنوں کو اس قدر	.... جنوں کو کس قدر
	گریۂ مجنوں سے دریا ہو گیا صحرا تمام	....
〃	انفعال و شرم کے مارے زمیں میں گڑ گیا	انفعال اور شرم ....
	کوہکن کی نامرادی دیکھ کر خارا تمام	....
〃	پڑ گئی دل میں ترے تشریف فرمانے میں دھوم	....
	باغ میں مچتی ہے جیسے فصلِ گل آنے میں دھوم	باغ میں مچتی ہے گل کی فصل کے آنے میں دھوم
〃	تیری آنکھوں نے نشہ میں اس طرح مارا ہے جوش	تیری آنکھوں میں نشے نے اس ....
	ڈالتے ہیں جس طرح بدمست میخانے میں دھوم	....

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۲۹	چاند کے پرتو سے جوں پانی میں ہو جادہ کا حشر	. . . . جلوہ کا اثر
	منہ تیرے کے عکس نے ڈالی ہے پیمانے میں دھوم	. . . .
؍؍	ابر جیسے مست کو شورش میں لاوے دل کے بیچ	. . . .
	چل گئی ایک باران بالوں کے کھل جانے میں دھوم	چل گئی یک بار . . . .
؍؍	بوئے مے آتی ہے منہ سے جوں کلی سے بوئے گل	. . . . جوں کے گل سے بوئے گل
	کیوں یقیں سے جان کرتے ہو مکر جانے کی دھوم	. . . .
۳۰	عمر آخر ہے جنوں کر لوں بہاراں پھر کہاں	. . . . جنوں کر لیوے . . . . . .
	ہاتھ مت پکڑو مرا یارو ں گریباں پھر کہاں	. . . .
؍؍	چشم تر پر گر نہیں کرتا ہوا پر رحم کر	. . . .
	دے لے ساقی ہم کو مے یہ ابر باراں پھر کہاں	دے لے ساقی مجھ کو مے ابرِ باراں پھر کہاں
؍؍	یار جب پہنے جواہر کر دے اے دل جی نثار	یار جب پھرے جواہر کر ٹک اے دل جی نثار
	جل چک اے پروانے یہ رنگیں چراغاں پھر کہاں	. . . .
۳۱	سیر ہیں نے کی بہت باغ تمنا کی یقیںؔ	سیر میں کی ہے بہت باغ . . . .
	گل نہیں رکھتا ہے غیر از داغ حسرت کا چمن	. . . .
؍؍	بن چاک سینہ بیچ محبت کی جا نہیں	بے چاک . . . .
	جس گھر کا در کھلا نہیں اس میں ہوا نہیں	. . . .
؍؍	کعبہ بھی میں گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق	کعبہ بھی ہم گئے نہ گیا . . . .
	اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں	. . . .
؍؍	ہیں سو سو التفات تغافل میں یار کے	. . . .
	بیگانگی سے اس کے کوئی آشنا نہیں	. . . . اُس کی کوئی . . . . . .
؍؍	الفت میں کس امید سے کیجے دماغ صرف	الفت میں کس امید پہ . . . .
	ان گلرخوں کی خاک میں بوئے وفا نہیں	ان گل رخوں کے بیچ میں . . . .
؍؍	شیریں دہن بھی تلخ لگے بولنے یقیںؔ	شیریں دہنا پہ تلخ لگے ہے یقیںؔ کتیں
	اب چھوڑ دے نظارہ کچھ اس میں مزا نہیں	اب چھوڑ اے نظارہ* . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۳۱	دردبن ہم کو کچھ اس آگ سے مقصود نہیں	.... لاگ ....
	عشق پھیکا ہے اگر زخم نمک سود نہیں	.... اگر داغ ....
۰	بت پرستی میں موحد نہ سنا ہوگا کبھو	.... ہوگا کہیں
	کوئی تجھ بن میرا واللہ کہ معبود نہیں	....
۳۲	کوئی شتاب خبر لوکہ بے نمک ہے بہار	کوئی شتاب خبر لو کہ بے خبر ہے یار
	چمن کے بیچ دیوانوں کا اب کے شور نہیں	....
۰	تونے ہم پر جو جفا کی ہے سو مذکور نہیں	....
	تس پہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں	تس پہ جو ہم نے وفا ....
۰	تابداں ہو نہ اگر گھر میں تو اندھیرا ہے وہ گھر	تابداں ہو نہ اگر گھر میں تو اندھارا ہے
	ہے وہ ظلمت کدہ جس سینہ میں ناسور نہیں	وہ ہے ظلمت کدہ ....
۳۳	تیغ میں آج بتاں کا کوئی دمساز نہیں	تیغ بن آج ....
	یہ خدا کا ہے غضب دلبری و ناز نہیں	....
۰	ہم گئے کام سے مرغانِ چمن سے کہیو	.... مرغانِ چمن کو کہیو
	فرض کیجئے کہ چھٹے طاقت پرواز نہیں	فیض کیجئے ....
۰	تیری تصویر کوئی کیونکہ رکھے تیری جگہ	.... رکھے تیرے بن
	کار استاد ہے پر حسن خدا داد نہیں	....
۰	خوش ہو کب نالۂ عشاق سے خوباں کا دماغ	کب ہو خوش نالۂ عاشق کے سے خوباں کا دماغ
	رگِ بسمل کی صدا تار کی آواز نہیں	ایک بسمل کی سدا تار کی آواز نہیں
۰	گل میں یار کی دل بھول جا پڑا تھا یقیں	گلی میں عشق کی دل بھول جو پڑا تھا یقیں
	پھر ان دنوں سے دیوانہ کا کچھ سراغ نہیں	....
۰	یہ ناخوشی سے بتاں کا مجھے خیال نہیں	....
	مزاج دل کا مرے ان دنوں بحال نہیں	.... مرا ....
۳۴	بلائے عقل سے کچھ چھوٹنے کی راہ نہیں	بلائے عشق سے ....
۰	بغیر میکدہ یاروں کہیں پناہ نہیں	....

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۳۴	خجل نہ کر مجھے مہماں نہ ہو مرا اے عشق	نہ کر خجل مجھے مہماں میرا ہو اے عشق
	کہ میرے آنکھ میں آنسو جگر میں آہ نہیں	. . . .
،،	جہاں کے بیچ کہیں آبرو نہیں اُس کو	بتاں کے بیچ کیوں آبرو . . . . . .
	یقیںؔ جو حضرت خوباں کا خاک راہ نہیں	. . . .
،،	مجھ کو اب سیر و تماشا سے شناسائی نہیں	. . . .
	تجھ بن اے نورِ بصر کچھ مجھ میں بینائی نہیں	. . . . . . کچھ مجھ کو . . . . . .
۳۵	کم نہیں ہم بوجھتے کعبہ سے میخانے کے تئیں	. . . . بتخانے . . . .
	سجدہ ہم کرتے ہیں جوں محراب پیمانے کے تئیں	. . . .
،،	ہے یہ دل ناصح بتاں کا جلوہ گاہ اس سے نہ بول	. . . . اسے نہ بھول
	توڑ مت سنگِ جفا سے اس پری خانے کے تئیں	. . . .
،،	لایئے مے کرتی ہے تعمیر دلہائے خراب	لایئے مے کرتی ہے کیا تعمیر دلہائے خراب
	تا ابد رکھیو خدا معمور میخانے کے تئیں	. . . .
،،	اٹھ گیا کہتے ہیں دیوانہ یقیںؔ دنیا سے ہائے	. . . . عالم سے ہائے
	ان نے کیا آباد کر رکھا تھا ویرانے کے تئیں	. . . .
،،	کروں کیونکر میں قیدِ زلف سے چھٹنے کی تدبیریں	کروں میں کیونکہ قید . . . .
	پڑی ہیں میری ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں	پڑی یوں ہیں میری انگشت میں یوں شانہ زنجیریں
۳۶	یقیںؔ اقبال ہاتھ آتا نہیں کچھ جی کے دینے سے	. . . . کچھ جی کے جانے سے
	نہیں ہونے کے ہم فرہاد گر سو بار سر چیریں	. . . .
،،	مارے ہیں بتاں ٹھوکر گر پاؤں پہ سر رکھیے	ماریں ہیں . . . .
	ہیں بندگیاں ان کے آئیں میں تقصیریں	. . . . آئیں میں یہ تقصیریں
،،	اس عشق کے کشور میں یکساں ہے حق و باطل	. . . .
	پرویز کو دیں افسر فرہاد کا سر چیریں	پرویز کو دے افسر . . . .
،،	ناداں ہیں جو معنی چھوڑ، صورت کی طرف جائیں	ناداں ہے . . . . جاوے
	لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں	. . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۳۶	نہ گزرا ہوگا کوئی مجھ سا رنگیں بانکے پن میں	نہ گزرا ہوگا رنگیں مجھ سا کوئی بانوے پن میں
	گریباں آپڑا ہے پھٹ کے گل کی طرح دامن میں	. . . .
،،	پڑی کہتی تھی یوں بلبل بہار آوے بہار آوے	پڑی کہتی تھی بلبل تو . . . .
	پڑا چین اب لگی جب رنگِ گل سے آگ گلشن میں	. . . .
،،	کوئی رستم ہو عاشق دم نہ مارے یار کے آگے	. . . . آگو
	کہ اس کا جی نکل جاوے گا اس کی ایک تنکھن میں	. . . . ایک نہیں گن (؟) میں
،،	کوئی گل چہرہ خوش آہنگ اس گلشن سے گزرا ہے	. . . . گلشن میں گزرا ہے
	کہ اور ہی دھن ہے مرغانِ چمن کی آج شیون میں	. . . .
۳۷	نہیں رخصت کر اب اے باغباں گو بیوفائی ہے	. . . .
	خزاں سے جی نہیں لگتا ہمارا اس گلستاں میں	خزاں میں جی . . . .
،،	چمن کے بیچ کھلیاتی ہے جیسے شاخ سنبل کی	. . . . کلہاتی . . . .
	ہوئے ہیں اس قدر دل جمع اس زلفِ پریشاں میں	. . . . . . کس قدر . . . .
،،	جنوں کرنے سے کب تک سر نہ میرا گرم ہو ناصح	. . . . کب تک سینہ میرا . . . . . .
	لگی ہے آگ رنگِ لالہ سے کوہ و بیاباں میں	. . . . لالہ سے گویا بیاباں میں
،،	لڑکے کھڑے ہیں غمگیں پتھرے پڑے ہیں بیکس	. . . . پتھر . . . .
	دیوانہ ہائے جب سے جاتا رہا ہے بن میں	. . . .
،،	مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو	. . . . داغ مجھ کوں
	کیا عیش کر گیا ہے ظالم دیوانہ پن میں	. . . .
،،	اس داغ دار دل کو گاڑو نہ ساتھ میرے	. . . .
	ڈرتا ہوں مت لگے اٹھ آتش میرے کفن میں	ڈرتا ہوں لگ اوٹھے مت آتش . . . . .
،،	اٹھا اس منہ سے اے بادِ صبا گھونگٹ کے آنچل کو	. . . .
	تو جس سے تیری ہم بھی ٹک ایک یہ گلستاں دیکھیں	. . . . ٹک اب تو گلستاں . . . .
،،	سہرا دیکھنے راہ میں اس کی کیا ہے چشم کو گریاں	ہر اکسنے اوس کی فرمائش کیا . . . .
	کرے کس دن جو پر رحم وہ سرو رواں دیکھیں	. . . . وہ آب رواں . . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۳۷	پکاریں اُن کو آؤ اپنے باغوں کی خبر پوچھیں	.... آؤ باغ کی اپنے خبر .....
	اسی گلشن سے آتی ہیں چلی یہ بلبلاں دیکھیں	.... سے آتی ہوں کبھو یہ ......
۳۸	گالی بھی پی گئے ہیں ماریں بھی کھائیاں ہیں	گالی بھی سن لی ہیں ....
	ہم نے تری جفائیں کیا کیا اٹھائیاں ہیں	کیا کیا تیری جفائیں ہم نے اٹھائیاں ہیں
〃	خسرو کے منہ پہ چڑھنا اور بیستوں سے بھڑنا	....
	کچھ عاشقی نہیں یہ زور آزمائیاں ہیں	...... نہیں ہے زور ....
〃	ہم تو چلے ہیں یارب آباد رکھیو ان کو	ہم تو چلے پہ یارب ....
	ان باغوں میں کیا کیا دھومیں مچائیاں ہیں	....
〃	ایسا دراز دامن نہیں ہاتھ ان کے آتا	ویسا ....
	بختوں میں عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں	....
〃	حق کو یقیںؔ کے یاروں پر بربادمت دو آخر	....
	تم نے سخن کی طرز میں اس سے اڑائیاں ہیں	.... طرز پہ اوس کی ....
〃	مئے گلرنگ جوں شیشے سے جھلکے معنی شوخ	.... شیشہ سیں چھلکے ......
	نمایاں تیری صورت سے ہے صورت اس کو کہتے ہیں	نمایاں ہے تیری صورت سے صورت ....
〃	چمن میں شاخ ہل جاتی ہے جیسے گل کے کھلنے سے	.... شاخ مل جاتی ....
	لہک جاتا ہے دم لیتے نزاکت اس کو کہتے ہیں	....
〃	یقیںؔ اس تیری بدخوابی کا یہ نظارہ باعث ہے	.... بے خوابی ....
	سبھوں سے مونچ کے آنکھیں کہ راحت اس کو کہتے ہیں	.... مونچ لے آنکھ راحت .....
۳۹	مرے گر بال و پر ٹوٹے قفس میں کیا ہوا لیکن	....
	گیا وہ ذوق سیر گل خسارت اس کو کہتے ہیں	.... خسارت ....
〃	نہیں ہوں منکرے اہل میخانے سے کہہ دیکھو	....
	نہیں کی جی سے میں نے تو یہ پیمانے سے کہہ دیکھو	.... سے ہم نے ....
〃	کیا سجدہ یقیںؔ نے دیکھ اس محراب ابرو کو	....
	برہمن تو رہا مسجد میں بت خانے سے کہہ دیکھو	.... رہا سجدے میں ......

	مطبوعہ دیوان	بیاض
۴۰	کہا جاتا نہیں کچھ مجھ سے جو تو کہہ سکے کہیو	. . . .
	میری اس بے زبانی پر نظر اے نامہ بر کیجو	میری اس سخت جانی پر . . . .
،	خون انصاف سے اتنی بھی زباں تر نہ کرو	. . . . اتنا بھی . . . .
	لعل کو یار کے ہونٹوں کے برابر نہ کرو	. . . . . ہونٹوں سے برابر . . . . .
۴۱	جی نکل جائے گا عشاق کا بلبل کی طرح	جی نکل جاوے گا بلبل کی طرح عاشق کا
	گل رخاں جامۂ رنگیں کو معطر نہ کرو	. . . .
،	گرہ کھولو نہ زلف یار کی شانے کو مت چھوڑو	. . . .
	چھومت دل کی زنجیر ایسے دیوانے کو مت چھیڑو	. . . . . زنجیروں سے . . . . . .
،	کوئی ترک ادب کرتا ہے معبودوں کی خدمت میں	. . . .
	مسلمانوں خدا سے ڈر کے بت خانے کو مت چھیڑو	. . . . خدا کے ڈر سے . . . .
،	ابھی جاتا ہے جل ایک دم تو جینے دو بچارے کو	. . . .
	ٹک ایک روشن کرو مت شمع پروانے کو مت چھیڑ	. . . . کرو تم شمع . . . .
،	محبت کا مزا بگڑا نہیں گر اس زمانہ میں	. . . . . مزا کڑوا نہیں . . . .
	جواب تلخ کیوں دیتے ہواے شیریں دہن مجھ کو	. . . . دیتے ہو یہ شیریں . . . . .
،	نہیں کھلتا ہے تجھ بن غنچۂ دل سیر گلشن سے	. . . . سیر گلستاں میں
	خس و خاشاک سے لگتے ہیں یہ سرو و سمن مجھ کو	. . . .
،	کوئی مجھ سے نہ بولو میں تو اب مرنے کو بیٹھا ہوں	کوئی مجھ سے نہ بولو مستعد مرنے کے بیٹھا ہوں
	خلافت دے گیا ہے خودکشی کی کوہکن مجھ کو	خلافت خودکشی کی دے گیا ہے کوہکن مجھ کو
۴۲	یہ آرزو ہے مجھے دورِ چرخ سے پسِ مرگ	. . . .
	کہ میری خاک خُمِ مے و جامِ صہبا ہو	. . . . . خُم مے ہو جام صہبا ہو
،	لہو یقیں کا جو پیتا ہے تو میں ڈرتا ہوں	. . . . میں روتا ہوں
	خدا کرے کہ تجھے یہ غذا گوارا ہو	. . . . یہ دوا . . . .
،	شہر میں تھا نہ ترے حسن کا یہ شور کبھو	. . . . حسن کا سا شور کبھو
	مصر اس جنس سے اتنا نہ تھا معمور کبھو	. . . . سے رہتا نہ تھا . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۴۲	عشق میں داد نہ چاہو کہ سنا ہم نے نہیں	. . . .
	عدل و انصاف کا اس ملک میں دستور کبھو	. . . . شہر میں . . . . . .
،،	فکر مرہم کا میرے واسطے مت کر ناصح	. . . . مت کرنا صنم
	خوب ہونا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو	. . . . اس زخم کا ناسور کبھو
،،	خنک گزرتے ہیں ایامِ عشق داغ بغیر	. . . . ایامِ عشق کے جو بغیر
	کہ سرد ہووے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو	. . . .
،،	دیوانے شہر سے یہاں آکے چین پاتے ہیں	. . . .
	خدا کرے یہ خرابہ کبھو خراب نہ ہو	. . . . یہ خرابات کہیں خراب . . . .
،،	یقیں بتوں کا ہوا بندہ جب سے ہے پُر داغ	یقیں بتاں کا ہوا بندہ تب سے ہے دل داغ
	جو ہووے کافر اسے کس طرح عذاب نہ ہو	. . . .
۴۳	اس رخِ تاباں کے ایدھر ادھر زُلف کے سر	. . . . مو ہائے سبز
	جوں سنہری آئینہ کے گرد تحریرِ سیاہ	. . . . تحریریں سیاہ
،،	ہو رہا ہے دل مرا بے ربط منصوبوں میں بند	ہو رہا ہے دل ہمارا اب تو اس مضموں میں بند
	جس طرح شطرنج کے پیادوں میں گھر جاتا ہے شاہ	. . . .
،،	عشق کے بھی کارخانے کی الٹ دیکھ لی	عشق کے بیکارخانہ کی . . . .
	بوالہوس جیویں مریں ہم اسے محبت واہ واہ	. . . .
،،	کر دیا آنکھوں کے رونے نے مرے دل کو خنک	. . . .
	کب تلک گرمی کروں اس مردمِ آبی کے ساتھ	. . . . ان مردم . . . . . .
،،	غنچۂ رنگینی کو اپنی چاہیئے تہ کر رکھے	. . . . تہ کر رکھے
	اس کو کیا نسبت ہے اُن لب ہائے عنابی کے ساتھ	. . . .
۴۴	پونچھتے اس منہ کے ہو جاتا ہے سب رنگیں رومال	. . . .
	گل کہاں ہوتا ہے ایسے رنگ و شادابی کے ساتھ	. . . . رنگِ شادابی . . . . .
،،	کہاں تاثیر ہے نالے میں اے مرغِ قفس چپ رہ	. . . . نالوں میں . . . .
	عبث صیاد کو ناخوش کبھی کیوں کرتا ہے بس چپ رہ	. . . . ناخوش ہی کیوں . . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۴۴	کوئی آوارگی کو چھوڑ کیونکر راہ پر آوے	کوئی آزادگی کو چھوڑ کر کیوں راہ . . . . .
〃	عبث تو شور و شر کرتا ہے اتنا اے جرس چپ رہ	عبث تو شور کیوں کرتا ہے . . . .
〃	گیا ہوگا نہ تو کیا یار کی گلیوں میں راتوں کو	. . . .
	نئی تقصیر میں نے ہی نہیں کی اے عسس چپ رہ	کوئی تقصیر . . . .
〃	یقیں یہ نالہ تیرا کیا بلا لاوے گا ڈرتا ہوں	. . . .
	لگا مت گھر کو اپنے آگ اے آتش نفس چپ رہ	لگا مت آگ اپنے گھر کو اے . . . .
۴۵	عمر میں تو نے تو دیکھے ہیں بہت غم خلنے	عمر میں دیکھے ہیں تو نے تو بہت غم خلنے
	آتو اے چرخ فلک اک اس دلِ ناشاد کو دیکھ	. . . .
〃	دل داغِ محبت بن کچھ کام نہیں آتا	. . . . نہیں ہیگا
	ہے جوں ورقِ باطل بے مہر یہ پروانہ	. . . .
〃	منہ پھیر نہ نالہ سے آنسو سے نہ موڑ آنکھیں	شورش میں نہ لا دل کو آنسو سے نہ پونچھ آنکھیں
	اتنا بھی یقیں مت ہو، اپنوں سنی بیگانہ	. . . .
۴۶	بہار آئی ہے کیا کیا چاک جیب پیرہن کرتے	. . . . ہے کیا چاک . . . .
	جو ہم بھی چھوٹ جاتے اب تو کیا دیوانہ پن کرتے	جواب ہم جیتے ہوتے بھی کیا . . . .
〃	تصور اس دہانِ تنگ کا رخصت نہیں دیتا	. . . .
	جو ٹک دم مار سکتے ہم تو کچھ فکرِ سخن کرتے	جو ٹک دم مار بھی سکتے تو کچھ فکر سخن کرتے
〃	نہیں جوں پنجۂ گل کچھ بھی ان ہاتھوں میں گیرائی	. . . . ہاتھوں سے گیرائی
	وگرنہ یہ گریباں نذرِ خوبانِ چمن کرتے	. . . .
۴۷	ارے صیاد اس بیداد پر بیداد کیا کیجے	ارے صیاد سن بیداد . . . .
	شکارِ ناتواں مجھ سے کے تئیں آزاد کیا کیجے	. . . .
〃	ٹلا گر بیستوں تو کیا ہوا خسرو نہیں ٹلتا	ٹلا جو بیستوں . . . .
	بڑا پتھر ہے چھاتی پر ترے فرہاد کیا کیجے	. . . .
〃	جفا پر دلبروں کے صبر کرنا ہی مناسب ہے	. . . .
	یقیں دعویٰ وفا کا کرکے اب فریاد کیا کیجے	. . . . کا کر کر اب

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۴۸	اُس بسنتی پوش سے آغوشِ رنگیں کیجیے	اس بسنتی پوش سوں . . . .
	جی میں ہے اس مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجیے	. . . .
〃	عشق میں راحت نہیں ملتی مگر جوں کوہکن	عشق میں ملتی نہیں راحت مگر جو کوہکن
	جانِ شیریں دیجیے تب خوابِ شیریں کیجیے	. . . .
〃	یوں دیا خوباں کی خاطر خانماں اپنا بہا	. . . .
	ایسی آنکھوں پر یقیںؔ کیونکر نہ تحسین کیجیے	ایسی آنکھوں کی یقیںؔ . . . . . .
۴۹	حیا و شرم سے کیوں کر کوئی حذر نہ کرے	. . . . . . سے کب تک کوئی . . . . .
	ادب سے تجھ پہ کوئی کب تلک نظر نہ کرے	. . . . . . کوئی جب تلک نظر . . .
〃	جو یار غیر کے ساتھ اس طرف سے ہو گزرے	. . . .
	خدا کے واسطے کوئی مجھے خبر نہ کرے	خدا کے واسطے مجھ کو کوئی خبر . . . .
〃	رقیب غالب و دیوانہ دل غیور یقیںؔ	. . . .
	گلی سے یار کی کیونکر کوئی حذر نہ کرے	. . . . سفر نہ کرے
۵۰	ناصحوں یہ بھی کچھ نصیحت ہے	ناصحا یہ . . . .
	کہ یقیںؔ یار سے وفا نہ کرے	. . . .
〃	یار گر منظور ہے دنیا و عقبیٰ سے گزر	. . . .
	منزلِ مقصود ہے دونوں جہانوں سے پرے	. . . . جہانوں کے پرے
〃	اس طرح رونے میں آنکھوں کا خدا حافظ یقیںؔ	. . . .
	دیکھیے یہ خانماں اس رَو میں ڈوبے یا ترے	. . . . اس سال ڈوبے . . . . .
〃	ترا خورشید سامنہ دیکھ کر سپہروں کی جاں لرزے	. . . .
	ترے قد کی نزاکت دیکھ سروِ گلستاں لرزے	ترا قد جو کہ یاد آوے تو سروِ گلستاں لرزے
〃	ترے خیمے ہی بادِ تند کے چلنے سے ہلتے ہیں	ترے خیمیں بھی بادِ . . . .
	مرا نالہ اگر شوخی پہ آوے آسماں لرزے	. . . .
〃	نگہ چبھتی ہے دل کی بھوں سترکنے میں کرامت ہے	نگہ چبھتی ہے ایسی اب سبھرکنے میں . . . . . .
	وگرنہ تیر لگتا ہے پریشاں گر کماں لرزے	. . . . . . پریشاں جو کماں . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۵۰	وہ بلبل کیونکہ ہووے خار و خس سے مختلط جس کا	...... خس سے بے خطر جس کا
	نسیم گل سے مارے نازکی کے آشیاں لرزے	....
″	نہیں کچھ بات سکتی شمع پروانے کے ماتم میں	....
	یقیں برجا ہے رونے میں کسو کی گر زباں لرزے	. . . کسو کی جو زباں . . .
۵۱	نہ بیٹھا کوہکن کا نقش کچھ اس رنج و محنت سے	نہ مٹتا کوہکن ....
	اٹھا سکتا نہیں تیشہ سر اپنا اس خجالت سے	....
″	دل روشن پہ تجھی کب لگتی ہے ظلمت نظارہ کی	. . تپش لگتی ہے کب ظلمت . . . . .
	صفا میں آئینہ کے کب خلل آتا ہے صورت سے	....
″	شراب تلخ کی لذت کو پوچھو مے پرستوں سے	....
	کوئی نعمت گوارا تر نہیں ہم کو مصیبت سے	گوارا تر نہیں ہم کو کوئی نعمت مصیبت میں
۵۲	رکھا تھا ایک دن وہ پائے رنگیں میری چھاتی پر	. . . . ایک دم وہ . . . . . .
	سو اب تک بوئے گل آتی ہے اس چاک گریباں سے	....
″	بتوں کی سیج نے دیوانہ کیا ہے ہم کو محشر میں	....
	گریباں کا ہم اپنے خون لیں گے ان کے داماں سے	. . . . اس کے داماں . . .
″	ہمیں رخصت نہ ہو گھنگرو بتوں کے پاؤں کوچہ میں	. . . ہو کیونکر بتوں . . . . . .
	یقیں یہ لوگ کیا ڈرتے نہیں دل ہائے نالاں سے	....
″	ٹک ایک تو رحم کر اب مر گئے ہے کی تمنا میں	ٹک آ کر رحم کر اب . . . .
	ہماری خاک پر روتے ہیں یہ ابر و ہوا ساقی	ہماری جان کو روتے . . . .
″	نہیں ہے جام مے بن کچھ ہمارا خوں بہا ساقی	....
	اس آب زندگی سے اپنے ماروں کو جلا ساقی	. . . . اپنے مردوں کو . . . . .
″	بتاں اپنی جفا سیتی نہ گزریں ہم وفا سیتی	. . . نہ گزرے ہم . . . . .
	یقیں ہم جان و دل سے معتقد ہیں اپنی ہمت کے	....
۵۳	پریشاں خاک سے اگتا ہے سنبل اس سے ظاہر ہے	....
	کھلے ہیں موئے لیلیٰ اب تلک ماتم میں مجنوں کے	کھلے ہیں اب تلک لیلیٰ کے مو ماتم . . . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۵۳	ہمیں مارِ سیاہ و زلف کے کاٹے سے کیا ہووے	. . . .
	کہ ہم ایک عمر سے عادی ہیں خالِ لب کی افیوں کے	. . . . عمر سے خادم ہیں . . . .
〃	نہیں ہے باغ سے کچھ کام جز شمشاد و سروِ ان کو	. . . . سرو اس کو
	سو جو لے ہیں یقیں ہم قمریوں کے طبع موزوں کے	. . . .
〃	کہاں سکتے ہیں چڑھ منہ پر بتانِ ناز و تمکیں کے	. . . . . . بتاں کی ناز . . . .
	کہ ہیں ہم صبر کے بے چرخ مفلس ہیں دل و دیں کے	. . . . بے چرخ و مفلس . . . .
〃	بتوں کی بادشاہی کے سپہ سالار عاشق ہیں	بتاں کی . . . .
	بٹھائے کوہکن نے بیستوں میں نقش شیریں کے	. . . .
〃	ہمارا دل ہوا ہے خوں ترِ دامن کی ٹھوکر سے	. . . . پر دامن . . . . . .
	گریباں گیر ہم ہوویں گے اس دامانِ رنگیں کے	. . . .
۵۴	خبر کیا پوچھئے مرغِ چمن سے آشیانے کی	. . . .
	اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی	. . . . ہے اب گلشن . . . . . .
〃	یہ لذت جس نے اپنے یار سے پائی ہے سو جانے	یہ لذت جنے . . . . . . پائی ہو . . . .
	نشہ میں گالیاں کھانے کی اور پیالا پلانے کی	. . . .
〃	بھلکتا ہے اس آب و تاب سے مستی میں پاؤں اس کا	چھلکتا ہے . . . . میں پاؤں کا
	ڈھلک جس طرح ہوتی ہے یقیں موتی کے دانے کی	. . . .
〃	اکیلا کیونکہ لگتا بیستوں میں دل بچارے کا	. . . . جی بچارے کا
	نہ ہوتا نقش شیریں کا اگر فرہاد کے آگے	. . . .
〃	یقیں اس قد کے آگے اس طرح سے سرو رسوا ہے	. . . .
	درختانِ بیابانی ہیں جوں شمشاد کے آگے	درختانِ بیابانی جیسے شمشاد . . . . .
۵۵	گلی تیری اگر پاوے تو بلبل گلستاں بھولے	اگر پاوے گلی تیری کو بلبل گلستاں بھولے
	ترا نقشِ قدم دیکھے تو اپنا آشیاں بھولے	میرا نقشِ قدم . . . .
〃	تو ایسا آدمی ہیگا کہ تجھ کو گر پری دیکھے	. . . . کہ گر تجھ کو پری . . . . .
	سمجھ کر صورت و معنی کو اپنا جسم و جاں بھولے	سمجھ کر صورت وحشی کو اپنا . . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
٥٥	تو لڑکا تھا سجن جب سے یقیں کو تیری آنکھوں کی	. . . تب سے . . . تیری انکھیاں سے
	سیاہی اور سپیدی دیکھ کر پیر و جواں بھولے	سیاہی اور سفیدی . . . .
〃	ہمیں ہجر چمن ہے موت پر صیاد کیا جانے	مجھے ہجر . . . .
	جو گزرے سر پہ مقتولوں کے وہ جلاد کیا جانے	. . . . . سو جلاد . . . . .
٥٦	خطا ہے مفت مرکر یار کو دنیا رقیبوں کو	. . . . یار کو دیجئے رقیبوں کو
	ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے	. . . .
〃	مزا پاتے ہیں ہکلانے میں اس کے اور مت پوچھو	. . . . ہکلانے سے اس . .
	چٹکنے کی لبوں کے وجہ وہ شیریں دہن جانے	. . . .
〃	نہ آیا کام شام غم ہمارے کے اثر تیرا	. . . .
	تری تقصیر کیا کی تھی ارے آہ سحر ہم نے	تری تقصیر کہہ کیا تھی اے . . . .
〃	گلی میں دلربا کے چل یقیں ڈھونڈیں دل اپنے کو	گلی میں دلبروں کی چل . . . . . .
	کہ مدت سے نہیں لی اس دیوانے کی خبر ہم نے	. . . .
٥٧	اگر دعویٰ نہ کرتا عشق کا بدنام کیوں ہوتا	. . . .
	زبانوں میں مجھے عالم کے ڈالا ہے زباں تو نے	. . . . ڈالا اے زباں . . . .
〃	بگولا بھی ہماری خاک سے اب اٹھ نہیں سکتا	بگولا بھی ہماری خاک ستی اٹھ نہیں سکتا
	ہمیں یوں کر دیا پامال اے سرو رواں تو نے	. . . .
٥٩	اگر دینی ہو دل کی داد جتنا اس کا جی چاہے	اگر دیتی ہو . . . .
	تو کرلے وہ اسے فریاد جتنا اس کا جی چاہے	. . . .
〃	ملی ہیں یار کی گلیاں ہمیں مجنوں سے یہ کہیو	. . . . . مجنوں سے کہہ دیجو
	کرے ویرانہ کو آباد جتنا اس کا جی چاہے	. . . .
〃	یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے	. . . .
	کون اس کوچہ میں جز تیر گزر کرتا ہے	. . . . میں بن تیرے گزر . . . .
〃	یار کی بات ہمیں کون سناتا ہے یقیں	. . . .
	کون کب گل کی دیوانوں کو خبر کرتا ہے	کون کب کوئی گل کے دیوانے کو . . . .

	مطبوعہ دیوان	بیاض
	اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے	. . . .
	زرا بُرا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے	مزا بُرا . . . .
	یقیں کا شور جنوں سن کے یار نے پوچھا	. . . .
	کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے	. . . . . . مجنوں سے کیا . . . .
۶۱	کرتے ہیں اپنے حال دکھا مبتلا مجھے	. . . .
	اس پیچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے	اس پیچ سے بتاں کے نکال اے خدا مجھے
″	جور وجفا میں یار بہت ہوگیا دلیر	جور وجفا پہ یار . . . .
	کرتے تو کی پہ راس نہ آئی وفا مجھے	. . . . پہ راست نہ آئی . . . . .
″	میں گر رہا ہوں یار کے قدموں اوپر یقیں	. . . . کے پاؤں اوپر . . . .
	آئی ہے راس سایۂ گل کی ہوا مجھے	آئی ہے راست سایہ . . . .
″	عشق تیرے سے لگا دے نہ خدا عار مجھے	عشق تیرے میں لگا دے . . . .
	نہ کرے دام رہائی میں گرفتار مجھے	. . . .
″	جب سے نظارہ کیا ترک ہوا ہوں دل سرد	. . . .
	گرم رکھتا تھا یقیں شعلۂ دیدار مجھے	گرم رکھتا ہے یقیں . . . .
۶۲	کب ہوس ہے مجھ کو رسوائی کی لیکن کیا کروں	. . . .
	کھینچ کر لاتی ہے اس کوچہ میں لاچاری مجھے[1]	. . . . ناچاری مجھے
″	دکھ تو دیتا ہے کروں میں تجھ کو حیراں تو سہی	. . . .
	باغباں اب کے اجاڑے تو گلستاں تو سہی	. . . . اجاڑے لیوں (؟) تو سہی
″	ابر میں دیتا نہیں تو مجھ کو اے ساقی شراب	ابر موں ساقی تو کیوں دیتا نہیں مجکو شراب
	میں کروں شیشہ کو تیرے سنگِ باراں تو سہی	. . . . . . شیشے کو . . . .

---

[1] اس شعر کے بعد مطبوعہ دیوان میں مندرجہ ذیل شعر درج ہے

میں جو بن غمخوار ہرگز جی نہ سکتا تھا کبھو
اِن دنوں کرنی پڑی ہے دل کی غمخواری مجھے

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۶۲	اب تو ناصح کے تئیں سینے دو میرا چاک جیب	اب ناصح کو تو سینے دیو دو میرا . . . .
	تار تار اس ضد سے کر دوں میں گریباں تو سہی	. . . . . . سے کر ڈالوں میں . . . .
〃	لوگ کب خاطر میں لاتے ہیں میرے دیوانہ کو	لوگ دیوانوں کو کب خاطر میں لاتے ہیں جو ہائے
	اشک خوں سے باغ کر ڈالوں بیاباں تو سہی	. . . .
〃	اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقیںؔ	. . . . جلا کر داغ دینے میں یقیںؔ
	ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی	. . . .
۶۳	حرم کو چھوڑ دل بے طرح بت خانہ پہ چلتا ہے	. . . .
	توقع یار رکھنے کی نہیں اس کو خدا رکھے	توقع یار کے رہنے کی نہیں اس کو . . . . . .
〃	یقیںؔ جاتا رہا گر بلبلوں کے ساتھ جانے دو	. . . . جانے دے
	کوئی اس بے مروت دل کو اپنے پاس کیا رکھے	. . . .
〃	ٹک ایک انصاف کر اتنی بھی کرتا ہے جفا کوئی	. . . . کر اتنا بھی . . . . . .
	کرے گا بعد میرے کس توقع پر وفا کوئی	. . . .
〃	گل و لالہ سے شور انگیز تر ہے گی حیا تیری	. . . .
	نہ ہو دیوانہ کیونکر دیکھ تیرے دست و پا کوئی	نہ ہو کیونکر دیوانہ دیکھ . . . .
〃	عجب سج سے کیا ہے قتل مجھ کو اس کو مت ٹوکو	. . . . مت لوگو
	طلب کرتا ہے ایسے قاتلوں سے خوں بہا کوئی	. . . .
〃	گزر جا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا اس کی	. . . . رضا تیری
	محبت میں یقیںؔ لیتا ہے نام مدعا کوئی	. . . .
۶۴	اگر اس کی جگہ پہلو میں ہوتا خار بہتر تھا	اگر اس کی جگہ بوٹوں (؟) میں تو خار . .
	بہت دیتا ہے میرا دل مجھے آزار کیا کہیے	. . . .
〃	جلا کر آشیاں اس فصل گل میں باغباں میرا	. . . . . اس فصل میں نے باغباں میرا
	جہنم تو نے مجھ پر کر دیا گلزار کیا کہیے	. . . .
〃	یقیںؔ کے واقعہ کی سن خبر وہ بدگماں بولا	. . . .

صفحہ	مطبوعہ دیوان	بیاض
۶۴	زنجیر میں بالوں کی پھنس جانے کو کیا کہیئے	زنجیر میں پاؤں کی . . . .
	کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیئے	. . . .
"	عاشق جو رہے جیتا معشوق کے کام آوے	. . . .
	کیا لطف ہے جل جانا پروانے کو کیا کہیئے	. . . . ہے مرجانا . . . . . .
"	تحقیق کو ظالم نے ٹک کام نہ فرمایا	. . . ظالم نے کچھ کام . . . .
	فرہاد کے اس ناحق مرجانے کو کیا کہیئے	. . . .
"	صحرا میں بقیں آ ہو کیا حور سے پھرتے ہیں	سبزے ہیں یقیں آ ہو کیا تہور سے پھرتے ہیں
	فردوس نہ کہیئے تو ویرانے کو کیا کہیئے	. . . .

ایک عظیم الشان علمی کارنامہ

قاموس الکتب

کتابوں سے متعلق یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلی جلد جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے۔ شائع ہو چکی ہے۔ یہ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مکمل فہرست ہے جس میں تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق بنیادی معلومات دی گئی ہیں۔

یہ کتاب ۲۰×۲۲ تقطیع کے چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے ۱۶۲ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

قیمت :۔ چالیس روپے

[illegible]

محمد حسین آزاد

ڈاکٹر اسلم فرخی

یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو کراچی یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں مولانا آزاد کی زندگی اور ادبی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔

قیمت جلد اول۔ آٹھ روپے

قیمت جلد دوم۔ پندرہ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

سس بش جس

(۳)

سیّد وصی احمد بلگرامی

میرے آگے غیر سے اس طرح یارانے کی بات
واقعی ہے اے ستمگر یہ تو مرجانے کی بات

واقعی ہے اے محبت آگ ہو جانے کی بات
کیوں نکالی ان کے گھر میں میرے ویرانے کی بات

جب کہا حیرت ہے۔ میں تم پر فدا۔ تم غیر پر
ہنس کے بولے۔ اپنے اپنے دل کے آجانے کی بات

میرے منہ سے اور شکوہ آپ کا،۔ اچھی کہی
کیا خیال آیا یہ ہے صاحب کے فرمانے کی بات

ایک بھی منہ سے نہ پھوٹا۔ ہو گئے پتھر یہ بت
زاہدو، تم کو سناؤں کیا میں بت خانے کی بات

شب کو ایسا ارتباط۔ اور صبح ایسی احتیاط
اے صنم سچ ہے کہ ہے یہ دل میں آجانے کی بات

اے صفیر اس سوزِ غم سے کون عاشق بچ سکے
جل بجھا کل رات۔ دیکھی تم نے پروانے کی بات

شمع و پروانہ کا ذکر خیر آ ہی گیا تو غازی پور اور الہ آباد کا ایک فسانہ بھی سن لیجئے۔ مولوی عبدالصمد شمیم غازی پوری نے ۱۲۹۱ھ میں صفیر بلگرامی کو مدعو کیا۔ صفیر بلگرامی غازی پور پہنچے اور للن نے ان کا آنا سنا تو ملنے کے لیے آئی۔ ان کو معلوم تھا کہ للن ملک الموت ہے اور سید کاظم علی مضطر الہ آباد میں موت کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ للن سامنے آئی تو دیکھتے ہی صفیر بلگرامی نے پوچھا:۔

کیا ہوئی عاشقِ مضطر کی یاد

اس کا جواب للن کی زبان اور صفیر بلگرامی کے قلم سے سنئے ؎

سن کے آنکھوں کو پھرایا اس نے
عجب انداز دکھایا اس نے
بولے اس بت کے لب شکر خند
کہا یہ کہتے ہو۔ خدا کی سوگند
جلوۂ طور صفا کی سوگند
جذبۂ اہل وفا کی سوگند
اپنی شرم اور حیا کی سوگند
ان کی مہر اور وفا کی سوگند

شوخ چشموں کے غضب کی سوگند   پیار کی نظروں کے ڈھب کی سوگند   حسن بے پردہ کی ضو کی سوگند   شمع رخسار کی لو کی سوگند
بسمل تیغ نگہ کی سوگند !   زخم کاری کی جگہ کی سوگند   غمزۂ شوخ روش کی سوگند   نظر نیم خلش کی سوگند
اپنے مژگاں کی خلش کی سوگند   دل مضطر کی طپش کی سوگند

گرم جوشوں کی محبت کی قسم   سرد مہروں کی عداوت کی قسم   سست عہدیٔ حسیناں کی قسم   حسرت گوشہ گزیناں کی قسم
شعلۂ شمع فروزاں کی قسم   عشق پروانۂ سوزاں کی قسم   سینہ کاویٔ نظارہ کی قسم   دل جانباز دوپارہ کی قسم
عشق کی بے خطر آہوں کی قسم   حسن کی نیچی نگاہوں کی قسم   خونچکاں نالۂ بلبل کی قسم   خوں فشانیٔ رگِ گل کی قسم
اپنے انجان تغافل کی قسم   ان کے سامان تحمل کی قسم   اپنے گیسوئے دل آرا کی قسم   اوسی آشفتہ و شیدا کی قسم
کہ مرے دل کا وہی عالم ہے!   جان بسمل کا وہی عالم ہے

رات دن آنکھوں میں دھیان ان کا   دھیان بھولا نہ کوئی آن ان کا   وہ نہ خط بھیجیں نہ بھیجیں پیغام   وعدہ اقرار دعا سے ہے کیا کام
زندگی اپنی کٹے تو کیوں کر؟   عمر کٹے اپنی بھلا ہو کیوں کر؟   طعن و تشنیع کہاں تک سنئے ؟   کب تک اس راہ میں تنکے چنئے :
سامنے ہے وہ دل آرا ہر دم   دھیان میں رہتی ہے وہ شاد و خرم   کہہ کے یہ بوسہ زن لب ہوئی آہ   دفعتاً اس کا ہوا حال تباہ
کھول دی اس نے کجھوری چوٹی   سانپ کی طرح زمیں پر لوٹی   ہاتھ مل مل کے چھڑائی مہندی   انگلیاں ڈس کے اڑائی مہندی
دست بوسی جو گریباں نے کی   پائے بوسی سر داماں نے کی   تا گریباں جو وہ داماں پہنچا   تا بہ دل چاک گریباں پہنچا
مجھکو وحشت ہوئی اس حالت پر   ہوگیا دیکھ کے اس کو مضطر   دوستانہ اسے سمجھانے لگا   اتنے میں غش بھی اسے آنے لگا
اس کی ایسی ہوئی حالت تغیر   کہ بنی صاف وہ غم کی تصویر   میں نے منگوا کے سواری اس دم   بھیجا گھر اس کے بصد رنج و ا
ایسے بیمار سنبھلتے ہیں کہیں ؟   بے موئے گھر سے نکلتے ہیں کہیں؟   میں نے مضطر کو روانہ کیا خط   اطلاع اس کی مناسب تھی فقط
بعد دو سال کے معلوم ہوا   کہ وہ سامان ہی معدوم ہوا   کھا گئی اس کو تمنا دل کی   جان مضطر ہوئی کشتہ دل کی
جان اس کی ہدف غم جو ہوئی   اسی آزار میں گھل گھل کے موئی   مرغ جاں اس کا فلک سیر ہوا   لیجیے — خاتمہ بالخیر :
مجھ پہ تھا حق محبت جو صفیر   حال میں نے کیا اس کا تحریر   یادگار اس کے ہیں یہ چند اشعار   بخشے اب اس کو خدائے غف

غزل

اوڑھ کے ڈسنا افعیٔ زلف دوسر کا کھیل ہے   وحشیوں کو روکنا تیری نظر کا کھیل ہے
لخت دل کا کھیل ہے اور اشک تر کا کھیل ہے   عشق کے بازار میں لعل و گہر کا کھیل ہے
کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر چلا منصور کیا   یہ تو ادنیٰ عاشق آشفتہ سر کا کھیل ہے
طبع معنی یاب بھی درکار ہے اس کو صفیر
[illegible] منہ کا کھیل

[redacted]

مرزا [illegible] حیدر مجروح عظیم آبادی نے ایک قطعہ میں شاگردان صفیر بلگرامی کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست مورخہ ۱۲۹۶ھ میں انھیں شاگردوں کو جگہ ملی تھی جن پر صفیر بلگرامی نے برسوں محنت کی تھی۔ ۲۹ شعر میں ۱۶ یہ ہیں:

میرزا احمد آنکہ صفیر　　ہست مشہور عالم ایجاد　　بلگرام اصل و آرہ مسکن او　　سالہا منزلش عظیم آباد
طوطی خوشنوائے گلشن نظم　　بلبل نغمہ سنج گلبن داد　　ہم ز پیر مائگی خزینہ کشا　　ہم ز قید غرور ہست آزاد
نامور در جہاں تلامذۂ اش　　بہرہ ور صاحبان استعداد　　مایہ دار از فیوض او شاگرد　　ہم ز تعلیم اوست شاد استاد
فیض یاب از صفیر با تمکین　　سخن احمد امیر سلطاں شاد　　مخلص و شورش اکبر و اصغر　　ہاشم و محسن خجستہ نہاد
صاف و عنقا ہما امیر اخلاص　　ہم شمیم و کلیم طور رشاد　　حسن اکھڑ حقیر و رند ظہیر　　ہم گرامی ضیائے مہر سداد
سخن اکرام قیصر و جادو　　ہم سلیم و زریر صاحب داد　　احسن و جوش و حیرت و فیاض　　ہم طبیب و متین نیک نہاد
آں صغیر و سطیر تمکین شور　　آل عنایت کبیر ہم فرہاد　　جاہ یکی غلام لائق تیز　　اصدی و حکیم و ہم ایجاد
قاصر و باقر و نزیہ بہشتر　　دانش و ہم ذکی عالی زاد　　آں نہال و جمیل و محزوں نیز　　باز مداح لائق ارشاد

ضلع شاہ آباد میں جو لوگ شاگرد ہوئے اُن سے قطع نظر کر کے باقی اور شاگردوں کا مختصر حال یہ ہے:۔

سخن خواجہ سید محمد فخر الدین حسین خاں۔ خلف خواجہ محمد جلال الدین عرف حضرت صاحب خلف خواجہ فقیر صاحب چشتی مودودی سجادہ نشین مقام لکھنؤ۔ سال غدر میں یہ اپنے عم نامدار مرزا محمد ابراہیم کے ساتھ آرہ آئے۔ عمر تقریباً پندرہ برس۔ مرزا صاحب موصوف نے ان کو حضرت صفیر بلگرامی سے ملایا۔ اسی زمانے میں ان کو ایک فسانہ لکھنے کا شوق ہوا۔ مگر سکۂ رائج الوقت فسانۂ عجائب تھا جس کی شاعرانہ خصوصیات کا برتنا اور قیود و قوانین سے عہدہ برآ ہونا بچوں اور نو مشقوں کا کام نہیں تھا۔ انھیں مجبوریوں سے جناب خواجہ فخر الدین حسین خاں نے نظم و نثر میں صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی کیونکہ اس صوبے میں اُس وقت صفیر بلگرامی کی جگہ پرستاران اردو کی صف اول میں تھی۔ بہرکیف خواجہ صاحب نے استاد سے سخن تخلص پایا۔ معمول یہ ہوا کہ جناب سخن اپنے فسانہ کا ایک یا دو ورق لکھ کر روزانہ استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جس روز خود نہ آسکتے مہدیوں پیادہ کے ہاتھ اوراق بھیج دیتے۔ سال بھر کی محنت میں وہ فسانہ ختم ہوا۔ یعنی ۱۲۷۶ھ میں۔ چنانچہ تاریخی نام سروش سخن ہوا۔ اس کے دو برس کے بعد خواجہ صاحب نے وکالت کا امتحان دیا۔ اور آرہ میں وکالت شروع کی۔ پھر منصف اور صدر اعلیٰ ہوئے۔

سروش سخن کا مسودہ صفیر بلگرامی نے اپنے استاد حضرت غالب دہلوی کے پاس اس عریضہ کے ساتھ بھیجا تھا:۔

> …… ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخر الدین صاحب سخن جن کا ددیہال لکھنؤ اور ننیہال دہلی میں ہے، اور غدر کے سال میں بعمر چاردہ یا پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے۔ اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحبزادی سے منسوب ہوئے۔ اور مجھ سے تلمذ کیا، اور قصہ مسمیٰ بہ سروش سخن

جس کو ان کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا۔ سب حال آپ سے بیان کیا تھا۔ چونکہ اس قصے کو چھپنا چاہیے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں۔ اس کے سوا حضور سے بڑھ کر کون ہے، اس لیے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور اس کو میری تصنیف سمجھ کر بنظر تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے اور طبیعت اُن کی (سخن کی) اچھی ہے۔ چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ سے اصلاح کو آئی ہے۔ اس کا ایک شعر میرے دل میں کھب گیا۔ وہ یہ ہے ؎

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر　　ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اس خط کا جواب حضرت غالب نے یہ دیا:۔

" مولوی سید فرزند احمد۔　　اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے۔ آج ہم نے بیٹھے بیٹھے حساب کیا کہ یہ سنہ ولادت بہترواں چلا جاتا ہے۔ ہائے ؎

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس　　بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا۔ اور قصہ مرسلۂ شش اس کے دوسرے دن پہنچا ۔ ۔ ۔ قصہ دیکھا۔ آپ کی جوہر طبع کی لمعانی، اور نیر فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصہ تو بچوں کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کیا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں۔ آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جابجا لاچار لکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاکا لگانا کاتب کی جہالت ہے ۔ ۔ ہائے خدا کی مار کاتبانِ ناہنجار پر، میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا ۔ ۔ ۔ ہو۔ بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک ان کو چپ بٹھا رکھا۔ اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز کہتے ہیں ۔ ۔ "

حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا ؎

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب　　بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے [illegible] کی ہے دعا　　خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

جناب غالب کے خط کا ایک جملہ تشریح طلب ہے۔ یعنی۔ اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے فسانۂ عجائب میں اہل دہلی کو بہت کچھ ناسزا کہا تھا۔ [illegible] میں اس کا جواب بھی دے گیا۔

فسانۂ عجائب	سروش سخن
جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے، کسی نے کبھی سنی ہو سنائے۔ لکھی دیکھی ہو دکھائے۔ عہد دولت بابر شاہی سے تا سلطنت اکبر ثانی کی مثل مشہور ہے نہ چولھے آگ نہ گھڑے میں پانی۔ دلی کی آبادی ویرانی تھی .... یہ لطافت اور فصاحت اور بلاغت کبھی نہ تھی۔ نہ اب تک وہاں ہے..... عیش و نشاط کی طرف (نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی طبیعت) آئی تو ایک ایک کنجڑن ادنیٰ اعلیٰ ہفت ہزاری بن گئی۔ لمد شاہ (بادشاہ دہلی) کی گور کھڑائی......"	اور جو اس قصہ کو ملاحظہ کرے وہ یہ نہ سمجھے کہ فسانۂ عجائب کا جواب لکھا ہے ... . کہاں فسانۂ عجائب کہاں سروش سخن۔ شمس کو [illegible] کو کیا ہمسری؟ ذرہ کو [illegible] سے کیا برابری؟ جو لطف و نثر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے ...... حق تو یہ ہے کہ جو اردوئے معلیٰ کی زبان نہیں جانتا۔ تذکیر و تانیث نہیں پہچانتا۔ جو شاہجہاں آباد میں نہیں رہا ہے۔ جس نے دربار شاہی نہیں دیکھا ہے۔ وہ فسانہ کیا لکھے؟ اردو جن کی زبان اخیر پر لعن طعن! ایسا بھی آدمی بے پیر نہ ہو۔ بقول حضرت نسیم دہلوی ؎ نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

نمونۂ کلام سخن دہلوی اصلاحی حضرت صفیر بلگرامی ؎

۱ کوئی بلا سے چیر کے پہلو نکال لے   یارو! جو دل یہی ہے تو اک روز ہم نہیں
۲ یہ مجبوری تمھاری ہاں میں ہاں ہم بھی ملاتے ہیں   نہیں کہنے کی جو باتیں ہیں وہ ناچار کہتے ہیں
کیا پامال ٹھوکر سے۔ جلایا جنبش لب سے   اسے رفتار کہتے ہیں۔ اسے گفتار کہتے ہیں
جنوں! یوں تو بہت تنکے پڑے رہتے ہیں صحرا میں   چبھے جو پاؤں میں کانٹا اسی کو خار کہتے ہیں

تحمد: سید احمد حسین رضوی۔ عرف کلو میاں۔ خلف سید رضا حسین۔ رئیس عظیم آباد۔ کوچہ پدالال۔ ۱۲۹۲ھ میں شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام :- ؎

بغل میں بیٹھ کر ظالم وہ غیر کی باتیں!   دبے جاتے ہیں ہم تو تیری تحریر دل کے پہلو سے

سلطان نواب سید تجمل حسین خاں۔ عرف سلطان مرزا۔ خلف نواب بہادر سید ولایت حسین ۔ رئیس اعظم عظیم آباد یہ صاحب دیوان ہیں۔ مثنوی درد دل بھی ان کی یادگار ہے۔ باب اول در بیان سخن میں تفصیل موجود ہے۔ جناب سلطان نے ایک غزل (سکندر دیکھ کر۔ چاند دیکھ کر) صفیر بلگرامی کو اصلاح کے لیے بھیجی تھی اس غزل میں ایک مصرع تھا ؎

جس طرح تلوار کو لیتے ہیں جوہر دیکھ کر

دوسرے مصرع کے لیے جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی ۔ صفیر بلگرامی نے اس پر ایک مصرع لگا کر قطع کر دیا ۔

خود کیا ہے ہم نے سلطاں اپنے قاتل کو پسند　　جس طرح تلوار کو لیتے ہیں جوہر دیکھ کر

اس مقطع کی داد دینے والے سب مرمٹے ۔ باقیات الصالحات میں صرف تین بزرگ اس وقت عظیم آباد کی لاج رکھے ہوئے ہیں سید فضل حق آزاد ۔ میر عنایت حسین امداد اور ڈاکٹر سید مبارک حسین مبارک ۔ جس کو سمجھنا ہو کہ سلطان کے مصرع ثانی کو صفیر بلگرامی کے مصرع اول نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے وہ ان باقیات الصالحات کے پاس جائے اور سمجھے ۔

امیر : سید محمد نواب ۔ خلف نواب حاجی سید محمد تقی خاں رئیس مظفر پور ۔ نمونۂ کلام ؎

سر مرا جب کہ کٹ چکا ہوگا　　کیا ہی قاتل اوچھل پڑا ہوگا !

اکرام : سید اکرام الدین ۔ داؤد نگر ۔ ضلع گیا ۔ نمونۂ کلام ؎

فرہاد و قیس دیکھتے دیوانگی مری　　سوتے ہیں اپنے منہ کو چھپائے کفن میں آج !

احسن : ناظر علی احسن ۔ شیخ محلہ ۔ علی گنج سیوان ۔ نمونۂ کلام ؎

کوچے میں کیوں ہجوم ہیں ارباب دید کے　　اے ماہِ نو تمھیں تو نہیں ہے نمود یار کے

جوش شاہ خلیل الدین احمد عرف شاہ خلیل ۔ خلف شاہ محمد اصغر ۔ منیر شریف ضلع پٹنہ ۔

ان کو خواجہ سخن دہلوی یا ابو مہدی بخش تسلیم عظیم آبادی کا شاگرد لکھتے ہیں اور جناب نساخ ان کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں ۔ سخن کی روایت میں کلام ہے ۔ نساخ کا بیان صحیح ہے کیونکہ نساخ کچھ دنوں کے لیے مونگیر میں تھے ۔ ان کے جانے کے بعد مونگیر میں جناب جوش حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے اور اپنا فارسی اور اردو کلام اصلاح کے لیے پیش کیا ۔ جناب جوش اپنے ایک مکتوب میں صفیر بلگرامی کو لکھتے ہیں ۔ ۔

.. .. اور ایک بات خیال میں آئی ہے ۔ وہ یہ کہ جوش تخلص بوجہ اس کے کہ بہت لوگوں کے اور اچھے اچھے شعرائے مغربی کے ہو گئے ہیں اب ترک کرنا مدنظر ہو گیا ہے ۔ اس لیے رمز اور عقل اولاً و ثانیاً (... ؟) پسند آئے ہیں کیونکہ آفتاب کے سامنے ذرہ کی تابش کہیں ہو سکتی ہے ؟ اگر یہ التماس میری حضور میں پسند آئے تو رمز تخلص تحریر فرماویں گے (یعنی ان دیوانوں میں جو اصلاح کے لیے صفیر بلگرامی کے پاس آئے تھے) اور رسید اس کی ارسال فرماویں کہ رشتہ نہیں پہنچنے کا نہیں رہے ۔ زیادہ تسلیمات ۔

فقیر زادہ خلیل الدین احمد منیری ۔ خاندان برباد کردہ مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری علیہ الرحمتہ

نمونۂ کلام ؎

اے ناخدائے کشتی عمر رواں ما　　خوش بستہ زنارِ نفس بادبان ما
سایہ کی طرح در پہ تو رہنے دے پاسباں　　مانا کہ پاسباں کے برابر نہیں ہوں میں

[redacted]

حیرت منشی احمد حسین عرف میاں جان۔ خلف منشی مرحمت حسین۔ ساکن حسین گنج کھوہ۔ پہلے یہ شہرت عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ پھر آرہ میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام ؎

اشارہ اُس کماں ابرو کا یہ ہے   ترا سینہ مرے تیروں کا گھر ہے!

تمکین: میر عبدالحکیم قنوجی۔ ساکن محلہ کشمیری کوٹھی۔ عظیم آباد۔ نمونۂ کلام ؎

تمھیں سبقت کرو تمکین اگر وہ آ نہیں سکتے   یہی کہتی ہے اب رہ رہ کے یاد رفتگاں ہم سے

غلام: غلام نبی خاں۔ ساکن باقر گنج عظیم آباد۔ نمونۂ کلام ؎

ندی ہے ہر مژہ مری چشم پر آب کی   پھبتی ہے میرے دیدوں پہ چشم حباب کی

خدا جانے کس عالم میں انھوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ پوری ہو کر رہی۔ یعنی وہ غرق دریا ہوئے۔

طبیب: ڈاکٹر حبیب اللہ۔ تخلص طبیب۔ بعد غدر بریلی سے آرہ آئے۔ اور وہیں مکان بنوایا۔ نمونۂ کلام ؎

مرنے کے بعد دی نہ جگہ کوئے یار میں   گردونِ دوں نے کیا مری مٹی خراب کی

فیاض: فیاض حسین۔ برادر خورد ڈاکٹر حبیب اللہ۔ نمونۂ کلام ؎

جب گیا میں تو رہا درہم و برہم نقشہ   جب وہ آیا تو بگاڑے ہوئے تیور آیا

متین: سید محمد باقر۔ خلف میر زین العابدین۔ ساکن چھپرہ۔

اصدقی میر جان علی شاگرد مولوی نثار علی وکیل عدالت باقر گنج بانکی پور۔ یہ حضرت شاہ قیام الدین اصدق کے مرید تھے اور اسی رعایت سے اصدقی تخلص کیا۔ خواجہ فخر الدین سخن دہلوی بھی حضرت اصدق کے مرید تھے۔ چنانچہ سروش سخن میں ایک قصیدہ کے دو شعر ہیں ؎

ستونِ کعبۂ اسلام۔ عرش اعظم حلم   گل بہشت کمالات۔ خضر را و صفا
وہ کون حضرتِ شاہ جہاں قیام اصدق   کہ جس کے زیرِ کفِ پا ہے جنت الماوا

میر جان علی اصدقی وہی ہیں جنھوں نے مرزا دبیر کی رباعی کے ایک مصرع پر اعتراض کیا تھا۔ اور صفیر بلگرامی نے سودا کی سند پیش کی تھی۔ اصدقی نے ہار مان لی اور کچھ عرصہ کے بعد صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ پھر اپنے دو بھانجوں کو شاگردی کے لیے پیش کیا۔ میر رفعت حسین بڑے بھانجے نے کبیر اور میر کفایت حسین چھوٹے بھانجے نے صغیر تخلص پایا۔ نمونہ کلام اصدقی ؎

بہم رکھتے ہیں دونوں عکس و آئینہ کی کیفیت   رُخِ روشن وہاں اس کا۔ دل روشن یہاں اپنا

کبیر: میر رفعت حسین ہمشیر زادۂ جناب اصدقی۔ نمونۂ کلام ؎

عشق نے تیرے مجھے دیوانہ ایسا کر دیا   راز دل میں جو مرے تھا سب ہویدا ہو گیا

صغیر: میر کفایت حسین ہمشیر زادہ جناب اصدقی۔ نمونۂ کلام ؎

جھوٹے وعدوں پہ اُٹھتے چلنے دیا بہت مشتاق
کیا کیا ہم نے۔ نہوں گے کہیں ناداں ہم سے

شور: داروغہ عبدالرحمان۔ ساکن باقر گنج عظیم آباد۔ یہ مونگیر میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام ؎

ہوئی ہے قاصدِ جاناں سے اب تو مایوسی
سوائے پیکِ اجل کس کا انتظار کریں

حکیم محمد اسمٰعیل خاں خلف جناب محمد بخش خاں وکیل بانکی پور و برادر خورد فخرِ ہندوستان مولوی خدا بخش خاں صاحب یہ مقام ہلسہ ضلع پٹنہ میں سب رجسٹرار تھے۔ نمونۂ کلام ؎

ہمتاب آفتاب ہے اُس یار کا مزاج
صورت تو نور کی ہے۔ مگر نار کا مزاج

باقر: سید باقر حسین رئیس مظفر پور۔ بڈہن۔ پورہ سنہ ۱۲۸۶ھ میں بمقام مظفر پور شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام ؎

دو آنکھوں میں عین لطف داور لکھا
اک بینی کو لام ہے مکرر لکھا

ناسب رہیں روشناس حیدر۔ باقر
چہروں پہ علی علی برابر لکھا

قاصر: لالہ جگت بہاری لال۔ دیوان سرکار میر رضا حسین۔ کوچہ جوالال عظیم آباد۔ نمونۂ کلام ؎

پوشاک سرخ پہنی ہے۔ مہندی لگائی ہے
قاصر کے قتل کے ہوئے ساماں نئے نئے

مخزوں: سید محمد حسین۔ عرف محمد صاحب۔ رئیس حاجی گنج۔ سب رجسٹرار۔ نمونۂ کلام ؎

بہت نزدیک ہے ملک عدم اے طالب منزل
بیک دم جا کے پہنچے ہیں جو اس بستی میں بستے ہیں

مداح: حکیم نوازش حسین مظفر پوری۔ نمونۂ کلام ؎

میں لے کے داغ غمِ ابن بو تراب چلا
اندھیرے گھر میں مرے ساتھ آفتاب چلا

نہال سید شاہ نہال حسن۔ وطن مولانگر ضلع مونگیر۔ مسکن بخشی محلہ عظیم آباد۔ پہلے یہ حکیم مولانا عبدالحمید صاحب پریشاں عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۸۷ھ میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام ؎

آپ تلوار تو لیتے ہی رہے
نگہ ناز کام کر بھی گئی!

حکیم مولانا عبدالحمید عظیم آبادی کے نام پر قلم۔ اسطی بلگرامی کو رُک جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ان کا اور اُن کے گھرانے کا علم و فضل و تقدس داستان عظیم آباد کا ایک ضروری باب ہے۔ مختصر یہ کہ خاندان صادق پور کا رویہ اسلام کے ساتھ وہی رہا ہے جو مجنوں کا لیلیٰ کے ساتھ تھا۔ یعنی ؎

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا ہے یہی
دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

چنانچہ مولانا عبدالحمید کے پدر گرامی قدر مولانا احمد اللہ صاحب نے سنہ ۱۲۸۰ھ میں آپ دریائے گنگ کے بدلے آب دریائے شور قبول فرمایا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ؎

شرابِ وفا ہم نے پی ہے صفیر
یہ دھبے نہ اب عمر بھر جائیں گے

ہیرے کا ٹکڑا بھی ہیرا ہے ۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ حکیم مولانا عبدالحمید بھی یگانۂ روزگار نہ ہوتے ۔ موروثی جائدادیں ضبط ہوگئیں کتب خانہ لٹ گیا ۔ گھر تباہ ہوگیا ۔ مگر علم وفضل کا دریا خشک نہ ہوا ۔ البتہ دریا پہلے صادق پور میں بہتا تھا ۔ اب خواجہ کلاں محلہ میں بہنے لگا ۔ دراصل تلاطم، اور تباہی، اور خانہ ویرانی، اور شکستہ پائی ۔ اور پریشانی کی حد ملاحظہ ہو کہ مولانا عبدالحمید کا تخلص تک پریشان ہوگیا ؎

پریشانی ہماری کاکل محبوب جانے ہے   پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے

چاند چودھویں کا ہو یا پہلی کا ۔ یہ بھی چاند وہ بھی چاند ۔ مولانا عبدالحمید مرحوم کے نواسے ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم (پی ۔ ایچ ۔ ڈی) آج بھی صدر نشین مسند علم وفضل ہیں ۔ بقول حضرت صفیر بلگرامی ؎

کسی صورت میں اے واعظ نہیں نقصان رندوں کا   کہ شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر پیمانہ ہوتا ہے!

مطیر شاہ سید حفاظت حسین ۔ خلف شاہ سید بخشش حسین ۔ رئیس حاجی گنج ۔ عظیم آباد

(۱) شہر عظیم آباد میں یہ پہلے شخص ہیں جو آرہ جاکر صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے ۔
(۲) جناب ہجرتی عظیم آبادی کے ہاں مشاعرے شروع ہوئے تو صفیر بلگرامی کو شرکت کے لیے آرہ سے یہی لائے تھے ۔
(۳) صفیر بلگرامی کا دیوان اول (صفیر بلبل) انھیں کی فرمائش سے طبع ہوا ۔
(۴) میر علی محمد شاد عظیم آبادی انھیں کے ہمراہ صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لیے حاضر ہوئے تھے ۔
(۵) یہ وفاداری میں فرد تھے ۔ بے وفائی کے دشمن تھے ۔

نمونہ کلام ؎

لایا ہے ان بتوں کے محلے میں مجکو دل   مذہب میں جن کے خون مسلماں حلال ہے!

فرہاد نواب سید تنبر علی خاں کے صاحبزادے سید تفضل علی خاں ۔ ان کے دو صاحبزادے سید علی تقی خاں عرف سید محسن اور سید اظہار حسین خاں عرف سید عباس مرزا ۔

سید محسن کے دو صاحبزادے ۔ میر جعفر حسین فرہاد اور میر نوروز حسین ۔ سید عباس مرزا کے دو صاحبزادے سید علی محمد شاد ۔ سید امیر حسن ایجاد اور ایک صاحبزادی سیدالنساء بیگم ۔

سیدالنساء بیگم کی شادی نوروز حسین سے ہوئی ۔ ان کے تین صاحبزادے نواب سید نصیر حسین خاں خیال ۔ نواب سید صادق حسین خاں نہال ۔ نواب سید عابد حسین خاں کمال ۔

سید محسن اور سید عباس مرزا حضرت صفیر بلگرامی کے خاص قدر دانوں میں تھے ۔ سنہ ۱۲۸۱ھ کا واقعہ ہے کہ سید محسن کے بڑے صاحبزادے میر جعفر حسین فرہاد اور سید عباس مرزا کے دونوں صاحبزادے سید علی محمد شاد اور سید امیر حسن ایجاد صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے ۔

شاد

سید علی محمد شاد کی شاگردی کا واقعہ نواب سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان میرزا یعنی سلطان عظیم آبادی اپنی تالیف مرقع فیض میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"شاد۔ سید علی محمد خلف مہین جناب میر عباس صاحب مرحوم۔ رئیس حاجی گنج پٹنہ۔ یہ مولف تذکرہ کے بہت بڑے دوست لڑکپن کے ہیں۔ اکثر شب و روز کی صحبت رہا کرتی تھی۔ سنہ ۱۲۸۰ھ میں جناب سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب ہجرتی نے حبیب مرزا علی صاحب کے امام باڑہ میں مشاعرہ شروع کیا اس وقت میر علی محمد صاحب کو شاعری کا شوق شروع ہوا۔ اور جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد مدظلہٗ کے شاگرد ہوئے۔ اور شاد تخلص مقرر کیا۔

وہ مشاعرہ کوئی چھ سات مہینے تک رہا۔ اس کے بعد محرم وغیرہ کے سبب سے موقوف ہوا۔ اسی مشاعرے میں حضرت صفیر بلگرامی مدظلہٗ بھی بہ تحریک جناب شاہ حفاظت حسین صاحب مظیر آرہ سے تشریف لائے کہ شاہ صاحب انھیں دنوں آرہ میں جاکر حضرت کے شاگرد ہو چکے تھے اور مظیر تخلص پا چکے تھے۔ المختصر جب سنہ ۱۲۹۱ھ شروع ہوا تو بعد اربعین جناب سید حامد حسین صاحب نکہت نے کشمیری کوٹھی میں مشاعرہ بخاطر حضرت صفیر مقرر فرمایا کہ جناب ممدوح بھی انھیں کے مکان میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اور دیوان صفیر بلبل چھپ چکا تھا۔ چنانچہ اس میں ایک تاریخ میر علی محمد صاحب شاد کی بہ شاگردی فریاد موجود ہے۔ غرض دوسرے مشاعرے کی طرح میں میر علی محمد صاحب شاد بمعیت شاہ حفاظت حسین صاحب چار بجے دن کو میر حامد حسین صاحب نکہت کے مکان میں تشریف لائے۔ اور باستمداد تمام جناب صفیر کے شاگرد ہوئے۔ اور سنہ [illegible]ھ تک یک قلم برابر تعلیم پائی۔ اور دور و نزدیک یعنی بذریعہ خطوط و ملاقات فیض پایا کیے۔ اور عین مشاعرے میں اصلاح لیا کیے اور شاعر کامل ہو گئے۔

اور پہلے پہل بندۂ سلطان کو بھی انھوں نے آمادہ کیا۔ اور ان کی شاگردی سے دو چار روز بعد انھیں کے مکان میں مجھے حضرت صفیر کی شاگردی کا اتفاق ہوا۔"

اس تحریر کو دیکھیے اور نواب بہادر سید ولایت علی خاں رئیس عظیم آباد کے ہاں کی تقریب کو یاد کیجیے۔ اس تقریب میں دو لڑکوں کا مونڈھے سے کھیلنا یاد کیجیے۔ ایک نو وارد کا احباب کو اشعار سنانا یاد کیجیے۔ اس روز س بشی۔ ص کا قضا و قدر کے جال میں آ جانا یاد کیجیے۔ اور پھر نو برس کے بعد س اور ش کا ایک ہی ہفتہ کے اندر ق کی خدمت میں شاگردی کے لیے حاضر ہونا دیکھیے بقول حضرت امیر مینائی ؎

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے

میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی۔ عرف میرن صاحب کے ہاں مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا تھا غزلیں شگوفۂ نکہت

میں چھپتی تھیں۔ یہ گلدستہ عظیم المطابع واقع کشمیری کوٹھی عظیم آباد سے نکلتا تھا۔ ۸۰ برس پہلے کا ایک اشتہار ملاحظہ ہو ؎

شہر میں پھر بہار آئی ہے   تازہ تازہ شگوفے لائی ہے
یعنی پھر یاں مشاعرہ ٹھہرا   خوش زبانی کا پھر مزا ٹھہرا
پندرہ دن پہ جلسہ ہوتا ہے   باغ و بستاں کا رنگ کھوتا ہے
بانیٔ جلسہ با مروت ہیں   میر حامد حسین نکہت ہیں
مغتنم ہے بہت عظیم آباد   اس کو رکھے مرا کریم آباد
اس طرح جب مشاعرہ ٹھہرا   دوستوں کا یہ مشورہ ٹھہرا
ہے مزا جو مشاعرہ چھپ جائے   خوش زبانوں کا تذکرہ چھپ جائے
از الف تا بہ یائے تحتانی   ایک مجموعہ ہوگا لاثانی
ہوگئی جب ردیف کی ترتیب   پھر تو دیوان ہے عجیب و غریب
ڈھنگ شہرت کا یہ نرالا ہے   بے تردد کلام چھپتا ہے
بے مشقت ہے مشق کی صورت   کھل رہا ہے شگوفۂ نکہت

اس اشتہار میں ۲۰ شعر ہیں۔ صرف ۱۱ شعر یہاں لکھے گئے ہیں۔ یہ وہی یادگار گلدستہ ہے جس سے جناب شادؔ کی شاگردی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہ وہی نکہتؔ عظیم آبادی ہیں جن کے مکان میں جناب شادؔ اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین مطیرؔ کے ساتھ صفیرؔ بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ اس یادگار مشاعرے کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مطیرؔ عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی	شادؔ عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی
پھیلا ہوا جو ان کی نگاہوں کا جال ہے	اس شش جہت میں جو ہے اسے انتقال ہے
اب میرے مرغِ رنگ کو اڑنا محال ہے	حقا کہ تیری ذات صنم بے زوال ہے
ہم کارزارِ عشق میں ثابت قدم رہے	جو کام ان کی زلف گرہ گیر سے ہوا
رستم ہمارے منہ پہ چڑھے کیا مجال ہے	صیاد تیرا جال کرے۔ کیا مجال ہے
لایا ہے ان بتوں کے محلے میں مجھکو دل	اللہ رے بہار کہ پھولا ہے لالہ زار
مذہب میں جن کے خونِ مسلماں حلال ہے	گلشن میں جس درخت کو دیکھو نہال ہے
محشر ہو اے مطیرؔ اگر میں برس پڑوں	اے شادؔ کس طرح سے کروں عرض مدعا
پھر ارض کی نشست نہ گردوں کی چال ہے	ناآشنا ابھی صنم خورد سال ہے

اس زمین میں صفیر بلگرامی کے چند شعر یہ ہیں ؎

تیرا ہمارے دھیان سے جانا محال ہے   تو ہے پری اسیرِ طلسمِ خیال ہے
تیری مثال نوعِ بشر میں محال ہے   آئینہ خانہ تیرا جہانِ مثال ہے
اس سے الجھ گئی کبھی اس سے الجھ گئی   تیغِ نگاہ یار کی کچھ طرفہ چال ہے
ہنسنے میں اس کے سیکڑوں باتیں نکلتی ہیں   موجِ تبسم اس کی زبانِ سوال ہے
نامہ نہیں، پیام نہیں، پوچھنا نہیں   کیونکر کہوں کہ آپ کو میرا خیال ہے
ہوتا ہے مجکو رنج تو ہوتے ہیں آپ خوش   دیوار قہقہہ مری گردِ ملال ہے

آہو ہے تو۔ تو کیا ہے؟ چھلاوا ہے تو۔ تو کیا؟
غافل! صفیر پاس کمندِ خیال ہے

جناب شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی تو مرثیہ کہنے کا بھی شوق ہوا۔ حضرت علی اکبر علیہ السلام کی شان میں اکاون بند کا ایک مرثیہ کہہ کر شاد نے صفیر بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کیا۔ مرثیہ نامربوط تھا۔ استاد نے جا بجا قطع و برید کی۔ رفو کیا اور اپنی طرف سے اکتالیس بند کا پیوند لگا کر مرثیہ کو درست کیا۔ یہ بانوے بند کا مرثیہ شاد کا سب سے پہلا مرثیہ ہے۔ اور یہ تبرک آج ستر برس سے آرہ میں ہے۔ آرہ میں کیوں ہے اس کی وجہ حضرت بلگرامی سے سنئے:۔

> "........ میں نے اکتالیس بند اور ملا کر، ربط دے کر، بانوے بند کا مرثیہ اپنے ہاتھ سے صاف کر دیا اور اس پر انھوں نے (شاد صاحب نے) چند رباعیاں پھر اپنے ہاتھ سے لکھیں۔ اس پر بھی میں نے اصلاح دی۔ آخر محرم میں مع اس مرثیہ کے ان کو (شاد کو) جناب مرزا دبیر صاحب کے پاس لے گیا۔ جناب محسن صاحب مرحوم (انھیں سید محسن کے پوتے نواب سید نصیر حسین خاں خیال مرحوم ہیں) ان کے عم نامدار بھی تھے مرزا صاحب کے پاس اس وقت کوئی پچاس آدمی بیٹھے تھے (ان پچاس آدمیوں میں میر بادشاہ علی بقا لکھنوی خلف میر عزیز علی صبا لکھنوی بھی تھے) جناب محسن صاحب نے فرمایا یہ میرا بھتیجا ہے اور اس نے مرثیہ کہا ہے۔ حضور کے پاس اصلاح کو لایا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا آپ کس کے شاگرد ہیں۔ جناب شاد نے کہا میر صفیر صاحب کے اور میری طرف اشارہ کیا۔ مرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے دیکھ لیا ہے؟ میں نے عرض کی جی ہاں۔ اور میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ اس وقت مرزا صاحب نے دو ایک بندوں پر اصلاح دی۔ اور پھر رکھ لیا آخر وہ مرثیہ مرزا صاحب کے ساتھ چلا گیا۔ اور دوسرے یا تیسرے برس وہ مرثیہ اصلاح دے کر مرزا صاحب نے لا کر جناب شاد کو دیا انھوں نے مجھے دکھایا میں نے ان سے لے لیا اور وہ بجنسہ مع مسودہ جناب شاد اور اس پر جناب مرزا صاحب کی اصلاح میرے پاس موجود ہے۔"

یہ مسودہ آج انمول ہے۔ اس کو گل بکاولی بھی نہیں پا سکتا۔ کیونکہ وہ شنیدہ ہے اور یہ دیدہ ہے۔ شاد عظیم آبادی کی تحریر۔ صفیر بلگرامی کی تحریر۔ مرزا دبیر لکھنوی کی تحریر۔ ان تینوں تحریروں کی زیارت نصیب ہو سکتی ہے تو اسی مسودہ میں۔ اب نمونۂ اصلاح ملاحظہ ہو۔

اصل بند شاد عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
بند ۴۵ رُخ کے قریب جو ہلتی ہے زلف سیاہ فام	پہلوئے رُخ میں دیکھیے زلفِ سیاہ فام
غل ہے کہ اک جگہ ہے بہم نورِ صبح و شام	کہتے ہیں سب کہ آج بہم دیکھیے صبح و شام
یا شام میں ہے یوسفِ ذی جاہ واحترام	یا چاہ میں ہیں یوسفِ ذی جاہ و احترام
کعبہ میں یا خلیل نے آکر کیا مقام	یا کعبہ میں خلیل خدا نے کیا مقام
بہرِ وفا جو عزم شہ کائنات ہے	عزمِ وفا میں ابن شہ کائنات ہے
مشغولِ سیر یاں عقب روز رات ہے	مشتاق سیر کی عقبِ روز - رات ہے
بند ۴۶ ڈوبا ہے وصفِ چاہ ذقن میں دل حزیں	ڈوبا جو وصفِ چاہ ذقن میں دل نزار
زمزم میں یا کہ ہے مہ کنعان بہر تزیں	گوہر کی طرح مل گئے مضمون آبدار
کہتا ہے یہ تلاطمِ دریا نہیں نہیں	خالی نہیں ہے آب سے یہ چاہ زینہار
ظاہر ہے صاف دُرِّ نجف کا ہے یہ نگیں	ہے چشمۂ دہن سے یہاں آب برقرار
چاہِ ذقن کے پاس خط مشکبار ہے	چاہِ ذقن کے پاس خط مشکبار ہے
کوثر کے گرد سبزۂ رنگیں بہار ہے	کوثر کے گرد سبزہ کی دونی بہار ہے

شاگرد کس طرح ٹھوکریں کھاتا ہے اور استاد اس کو کس طرح سنبھالتا ہے۔ یہ دیکھنا ہو تو پہلے بند کی ٹیپ کا پہلا مصرع اور دوسرے بند کا دوسرا مصرع دیکھیے۔ یعنی شہ کائنات اور زمزم میں مہ کنعاں۔ شاہ کائنات نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ماہ کنعاں کو زمزم سے کوئی واسطہ نہیں۔ جائے استاد خالی است:

اس مرثیہ کا آخری بند یہ تھا۔

اے شاد بس۔ کہ طول کا دینا نہیں پسند   پہنچی ہے اب کہاں سے کہاں فکر ارجمند
مضموں کے ساتھ ہوں گے ترے مرثیے بلند   مطبوع طبع اہلِ سخن ہوں گے سب یہ بند
شایانِ خود پسندی و اعزاز تو نہیں

مرزا دبیر لکھنوی کی مروت اور بلند نظری نے یہ گوارہ نہ کیا کہ عظیم آباد کا پلہ لکھنؤ کے مقابلے میں سبک ہو۔ اس لیے بادشاہ ملک معانی نے اصلاح یہ فرمائی ؎

یارب یہ باغ نظم ترا بے خزاں رہے   اک رنگ پر بصورتِ باغ جناں رہے

اس پہنچے ہوئے فقیر کی دعا کا اثر دیکھیے کہ آج شاد کی پھلواری میں بہارِ بے خزاں کا دَور دورہ ہے!

شاگردی کے زمانے ہی میں جناب شاد کو کن کن منزلوں سے گزرنا ہوا تھا اس کی تفصیل کے لیے دفتر چاہیے اس دفتر کا ایک پرزہ یہ ہے

	کلام شاد عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
(۱)	گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں۔ دیوانوں کا مدخل ہے	گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں۔ دیوانوں کی ہلچل ہے
	خدا کے فضل سے کیا ان دنوں آباد جنگل ہے	ذرا دیکھو اے جنوں۔ کیا ان دنوں آباد جنگل ہے
	ہماری آنکھ سے وہ شمع خوبی جب سے اوجھل ہے	عجب اندھیر ہے۔ وہ شمع خوبی جب سے اوجھل ہے
	تو اپنے خانۂ تاریک میں آہوں کی مشعل ہے	مرے تاریک گھر میں نالۂ سوزاں کی مشعل ہے
	کہیں سر وجد میں ساکن۔ کہیں لاشے اچھلتے ہیں	کہیں سر وجد میں جنباں۔ کہیں لاشے اچھلتے ہیں
	ترے آنے سے او سفاک بزم حال مقتل ہے	ترے آنے سے او سفاک بزم حال مقتل ہے
	دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی	دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی
	صدف مینا ہے۔ ساغر ساقیا نیساں کا بادل ہے	صدف ساغر ہے۔ مینا ساقیا نیساں کا بادل ہے
(۲)	نہ ہوئے عاشقوں میں نام تک اس کا کبھی روشن	نہ ہوتا عاشقوں میں نام تک میرا کبھی روشن
	بجھادی شمع تک کافر نے آکر میرے مدفن پر	بجھادی شمع بھی کافر نے آکر میرے مدفن پر
	نزاکت نے نہ یارا قتل کا میرے دیا اُن کو	نزاکت نے نہ چاہا مجھکو ان کے ہاتھ کا کشتہ
	کہ خطِ تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر	کہ خطِ تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر
	چمن میں جب تلک ٹہلتے رہے مستی و مدہوشی میں	وہ جب تک باغ میں ٹہلتے رہے مستی کی دھنوں میں
	میں کیا کیا چشمکیں کرتا رہا نسرین و سوسن پر	میں کیا کیا چشمکیں کرتا رہا نسرین و سوسن پر
(۳)	پہلو سے چھٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو	پہلو سے چھٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو
	جنگل سے اپنے جنوں کوئی وحشی جدا نہ ہو	نکہت میں اے جنوں کوئی گھر سے جدا نہ ہو
	لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کو بکو	لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کو بکو
	ملنے کا تیرے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو	ملنے کا تجھ سے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو

کلام شاد عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
چاہا تو تھا کہ فیصلۂ جسم و جاں کرے	چاہا تو تھا کہ فیصلۂ جسم و جاں کریں
ہجراں کا کیا گناہ جو میری قضا نہ ہو	وحشت کا کیا گناہ جو اپنی قضا نہ ہو
نازک ہے دل ۔ مزاج کو احساں نہیں پسند	اپنے دلِ غیور کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو	شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو
زیبا نہیں ہے ۔ رشک دو روزہ نشاط پر	زیبا نہیں ہے ناز دو روزہ نشاط پر
اپنی خوشی سے تنگ ہماری قبا نہ ہو	اپنی خوشی سے تنگ بدن میں قبا نہ ہو
رہنے دو تا بمرگ تصور اُس آنکھ کا	"یہ شعر کچھ نہیں"
آنکھوں سے میری ساغر و مینا جدا نہ ہو	
مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف	مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف
اے شاد کیا کروں جو طبیعت بجا نہ ہو	کیوں شاد کیا کرو جو طبیعت بجا نہ ہو
(۴) گئی ہرگز نہ بوئے پیرزایا نہ مرے سر سے	گئی ہرگز نہ بوئے پیرزایا نہ مرے سر سے
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ سر سے	گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ زر سے
حرارت ہوئے گی جس دم سوا گرمیٔ محشر سے	حرارت جب کہ بھڑکے گی سوا خورشید محشر سے
چھپاؤں گا میں جسم زار اپنا دامن تر سے	چھپاؤں گا میں جسم زار اپنا دامن تر سے
جو وہ زلف سیاہ فتنہ ساماں رام ہو جائے ۔	جو وہ زلف سیاہ فتنہ ساماں ہاتھ آجائے
تو بھر دوں یا الٰہی طاق مسجد مشک و عنبر سے	بھروں گا یا الٰہی طاق مسجد مشک و عنبر سے
مثالِ عاشقِ شیدا جو ہر دم اُس کا طالب ہے	بسانِ عاشقِ شیدا جو ہر دم گرد ہے اُن کے
ملا کیا لطف اس غم کو ہماری جان مضطر سے	ملا کیا لطف ہے غم کو ہماری جان مضطر سے
براقت میں صفا میں روشنی میں ۔ ایک پاتا ہوں	صفائی میں جلا میں روشنی میں ایک پاتا ہوں
کروں گا استعارہ دل کا رخسارِ منور سے	بجا ہے استعارہ دل کا رخسارِ منور سے
شبِ فرقت جب آئی ۔ خونِ دل اپنا پیا آکر	شبِ فرقت جب آئی خون دل کا کر دیا حاضر
نہیں مہماں پھرا بھوکا ۔ خلیل اللہ کے گھر سے	نہیں مہماں پھرا بھوکا خلیل اللہ کے گھر سے
دم رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی	دم رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی

کلام شاد عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
کئی باری اجل پھر پھر گئی آ آ کے بستر سے	کئی باری اجل پھر پھر گئی آکر مرے سر سے
(۵) مخمس برغزل خواجہ وزیر لکھنوی	.. ..
کون سی ساعتِ بد کٹی جو یہاں آکے پھنسے	جائے رقت ہے ۔ اسیری کے محن کیا کہئے
پائے وحشت زدہ بڑھ بڑھ کے فرمانے چوسے	ہڈیاں رہ گئی ہیں ۔ حال بدن کیا کہئے
حضرت خضر کہیں آگاہ ہیں ان باتوں سے	جس کی تحقیق نہ ہو کچھ وہ سخن کیا کہئے
مدتِ قید اسیرانِ کہن کیا کہئے	مدتِ قید اسیرانِ کہن کیا کہئے
گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پہ	گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پہ
حلقۂ گیسوئے پیچیدہ نہیں ۔ زنداں ہیں	بے وفا! دونوں ہیں گیسو ترے یا زنداں ہیں
یہ بھی انسان ۔ کرو غور ۔ نہیں ۔ حیواں ہیں	ان کے حلقوں میں ہیں دل ۔ یا کہ مہ کنعاں ہیں
چھوٹنے کی نہیں صورت ۔ تو عجب حیراں ہیں	سالہا سال سے بیچارے بلا گرداں ہیں
دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں	دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کردہ آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پہ	کردہ آزاد کہ ہے شور اسیراں سر پہ
مزۂ وحشتِ دل دشت بھی چکھا ہم نے	جب کیا وادئ وحشت کا ارادہ ہم نے
اے جنوں رتبۂ عالی ترا دیکھا ہم نے	جسم سے رختِ تعلق کو اتارا ہم نے
کرکے صحرا میں گزر ۔ لطف اٹھایا ہم نے	جاکے لی سلطنتِ وادی صحرا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے	دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے
چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پہ	چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پہ
شاد سے پوچھئے کیفیتِ حال دل گیر	قابل رحم ہے اب شاد کا حالِ دل گیر
ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے الفت کے اسیر	ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے الفت کے اسیر
حال کیا کیجئے اب آپ سے اپنا تقریر	حال کیا کیجئے اب آپ سے اپنا تقریر
ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجھکو وزیر	ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجھکو وزیر
زیر پا چاک گریباں ہے تو داماں سر پہ	زیر پا چاک گریباں ہے ۔ تو داماں سر پہ

ان اصلاحوں کا سلسلہ کامل سات برس تک جاری رہا۔ ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۰۲ھ تک ۔ اس زمانے میں صفیر بلگرامی کا قیام

[redacted]

زیادہ تر عظیم آباد کشمیری کوٹھی میں تھا۔ اس وجہ سے جناب شاد کو فیض حاصل کرنے میں بہت سہولت ہوئی۔ خود حضرت صفیر بلگرامی کے الفاظ یہ ہیں :۔

> …… (ہجرتی عظیم آبادی کے ہاں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں) جناب میر علی محمد صاحب شاد کا حال معلوم ہوا کہ پانچ چار مہینے سے شعر کہتے ہیں۔ اور جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد سے اصلاح لیتے ہیں اتنے میں گذری کا مشاعرہ برخواست ہوا۔ اور اب میری خاطر سے کشمیری کوٹھی میں جناب نکہت کی طرف سے ہونے لگا ……… اسی مشاعرے کی دوسری طرح میں (زمین ملال ہے خیال ہے) ……غزل کہہ کر جناب شاد میرے پاس اصلاح کے لیے لائے۔ اور شاگرد ہونے آئے …… میں تو جانتا تھا کہ وہ جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد کے شاگرد ہیں۔ مجکو تامل ہوا، اور استفسار کیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا وہ کلکتہ جاتے ہیں اور میں آپ کے سوا کسی دوسرے کو قابل اصلاح دینے کے نہیں پاتا… …… آخر میں نے بعد اصرار کے قبول کیا اور چند رئیسانِ کشمیر کوٹھی کے سامنے ان کی غزل پر اصلاح دی اور ہر اصلاح پر وجہ اصلاح کی بھی لکھ دی۔ اس دن سے جناب شاد اصلاح لینے لگے۔ اور میں بھی روزانہ چار گھڑی دن رہتے حاجی گنج جاتا اور نو دس بجے شب کو سواری پر وہاں سے آتا۔ اور یہی حال برسوں رہا۔ اس مدت میں بیسیوں مشاعرے ہوئے اور جناب شاد کو شوق بڑھتا گیا اور میں بھی اپنی کم مائگی پر جو کچھ جانتا تھا بتانے میں دریغ نہیں کیا۔ اور ان کی طبیعت کہ مائل بہ پستی تھی اس کو طریقہ شا بتاکر بلند کر دیا اور اپنے ڈھنگ اور اپنے خاندان کی وضع پر لایا ……“

اس بیان کی تصدیق خود جناب شاد کا قلم اس طرح کرتا ہے ؎

ن۱ دروغ گو نہیں کچھ شاد جو زباں پھیرے
جہاں میں کہنے کو شاعر ہیں یوں تو بہتیرے
جو مجھ سے پوچھ تو یہ ہے گماں میں میرے
صفیر لطف ہے ملتا کلام میں تیرے
زباں خوب ہے تیری۔ بیاں بہت اچھا

ن۲ کرلیا ہے شاد کو زلفِ مضامیں نے اسیر
فی الحقیقت آپ اس فن میں نہیں رکھتے نظیر
اب نئی طرحوں میں پڑھیئے شعر ہائے دل پذیر
یہ زمیں تفریح کی تھی۔ بس کریں آپ اے صفیر
ہو چکے اس میں بہت اشعار۔ رہنے دیجئے

زمانۂ شاگردی میں جناب شاد نے اپنے استاد صفیر بلگرامی کو جو خطوط بھیجے ان میں سے چند یہ ہیں :۔

مکتوب اول

بلبل شاخسار حدیقہ جادو بیانی جناب استادی میر فرزند احمد صاحب مدظلہ العالی۔ بعد تسلیم عرضہ رسا است بخیریت بود صحت و رفع مزاج اقدس می خواہد۔ از چندے احوال صحت و رفع معلوم ندارم

خداوند کریم ذات عالی را از جمیع بلیات محفوظ دارد۔ بمنہ و کرمہ۔

دریں مشاعرہ سوائے بندہ و شاہ حفاظت حسین صاحب و سید کاظم حسین صاحب کسے نبود۔ جناب خود تشریف نداشتند تا بدیگراں چہ رسد؟ بنائے جلسہ را لاحاصل دانستہ موقوف ساختم۔ و باوجود وعدہ جناب میر حامد حسین صاحب نیز تشریف نیاوردند۔

برائے تفریح طبع دریں روز ہا میخواہم کہ بخدمت شریف حاضر شوم۔ اطلاعاً عرض ساخت۔ زیادہ حد ادب۔

کمترین علی محمد عفی عنہ

مکتوب دوم

بلبلیکہ صفیرِ منقار گہر بارش لب طوطیانِ ہند بند۔ دام ظلہ۔ تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد عفی عنہ تسلیم و نیازی رساند۔ روزیکہ جناب والا رونق افروز خانہ ام بودند بحسب تذکرہ دو چہار بند مختلف از مراثی جناب مرزا دبیر صاحب خواندہ بودند۔ پس منجملہ آں اگر کدامی مرثیہ ایں جا باشد بعینہ تیئش ممنون تواں فرمود۔ والا دو چہار بند کہ یاد باشد نوشتہ عنایت فرمائید۔

بخدمت جناب میر حامد حسین صاحب نکہت سلام می رسانم۔ فقط

علی محمد شاد

مکتوب سوم

ہادی۔ سرگروہ معرکہ آرایانِ سخن استادی شبستان فصاحت را شمع انجمن دام ظلہ۔ شاد چوں دل خود در اضطراب ہدیہ سلام و تحیات تسلیمات رسانیدہ عرض دہ اینکہ عرصہ ہوا کہ آپ کی خیریت سے آگاہ نہیں۔ ترسیل عنایت نامہ ضرور ہے کہ اُس سے باعث زور و قوتِ شاگرد نیاز مند۔ متصور ہے۔

ان دنوں عجب واقعہ، طرفہ ماجرا، برپا ہے۔ ہرچند پہلے مولوی محمد احسن صاحب شاعر گر و میر محبوب فقیر شاگرد اُن کے ہم سے مباحثہ میں الزام اٹھا چکے ہیں، اب پھر وہی تقریب پیش آئی۔ ایک آشنا کے مکان پر بندہ گیا تھا۔ وہاں ایک سادی کتاب رکھی تھی۔ اس میں کچھ اشعار مولوی صاحب کے لکھے تھے۔ اور ایک رنڈی ہے۔ مسمیٰ جُتبا۔ ردیف غزل اُسی کے نام سے تھی۔ بندہ نے وہیں ایک غزل اُسی قافیہ ردلیف میں کہہ کے لکھ دی۔ جب مولوی صاحب کے ملاحظہ میں آئی تب انھوں نے ایک مطلع اور دو شعر اُس کتاب میں لکھ کر جو عبارت کہ ہم آگے لکھیں گے لکھ دی۔ جب بندہ نے وہ دیکھا خدا کے فضل سے وہیں جواب اُس کا لکھا اور پھر مولوی صاحب نے اُس کو دیکھ کر جواب لکھا۔ بندہ نے پھر اس کا جواب لکھا۔ جب سے پھر اُس کا جواب مرحمت نہ ہوا اس شہر میں ایک دھوم ہوئی کہ جناب شاعر گر صاحب سپر انداختہ ہوئے اور الزام کھایا۔

چونکہ اطلاع اس کی آپ کی جناب میں حقیر کو ضرور تھی اس واسطے التماس کیا فقط

کمترین علی محمد شاد

مکرر آنکہ جو کچھ اماں علی خاں صاحب پدر یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہ انشاء اللہ۔

نقل عبارت مولوی صاحب

جس شخص کو دعوئ شاعری ہو، اس میں شعر کہے، تب حقیقتِ امر کھُلے۔

ببیں کہ دارم بسوز عشقت　　جگر میں داغوں کا ایک گلشن
مَتَاعَ رُوحِی فِدَاکَ اُنظُر　　تنک تو پیارے ہمار کلپن [1]

ثنائے حسنت چہ بر نگارد　　تمھارے غمزوں کا کشتہ احسن
تَخَجَّلِ الشَّمسُ وَالکَوَاکِبُ　　تمھارے مکھڑے کی دمک سے سرجن [2]

اور یہ مطلع ہے کہ جس پر ہم کو دعویٰ ہے کہ ورائے قافیہ مُجبّا و قُبّا کوئی نہیں کہہ سکتا

کل جو ہم نے طرفِ سینۂ جُبّا دیکھا　　صفحۂ حسن میں بس نور کا قُبّا دیکھا

راقم محمد احسن عفی عنہ

الجواب: - تیغ آبدار زبان سوال اول کے جواب میں رطب اللسان ہے ؎

بگو دلا - چیستِ حالت تو　　بتا تو اے عقل ودین کے دشمن
نَجَاءَ مَن فِی الخَیَالَ الآن　　جو بیٹھا بیٹھا کرے ہے سُن سُن [3]

چناں ز وحشت بتنگ گشتم　　کہ روز کرتا ہوں چاک دامن
تَکُنتُ کالقیس یا حبیبی　　پڑے جو بپتا تو لاج کیُسن [4]

وصالِ تو بہر دردِ فرقت　　دوا ہے اے حورِ عیسوی فن
لِعِلَّتِی لَا شَفَاءَ قَط　　لگاؤ ہو ماتھ پر جو چندن [5]

---

[1] برہ کی سلگن سے جگر داغ داغ ہے۔ داغوں کی پھلواڑی ہے۔ اے پیارے! ہماری جان تجھ پر فدا ہو! اس تڑپن کو ایک نظر دیکھ تو لے۔

[2] تیری اداؤں کا مارا احسن تیرے حسن کی تعریف کرے تو کیا کرے؟ - جب تیرے مکھڑے کی دمک سے سورج اور سورج بنسی تک شرمائے جا رہے ہیں۔

[3] اے دل! اے عقل اور دین کے دشمن! تیرا حال کیا ہے؟ - تجھ کو اس وقت کس کی یاد آگئی جو تو بیٹھا ہوا یوں سُن سُن کر رہا ہے؟

[4] وحشت کا اب یہ عالم ہے کہ دامن ہر روز پھٹتا ہی رہتا ہے۔ اے لیلیٰ! تیرا دیوانہ کہتا ہے کہ بپت کا مارا لاج کرے تو کہاں تک کرے؟

[5] جدائی کا درد وصل سے جاتا ہے۔ ماتھے پر چندن لگانے سے نہیں جاتا۔ بید جی مہاراج! اب آپ ہی بتلائیں کہ آپ کا

شدہ است عالم چناں ز وحشت   کہ ہوئے جس کے بیاں سے الجھن
فَفِی فِرَاقِ الحبیبِ سِرْتُ   اتیت جیسے پھرے ہے بَن بَن [۱]
صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے   تمھاری آفت کی چشم پُرفن
یَکُونُ سَیْفاً بِقَلْبِ مَحزون   غضب کریں ہیں تُہار چتون [۲]
شدہ است تاریک و تار از حد   مری نظر میں جہانِ روشن
رَاَیتُ فِی اللَّیلِ یا اِلٰھی   یہ ہم نے سپنے میں کیہ کا درسن [۳]
دلم شکستہ چو جام شیشہ   خبر ہے او عاشقوں کے دشمن
مِنَ الحجارِ الفراقِ انظُرُ   یہ تم نے چھوڑیو ہمار باسن [۴]
گہے چو آمد بزیر پا یش   ز اتفاقات میرا مدفن
فَقَالَ مِنَ الرَّحمِ قُم بِاِذْنِی   موئے ہو تم شاد کیہ کے کارن [۵]

اب جواب سوال ثانی کا بیان ہے۔ بہت عجب ہے۔ اور مقام فکر و تعجب کہ کس دانائے بے بدل، اور کس جادو نگار شیوا زبان نے یہ مطلع، مثل مطلع خورشید، آسمانِ کاغذ پر جلوہ گر کیا ہے، اور کس ناظم دور اندیش، انشا کیش نے اس عبارت کو لکھ دیا ہے۔ اول مشبہ بہ واحد کا اس مقام پر استعمال ضرور ہے۔ اور اگر مشبہ جمع ہے تو مشبہ بہ جمع لانا ایسے مقام پر دستور ہے۔ لیکن یہ مطلع عاشقانِ بے سر و پا کی طرح، دونوں سے مہجور ہے۔ اگر یہ مطلع پھر درست کر کے لکھیں تو ہم اس پر توجہ کریں۔

اور ایک دو قافیے نادر اگر تلاش سے ہاتھ آئیں تو باعث فخر و مباہات نہیں۔ اکثر کم گو بھی نکال لیتے ہیں۔ کچھ

---

[۱] جنوں کا اب یہ عالم ہے کہ اس کے بیان تک سے الجھن ہوتی ہے۔ جس طرح بیراگی بَن بَن مارا پھرتا ہے اسی طرح اپنے پیارے کی جدائی میں ہم کو بھی کہیں چین نہیں۔

[۲] اے پیارے! تجھ کو کوئی کس طرح سمجھا دے کہ تیری جادو بھری آنکھ کیسی قہر ہے اس بیچارے دل کو دیکھ۔ اور اپنی تلوار کو دیکھ۔ اللہ رے تیری چتونوں کا غضب۔

[۳] اے اللہ! یہ ہم نے رات سپنے میں کس کا درشن کیا ہے کہ اس وقت دن دوپہر ہے مگر آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔

[۴] اے چاہنے والوں کے دشمن! تو نے تو ہمارا باسن ہی چھوڑ دیا۔ دیکھ لے کہ جدائی کے پتھر سے دل کا شیشہ چور چور ہے یا نہیں!

[۵] ایک دن اتفاقیہ اس کے پاؤں کے نیچے ہمارا مدفن آ گیا تو رحم اس کو آ ہی گیا۔ کہنے لگا کہ قم باذنی! اب اٹھ جا۔ اور ہاں اے شاد تو نے کس کے کارن اپنی جان گنوائی ہے۔

بات نہیں - یہ امر اتفاقیہ دلیل شاعری نہیں - برہانِ ماہری نہیں - وہ بھی ٹھیک نظر نہیں آتا - کیونکہ لفظ جُبّا ساتھ الف مقصورہ کے علم ہے - اور قبا ہائی مختفی کے ساتھ ضم ہے - ہر چند صحت قافیہ آشکارا ہے - پر طبع رسا کو کب گوارا ہے ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

پردے میں گفتگو کب خوب ہے - اپنے نزدیک معیوب ہے - گیسوئے مشک بار سخن کو طول ہو - کسی صحبت میں اس کا چرچا معقول ہو ؎

ہمچو مرداں سیر میداں آیند   در پسِ پردہ زباں نکشانید

مطلع کا جواب پائیں - کچھ حظ اٹھائیں -

کتبہ خادم الشعرا سید علی محمد شاد عفی عنہ

مکرر یہ ہے کہ ایک غزل بندہ نے کہی ہے - طالب جواب ہے ؎

یاد آئی کیوں اسیری میں ترے بالے کی گونج   توڑتی ہے سقفِ زنداں کو مرے نالے کی گونج
میکدہ میں قلقلِ مینا سے شورِ صور ہے   حشر برپا کر رہی ہے آج متوالے کی گونج
ابتدائے حسن میں کب تھی تمھیں اتنی تمیز   یاد ہے کہتے تھے اکثر کھول دو بالے کی گونج
دسترس ہو کاش ہم کو بھی کبھی اے آسماں!   وصل میں وہ ہم سے کھلوایا کریں بالے کی گونج
زلفِ جاناں کے تصور میں جو روئے دشت میں   میرے نالوں سے کہیں دب دب گئی بالے کی گونج

کیا اسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاؔد
غور کر کے دیکھتا ہے چاند کے ہالے کی گونج

جواب از طرف محمد احسن :-

یہ چند سطریں کسی کی لکھی ہوئی نظر سے گزریں - کیفیت استعداد کاتب ہویدا ہے - اگر سوال قابل جواب ہوتا دیا جاتا - قابل خطاب نہ جان کر احتراز کیا - مگر باصرار عنایت فرمائے حاضر الوقت دو تین بیت بجواب ہر دو ایراد معترض لکھ دیے جاتے ہیں -

فردوسی :-   چو بکشاد آں طرۂ مشکناب   شب آمد بپا بوسیٔ آفتاب
مولانا جامی علیہ الرحمۃ -   چو فرق آراست آں پاکیزہ گوہر   کشیدہ بر محک گویا خطِ زر
قلق :-   سامنا سلطانِ عالم سے ہمارا ہو گیا   پرتوِ خورشید سے ذرہ ستارا ہو گیا

العاقل تکفیہ الاشارۃ اگر خرد است ہمیں قدر بس است -

جواب الجواب :- یا قوم انی لکم من الناصحین۔ واہ وا۔ سبحان اللہ کاتب کا لکھا دیکھا۔ یہ جو تحریر ہے کہ سوال قابل جواب نہیں۔ یہ وہی مثل ہے کہ ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا۔ اور جو اشعار اساتذہ کے لکھے ہیں وہی ہے کہ ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا   الا یا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا

وہ اشعار جواب نہیں۔ جواب دہندہ کامیاب نہیں۔ جو اصل قاعدہ ہے وہی مطلع میں رہ گیا ہے۔ اس میں جتنے گفتگو کیا ہے۔ مگر علمفوں کی بول چال ہے۔ اس کا سمجھنا محال ہے۔ فقط

عبد المذنب سید علی محمد شاد

نقل لفافہ مہری ڈاکخانہ پٹنہ و آرہ

بعونہ تعالیٰ بقصبہ آرہ ضلع شاہ آباد۔ بہ پھاٹک صاحبان بلگرام   بعالی ملاحظہ
بلبل شاخسار خوش بیانی جناب استادی سید فرزند احمد صاحب قبلہ المتخلص بصفیر دام ظلہ
مشرف باد۔ از عظیم آباد۔ علی محمد شاد۔ بیرنگ

جناب شاد کا اپنے استاد صفیر بلگرامی کے نام یہ بیرنگ خط پڑھئے۔ اور پھر نواب سید محمد خاں رند لکھنوی کا یہ مقطع پڑھئے ؎

چل کے اب عرض کرو حضرت آتش سے رند   معرکہ آپ کا یہ طفل دبستاں جیتا

جناب شاد کے اس پر لطف خط میں چند باتیں تفصیل طلب ہیں :-

(۱) عظیم آباد میں ایک مرتبہ ڈھول پٹ گیا کہ صفی پور ضلع ہردوئی سے ایک استاد ایسا آیا ہوا ہے جو آٹھ دن میں شاگرد کو خاقانی اور سعدی اور فردوسی بنا دیتا ہے۔ یہ غوغا ہوا تو پچھم سے پورب سے دکن سے اتر سے جو آتا ہے وہ سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے مکان کا پتہ پوچھتا ہے کیونکہ یہ عجیب و غریب استاد اسی مکان میں جلوہ فرما تھا۔ اس جادو گھر میں ایک نومشق بھی جاتا تھا تو دو دن کے بعد حافظ اور جامی کے لباس میں نکلتا تھا۔ سید محبوب شیر اور دیگر شاگردوں سے پوچھا گیا کہ آخر معمہ کیا ہے تو جواب ملا کہ استاد کا حکم ہے کہ یہ راز فاش نہ ہو۔ تب ایک جاسوس بھیجا گیا۔ یعنی عبد الحکیم تمکین قنوجی۔ اس جاسوس نے شاگردی اختیار کی اور دو دن کے بعد راز فاش کیا — استاد کے پاس دو کتابیں ہیں۔ ایک میں مترادف الفاظ ہیں۔ دوسری میں مترادف فقرات۔ جس شاعر کی غزل کے موافق کہنا ہوا وہ کتاب سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ الفاظ کی تبدیلی کر کے مصرع موزوں ہو جاتا ہے پہلے تو کتاب رکھنے کی حاجت ہوتی ہے۔ پھر مبتدی اس کے الفاظ و فقرات مترادف کو یاد کر لیتا ہے اور غزل پر غزل کہہ دیتا ہے۔

یہ استاد وہی استاد ہے جس کو جناب شاد نے اس خط میں مولوی محمد احسن شاعر گر لکھا ہے۔ شاعر گر سے مراد یہی واقعات ہیں۔ اور عجیب اتفاق کہ تمکین قنوجی جنھوں نے احسن کا راز فاش کیا۔ اور شاد عظیم آبادی جنھوں نے احسن کو شکست دی، دونوں صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔ احسن کو بدگمانی ہوئی کہ پس پردہ صفیر بلگرامی ہیں۔ حالانکہ جناب شاد کا یہ خط شاہد ہے کہ عظیم آباد میں

اس وقت یہ معرکہ ہو رہا تھا صفیر بلگرامی اس وقت آرہ میں تھے ۔

احسن کا قیام سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے ہاں تین چار برس رہا ۔ مگر تمکین و شاد کا بخار انھوں نے صفیر بلگرامی سے نکالا ۔ اور باوجود ہم وطنی کے (صفی پور موضع بلگرام کے پاس ہے) ان سے ملاقات نہ کی ۔ صفیر بلگرامی نے ایک مرتبہ رقعہ لکھ بھیجا جس میں کسی کا یہ شعر بھی تھا ؎

تعجب کی جگہ ہے ۔ ہم تم اک بستی میں بستے ہیں
اور اس پر یہ مزا ہے ۔ دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

اس کا جواب احسن نے دیا کہ جو مشتاق ہو وہ خود آئے ۔ الغرض احسن تین چار برس رہ کر اور سید محبوب شیر صولت کو صاحب دیوان بنا کر غازی پور چلے گئے ۔ وہاں محمد تقی کوکب جونپوری، حکیم محمد اسحاق حاذق لکھنوی وغیرہ احسن کے شاگرد ہوئے ۔ اب عظیم آباد کا واقعہ سنیے کہ سید محبوب شیر نے اپنا دیوان میر قاسم شیر کے ہاتھ مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی کی خدمت میں بھیجا اور تقریظ لکھنے کی استدعا کی ۔ مولانا حسرت نے یہ لکھ کر ٹال دیا :-

"وصف کلام فصاحت التیام سامی کہ مالا مال نازک خیالی ہاست چہ گویم کہ می ترسم کہ تحسین ناشناس موجبِ شکستِ قدرِ آں گوہر شاہوار نگردد "

یعنی آپ کے کلام کی تعریف ہم کریں تو کیونکر کریں ؟ ڈر یہ ہے کہ تحسین ناشناس اس کو بے قدر کر دے گی ۔ تقریظ آپ کسی سخن شناس سے لکھوائیے ۔ بہرکیف سید محبوب شیر نے ۱۲۸۵ھ میں رحلت کی ۔ چار برس کے بعد مرحوم کے خلف سید علی شیر کستہ نے یہ دیوان چشمۂ علم پٹنہ میں طبع کرایا ۔

آج نہ احسن ہیں ۔ نہ سید محبوب شیر ہیں ۔ نہ شاد عظیم آبادی ہیں ۔ مگر اس ہنگامہ کی یاد شاد کے مقطع سے آج تک تازہ ہے ؎

کیا اسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاد
غور کر کے دیکھتا ہے چاند کے ہالے کی گونج

مصرع اول میں "محبوب" کا اشارہ جناب احسن کے محبوب یعنی سید محبوب شیر کی طرف ہے ۔

(۲) جس زمانہ میں احسن کا دور دورہ تھا اس زمانے میں زلیخائے مصری کی دو بہنیں نجّا اور جبّا سارے عظیم آباد کو چاٹے ہوئی تھیں ۔ نجّا کی نشانی باندی ۔ باندی کی نشانی سعیدہ ۔ مگر جبّا کی نشانی پوچھیے تو شاد و احسن کا یہ معرکہ ؎

صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے
تمھاری آفت کی چشمِ پُرفن
یکونَ سَیفاً لِقلبِ محزون
عجب کریں ہیں تہار چتون

شاد نے جن آنکھوں کی دہائی دی ہے وہ آنکھیں ایک باکمال عورت کی تھیں ۔ جبّا کی فارسی دانی اور ادبی قابلیت سے لوگوں کا ناطقہ بند تھا ۔ ایک مرتبہ کشمیری کوٹھی میں مخصوص فارسی قصائد کے لیے مشاعرہ تھا ۔ فارسی گو اساتذہ کا مجمع تھا اور صدر میں جبّا تھی ۔ شعرا اپنے اپنے قصائد سنا رہے تھے ۔ اتنے میں ایک ممتاز رئیس داد عیب نے اپنا قصیدہ شروع کیا تو جبّا بول اٹھی ۔

« میں اس کا قصیدہ سن کے کیا کروں گی"؟

یس و ادیب بیچارہ پانی پانی ہوگیا ۔ مجمع انگشت بدنداں تھا ۔ مگر جتبا کے سامنے کوئی دم نہ مار سکا ۔

(۳) جناب شاد کے اس خط میں ایک جملہ ہے :- " جو کچھ امان علی خاں صاحب پدر یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہ انشاءاللہ"
ں سے مراد مرزا قتیل کے شاگرد مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی ڈپٹی کلکٹر ہیں ۔ اردو میں قصہ امیر حمزہ انھیں کی تالیف ہے۔
ن کا قیام دیوان محمد عظیم آباد میں تھا ۔ غالب لکھنوی کے بیٹے مرزا نوروز علی خاں یکتا عظیم آبادی وہی ہیں جن کی یکتائ
بد الغفور خاں نساخ کو نہ بھائی ۔ نساخ کا نشتر ملاحظہ ہو :-

« ان میں (یکتا میں) ایک بڑا عیب ہے کہ دوسرے شاعروں کے شعر کو اپنے نام سے پڑھتے ہیں"

ر ناظر وزیر علی عبرتی کے ایسا مستند ادیب و چشم دید گواہ کہتا ہے :-

"چشم بد دور تلاشے دارد رنگین تر از ذہن گل ۔ و فکرے دارد آتشیں تر از نغمۂ بلبل ...... نظم آبدار
می نگارد ۔ و نثر ثریا نثاری طرازد ۔ ایزد تعالیٰ نہال خیالش را ہمہ بہار دارد ...."

تقویم سنہ ہجری و عیسوی

تحقیقی کام کرنے والوں کو ہمیشہ ایسی تقویم کی ضرورت رہتی ہے جس سے ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت معلوم ہو سکے ۔ انجمن نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ جنتری شائع کی ہے ۔ اس سے صحیح سنہ، تاریخ اور دن معلوم کیا جا سکتا ہے ۔

قیمت :- ایک روپیہ پچاس پیسے

اشاریہ مضامین اردو

یہ رسالۂ "اردو" کے بیالیس برسوں کے مضامین کی مکمل فہرست ہے ۔ اس اشاریے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ "اردو" میں کن کن موضوعات پر مضامین شائع ہوئے اور وہ کن مصنفین کے لکھے ہوئے تھے ۔ ہر مضمون کے مندرجات کی وضاحت کی گئی ہے ۔ ایسا مفصل اور جامع اشاریہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے ۔ (زیر طبع)

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

گردوپیش

عالمی شہرت کے سائنسداں کا خیال

عالمی شہرت کے سائنسداں اور صدر مملکت پاکستان کے سائنسی مشیر جناب پروفیسر عبدالسلام نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ سائنسی مضامین قومی زبانوں میں بآسانی پڑھائے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام نے یہ رائے ریڈیو پاکستان سے تقریر کرتے ہوئے ظاہر کی۔ آپ نے کہا کہ دنیا کے لاتعداد ملک اپنی قومی زبانوں میں سائنسی تعلیم دے رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی سائنسی تعلیم اردو میں دی جائے تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

وزیر قانون کا ارشاد

مرکزی وزیر قانون و پارلیمانی امور جناب ایس۔ ایم ظفر نے کہا ہے کہ حکومت اردو زبان کی ترویج و اشاعت پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ آپ نے یہ امید ظاہر کی کہ وہ وقت دور نہیں جب ہمارے دفتروں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں میں اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج ہو جائے گی۔ آپ نے یہ بات ایک محفل موسیقی کا افتتاح کرتے ہوئے کہی۔

اردو میں انجینئرنگ کی تعلیم

انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب اکمل حسین نے لاہور میں ایک مجلس مذاکرہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ صوبے کے ٹیکنیکل اداروں اور انجینئرنگ کالجوں میں اردو زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر بآسانی جاری کی جا سکتی ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ راولپنڈی میں اردو ذریعۂ تعلیم کے طور پر تجرباً رائج کی گئی ہے۔ جس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ آپ نے بہاولپور کے تجربے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کی روشنی میں حکومت پولی ٹیکنک اداروں میں انگریزی کی جگہ ذریعۂ تعلیم اردو کو قرار دینے پر غور کر رہی ہے۔ جناب اکمل حسین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو کے قومی زبان ہونے سے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں طلبہ کو بہت مدد مل سکتی ہے۔

مجلس ترقی ادب کا اجلاس

لاہور میں ۱۱ر جولائی کو مجلس ترقی ادب کے زیر اہتمام ایک اجلاس میں صدر مملکت کے حالیہ بیان کا خیر مقدم کیا گیا۔ جس کی رو سے مغربی پاکستان کی وحدت برقرار رکھنے کے

لیے صوبہ بھر کے لیے ایک زبان کے استعمال پر زور دیا گیا تھا۔ اجلاس کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر حمید احمد خاں کر رہے تھے۔ آپ نے کہا اس مسئلے پر صدر ایوب نے اس سے قبل کبھی اس قدر بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے کہا کہ مشترکہ زبان قیام پاکستان کی جدوجہد کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ آپ نے یہ یاد دلایا کہ شیر بنگال نے کلکتہ یونیورسٹی میں اردو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ وائس چانسلر نے یہ وضاحت کی کہ ہم علاقائی زبانوں کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جو افراد لسانی بنیاد پر ملک کی وحدت کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں وہ ملک کے دشمن ہیں۔ اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ صدر مملکت کا یہ بیان حقائق پر مبنی ہے کہ صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو صوبے بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور یہی زبان صوبے کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے۔ قرارداد میں یہ وضاحت کی گئی کہ اردو اسی علاقے کی پیداوار ہے اور محمد بن قاسم کے دور سے لے کر آج تک اس علاقے میں اردو زبان کی جتنی خدمت کی جاتی رہی ہے۔ اتنی برصغیر پاک و ہند میں کسی اور علاقے میں نہیں کی گئی۔

انجمن عرائض نویساں کا مطالبہ

انجمن عرائض نویساں مغربی پاکستان نے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو کو بلاتاخیر سرکاری اور عدالتی زبان قرار دیا جائے۔ اگر اردو کو اعلیٰ عدالتوں اور دفتروں میں رائج کرنے کے لیے فی الحال کوئی دشواری ہو تو اسے ضلع سطح پر عدالتوں اور دفاتر کی زبان فوراً قرار دیا جائے۔

اکتوبر میں ہفتۂ اردو

لاہور میں ۱۰ ستمبر کو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی صدارت میں اردو میں تصنیف و تالیف کے اداروں کے سربراہوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں "ہفتۂ اردو" منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اجلاس میں اس ہفتے کا اہتمام کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید قاسم محمود کو اس کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔

طبی تعلیم کے لیے اردو بنگلہ کمیٹی

میڈیکل اکیڈیمک کونسل کے چیئرمین اور لیاقت میڈیکل کالج کے ایڈمنسٹریٹر بریگیڈیر سید حیدر علی گردیزی نے ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ حکومت اردو اور بنگالی کو میڈیکل کالجوں میں ذریعۂ تعلیم بنانے کے سوال پر غور کر رہی ہے اور اس سلسلے میں ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے۔ جناب گردیزی نے کہا ان دونوں قومی زبانوں میں اتنی وسعت ہے کہ انھیں کسی بھی مضمون کے لیے ذریعۂ تدریس بنایا جا سکتا ہے۔ آپ نے خیال ظاہر کیا کہ میڈیکل کی تعلیم قومی زبانوں میں دینے کے امکانات روشن ہیں۔

عدالتوں میں اردو

قانونی اصلاحات کے کمیشن کے چیئرمین جناب جسٹس حمود الرحمان نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ کمیشن اس بات پر غور کر رہا ہے کہ ماتحت عدالتوں سے لے کر ہائی کورٹ تک اردو کو عدالتی زبان بنا دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ کمیشن اب تک مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے چار سو افراد سے اس سلسلے میں انٹرویو کر چکا ہے۔

ہومیوپیتھی کی کتابوں کا ترجمہ

ہومیوپیتھی طریق علاج کے بورڈ کے صدر ڈاکٹر یو۔ اے پاشا ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ بورڈ نے چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل کی ہے یہ کمیٹی اردو اور بنگلا زبانوں میں ہومیوپیتھی کی کتابوں کا ترجمہ کرے گی۔

علمی، ادبی، تعلیمی اور تہذیبی خبریں

دو اداروں کا اشتراک

صدر مملکت نے راولپنڈی میں ۱۲ر اگست کو ایٹمی توانائی کے انسٹی ٹیوٹ اور اسلامی تحقیقاتی انسٹی ٹیوٹ کو اسلام آباد یونیورسٹی میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے تعلیمی اور افرادی طاقت کے قومی کمیشن کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی کے قیام کا مقصد کم و بیش میرے اس خیال پر مبنی ہے کہ ملک میں ایسا ادارہ ہونا چاہیئے جہاں ہر قسم کے دانشور اور ذہین افراد جمع ہوں اور مشترکہ مسائل پر سوچ بچار کریں۔ اس طرح صحت مند بنیادوں پر ترقی ہوگی۔ صدر نے کہا کہ ایٹمی توانائی کے ادارے کا مقصد بھی سائنسی اور ریاضی تعلیم دینا ہے۔ اس لیے کیوں نہ اسے اسلام آباد یونیورسٹی میں ضم کر دیا جائے۔ صدر نے اسی طرح اسلامی تحقیقاتی ادارے کو بھی اسلام آباد یونیورسٹی کا حصہ بنانے کا مشورہ دیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں کے ارشادات

حکومت یونیورسٹیوں میں قومی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سوال پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ اور باور کیا جاتا ہے کہ ایک دو سال تک اس پروگرام پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔ یہ بات پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے شام ہمدرد میں تقریر کرتے ہوئے کہی۔ جناب پروفیسر حمید احمد خاں نے خیال ظاہر کیا کہ یونیورسٹی میں قومی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے قبل قومی زبانوں کو دفتری اور عدالتی زبان قرار دینا اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر یہ اہم تبدیلی بھی بے فائدہ ثابت ہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دونوں صوبوں میں بیک وقت دونوں قومی زبانوں کو اپنا لیں اور اپنی آزادی برقرار رکھنے لیے ملک میں تعلیم کے فروغ اور سائنسی اور فنی تعلیم کی اشاعت کی کوشش کریں۔

یوم شہدائے پاکستان

لاہور میں یوم دفاع پر ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے ایک جلوس کی شکل میں پاک بھارت سرحد پر جا کر ستمبر ۶۵ء کے شہدائے پاکستان کو نذرانۂ عقیدت پیش ک فنکاروں کے اس جلوس میں شرکاء کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ جس کی قیادت صوبائی وزیر خوراک ملک خدا بخش کر رہے جلوس میں شرکت کے لیے کراچی سے ادارۂ مصنفین کی جانب سے جمیل الدین عالی اور ابن انشا نے شرکت کی۔ لاہور ـ قابلِ ذکر ادیبوں میں احمد ندیم قاسمی، امتیاز علی تاج، انتظار حسین، مرزا ادیب اور اشفاق احمد تھے۔ میجر جنرل سرفرا نے ادیبوں کے اس جلوس کو خطاب کیا۔ کراچی میں بھی رائٹرز کلب کی طرف سے ادیبوں اور شاعروں کا ایک اجلاس

جس کی صدارت رحمان کیانی نے کی۔ اس کے علاوہ تمام اہم شہروں میں اس موقعے پر ادیبوں اور ادبی انجمنوں کی طرف سے اجلاس اور مذاکرے منعقد ہوئے۔

گوشۂ ادب ساہیوال

گوشۂ ادب ساہیوال کے زیر اہتمام ادیبوں اور دانش وروں کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اردو ادب میں کشمیر کے مسئلے پر ایسا ادب تخلیق نہیں کیا گیا۔ جس میں کشمیری عوام کے جذبات کی سچی اور حقیقی ترجمانی کی گئی ہو۔ اجلاس میں ادیبوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس مسئلے پر قلم اٹھائیں اور حق کا اظہار کریں۔

ابن خلدون — ماہر عمرانیات

اسلامک اکیڈمی کے ڈائرکٹر جناب ابوالہاشم نے ۱۴ اگست کو ڈھاکے میں ایک مجلس مذاکرہ میں ابن خلدون کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ابن خلدون ہی عمرانیات کا باوا آدم ہے۔ کارل مارکس اور ابن خلدون کا موازنہ کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ مارکس نے جو تجربہ کیا تھا وہ وقت کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکا جب کہ ابن خلدون کے نظریات کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اور جتنی کاوشیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اتنی ہی یہ حقیقت سامنے آتی جا رہی ہے۔ مغربی دنیا بھی ابن خلدون کو عمرانیات کا باوا آدم تسلیم کرتی ہے۔ مذاکرے سے خطاب کرتے ہوئے رفیق الاسلام چودھری نے کہا۔ ابن خلدون علم عمرانیات کا بانی ہے۔ کیونکہ ۱۸ ویں صدی سے قبل ہمیں فلسفہ تاریخ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ آپ نے کہا کہ جدید دور کے ممتاز مغربی مفکرین نے حقیقی معنوں میں پہلا ماہر عمرانیات ابن خلدون کو تسلیم کیا ہے۔

ارباب قلم کی دوسری سالگرہ

ارباب قلم کی دوسری سالگرہ کے موقعے پر مرکزی وزیر قانون جناب ایس ایم ظفر نے فرمایا کہ تاریخ گواہ ہے کہ انسان کی تمام ترقی اس کے خیالات کی وجہ سے ہوئی ہے اور یہ خیالات اہل قلم ہی پیش کرتے ہیں انہوں نے کہا اسلامی نقطۂ نظر سے عالم کے قلم کی سیاہی کو ایک شہید کے خون سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اس لیے اہل قلم کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اس تقریب میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے مغربی پاکستان ہائی کورٹ اور اس کی تمام ماتحت عدالتوں میں اردو کو نافذ کیا جائے۔

تقریب غزال و غزل

کراچی میں ۳۰ جولائی کو ممتاز غزل گو شاعر سراج الدین ظفر کے نئے مجموعۂ کلام کے سلسلے میں ایک تقریب ایک مقامی ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت ڈاکٹر ابواللیث نے فرمائی اور کلام سراج الدین ظفر پر مقالات پڑھے گئے۔ اس تقریب میں کراچی کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

اس آئینہ خانے میں

پروفیسر عبدالسلام کا نیا اعزاز پاکستان کے نامور سائنس داں اور صدر مملکت کے سائنسی مشیر جناب پروفیسر عبدالسلام کو ایٹم برائے امن کا آٹھواں سالانہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام کو ۳۰ ہزار ڈالر ملیں گے۔ اس سلسلے میں آپ نے اعلان کیا ہے کہ آپ اس رقم سے ایک ایسا ٹرسٹ قایم کریں گے جو ترقی پذیر ملکوں کے سائنس دانوں کی مدد کرے گا۔ پروفیسر عبدالسلام امپریل کالج لندن میں پروفیسر ہیں اور آپ نے ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کے شعبے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا اعزاز ممتاز افسانہ نگار اور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کو اردو ادب میں اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں حسن کارکردگی کا صدارتی انعام اور اعزاز ملا ہے۔ آپ کو ۱۹۶۳ء میں آدم جی انعام بھی مل چکا ہے۔ ندیم صاحب کو صدارتی ایوارڈ کے ساتھ دس ہزار روپے بھی دیئے جائیں گے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ارشاد سراج الدولہ کالج کے ایک عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے فرمایا کہ اردو کے پاکستان کی قومی زبان قرار دیئے جانے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ اسے پروان چڑھائیں اور ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اسے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ شیخ الجامعہ نے اردو کی تعلیمی اور علمی حیثیت کو دلائل اور براہین سے واضح فرماتے ہوئے کہا کہ وہ ایک لیڈر اور ادیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ معلم کی حیثیت سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے بغیر ہماری تعلیمی اور ذہنی ترقی ناممکن ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے ساتھ ایک شام خالقدینا ہال لائبریری ایسوسی ایشن کی جانب سے ۲۶ جولائی کو اردو کے ممتاز نقاد جناب مجنوں گورکھپوری کے ساتھ ایک شام منائی۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی کے علاوہ، سید سبط حسن، حفیظ ہوشیارپوری، حکیم محمد سعید اور کراچی کے متعدد ادیبوں اور شعرا نے شرکت کی۔ ادب اور صحافت کے موضوع پر سبط حسن اور مجنوں گورکھپوری نے تقاریر کیں۔ مجنوں صاحب نے کہا کہ اگر ادیب اور صحافی اپنے فن کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو اپنا ایک علیحدہ اسلوب اختیار کریں۔

یادوں کے چراغ

یوم حسرت موہانی کراچی میں [illegible] کو مولانا حسرت موہانی کی ۱۷ ویں برسی منائی گئی۔ اور تھیوسوفیکل ہال میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا۔ جس کے نام اپنے ایک پیغام میں مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات خواجہ شہاب الدین

نے کہا کہ مولانا حسرت موہانی ایک عظیم شخصیت تھے۔ وہ ایک عظیم شاعر تھے اور پکے مسلمان، جید عالم، بلند پایہ ادیب، بیباک صحافی، شمع آزادی کے پروانے اور منفرد سیاسی اور سماجی رہنما تھے۔ انھوں نے تحریک آزادی میں صف اول کے قائد کی حیثیت سے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہندوستان کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ مولانا حسرت موہانی ایک عظیم اردو ادیب اور آزادی کے بے مثال رہنما تھے۔ اُن کی قومی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جناب سید ہاشم رضا، جناب عبدالمجید سندھی، جناب حسین امام اور جناب حسن مثنیٰ ندوی نے مولانا کی خدمات سیاسی اور ادبی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسے کے بعد جناب ذوالفقار علی بخاری کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں شہر کے مشہور شعرا نے حصہ لیا۔

یوم اقبال بزم فکر و دانش مظفر آباد کے زیر اہتمام یوم اقبال کی ایک تقریب میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس عطاء اللہ سجاد نے شاعر مشرق کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ علامہ اقبال کشمیری عوام کی آزادی کے بارے میں بڑے فکرمند رہتے تھے اور انھوں نے اپنی کئی نظموں میں اُن مظلوم کشمیریوں کی تصویریں پیش کی ہیں جو غیر ملکی اور استبدادی طاقتوں کے زیر اثر غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

بیاد غالب ارباب قلم کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرے میں مرزا غالب کی زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور اُن کی فنی اور شعری خوبیوں کو اجاگر کیا گیا۔ مجلس مذاکرہ میں جس کی صدارت جناب مجنوں گورکھپوری کر رہے تھے۔ شان الحق حقی اور ماہر القادری نے شرکت کی۔

باری کی یاد میں پرانی انارکلی لاہور میں ممتاز ادیب باری علیگ مرحوم کے مکان پر "یادگار تختی" نصب کرنے کی تقریب ہوئی۔ جس میں صوبائی وزیر خزانہ سید احمد سعید کرمانی مہمان خصوصی تھے۔ آپ نے اپنی تقریر میں باری علیگ کی علمی، ادبی اور قومی خدمات پر انھیں شاندار خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ باری مرحوم جیسے اہل قلم کی یادگاریں ہمیشہ باقی رہتی ہیں

ماتم میں ہم شریک

مولانا محمد اکرم خاں کی رحلت تحریک آزادی کے سرخیل اور برصغیر کے سب سے معمر صحافی مولانا محمد اکرم خان کا انتق
پر ملال ڈھاکے میں ۱۸؍ اگست کو طویل علالت کے بعد ہو گیا۔ مولانا اکرم خاں کے سا
تاریخ برصغیر اور آزادی کی تحریک کا ایک طویل دور خاک میں دفن ہو گیا۔ مولانا اکرم خاں نے آزادی کی جدوجہد میں اور تقسیم ہنگا
کے خاتمے کے بعد اپنے قلم سے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک نئی روح بیدار کر دی تھی۔ آپ کی رحلت پر پاکستان کے ہر حلقے سے دلی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ صدر مملکت، دونوں گورنرز، وزرا، مملکت کے ساتھ ساتھ حزب اختلاف کے ممتا
لیڈروں نے مولانا کے انتقال کو ایک عظیم سانحہ تعبیر کیا ہے۔

امین حزیں کا انتقال پاکستان کے مشہور شاعر اور طرز اقبال کے ایک ممتاز اور معروف شاعر امین حزیں سیالکو

[redacted]

کا ۸۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا - آپ ایک صاحب نظر، پُرگو اور منفرد شاعر تھے - ان کے کلام سے برصغیر کے تمام ممتاز ادبی پرچوں نے جلا پائی -

ڈاکٹر ایم ایم احمد کی رحلت

مشہور و ممتاز عالم، مفکر، فلسفی اور عالم اسلام کی ایک نمایاں شخصیت ڈاکٹر ایم ایم احمد کا انتقال جدّے میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۲؍ستمبر کو ہو گیا - ڈاکٹر ایم ایم احمد کراچی یونیورسٹی میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور صدر شعبۂ فلسفہ رہ چکے تھے - آپ کے انتقال سے اسلامی فکر کو ایک زبردست دھچکا پہنچا ہے - وہ ایک عالم باعمل تھے اور اپنے مضمون میں یگانۂ روزگار خیال کئے جاتے تھے -

عبداللہ مسعودی کا انتقال پر ملال

جامعہ عثمانیہ کے مایہ ناز فرزند اور مشہور محقق مورخ علامہ عبداللہ المسعو کا انتقال کراچی میں ہو گیا - مرحوم اردو کالج میں قانون کی تدریس کے فرائ انجام دیتے تھے - انھوں نے "مذاہب عالم" اور "افریقہ ایک چیلنج" جیسی کتابیں تصنیف کیں جو ان کی صلاحیتوں کا رو ثبوت ہیں - وہ اور بھی کئی تحقیقی اور علمی کاموں میں مصروف تھے جو بے وقت موت کی وجہ سے تشنۂ تکمیل رہ گئے -

مفتی انتظام اللہ شہابی رخصت ہو گئے

انجمن اسلامیہ کے صدر اور متعدد تعلیمی اداروں کے سرپرست مشہو مصنف و مولف جناب مفتی انتظام اللہ شہابی کا انتقال کراچی میں ۸؍ست کو ہو گیا ہے - مرحوم کئی برس بابائے اردو کی زیر نگرانی قاموس کتب کی ترتیب و تدوین میں بھی شریک رہے - آخری ایام میں وہ پا ہسٹاریکل سوسائٹی سے منسلک تھے اور "قاموس المصنفین" کے منصوبے پر کام کر رہے تھے -

جناب اے آر زبیری کی وفات

مشہور ماہر تعلیم، سائنس داں اور مغربی پاکستان انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانس جناب ڈاکٹر اے آر زبیری نے لاہور میں ۲۶؍جولائی کو داعئ اجل کو لبیک کہا - مرحوم - پاکستان میں سائنسی تعلیم کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی تھیں - ان کی رحلت سے ملک کے علمی حلقوں میں ایک مایہ ناز فرزند کی جگہ خا

آئینۂ ہند

ہندی کے خلاف متحدہ

جنوبی ہندوستان کے چار صوبوں کیرالا، مدراس، میسور اور آندھرا پردیش میں ہندی ک مسلط کرنے کی کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک متحدہ تحریک شروع کی گئی ہے - اور ہن کے مخالفین کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ترپونڈرم میں ایک خاص کمیٹی بنائی گئی ہے جس کا نام " ہندی کے غلبہ کی مخالفت کرنے کمیٹی " رکھا گیا ہے -

اردو فنڈ کی اپیل

انجمن ترقی اردو ہند کی ایک پانچ منزلہ عمارت نئی دہلی میں بن رہی ہے - اس کا نام اردو گھر رکھا ے - زمین لے لی گئی ہے - سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے - اور اب تعمیر کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے - اس

کی تعمیر کے لیے پروفیسر آل احمد سرور معتمد عمومی انجمن ترقی اردو ہند نے اردو دوستوں سے اردو گھر فنڈ میں چندہ دینے کی اپیل کی ہے۔

اردو میں حلف برداری

بنارس کارپوریشن کے میئر نے اردو زبان میں حلف لینے کے خواہش مندوں کو اس کی اجازت نہیں دی تھی اس ذہنیت کے خلاف جب موثر احتجاج کیا گیا تو گورنر اتر پردیش نے ایک غیر معمولی گزٹ کے ذریعے کارپوریشن کے ممبروں کی حلف برداری کے طریقۂ کار سے متعلق نئے قواعد کا اعلان کر دیا ہے جس میں کہا گیا ہے "اتر پردیش کی میونسپل کارپوریشنوں کے ممبر دستور ہند کی آٹھویں فہرست میں مندرج زبانوں میں سے کسی بھی زبان میں بشمول اردو اور انگریزی حلف لے سکتے ہیں"

جشنِ غالب کی تقریبات

ہندوستان میں اردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء میں بڑے پیمانے پر منائی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں خصوصی تقریبات کا اہتمام کیا جا رہا ہے علی گڑھ یونیورسٹی میں جشنِ غالب کی تقریبات کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے۔

کرانتی دل اور اردو

بھارتیہ کرانتی دل یوپی کی پہلی سیاسی پارٹی ہے۔ جس نے آئندہ وسط مدتی انتخابات کے لیے اپنا منشور شائع کر دیا ہے۔ اس انتخابی منشور میں بہت واضح طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ بھارتیہ کرانتی دل اردو کی تائید کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ منشور میں یہ بھی بہت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ کرانتی دل اردو زبان کو یوپی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مخالف ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں تحقیقی مقالہ

اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی پر سید نثار مصطفیٰ کو پٹنہ یونیورسٹی کی جانب سے تحقیقی مقالہ لکھنے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے۔ مقالے کا عنوان "راجندر سنگھ بیدی اور ان کی ادبی خدمات ہے"۔ یہ مقالہ ڈاکٹر اختر اورینوی کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔

طبیعیات کی داستان
پروفیسر نصیر احمد عثمانی

طبیعیات کے موضوع پر جامع اور مفصل کتاب جس میں نہایت سادہ اور آسان زبان میں دقیق مضامین کو پیش کیا گیا ہے۔

قیمت: آٹھ روپے پچھتر پیسے

حیوانیات
پروفیسر مظفر عابدی

اس کتاب میں حیوانیات سے متعلق معلومات جمع کر دی گئی ہیں اور محققین کی آرا کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔

قیمت۔ تین روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

نئے خزانے

جنوری تا جون کے رسائل موضوع وار اشاریہ

(۲)

ابوسلمان شاہجہاں پوری

منظر، عبدالودود	اسٹیج سے ٹیلی ویژن تک	〃 〃 ۱۶۲ تا ۱۹۹، 〃
ناز، ایم ایس	تمثیل نگاری (خورشید اللہ سے ایک ملاقات)	قندیل، ص ۲، ۳ر اپریل
وزیر آغا، ڈاکٹر	اردو ڈراما	(نئی قدریں، ص ۳۳ تا ۴۶، ۱۹۶۸ء نمبر ۸، ۹)

عربی زبان و ادب

احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سید	جدید عربی ادب میں آزاد شاعری کا ارتقا	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۱۵ر جنوری
〃	عربی تنقید کے بنیادی رجحانات	اردو، ص ۱۱۷ تا ۱۳۴، اپریل
احسن علی خاں ندوی، محمد	جدید عربی شاعری	مجلہ سیفیہ، ص ۱۴۵ تا ۱۶۴، ۶۷-۱۹۶۶ء
ارشد، رشید احمد	جدید عربی شعرا اور ان کے رجحانات	یونی ورسٹی اسٹڈیز، ص ۱ تا ۲۷، اگست ۱۹۶۶ء
اکبر علی خاں، ڈاکٹر	ہندوستان کی عربی شاعری کی لسانی و ادبی خصوصیات	معارف، ص ۲۸۶ تا ۲۹۹، اپریل
حامد علی، ڈاکٹر	ہندوستان کی عربی شاعری میں جغرافیائی و تہذیبی اثرات	〃 〃 ۳۴۰ تا ۳۷۷، مئی
〃	〃 〃	〃 〃 ۴۳۷ تا ۴۴۴، جون
ساجد ندوی، سید	تاریخ عربی ادب ایک نظر میں	مجلہ سیفیہ، ص ۱۸۲ تا ۱۸۴، ۶۷-۱۹۶۶ء
شبیر احمد، پروفیسر	عربی رسم الخط میں بنگالی زبان	العلم، ص ۹ تا ۱۴، اپریل
عبدالحلیم ندوی	بیسویں صدی عیسوی میں عربی ادب کی نشوونما اور ارتقا	مجلہ سیفیہ، ص ۱۰۷ تا ۱۲۷، ۶۷-۱۹۶۶ء
عبدالحلیم ندوی	عربی ادب میں افسانہ نگاری۔ رومان پسند مکتب فکر (۲)	جامعہ، ص ۲۲ تا ۴۴، جنوری
فارق، خورشید احمد	عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان	برہان، ص ۵ تا ۲۲، 〃
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۱۵۰ تا ۱۶۶، مارچ
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۲۹۳ تا ۳۱۱، مئی
محمد شاکر، پروفیسر	عربی زبان کے ماخذ اور مجمع اللغۃ العربیہ کی خدمات	〃 〃 ۲۵۶ تا [illegible]، اپریل
محمد صابر	چین میں عربی رسم الخط	یونی ورسٹی اسٹڈیز، ص ۲۱ تا ۵۹، اگست ۱۹۶۶ء

فارسی زبان و ادب

زبیر صدیقی، ڈاکٹر	فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبانوں پر عموماً اور بنگالی زبان پر خصوصاً	معارف، ص ۲۶۶ تا ۲۹۰، اپریل

اختر	اردو پر فارسی تنقید کا اثر	ماہ نو، ص ۲۲ تا ۲۴، دسمبر
ی، ڈاکٹر سید امیر حسن	کلیات سامی	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۳۳ تا ۴۴، دسمبر ۶۲ء
〃	مثنوی مہر و ماہ	〃 〃 ۱۰۰ تا ۱۶۳، جولائی ۶۳ء
ابوداود، صدیقی	دیوان نجیب الدین جربادقانی	〃 〃 〃 ۷۹ تا ۹۲، دسمبر ۶۳ء
ان، عبدالرب	کلیات علاءالدین خسرو کا ایک قلمی نسخہ	آج کل، ص ۳۰ تا ۳۴، اپریل ۶۲ء
غفار صدیقی	فارسی کی صوفیانہ شاعری	شاخسار، ص ۴۷ تا ۴۹، ۶۳ء جزو ۱، ۲
ود حسین خاں	ملک الشعرا غواصی کا نایاب کلام	قدیم اردو، ص ۳۰۳ تا ۳۰۸، جلد دوم ۶۳ء
یر احمد، ڈاکٹر	دیوان حافظ کا ایک قدیم مخطوطہ	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۸۵ تا ۸۶، دسمبر ۶۱ء
یم الدین، ڈاکٹر سید	بروصہ کے کتب خانوں کے چند فارسی مخطوطات	〃 〃 〃 ۱۶۵ تا ۱۷۹، جون ۶۲ء
〃	عرفی کے کچھ غیر معروف قطعات	〃 〃 〃 ۸۵ تا ۱۰۱، دسمبر ۶۳ء

دیگر زبانوں کا ادب

دلاورجان خاں	انگریزی ادب میں مضمون نگاری کی ابتدا	مجلہ سعیدیہ، ص ۲۴ تا ۳۴، ۶۲-۱۹۶۱ء
سعید احمد	بنگلا ادب	المعارف، ص ۳۴ تا ۴۸، جنوری فروری
عبدالصمد خاں	پشتو ادب	〃 〃 ۴۹ تا ۶۶، 〃 〃
کنول پال سنگھ	جدیدیت اور ہندی ناول	کتاب لکھنؤ، ص ۲۵ تا ۲۸، فروری
محمود بالیسری	جدید اڑیا ادب اور گوپ بندھوداس	شاخسار، ص ۳۸ تا ۴۰، ۶۳ء جزو ۱، ۲

اردو زبان اور اس کے مسائل و مباحث

اشتیاق طالب	اردو زبان	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۴۱ تا ۴۷، جنوری
حمید احمد خاں، پروفیسر	اردو ذریعۂ تعلیم	قومی زبان، ص ۵ تا ۸، جنوری
زبیر، اے آر	اردو میں سائنسی کتب	〃 〃 ۵ تا ۱۲، 〃
سرور، آل احمد	سہ لسانی فارمولا اور اردو	ہماری زبان، ص ۱ تا ۲، ۱۵ جنوری
شہید، صابر القاسمی	حجاز میں اردو	〃 〃 ۳، یکم اپریل
عیدن، عنایت حسین	مارشس میں اردو	〃 〃 ۴۲، ۸ مارچ

فرمان فتح پوری	ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور اردو	نگار پاکستان، ص ۳ تا ۶، اپریل
قدرت نقوی، سید	سنسکرت اور پراکرتیں	اردو نامہ، ص ۵ تا ۳۴، جنوری
مانک رام	اردو[1]	نیرنگ خیال، ص ۹ تا ۱۱۱، دسمبر [illegible] جنوری [illegible]
محمد باقر، ڈاکٹر	اردو، ہندوستانی، ہندی یا ہندیہ ہندوئی	اردو، ص ۷۳ تا ۹۳، جنوری
محمد صابر	بابری زبان میں اردو الفاظ کا املا	یونی ورسٹی اسٹڈیز، ص ۸۷ تا ۱۰۶، اگست [illegible]
مسعود احمد، محمد	اردو زبان کے مختلف نام اور ان کی تاریخ	تاج العرفان، ص ۳ تا ۱۰، مئی
مسعود حسین خاں، ڈاکٹر	اردو کے لیے ہندی رسم الخط کیوں نہیں؟	ترقی اردو، ص ۳، ۱۶ر فروری
"	ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور اردو	خاتون دکن، ص ۱۲ تا ۱۷، جنوری تا مارچ
"	" " "	سب رس، ص ۸ تا ۱۰، مارچ
"	" " "	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، یکم اپریل
مصطفیٰ علی بریلوی	ساٹھ سال قبل کی ایک اردو کانفرنس	قومی زبان، ص ۱۹ تا ۲۲، مئی
منور ابن صادق	پاکستان میں زبان کا مسئلہ	آئین، ص ۱۴ تا ۱۵، ۱۷ جنوری
یونس اگاسکر	مراٹھی نثر کا انگریزی اثر	صبح امید، ص ۳۳ تا ۲۵، مئی جون

ادارے اور کانفرنسیں

اشفاق انور	انجمن پنجاب (قسط دوم)	صحیفہ، لاہور، ص ۹۹ تا ۱۰۸، جنوری
"	" (" ۳)	" " " [illegible] تا [illegible] اپریل
بدر منیر، محمد	مقبول اکیڈمی	کتاب، لاہور، ۷ تا ۱۰، مئی
حنیف ندوی، مولانا محمد	ادارہ ثقافت اسلامیہ (لاہور)	المعارف، " ۱۰۸ تا ۱۱۸، جنوری فروری
عبداللہ ملک	بین الاقوامی کلچرل کانگرس	معارف اعظم گڑھ، ص ۱۲۵ تا ۱۳۱، فروری
عبدالمنان اعظمی	انجمن اسلام بمبئی	امروز، لاہور ۲۴ فروری [illegible] ص ۴

آپ بیتی

احسان دانش	میری زندگی — احسان دانش بننے سے پہلے	اردو ڈائجسٹ، لاہور، ص ۶ [illegible] اپریل

---

[1] خطبہ صدارت جلسہ تقسیم اسناد جامعہ اردو، علی گڑھ

سان دانش	میری زندگی۔ احسان دانش بننے سے پہلے	اردو ڈائجسٹ، لاہور، ص ۹۸-۱۰۴، جون
ر عباس، خواجہ	میری زندگی کا پہلا موڑ	آج کل، دہلی، ص ۴ تا ۵، دسمبر کراچی
مذ ویلو	سر احمد ویلو کی خود نوشت سوانح حیات	اخبار جہاں، ص ۸ تا ۹، ۷ فروری
〃	〃 〃	〃 〃 ۸ تا ۹، ۱۴ ر 〃
〃	〃 〃	〃 〃 ۶ تا ۷، ۲۱ ر 〃
〃	〃 〃	〃 〃 ۸ تا ۹، ۲۸ ر 〃
ا جعفری	نوائے سروش سے صریر خامہ تک	نیرنگ خیال، لاہور، ص ۱۱ تا ۱۲، جولائی
اصغر، غلام جیلانی	پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے ایک ملاقات	اردو زبان، سرگودھا، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸، مئی جون
آزاد، جگن ناتھ	مجھے آج تک یاد ہے وہ زمانہ (۱)	آج کل، دہلی، ص ۵ تا ۱۴، مئی
〃 〃	〃 〃 (۲)	〃 〃 〃 ۱۰ تا ۱۵، جون
بیدی، راجندر سنگھ	میں اور میرا فن	〃 〃 〃 ۱۶ تا ۱۸، اپریل
ٹیٹو	صدر ٹیٹو کی کہانی ان کی اپنی زبانی	اخبار جہاں، ص ۸ تا ۹، ۱۷ جنوری کراچی
〃	〃 〃	〃 〃 ۲۴ ر 〃
ثریا، ملکہ	سابق ملکہ ایران کی داستان حیات	مشرق، لاہور، ص ۳ + ۶ تا ۱۲، ۷ جنوری
حجاب امتیاز علی	میری ادبی زندگی	نیرنگ خیال، ص ۱۳ تا ۱۷، دسمبر، جنوری
رستم علی [illegible]	کاش وہ مجھے نہ ملتی (۱)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۳۶ تا ۸۵ کراچی
عبدالمجید قریشی، پروفیسر	علی گڑھ میں میرے چالیس سال (قسط دوم)	العلم، ص ۹ تا ۴۰، جنوری 〃
〃 〃	〃 〃 (قسط سوم)	〃 〃 ۱۰۵ تا ۱۲۵، اپریل
〃	یاران علی گڑھ	سیارہ، ص ۶۲ تا ۸۰، فروری لاہور
قیصری بیگم	کتاب زندگی	اردو نامہ، ص ۷۴ تا ۸۰، جنوری کراچی
لطیف انور، علامہ	خود نوشت سوانح حیات	لاہور، ص ۱۰، ۲۰ مئی لاہور
محمد زبیر الحاج و عبدالمجید قریشی	یاران علی گڑھ	العلم، ص ۶۶ تا ۷۵، اپریل کراچی

تاریخ و سیاست

ابراہیم، میجر	سلطان حیدر علی کا توپ خانہ	امروز، ص ۳، ۲۰ر فروری	لاہور
ابوالصباحے، ضیا کانت	اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی	ہمایوں، ص ۴۴۳ تا ۴۴۹، مئی	دہلی
احمد میاں بھیتی، قاری	حافظ الملک کا طرز حکومت	پیام حق، ص ۳۲ تا ۳۶، مارچ	کراچی
احمد کسروی			
بکیر احمد جائسی (مترجم)	آذربائیجان کی قدیم زبان اور لوگ	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸ر جون	علی گڑھ
اختر سعید ریکھ	جب قرارداد پاکستان پیش ہوئی	امروز، ص ۲، ۲۳ر مارچ	لاہور
ادارہ آئین	جماعت اسلامی — کنونشن مسلم لیگ کا سب سے بڑا مسئلہ	آئین، ص ۴ تا ۵، ۱۱ر فروری	"
"	"	" " ۲ تا ۳، ۱۸ر "	
"	بیرو کی تلاش	" " ۴ تا ۵، ۲۸ر جنوری	
اشرف، عبدالرحیم	حکومت سعودیہ کا تاریخی پس منظر	صحیفۂ اہل حدیث، ص ۹۰ تا ۹۳، محرم ۱۳۹۶ھ	کراچی
الطاف حسین قریشی	تازہ ترین تاثرات (مشرقی پاکستان کی سیاسیات)	اردو ڈائجسٹ، ص ۹ تا ۴۲، مارچ	لاہور
الطاف، حامد عبدالرحمان	صحرائے سینا	چراغ راہ، ص ۱۵۱ تا ۱۶۰، جون	کراچی
امجد الطاف	پاکستان کا منشائے تخلیق	قندیل، ص ۳ تا ۱۴، ۲۰ر مارچ	لاہور
ہرمز	ٹیکسلا — نئے انکشافات	امروز، ص ۳، ۱۴ر جنوری	"
امن، گوپی ناتھ	میرے بچپن کا لکھنؤ	آج کل، ص ۶ تا ۱۴، اپریل	دہلی
امن پاکستانی، مرزا منور علی بیگ	قیام امن کا نظریہ	صحیفۂ اہل حدیث، ص ۱۸ تا ۲۲، ۱۶ر جون	کراچی
انیس الرحمان، سید	جے پرکاش نرائن — اپنے اقوال و افکار کی روشنی میں	لاہور، ص ۵، ۲۳ر فروری	لاہور
اولاد احمد صدیقی، ڈاکٹر	"ہندوستانی مسلمان" اور پروفیسر محمد مجیب	جامعہ، ص ۱۹۹ تا ۲۱۳، اکتوبر ۶۷ء	دہلی
ایوب قادری، محمد	تصور پاکستان کی ایک گم شدہ کڑی	العلم، ص ۴۱ تا ۵۰، جنوری	کراچی
" "	جزائر انڈمان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات	اردو، ص ۵۵ تا ۶۸، جنوری	"
ایوب شاہ پوری	بالاکوٹ پہلی جنگ آزادی	اردو ڈائجسٹ، ص ۹۵، مئی	لاہور

آبادشاہ پوری (ترجمہ)	مجاہد ریف	اردو ڈائجسٹ، ص ، مارچ	لاہور
〃 〃	جنگ آزادی کے چالیس برس (مجاہد ریف کی دوسری قسط)	〃 ۰ ۱۳۱، اپریل	
بابر آغا	مقبرہ حکیم ابو الفتح حکیم ہمام	ماہِ نو، ص ۳۳ تا ۴۲، نومبر ۸۶ء	کراچی
بدری، شیخ عبدالعزیز	اسلامی تاریخ میں علماء اور حکام کا کردار (۱)	ترجمان القرآن، ص ۲۷ تا ۳۳، مئی	لاہور
خلیل حامدی (مترجم)			
〃 〃	اسلامی تاریخ میں علما اور حکام کا کردار (۲)	〃 〃 ۴۴ تا ۴۵، جون	
بروہی، اے کے	انسانی تاریخ پر قرآن پاک کے اثرات [1]	قندیل، ص ۹، ۱۴ فروری	لاہور
〃 〃	تاریخ انسانی میں پاکستان کا کردار	چراغِ راہ، ص ۹ تا ۲۳، مئی	کراچی
بشیر احمد، میاں	تحریک پاکستان کے فکری عناصر	جنگ، ص ۴، ۱۳ اپریل	〃
بشیر حسین جعفری	خلیج فارس کی ریاستوں کا وفاق	المنبر، ص ۵ تا ۶، ۱۵ مارچ	لائلپور
پامر، جے۔ اے۔ بی	میرٹھ کی خفیہ فوجی ڈائری	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵۹ تا ۱۷۳، مارچ	لاہور
تابش، لکھنوی نرائن وششٹ	چکبست لکھنوی کی قدریں	برہان، ص ۱۰۴ تا ۱۱۴، جون	دہلی
تاجور سامری	اٹھارہ سو ستاون کا ہنگامہ اور بہادر شاہ ظفر	ہمایوں، ص ۳۵۰ تا ۳۵۳، مئی	〃
جعفر رضا بلگرامی، ڈاکٹر	قومیت عہد حاضر میں	جامعہ، ص ۷ تا ۲۰، جنوری	〃
جلالی، امین الدین	ہندی مصنوعات کی تجارت اور علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں عربوں کا حصہ	آج کل، ص ۵۷ تا ۶۳، دسمبر ۸۶ء	〃
جمیل احمد، خواجہ	جغرافیائی دریافت میں مسلمانوں کا حصہ	کارگر، ص ۱۵ تا ۱۷، مارچ اپریل	کراچی
جنرل چودھری			
مقبول جہانگیر (مترجم)	بھارت کی خفیہ دستاویز — جنرل چودھری کی غیر مطبوعہ کتاب	اردو ڈائجسٹ، ص ۳۳، جنوری	لاہور
حسن ثانی نظامی	ہندوستان کے چند مشہور عرس	آج کل، ص ۴۴ تا ۴۸، اپریل	دہلی
حسن خاں، کرنل ایم	جب گلگت آزاد ہوا	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۱۱ تا ۱۱۹، مارچ	لاہور
حمید اللہ، ڈاکٹر محمد	زمانہ جاہلیت میں عربوں کے معاشی و سفارتی تعلقات	البلاغ، ص ۱۵ تا ۲۷، جون	کراچی
خان، ڈاکٹر ایف اے	پاکستان میں آثار قدیمہ کی نئی دریافت	مشرق، ص ۱۱، ۱۵ جنوری	〃

---

[1] ان کی دو قسطیں [illegible]

لیفہ، عبدالرحمان	مسئلہ فلسطین کا حل	چراغ راہ، ص ۲۹ تا ۳۵، جون	کراچی
لیل اللہ، پروفیسر محمد	جب مطالبہ پاکستان مقبول ہو رہا تھا	جنگ، ص ۳، ۲۳ مارچ	کراچی
لیل حامدی	شام کی حزب البعث	تجلی، ص ۵۹ تا ۶۷، مارچ اپریل	دیوبند
خلیل حامدی	عراق کی صورت حال	ترجمان القرآن، ص ۳۱ تا ۴۴، جنوری	لاہور
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	شیخ محمد عبداللہ — جنھوں نے عمر قید کاٹ لی	مشرق، ص ۴، ۲۱ جنوری	کراچی
″ ″	قبرص کا مسئلہ	″ ″ ۱۲، ۱۵ نومبر	
″ ″	یمن کا حالیہ انقلاب	″ ″ ۲، ۱۸ ″	
خورشید احمد	مشرق اوسط ۱۹۲۸ سے ۱۹۶۷ تک	چراغ راہ، ص ۵ تا ۲۸، جون	کراچی
خورشید عالم	برطانیہ کا عالمی کردار	طلوع اسلام، ص ۲۹ تا ۳۵، مارچ	لاہور
″ ″	انڈونیشیا کا عالمی کردار	″ ″ ۳۱ تا ۳۷، مئی	
″ ″	رنگ و نسب	″ ″ ۱۸ تا ۲۸، جون	
″ ″	فلسطین کس کا ہے ؟	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۱۷، جون	
راشد الخیری	شاہجہاں آباد (دلی) کے	ہمدرد صحت، ص ۱۰۳ تا ۱۰۹، جون	کراچی
راشدی، پیر علی محمد	انگریز کے فوجی اڈے	جنگ، ص ۱۰، ۲۹ جنوری	″
″ ″	سوشلزم کا نعرہ	″ ″ ۱۲، ۱۰ فروری	″
″ ″	ہندوستانی ریاستیں	″ ″ ۱۲، ۲۰ جنوری	″
″ ″	کالے گورے	″ ″ ۱۲، ۱۶ مارچ	″
″ ″	ویت نام	″ ″ ۱۲، ۲۳ ″	″
″ ″	نظم ونسق — لا اینڈ آرڈر	″ ″ ۲۵ مئی	″
رزاقی، شاہد حسین	پاکستان کے بیس سال (سیاسی سرگزشت، قومی مسائل اور اسلامی ممالک سے تعلقات)	المعارف، ص ۳ تا ۴۴، جنوری فروری	″ لاہور
رضوان احمد	تحریک پاکستان	جنگ، ص ۱۱، ۱۰ اپریل	کراچی
رئیس احمد جعفری، سید	حضرت ابوبکر صدیق اور واقعہ افک	ہمدرد صحت، ص ۲۳ تا ۴۲، فروری	″

رئیس احمد جعفری، مولانا	ہنومان گڑھی کی مسجد بابری	المعارف، ص ۴۷ تا ۴۸، جون لاہور
ریاض حسین، سید	خلافت عباسیہ میں علم ریاضی کا عروج	مجلہ سیفیہ، ص ۲۰۷ تا ۲۲۲، اگست ۶۶ء بھوپال
سعید احمد میاں	ریاضی میں مسلمانوں کا حصہ	مطلع نو، ص ۲۰ تا ۲۲، جنوری بہاولپور
سلیمان احمد	لکھنؤ کا تاریخی، سماجی اور معاشرتی پس منظر	آج کل، ص ۲۷ تا ۳۹، مارچ دہلی
سلیمان حسین، ڈاکٹر سید	لکھنؤ کا تاریخی و سماجی ماحول	قومی زبان، ص ۱۲ تا ۴۷، فروری کراچی
سیف، غلام باری	اسلامی معاشرتی عدل	لاہور، ص ۶، ۷، ۲۹ر اپریل لاہور
" "	" "	" " ۵، ۱۲، ۶ر مئی "
" "	" "	" " ۶، ۷، ۱۳ر " "
شاہ فیصل	دعوت اتحاد[1]	صحیفہ اہل حدیث، ص ۱۱۳ تا ۱۱۵، محرم ۱۳۸۶ھ کراچی
شاہد	آئندہ انتخابات اور تحریک جمہوریت[2]	نوائے وقت، ۵ ص ۳ر مارچ لاہور
"	تحریک جمہوریت کا ایک سال	" ۶، ۳، ۲۸ر اپریل "
شاہین، علی محمد	سرزمین پاکستان کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر	جنگ، ص ۷، ۲۳ر مارچ کراچی
شمس الحق نظامی، مولانا	سلاطین دہلی کے عہد میں ذرائع خبر رسانی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۵ تا ۳۰، مئی "
شوق، محمد مظہر جلیلی	مرادآباد (یوپی۔ بھارت)	العلم، ص ۷۶ تا ۸۱، جنوری "
شہاب ثن، ایم		
فضل الرحمان ہمدانی	اسرائیل کی قید میں سولہ سال	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۰۹، جنوری لاہور
شہابی، انتظام اللہ	جونپور کی علمی روداد	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۳ تا ۴، جنوری کراچی
صباح الاسلام	قیام اسرائیل اور اینگلو امریکی ڈپلومیسی	چراغ راہ، ص ۷۶ تا ۸۹، جون "
صدیق الحسن گیلانی، سید	اسرائیل جارحیت کے اسباب	ایشیا، ص ۷، ۱۶ر جون لاہور
صفدر سلیمی	کیا اسلام جمہوریت کا حامی ہے؟	شہاب، ص ۶ تا ۷، ۲۸ر جنوری "
طلعت محمود، رانا	سامراجی طاقتیں اور پاکستان کا مستقبل	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۳، ۱۰ر اپریل "

---

[1] صحیفہ اہل حدیث کا یہ سعودی عرب نمبر ہے۔ اس میں سعودی عرب کی مذہبی، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی اور سیاسی اہمیت کے ۳۵ مضامین شامل ہیں۔ (صفحات ۱۹۴)

[2] اس عنوان کے تحت "نوائے وقت" میں اس سے قبل اور اس کے بعد متعدد مضامین آچکے ہیں

عزالحسن، مرزا	برطرفی[1]	قومی زبان، ص ۵۳ تا ۵۵، مارچ کراچی
"	لاہور کی ایک صبح، دلی کی ایک شام	ادبِ لطیف، ص ۶۳ تا ۶۶، دسمبر ۶۷ء وجنوری ۶۸ء لاہور
ظہیر فتح پوری، ڈاکٹر	اردو کا سماجی انقلاب اور مرزا رسوا	فنون، ص ۹۱ تا ۱۰۱، جنوری وفروری "
عارف اسحاق	جلیانوالہ باغ کا المیہ — ایک چشم دید گواہ ملک عبدالعزیز کے تاثرات	جنگ، ص ۹، ۱۵ اپریل کراچی
عاقل علی خان، محمد	جمہوریت اور رائے عامہ	چٹان، ص ۲۱، یکم جنوری لاہور
عالی، جمیل الدین	تاریخ پاکستان — یادگار پاکستان	جنگ، ص ۱۱، ۲۶ فروری کراچی
عبادالله فاروقی	مقبرہ جہانگیر	ماہِ نو، ص ۳۷ تا ۴۲، جنوری
عبدالحق، ڈاکٹر محمد	چوتھی صدی ہجری میں عراق اور مغربی ایران کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالت	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۷۳ تا ۹۱، جون ۱۹۶۷ء علی گڑھ
عبدالحمید چھاپرو	بلوچستان اور قیام پاکستان کی تحریک	جنگ، ص ۳، ۶ مئی کراچی
عبداللہ، ڈاکٹر سید	تحریک پاکستان کے فکری عناصر	چٹان، ص ۱۳ تا ۱۴، یکم اپریل لاہور
عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد	تاج محل — کبھی شیو کا مندر تھا؟	" " ۲ + ۱۸، ۲۲ جنوری "
"	تاج محل	کتاب، لاہور، ص ۴۴، اپریل
"	کھٹو — راجستھان کی ایک قدیم بستی	اردو، ص ۷۳ تا ۱۰۲، جنوری کراچی
عبداللہ مسعودی، محمد	قضیۂ فلسطین	البلاغ، ص ۴۳ تا ۵۰، " "
عترت حسین، ڈاکٹر	اسلامی تاریخ کا مطالعہ	تہذیب الاخلاق، ص ۲۷ تا ۲۹، اپریل لاہور
عزیز، نصراللہ خاں	ہندو سیاست کی چند جھلکیاں	اردو ڈائجسٹ، ص ۷۵ تا ۸۵، فروری "
عسکر علی شاہ	افغانستان کا سفید انقلاب (۳)	ایشیا، ص ۱۲ + ۲۶، ۲۵ فروری "
عنایت اللہ، ڈاکٹر شیخ	حضرت عثمان کی شہادت	امروز، ص ۳، ۱۴ مارچ "
غلام محمد، چودھری	عرب اسرائیل جنگ — تاریخی پس منظر	چراغِ راہ، ص ۵۳ تا ۶۶، جون کراچی
"	مشرق وسطیٰ کے حالات کے بارے میں ایک مکمل دستاویز[2]	آئین، ص ۳ تا ۱۸، ۱۳ مارچ لاہور

---

[1] سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم حیدرآباد دکن کی حکومت کے خلاف انجمن ترقی اردو کی امداد بند کرنے کے سلسلے میں جلسۂ دہلی کی روداد اور رزولیوشن۔

[2] آئین کا یہ مقالہ مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل اور عربوں کی کشمکش کے پس منظر، پیش نظر اور موجودہ صورت حال کی وضاحت اور نجات کی راہ کی نشاندہی کے لیے وقف ہے

19 NOV 1968

ماہنامہ

قومی زبان

نومبر ۱۹۶۸ء

شمارہ - ۵

جلد ۳۳

19 NOV 1968

19/XI/68

اس شمارے کے لکھنے والے

جناب اختر حسین

ڈاکٹر سید عبد اللہ

انصار اللہ نظر

محمد ایوب قادری

لطف اللہ بدوی

آفاق صدیقی

ڈاکٹر سید محمد عقیل

فریدہ نقوی

سید وصی احمد بلگرامی

ابو سلمان شاہجہاں پوری

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ
قیمت سالانہ دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی

(انجمن پرنٹنگ پریس، کراچی)

فہرست

عطیات برائے اردو کالج		۳
خطبۂ افتتاحیہ	جناب اختر حسین	۵
اے ہم نفساں	ڈاکٹر سید عبداللہ	۱۱
اردو میں تدوین	انصار اللہ نظر	۱۷
اللہ بخش یوسفی	محمد ایوب قادری	۲۵
گلدستۂ ہمایوں	لطف اللہ بدوی	۳۳
ادب اور ادبی قدریں	آفاق صدیقی	۴۱
چنچل نار اور کشن پرشاد شادؔ	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۴۷
شوقؔ قدوائی (۱)	فریدہ نقوی	۶۵
س۔ ش۔ ص (۲)	سید وصی احمد بلگرامی	۷۱
نئی کتابیں		۸۷
گرد و پیش		۹۳
نئے خزانے	ابو سلمان شاہجہانپوری	۱۰۱

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
مشفق خواجہ

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اقامتی اردو کالج کے لئے مبلغ تین لاکھ پنتالیس ہزار ایک سو تیرہ روپے ستائیس پیسے (۳،۴۵،۱۱۳-۲۷) جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ مہینے جو رقوم موصول ہوئیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

ذاتی عطیہ:-

اوپل لیبورٹریز لمیٹڈ کراچی	دو ہزار پانچ سو روپے

عطیہ — رسیدوں کی فروخت کے ذریعے

محمد محمود حسین صدیقی صاحب	پانچ سو روپے

اینٹوں پر نام کندہ کرانے والوں کے عطیات

۱- سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور	سو روپے
۲- گراؤنڈ سروس ڈپارٹمنٹ ہیڈ آفس انٹرنیشنل ایرلائن کراچی ایرپورٹ	پچاس روپے
۳- قاضی منتخب الدین صاحب، سانگھڑ	پچاس روپے
۴- سید نذیر علی شاہ صاحب بہاولپور	پچیس روپے
۵- ایم آئی قریشی صاحب خازن کراچی یونیورسٹی	پچیس روپے

اپیل

اردو کالج جن حالات میں قائم ہوا اور اپنی تمام بے بضاعتی کے باوجود قوم کی اور قومی زبان کی اس نے جو خدمات انجام دی ہیں اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں کیونکہ آپ کے تعاون اور اشتراک ہی سے یہ سب کچھ ممکن ہوا۔

آپ ہی کی ہمت افزائی کے سہارے اردو کالج نے ایک اقامتی کالج کی تعمیر کے عظیم منصوبے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم سب کی کوششوں سے یہ تین کروڑ روپے کا منصوبہ جلد از جلد مکمل ہو جائے اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے جہاں ایک عظیم درسگاہ قائم ہو وہاں انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ کس کس نے اس عمارت کی اینٹیں رکھی ہیں۔ جس اینٹ کا آپ عطیہ دیں گے اس پر آپ کا نام کندہ کیا جائے گا۔ امید ہے آپ ایک سے زیادہ اینٹوں کا عطیہ دے کر اپنے نام کو جلی لکھوائیں گے۔

آج ہی اپنا نام صاف لکھ کر صرف پچیس روپے بھیج دیجئے آپ کا نام ابدالآباد تک زندہ رہے گا۔

اس کارخیر میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی شریک رکھیے۔ عطیات آپ انجمن ترقی اردو کے حساب میں ان بینکوں کی کسی بھی شاخ میں جمع کرا سکتے ہیں۔

۱۔ نیشنل بینک آف پاکستان
۲۔ حبیب بینک لمیٹڈ
۳۔ یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

اختر حسین

(ہلال پاکستان)

صدر۔ انجمن ترقی اردو پاکستان

خطبۂ افتتاحیہ

جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو

محترم حاضرین!

میں سب سے پہلے آپ حضرات کا اور اردو کانفرنس کے کارکنوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے یہاں مدعو کر کے اور کانفرنس کا افتتاح کرنے کی دعوت دے کر میری عزت افزائی کی ہے۔ میں آپ لوگوں کے خلوص کی تہ دل سے قدر کرتا ہوں اور اسی خلوص کی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔

بہاول پور میں اردو کانفرنس کا انعقاد ایک نہایت مفید اور قابلِ قدر اقدام ہے، اس طرح اردو زبان کے نام لیواؤں کو ایک جگہ جمع ہونے اور اردو کے مسائل پر غور کرنے کا موقع ملا ہے مجھے امید ہے کہ اس کانفرنس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ اور اس طرح اردو تحریک کو تقویت پہنچے گی۔

حضرات! آج ہم جس جگہ جمع ہوئے ہیں، یہ ایک تاریخی مقام ہے۔ سابق ریاست بہاول پور کا علاقہ بے شمار برگزیدہ ہستیوں کے فیضان کا سرچشمہ رہا ہے۔ یہاں جن علمی روایات نے جنم لیا وہ آج ہماری ثقافت کا اہم جز ہیں۔ اوچ شریف جیسا علمی مقام بھی اسی خطے کا حصہ ہے، جس نے تیرھویں صدی عیسوی ہی میں ایک بلند مرتبت حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس علمی مرکز سے علم کی جو شعاعیں پھوٹیں ان سے پورے برصغیر پاک و ہند نے روشنی حاصل کی۔ اس خطے نے جن بزرگانِ دین کے نفوسِ قدسیہ سے فیضان حاصل کیا ان میں حضرت جہانیاں جہاں گشت ؒ جیسے فرزندانِ اسلام بھی شامل ہیں۔ جن کی تعلیمات آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

حضرات! عام طور پر اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی بہت سی وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ خدا رسیدہ بزرگوں اور صوفیائے کرام نے اس زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنا کر مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت کی اور اس طرح مذہب کی ترویج کے ساتھ ساتھ زبان کی ترویج کا فریضہ بھی انجام پا گیا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس موضوع پر ایک مفصل مقالہ لکھا ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ اردو زبان کی اشاعت میں صوفیائے کرام نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ عدیم المثال ہے۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ بہاول پور کا خطہ جو صدیوں سے صوفیائے کرام

لونیہ کا مرکز رہا ہے وہاں انھوں نے کس زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت علمی زبان فارسی تھی لیکن صوفیائے کرام کو عوام سے براہِ راست تعلق رکھنے کے لیے اسی زبان سے مدد مل سکتی تھی، جسے عوام سمجھ سکتے ہوں۔

صوفیائے کرام کے اردو کو ذریعۂ اظہار بنانے کے متعدد تاریخی شواہد موجود ہیں برصغیر کے تقریباً سبھی علاقوں کے بارے میں اہلِ علم نے تحقیق کرکے قدیم اردو کے نمونوں کا سراغ لگایا ہے۔ بہاول پور کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ اردو کے قدیم ترین نمونے جو دستیاب ہوئے ہیں، وہ اسی علاقے سے ملے ہیں۔ اس قدرے طویل تمہید سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بہاول پور، جو صوفیائے کرام کی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز تھا، ماضی میں اردو کا بھی ایک اہم مرکز رہا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اردو یہاں کے عوام کے مزاج میں دخیل ہوتی گئی اور آخرکار انیسویں صدی کے وسط میں اسے کسی حد تک سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوگیا۔ ۱۸۶۶ء میں یہاں سے "صادق الاخبار" کا جاری ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اردو اس خطے میں ایک ممتاز مقام حاصل کرچکی تھی اور جب تک کوئی زبان عوامی زندگی کا جزو نہ بن سکے اس وقت تک اس میں کسی اخبار کی اشاعت مفید ثابت نہیں ہوتی۔ گزشتہ صدی میں یہاں کے بہت سے ادیبوں نے اردو کی آبیاری کی اور آج بھی اردو کے بے شمار نام لیوا موجود ہیں جو اپنی سرگرمیوں سے اس زبان کی ترویج کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں اور انھی کی کوششوں کا ایک نتیجہ یہ اردو کانفرنس ہے۔

محترم حضرات! اس وقت اردو کو جو مسائل درپیش ہیں انھیں بآسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو حکومت سے متعلق ہے اور دوسرے وہ جو عوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک حکومت کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے، اس کی وضاحت صدرِ مملکت **فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں** کے ایک حالیہ بیان سے ہوچکی ہے، جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ اردو ہماری اپنی زبان ہے۔ یہ پاکستان ہی کی پیداوار ہے اور اسے غیر زبان نہیں سمجھنا چاہیے۔ جنابِ صدر کا بیان ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں جو اردو کو اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن ابھی اردو کے راستے میں ایک کڑی منزل آنے والی ہے اور وہ یہ کہ حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۹۷۰ء میں ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ جو اس امر کا جائزہ لے گا کہ اردو میں تعلیمی و سرکاری زبان بننے کی اہلیت ہے یا نہیں۔ صدرِ مملکت کے مذکورہ بیان کے پیشِ نظر، اس کمیشن کے بارے میں، میں نے اس سال یومِ بابائے اردو کے موقع پر عرض کیا تھا:

> "اب حکومت کو مجوزہ کمیشن کے مقصد میں تبدیلی کرنی چاہیے۔ یہ کمیشن اس لیے مقرر نہیں ہونا چاہیے کہ اردو کی اہلیت کا جائزہ لیا جائے۔ بلکہ اس لیے مقرر ہونا چاہیے کہ اردو کو سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کے لیے ٹھوس اور عملی تجاویز پیش کرے۔"

اپنی اس رائے کا میں اس وقت بھی اعادہ کرتا ہوں اور حکومت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجوزہ کمیشن کے دائرہ کار میں مناسب تبدیلی کرے تاکہ اردو زبان نے جس خطے میں جنم لیا تھا وہاں اسے وہ مقام حاصل ہو جو اس کا حق ہے۔

آئیے اب اردو کے ان مسائل کا جائزہ لیں، جن کا تعلق عوام سے یعنی ہم سب سے ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ اردو کو علاقائی زبانوں کا حریف سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک اردو کی ترقی علاقائی زبانوں کے لیے غیر مفید ہے

یا علاقائی زبانوں کی ترقی اردو کے منافی ہے۔ یہ ایک غیر سائنٹفک نقطۂ نظر ہے۔ اردو کی جو صورت آج ہمارے سامنے ہے، یہ علاقائی زبانوں ہی کی مرہونِ منت ہے، اس زبان کی ترقی کسی حالت میں بھی علاقائی زبانوں کی راہ میں حارج نہیں ہو سکتی۔ علاقائی زبانوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ کوئی بھی صحیح الدماغ شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ علاقائی زبانوں کو ترقی نہیں دی جانی چاہیئے۔ سب زبانیں ہماری اپنی زبانیں ہیں اور ان کی ترقی کے لیے سوچنا اور عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ہر علاقائی زبان کا ایک حلقہ ہوتا ہے اور وہ اپنے حلقے سے باہر بولی یا سمجھی نہیں جاتی۔ مغربی پاکستان میں کئی علاقائی زبانیں ہیں اور یہ سب اپنے اپنے علاقوں میں مروّج ہیں۔ ان علاقوں میں ان کی ترقی ضرور ہونی چاہیئے۔ لیکن جب ہم قومی سطح پر اس مسئلے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہی زبان اپنانی چاہیے جو ان سب علاقوں کے رہنے والوں کے لیے قابلِ فہم ہو۔ اس اعتبار سے اردو ہی وہ واحد زبان ہے جو پاکستان کے تمام علاقوں کی مشترکہ میراث ہے، اور یہی وہ زبان ہے جو مغربی پاکستان کے تمام علاقوں کی مشترکہ میراث ہے، اور یہی وہ زبان ہے جو مغربی پاکستان کے تمام باشندوں کے مشترکہ اظہارِ مطالب کا واحد ذریعہ ہے، ابھی علاقائی زبانوں کو اُردو سے اور اردو کو علاقائی زبانوں سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اردو اور علاقائی زبانوں کے مسئلے پر قومی نقطۂ نظر سے غور و فکر کریں۔ امید ہے یہ کانفرنس اس مسئلے پر افہام و تفہیم کے لیے راستے تلاش کرے گی تاکہ جہاں اردو کی ترقی کا کام آگے بڑھے وہیں علاقائی زبان والوں کو بھی یہ احساس نہ ہو کہ ان کی حق تلفی ہو رہی ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ہم اردو زبان کو سرکاری زبان بنانے کے لیے حکومت سے مطالبہ تو کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اپنا جائزہ نہیں لیتے اور یہ نہیں سوچتے کہ خود ہم نے اردو کے وہ حقوق ادا کئے ہیں کہ نہیں جو ہم پر واجب ہیں، اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہم نے اردو کے مطالبات پیش کرنے میں جس سرگرمی کا اظہار کیا ہے۔ اگر اتنی ہی سرگرمی کا اظہار ہم اردو کو اپنی عملی زندگی میں دخیل کرنے میں کرتے تو آج اُردو کو بہت سی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اردو کو سرکاری زبان بنانا یا یونی ورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم بنانا حکومت کی توجہ کے بغیر ممکن نہیں لیکن اردو کو عوامی زندگی کا جز بنانا تو حکومت کا فرض نہیں ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ روزمرہ کی معمولی معمولی باتوں میں بھی ہم انگریزی کا سہارا لیتے ہیں۔ دکانوں کے ناموں سے لے کر دعوتی رقعوں تک میں ہم انگریزی کے محتاج ہیں۔ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کسی قوم کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرات! اس موقع پر یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جب تک ہم خود اردو سے عملی دلچسپی کا ثبوت نہیں دیں گے۔ حکومت بھی ہمارے مطالبات سے کوئی دلچسپی نہیں لے گی۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اردو کو اپنی زندگی کا جز بنا لیں۔ آپ معاشرے کے کسی طبقے سے بھی تعلق رکھتے ہوں، تاجر ہوں، استاد ہوں، وکیل ہوں یا ڈاکٹر ہوں۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ غلامی کی یادگار انگریزی زبان کی بجائے اردو کو ذریعۂ اظہار بنائیں۔ کاروباری معاملات ہوں یا نجی مراسلت۔ ان سب میں اردو کو اوّلیت دی جائے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ کچھ عرصے میں حکومت کا رویّہ بھی تبدیل ہو جائے گا۔

یہاں میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ انگریزی سے ہمیں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ انگریزی دنیا کی ایک بڑی زبان ہے اور ں میں علم و فن کے بیش بہا خزانے موجود ہیں اس قول کے مصداق کہ علم کہیں بھی ہو ہماری میراث ہے۔ ہمیں انگریزی سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لیکن اسی حد تک کہ جس حد تک ہماری معاشرتی ضروریات اجازت دیں۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم انگریزی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔ یہ خام خیالی ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ان مغربی زبانوں کے بغیر جو ان پر مسلط تھیں اتنی ترقی کی ہے جو ساری دنیا کے لیے قابلِ رشک ہے۔ روس، جاپان اور چین جیسے ملکوں کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں، ہم بھی ان ملکوں کی تقلید کر کے اپنے آپ کو اقوامِ عالم کی نگاہوں میں ممتاز کر سکتے ہیں۔

حضرات! اب میں ایک اہم مسئلے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ ہے۔ آپ پر یہ حقیقت بخوبی واضح ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے کئی اہم اور کامیاب تجربے ہو چکے ہیں جن میں سرِ فہرست جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ اس جامعہ نے اردو کو جملہ علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم ایسے زمانے میں بنایا جب انگریزی کا جادو پوری طرح اپنا کام کر چکا تھا۔ ہر شخص کو اس پر حیرت تھی کہ یہ تجربہ کہیں دیوانے کا خواب ثابت نہ ہو لیکن دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ جامعہ عثمانیہ نے علم کے معیار کو نہ صرف بلند رکھا بلکہ آیندہ کے لیے ایک روشن مثال قائم کر دی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بابائے اردو نے جو جامعہ عثمانیہ کے بانیوں میں سے تھے، اس سمت میں پہلا اقدام کیا اور کراچی میں اردو کالج کی بنیاد رکھی۔ اس کالج میں گزشتہ بیس برس سے نہایت عمدگی کے ساتھ اردو کے ذریعے جملہ علوم و فنون کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس کالج نے ایک تابندہ مثال قائم کی اور اس کی تقلید میں بہت سے کالجوں میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ یہی نہیں، بعض یونی ورسٹیوں میں بھی اردو کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا یہ کام اگرچہ بڑی حد تک اطمینان بخش ہے لیکن اسے منزلِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ابھی اس جہت میں بہت سا کام باقی ہے۔ ابھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو اردو ذریعۂ تعلیم کی افادیت کے قائل نہیں، اور ایسے لوگوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مغربی پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں میں اردو کو اس کا جائز مقام نہیں مل سکا ہے۔ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کا یہی واحد ذریعہ ہے کہ صرف انھی تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی جائے جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصے بعد ہر جگہ اردو ہی نظر آئے گی۔

آج سے چودہ برس پہلے آپ کے اسی شہر میں بابائے اردو نے ایک اردو کانفرنس کی صدارت فرماتے ہوئے اردو یونی ورسٹی بنانے کا اعلان کیا تھا۔ اُن کا منصوبہ تھا کہ ایک ایسی یونی ورسٹی قائم کی جائے جو اردو ذریعہ تعلیم ہی کا نہیں بلکہ علمی تحقیق کا بھی ایک زبردست مرکز ہو۔ مرحوم نے اس سلسلے میں بہت کچھ ابتدائی کام کیا۔ لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر وہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بابائے اردو کے بعد انجمن ترقی اردو کی صدارت میرے سپرد ہوئی۔ میں نے تمام مسائل پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ فی الحال یونی ورسٹی کی بجائے اردو کالج ہی کو اس حد تک توسیع دی جائے کہ اس سے صرف کراچی ہی کے طالب علم نہیں بلکہ پورے پاکستان کے طلبہ مستفید ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے کراچی کے ایک عمدہ علاقے میں ایک وسیع قطعۂ اراضی حاصل کر لیا جس پر ایک اقامتی کالج کی عمارت کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔ اس عمارت کا سنگِ بنیاد صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے رکھا تھا۔ اس عمارت کا ایک حصہ تعمیر ہو چکا ہے۔ با

کام کی تکمیل کے لیے سرمائے کی فراہمی کا کام جاری ہے - خدا کی ذات سے توقع ہے کہ بہت جلد یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا اور پھر اس کے افادے کا دائرہ اس حد تک وسیع ہو جائے گا کہ اس میں پاکستان کے تمام علاقوں کے طالب علم تعلیم حاصل کر سکیں گے -

سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں ہمیں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان سے وہ حضرات بخوبی واقف ہوں گے جنھیں اس قسم کی تحریکات میں کام کرنے کا تجربہ ہے - میں پہلے بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ ہم اس منصوبے کو صرف حکومت کی امداد یا اہلِ ثروت کے تعاون سے مکمل نہیں کرنا چاہتے - میری یہ خواہش ہے کہ اس منصوبے میں تمام اردو دوست شریک ہوں اور وہ اتنی ہی مدد کریں جتنی ان کے حالات اجازت دیں - ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کم سے کم لوگوں سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کر کے اس منصوبے کو مکمل کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون اس طرح حاصل کیا جائے کہ مطلوبہ رقم حاصل ہو جائے اور اس طرح ہر اردو دوست کو یہ احساس ہو کہ اردو تحریک کے اس منصوبے کی تکمیل میں اس نے بھی ہاتھ بٹایا ہے مجھے امید ہے کہ آپ کے شہر کے اردو دوست اور مخیر حضرات اس کارِ خیر میں حصہ لے کر اردو تحریک کو مضبوط کریں گے -

آخر میں ایک مرتبہ پھر میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ کانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب ہو -

بہت جلد منظرِ عام پر آ رہا ہے
بہار اردو رائٹرس سرکل کا علمی و ادبی دوماہی ترجمان
مطالعہ
نگراں : کلیم الدین احمد
مجلسِ ادارت : ڈاکٹر محمد صدیق، ڈاکٹر کلیم احمد عاجز
ڈاکٹر خالد رشید صبا، ڈاکٹر ممتاز احمد
ہند و پاک کے مشاہیر اہلِ قلم کی نگارشات سے مزین
علمی و ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مقالات، منظومات اور افسانے
نیز عالمی ادب کا انتخاب
ضخامت : ۱۰۰ صفحات ● قیمت فی شمارہ ایک روپیا
ایجنسی اور دیگر تفصیلات کے لیے لکھیں
بہار اردو رائٹرس سرکل پوسٹ بکس ۱۳۱ پٹنہ ۴
فون — ۲۲۲۸۰

نصرتی

بابائے اردو

یہ کتاب ملک الشعرائے بیجاپور ملا نصرتی کے حالاتِ زندگی اور جائزہ کلام پر مشتمل ہے اس میں بابائے اردو نے بڑی تحقیق و جستجو سے نصرتی کے حالات جمع کئے ہیں نیز نصرتی کے غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب مع شرح و حواشی شامل کیا ہے

قیمت :- پانچ روپے

مرحوم دہلی کالج

بابائے اردو

مرحوم دہلی کالج کا شمار و ہند و پاکستان کے ان علمی اداروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس برصغیر میں اشاعت علم کی خدمت صحیح معنوں میں انجام دی ۔ دہلی کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور تمام علوم و فنون کی تدریس اردو کے ذریعے ہوتی تھی ۔ بابائے اردو نے اس کالج کی تاریخ اس کتاب میں بیان کی ہے ۔

قیمت :- چار روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کرا

اے ہم نفساں

ڈاکٹر سید عبداللہ

میں اپنا تعارف خود کرا رہا ہوں تاکہ دل کھول کر اپنی تعریف کر سکوں - اور اپنی کمزوریوں کو اچھی طرح چھپا سکوں !

اب پہلی بات یہ ہے کہ میں اصلاً مدرس ہوں - ۱۹۶۵ء تک یونیورسٹی میں مدرس رہا اور اب یونیورسٹی کا اعزازی استاد ہوں پر یہ اعزازی ! وہ یوں کہ مجھ سے دوسرے کام تو لئے جا رہے ہیں - مگر مجھے پڑھانے کی اجازت نہیں - یوں تو جس ادارے سے میں چالیس سال منسلک رہا، صدق دل سے اس کی خدمت کی اور اس کی ترقی کے لئے کچھ نہ کچھ کر سکا اب اس میں میرا نام لینا ممنوع ہے - ۱۹۶۶ء مجھے پروفیسر "امریطس" بنا دیا گیا مگر وہ پروفیسر جسے پڑھانے کی اجازت نہیں -

اس کی وجہ یہ ہے کہ میں پڑھا نہیں سکتا اور اچھا مدرس نہیں ہوں - ظاہر ہے کہ اس نالائقی کی سزا مجھے ملنی ہی چاہیئے - یوں ۱۹۶۵ء تک میرے طلبہ میری تدریس سے ناخوش نہ تھے اور بعض اب بھی میرے لطیفوں کو یاد کرتے ہیں اور غائبانہ محظوظ ہوتے ہیں -

بہرحال تدریس کے فن سے مجھے محبت ہے - اب بھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں کہیں پڑھاؤں - لیکن میرے شوقِ تدریس پہ وہی بدگمانی ہوتی ہے جو شاہ جہان پہ ہوئی تھی - کہتے ہیں جب اسے زندان میں ڈال دیا گیا تو اس نے دل بہلانے کیلئے پڑھانے کا مشغلہ اختیار کرنا چاہا - اس پر اسے کہا گیا: "ہنوز بوئے سلطانی از دماغ نرفتہ" - میں نے تو سلطانی کبھی نہیں کی ہاں میرے بارے میں شاید یہ سوچا جاتا ہوگا کہ ہنوز بوئے درویشی از دماغ او نرفتہ - یہ درویشی بھی تو بری بلا ہے -

دوسری بات یہ کہ میں قلم کا مزدور - یعنی قلم کا کوہکن ہوں میرے لکھے ہوئے دس پندرہ ہزار صفحے چھپ چکے ہیں اور ان میں سے بعض اوراق پسند بھی کیے گئے ہیں مگر میں خود اپنی ان چند سطروں کو نہ پا سکا جو مجھے عمر ابد دے سکیں تاہم میرا خیال ہے کہ میرا مضمون "میں اور میرا زمانہ" تھا - اور "بیری کا درخت" بھی کچھ نہ کچھ تھا ! اور درخت اور کفن پر بھی کچھ لوگ خوش ہوئے تھے -

یہ بھی سن رکھیئے کہ میں کباب اور پرقاب کا بے حد شائق ہوں - کھاتا کم ہوں سوتا زیادہ ہوں - سنتا کم ہوں سناتا زیادہ ہوں - غم مجھے عزیز ہے مگر میں اسے نشاط بنا سکتا ہوں -

میرا مسلک دردمندی ہے - ایک زمانے میں میں اس لفظ کا بکثرت استعمال کیا کرتا تھا - لیکن رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوا کہ ایسا آسان کام

نہیں جیسا بظاہر نظر آتا ہے کسی دوسرے انسان کے دکھ درد کو بانٹنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے پھر انسانی دکھ کی دنیا ہے کہ ان میں کبھی تو ہے اس پر کوئی تسلی کی دو باتیں ہی کر سکے تو غنیمت سمجھیے خصوصاً اس زمانے میں جبکہ ہر شخص اپنے سوا کسی کو تسلیم ہی نہیں کرتا - اپنا ہی غم کھاتا ہے اور اپنے ہی لئے جیتا ہے اس کے نزدیک باقی ساری دنیا اس کی دشمن ہے اور اپنا خیر خواہ وہ خود ہی ہے - تو اس عالم میں دوسرے کے دل کو سمجھنا کار دشوار ہے - لہٰذا میری انسان دوستی اب مشکوک ہے اور میں دردمندی کے دعوے میں اب کچھ زیادہ سچا نہیں رہا -

معلوم نہیں میرا مذہب کیا ہے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں خدا کی جستجو میں دور دور جاتا ہوں - اور محبت کی جستجو کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ عالمگیر ہو جاؤں - لیکن میرے سینے میں ایک جڑ مضبوطی سے پیوست ہے - وہ ہے اسلام کی محبت - میں ادب اور فکر کی وسعتوں میں دور دور تک گھومنے کا شائق ہو کر بھی ذہناً مسلمان ہی رہتا ہوں اور اس سے مجھے بڑی راحت ملتی ہے -

میں کسی زمانے میں نماز بہت پڑھا کرتا تھا - اب صرف دعا ہی کو نماز بنا لیتا ہوں - یا عاجزی اور نیاز کو ؛ جو خدا سے میرے دل کا رشتہ استوار رکھتی ہے - اسی لئے میں انسانوں سے بہت کم بیزار ہوتا ہوں - دشمن کو بھی دعا دینے کی عادت ہے - نفرتوں اور کدورتوں کی اس دنیا میں مجھے نظر آتا ہے کہ بالآخر ہر نفرت کا علاج انسان کی محبت ہی ہے - بس یہی میرا مذہب ہے ، میرا عقیدہ ہے کہ دوسروں کو برا کہنے کی بجائے اپنے آپ کو اچھا بنانا چاہیئے - اس طرح دنیا بہت وسیع ہو جاتی ہے اور محبت کی تسخیر اپنا اثر دکھاتی ہے در اصل دوسروں کو برا سمجھنے والا خود برا ہوتا ہے -

میرا عقیدہ ہے کہ زندگی کے چمن کو ہر وقت آراستہ رکھنا چاہئے اس کے لئے ضروری ہے کہ شفقتوں کے پھول کھلے رہیں ، پھر وہ قدم بھی راحت ہے جو بے غرض ہو لہٰذا شب و روز کے چند ایسے لمحے ضرور نکالتا ہوں جن میں وہ کام کرتا ہو - جو محض خدا کے لئے ہوں اور ان میں کوئی ذاتی نفع مطلوب نہ ہو -

میں زندگی کی بدنمائی اور فساد کے خلاف احتجاج کو بھی ضروری فریضہ خیال کرتا ہوں - اس وقت ہمارے معاشرے میں بدی کی قوت اس وجہ سے ہے کہ کوئی اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتا - ! میں کبھی کبھی سچ بھی بول سکتا ہوں - اگرچہ - میرا لہجہ ہر وقت محبت آمیز ہی ہوتا ہے - مگر ایک ادھ معاملے کے سوا میں عموماً بزدل آدمی ہوں -

میں انقلاب کا بھی معتقد ہوں - پے بہ پے انقلاب کا - یعنی مسلسل تبدیلی احوال کا مگر اس کے لئے پاکیزہ مقصد اور پاکیزہ ذرائع دونوں کو ضروری سمجھتا ہوں - میں انقلاب اور فساد کے فاصلے پر اصرار کرتا ہوں کیونکہ ہر اچھے انقلاب کی جڑیں روحانیت میں پیوست ہوتی ہیں - میں تن پروری کے انقلاب کو انقلاب ہی نہیں مانتا -

میرے دوستوں کی تعداد خارج از شمار ہے - لیکن میرے حقیقی دوست صرف میرے شاگرد ہیں جن کا اعتماد مجھے حاصل ہے اور میں مہمات زندگی میں انہیں پر بھروسہ رکھتا ہوں - میں جب کسی شاگرد سے ملتا ہوں تو بڑی وسعت پاتا ہوں میں نہ پاکستان کے مستقبل سے مایوس ہوں - نہ اسلام سے ، نہ انسان سے - جب تک مایوسی کی کوئی وجہ نہیں - ! اس شرط کے ساتھ کہ خدا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور محبت کا وسیلہ ترک نہ ہو -

زندگی میں مجھے اعزاز بھی بہت ملے اور انعامات بھی بہت حاصل ہوئے۔ نفرین سے زیادہ تحسین سنتا رہا۔ نفرت سے زیادہ محبت مجھے حاصل ہوئی۔ میرا دشمن اگر ایک ہے تو مجھے معاف کرنے والے ہزاروں ہیں۔

میں خدا کے اس انعام کا ہر وقت شکر ادا کرتا رہتا ہوں کہ زندگی میں تین چار قابل ذکر کام بھی کر سکا ہوں، پہلا کام تو یہ کیا کہ لڑکپن میں بسلسلۂ تحریک خلافت، لاہور سے بھاگ کر علی گڑھ چلا گیا اور رضا کاران خلافت میں شریک ہو گیا۔ آج جو سوچتا ہوں تو اپنے اس عمل کو زندگی کا واحد بے غرض عمل دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کا ثواب ملا ہے اور خدا نے اس کی وجہ سے مجھ پر بڑے بڑے انعام کئے ہیں جن کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔

میں ایسی زندگی کو کامیاب زندگی سمجھتا ہوں۔ اسکا باعث خدا کا کرم، میری محنت اور پھر یہ بات کہ مجھے میرے گھر کا تعاون حاصل ہے

ایک دوسرا قابل ذکر کام میں نے یہ کیا کہ اردو کا ایک خاموش جلوس نکالا اور بہت سی گالیاں کھائیں۔ خود ٹس سے مس نہ ہونے والوں نے اعتراض یہ کیا کہ خاموش جلوس کیسا؟ شکست و ریخت کے بغیر جلوس کا مزا کیا؟ مگر مجھے اس جلوس سے اس لئے خوشی ہوئی کہ اس میں شرافت موجود تھی اور پھر میری کوئی ذاتی غرض اس سے وابستہ نہ تھی،

ایک حرکت میں نے یہ کی کہ احتجاجاً ایک جلسے سے اٹھ کر چلا آیا اور کئی دن تک تن کر پھرتا رہا اخباروں نے خوب اٹھایا۔ میری خودپرستی نے مجھے خوب دھوکا دیا پھر ایک روز خیال آیا۔ کالے پانی کی سزا پانے والے مولویوں نے کیا کیا ظلم سہے اور اپنی تعریف نہ کی نہ کرائی۔ تم بیسویں صدی کے ماڈرن کتنے بے مایہ ہو کہ ایک مکھی اڑا کر پھولے پھولے پھرتے ہو۔ اس سے تمہارے حوصلے کا پتہ چلتا ہے ؎

جس کی بہار یہ ہو تو اس کی خزاں نہ پوچھ

اس خیال سے کئی روز ندامت رہی۔

تیسرا کام یہ کیا کہ میں نے ایک زمانے میں طلباء کے اس طبقے کی خدمت کی جس کو عرف عام میں غریبوں کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ میں ان کے دل تک پہنچتا رہا اور کچھ کر بھی سکا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ہماری تعلیم گاہوں میں کس طرح دکھ اور نامرادی کی کاشت ہوتی ہے۔ اس تاثر کے تحت د کے موجودہ نظام کو انسان کش، محبت کش اور شرافت کش سمجھتا ہوں۔ بہرحال میں تعلیم کو خدمت کا ذریعہ بنا سکا۔

اب چند باتیں اور۔ میں زندگی میں سب سے زیادہ قرآن کی ترتیل سے متاثر ہوتا ہوں۔ معنی سمجھ میں آجائیں تو سبحان اللہ۔ بغیر معنی کی ترتیل سے میرے اندر ترفع پیدا ہوتا ہے۔

مجھے اذان کی گونج بے حد متأثر کرتی ہے،۔ جب خاموش فضاؤں میں اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشہد ان محمد رسول اللّٰہ کی صدائے شہادت گونجتی ہے تو میں اپنے وجود سے خدا کی ہستی تک ایک نور کی لکیر کھنچی ہوئی دیکھتا ہوں۔ اور اب جب شہروں کے شور و غوغا میں یہ آواز کم پاتا ہوں تو مجھے اپنی ہستی بے دلیل معلوم ہونے لگتی ہے۔

مجھے شعر سے عشق ہے۔ شاعروں میں میر تقی میرے دل کا شاعر ہے اور غالب میرے ذوق کا سخنور، حافظ سے میں زندگی کا درس لیتا ہوں اور اقبال سے اپنے مستقبل کو پُر امید بناتا ہوں، کبھی کبھی نظیری کو بھی پڑھتا ہوں، اور رومی کو بھی اقبال کے حوالے سے دیکھتا ہوں۔

بلھے شاہ اور سلطان باہو کے دوہے بچپن سے میری رگوں میں پیوست ہیں، میں پنجابی سے اردو ہی کی طرح محظوظ ہوتا ہوں میں زبانوں کے تنازعے میں بے تعصب ہوں اور اس مسئلے کو ذوقی، علمی، عقلی اور ملکی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ میری مادری زبان ہندکو ہے مگر میں اس وقت اس زبان کے حقوق کا سوال نہیں اٹھاؤں گا جب تک قومی زبان کا حق انگریزی سے چھین نہیں لیتا۔

میں ناول اور افسانے کا معتقد نہیں ہوں۔ میرا مرغوب مضمون مطالعہ سوانح عمری ہے، میں افسانہ کی حقیقت کو واقعہ کی صداقت سے کمتر خیال کرتا ہوں پھر ہمارے ناول میں غرض مندی اور سیاسی ملاوٹ بھی بہت ہے۔ ہمارے افسانے خود کو خود سے بیزار کر کے انسان کو انسان کا دشمن بناتے ہیں۔ البتہ مجھے قاسمی کی انسان دوستی، اشفاق احمد کے شفقتوں والے افسانے، انتظار حسین کی وہ کہانیاں جو ملکی تہذیب کی مصوری کرتی ہیں۔ حجاب کے ناول اور خواب آلود کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ الطاف فاطمہ کے فن کی بھی میں قدر کرتا ہوں۔

میں سینما کا شوقین ہوں اور ڈرامے کی اہمیت میں بھی یقین رکھتا ہوں۔ سینما میری تفریح اور ڈرامہ میرے نزدیک روح زندگی ہے مگر اس ملک میں دونوں کا انحطاط ہے، میرے اعصاب اب ان دونوں سے تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں۔ ہمارا ڈرامہ ہماری روحانی آرزوؤں کا عکاس ہو تو تب بات بنتی ہے۔ فی الحال یہ بات نہیں۔ وجہ یہ کہ ڈرامے والے اکثر تاجر ہیں۔ دردمند انسان نہیں۔ نہ فن کے عاشق ہیں۔ ان میں سے بعض غیر ملکی تہذیب کے مبلغ ہیں اور اپنی تہذیب میں انہیں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں ڈرامہ کیا پیدا ہوگا۔ ڈرامہ محبت اور درد سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہاں غائب ہے۔

میں روس کے انسان دوست ادیبوں کا بے حد مداح ہوں۔ طالسطائے اور دوستوفسکی میرے دل کے قریب ہیں۔ میں کمیونزم کا بھی مداح رہا ہوں کیوں کہ یہ بہرحال انسانی مسئلے کا ایک فلسفہ ہے مگر اپنے ملک کے اشتراکیوں کے جھوٹے اور بے سوز طرزِ زندگی کی وجہ سے میں دور بھی ہوا ہوں۔ میں کمیونزم سے خائف نہیں اور اسکے ہمدردانہ مطالعے کا قائل ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اسلام میں وہ قوت ہے کہ ایک روز وہ کمیونزم کو اپنے اندر جذب کرے گا — میری نظر میں کمیونزم کی اصلی روح اب گم ہوتی جا رہی ہے۔ انسان دوستی کی بجائے پارٹی کا تعصب اور جبر غلبہ پا رہا ہے۔ اور دنیا کی سیاسیات میں کمیونزم بھی انسانیت سے زیادہ اپنے ملک اور پارٹی کے خاص مفاد پر نظر رکھتا ہے میرے خیال میں یہ تبدیلی مفید ہے۔ کیونکہ اس خلا میں اسلامی فکر کے لئے پھر کام کی گنجائش نکل آئی ہے!

میں نوجوانوں سے محبت رکھتا ہوں مگر مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ ان میں انقلاب کی تڑپ نہیں۔ بلکہ احتجاج کی عادت بھی نہیں۔ وہ افیونیوں کی طرح سب کچھ دیکھتے ہیں مگر ردعمل کا اظہار نہیں کرتے۔ اس کے بے شمار اسباب ہیں مگر یہ موضوع بحث کا نہیں۔

مجھ سے پوچھا جاتا ہے: نوجوانوں کے لئے کوئی پروگرام؟ میرا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی تربیت اور حلال روزی کا سامان ہونا چاہیئے اس کے بعد اپنے اندر نیک جذبوں کی پرورش کرنی ہو گی۔ غصے اور تن پروری سے ابھرنے والے جذبے۔ بلکہ حسن زندگی کا تحفظ اور ادراک کرنے والے جذبے نہیں۔ بلکہ حسن زندگی کا تحفظ اور ادراک والے جذبے!

پھر ان نیک جذبوں کی روشنی میں زندگی کی ہر بدنمائی کے خلاف ایک ردعمل پیدا کرنا ہو گا۔

پھر اس ردعمل کے اظہار کی قولی اور عملی صورتیں اختیار کرنی ہوں گی۔ اور تنظیم کے ذریعے تبدیلی احوال کی کوشش بھی! — ؟

اس کے لئے مشق اور ریاضت کی ضرورت ہوگی لہٰذا ابتدا چھوٹے کاموں سے کرنی ہوگی کیونکہ اگر آپ سے ایک معمولی سی مہم سر ہو جائے گی پ کا دل بڑھے گا اور آپ مہمات میں لذت محسوس کرنے لگیں۔

اگر میں بے عمل نہ ہوتا اور آزاد ہوتا تو میں اپنے عزیزوں کا ناصح بننے سے پہلے چند کام خود کر گزرتا: مثلاً:

۱۔ کیلے اور خربوزے کے چھلکوں کی بے پروا تیر اندازی کو روکتا جو پھلوں کی دکانوں کے پاس ہر وقت ہوتی رہتی ہے۔ پھر ڑکوں کو صاف کراتا اور نوجوان مرد و زن کو چلنے پھرنے کے آداب سے آگاہ کرتا۔

۲۔ غلاظت کے ڈھیروں کو دور کرانے اور شہر کی صفائی کے لئے مہم مرتب کرتا۔

۳۔ شہری حقوق کے لئے کارپوریشن اور ٹرسٹ سے لڑائی لڑتا۔

۴۔ شہر کی دیواروں کو اشتہاروں سے بدنما نہ ہونے دیتا۔

۵۔ سینما کے فحش اشتہاروں کے خلاف موثر احتجاج کرتا۔

۶۔ امریکی فلم کے خلاف مظاہرہ کراتا۔

۷۔ ٹیلی ویژن کی اخلاق کش پالیسی کے خلاف ہنگامہ کراتا۔

۸۔ ملکی اخبارات کے اس رجحان کے خلاف احتجاج کرتا کہ اس کے بعض حصے ہماری تہذیب کو بری نیت سے بلیک میل کر رہے ہیں

۹۔ تعلیم گاہوں میں مخلوط کیفے ٹیریا بند کراتا۔

۱۰۔ عورتوں کو آزادی دے کر انہیں نیچی نظر کی تہذیب سے آگاہ کرتا۔

۱۱۔ ان استادوں کے خلاف ہنگامہ کراتا جو اپنی کلاسوں میں ملک کی اہم بنیاد (اسلام) اور اخلاق کے خلاف، ہرزہ سرا ہوتے ہتے ہیں۔

۱۲۔ علاقائیت کے خلاف سر، دھڑ کی بازی لگا دیتا تاکہ ملک کی وحدت برقرار رہے کیونکہ ہم پنجابی اور پٹھان ہونے سے یادہ اور اس سے پہلے مسلمان ہیں۔

۱۳۔ انسان کی آزادی اور شرافتوں کی بحالی کے لیے لڑتا۔ جمہوری ذوق پیدا کرنے کے لئے تربیت کی صورتیں پیدا کرتا اور یہ بتاتا جمہوریت فرد کی آزادی بھی ہے مگر شرافتوں کی خود عائد کردہ پابندی بھی ——— جو لوگ جمہوریت کو نری آزادی سمجھتے ہیں غلطی پر ہیں —— مہوریت آزادی مع پابندی کا دوسرا نام ہے۔ میرے نزدیک بنیادی جمہوریت سے پہلے بنیادی دیانت داری کا پیدا کرنا ضروری ہے۔

۱۴۔ — اور اگر ان کاموں کو اپنی طاقت سے باہر سمجھتا تو یہ چھوٹے کام تو ضرور کرتا۔

(۱) شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کرتا۔

(۲) شاہراہ قائداعظم کے دکانداروں کی انگریزی پرستی کے خلاف جہاد کرتا۔

(۳) شاہراہ قائد کے تاجروں کے خلاف مقدمہ ہو تاکہ وہ قائد کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

میرے نزدیک یہ سب پروگرام قابلِ عمل ہیں۔ مگر ان پر عمل کون کرے گا: مسلمان درگور، اور مسلمانی درکتاب، اور کتاب درجزدان، اور جزدان بر طاق — اور وہ طاق جس پر جزدان تھا اب غفلت کے کمرے میں ہے سڑک وہ آباد ہوتی جا رہی ہے جو جم خانہ اور انٹر کانٹی نینٹل کو اور والٹن کو جاتی ہے۔ خدا کرے۔ یہ بھٹکا ہوا ہو پھر حرم کے راستے پر آجائے مگر جب تک میرے جیسے ناصحانِ بے عمل موجود ہیں جو خود کچھ نہیں کرتے اور اوروں کے لیے تلقین شاہ بنے رہتے ہیں یہ سب باتیں باتیں ہی ہیں — ہاں اگر نوجوان کچھ کر گزریں تو ان بوڑھے درختوں کے پتے بھی شاید ہرے ہو جائیں۔

قدیم اردو

بابائے اردو

یہ کتاب بابائے اردو کے مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو کے قدیم مصنفین اور کتب سے متعلق ہیں قدیم اردو کی ادبی اور لسانی خصوصیات کا اندازہ کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:-

بیجا پور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان
حیدرآباد دکن کا ایک شاعر خاندان
دکنی اردو میں شاہنامے کی داستان
کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ
شرح تمہید ہمدانی
"سب رس" از ملا وجہی
گجری یا گجراتی زبان
پرانی اردو میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں
اردو زبان کا قدیم کتبہ
مثل خالق باری
مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ
سب رس منظوم

قیمت:- پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

اردو میں تدوین

انصار اللہ نظر

تقریباً دو سال قبل ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے حیدر بخش حیدری کا تذکرہ گلشن ہند مدون کر کے شایع کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ فی الاصل انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے سہ ماہی رسالے "اردو ادب" کے شمارہ نمبر ۳ ۱۹۶۶ء میں چھپا تھا۔ قراین سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تذکرے کے اوراق "اردو ادب" ہی کے OFF PRINTS ہیں۔ جلد بندی کرا دینے کے بعد علمی مجلس دہلی نے تذکرے کی اشاعت کا شرف حاصل کر لیا ہے۔ اردو ادب کے شمارہ نمبر ۳ ۱۹۶۶ء (جس میں یہ تذکرہ بھی شامل ہے) کی قیمت تین روپے ہے لیکن علمی مجلس نے تذکرے کی ایک جلد کی قیمت پانچ روپے مقرر کی ہے۔ تذکرے میں "اردو ادب" کے مذکورہ شمارے کا کوئی ذکر نہ ہونا غالباً سہواً ہے یا کسی مجبوری کے تحت، اسے ارادی عمل کہنا اس لیے مناسب نہیں کہ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے اہل تحقیق حقایق کی دریافت کر کے ان کا انکشاف کرتے ہیں حقایق کی اور خصوصاً ایسے حقایق کو جن سے غلط فہمی کے امکانات ہوں نظر انداز عام حالات میں بھی نہیں کرتے۔

تذکرہ ہذا کے حواشی میں بعض اضافے نمایاں طور پر بعد کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ کاتب نے جا بجا یہ جملے چھوڑ دیئے تھے اور بعد میں ان کو شامل کرنا پڑا قرین قیاس کم ہے اس لیے کہ اس صورت میں یہی کیفیت دوسرے مضامین میں بھی ہوتی جو نہیں ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدون نے آخر آخر تک حواشی لکھے ہیں اور اس کا بھی امکان ہے کہ بعض باتیں پھر بھی شامل نہ ہو سکی ہوں۔

تذکرے کا مقدمہ (تمہید) دس صفحات پر محیط ہے جس میں مصنف کے حالات کافی جستجو اور تلاش کے بعد لکھے گئے ہیں، حیدری کی مختلف تصانیف کا تعارف بھی کرایا گیا ہے، یہ ایک قابل قدر کام ہے۔ تدوین کے سلسلے میں جو اصول اپنا لیے گئے ہیں یا جو مسائل سامنے آئے ہیں ان کا ذکر مختصراً ایک جملے میں ملتا ہے۔

"متن کی تصحیح و مراجعت میں بہت کھکھیڑ اٹھانی پڑی لیکن پھر بھی کچھ مقامات مشتبہ رہ گئے" (ص ۲) یہ واقعہ ہے کہ تدوین کا کام نہایت مشکل اور دقت طلب ہے۔ نئی نسل کے لیے پچھلے بزرگوں کے تجربات اور مشاہدات کی خصوصی اہمیت ہے تاکہ ان کی رہنمائی ہو سکے۔ مدون گلشن ہند کے طریقہ کار اور ان کے تجربات کا اندازہ کرنے کے لیے اس تذکرے کا بغور مطالعہ اہم ہے۔

عام رواج کے مطابق اس تذکرے کی ترتیب اصل کے مطابق ہے۔ مرتب نے اگرچہ واضح طور پر اس کا ذکر نہیں کیا لیکن ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے لیکن اس ترتیب کا پورا التزام نہیں ہے ذیل کی مثالوں سے اس کا ندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آفتاب، آصف، انجام، امید، آرزو، اشتیاق، آبرو

بیدار، پرواز (پروازعلی) پروانہ (جسونت سنگھ)، بسمل

جرات (قلندربخش) جوان، جوشش، جوہر، جودت، جرات (شیرعلی)

مدون کے لیے یہ بات بالکل ضروری نہیں کہ وہ اصل کی ترتیب میں کوئی فرق پیدا کرے، ہاں اگر یہ بات کسی وجہ سے ضروری معلوم ہوتی ہے تو میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ زیادہ قباحت بھی نہیں۔

اس سے پہلے میں نے جن تذکروں کا ذکر کیا ہے ان کی تدوین ایک ہی مخطوطے کی بنیاد پر عمل میں آئی تھی یہ تذکرہ اس لحاظ سے زیادہ قابل قدر ہے کہ اس کے فاضل مدون نے بڑی کوشش اور تگ و دو کے بعد اس کے دو مخطوطے تلاش کرلئے۔ ان کی اس جد و جہد سے علمی طور پر جو فائدہ ہوا ظاہر ہے اور اس کا اعتراف نہ کرنا یقینی طور پر زیادتی ہوگی۔ دو مخطوطات کے مل جانے کے بعد تصحیح متن کا کام اگر آسان ہوگیا تو اس سے دقت کی بھی ایک صورت پیدا ہوگئی یعنی اختلاف کی صورت میں اخذ و ترک کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ یہاں مدون کو اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لانے کا موقع حاصل ہوا۔

تذکرے کے بغور مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ:

۱۔ قلمی نسخوں میں جو اختلاف پایا گیا اس کی حاشیے پر نشان دہی کردی جائے۔

۲۔ ایسے اختلافی مواقع پر ایک نسخے کی عبارت کو ترجیح دے کر اسے متن میں شامل کیا گیا ہے اور دوسرے کو حاشیے پر تحریر کردیا گیا۔ اس سلسلے میں دو طریقہ کار ہیں۔

اول یہ کہ کسی ایک نسخے کو بنیاد بنا لیا جائے اس کی عبارت کو من و عن متن میں لکھا جائے اور دوسرے کے اختلافات کی نشاندہی حاشیے پر کردی جائے۔

دوم یہ کہ دونوں میں جس کی عبارت زیادہ موزوں، مناسب اور صحیح معلوم ہو اسے متن میں جگہ دیں اور دوسری صورت حاشیے پر ہو۔ البتہ اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ مدون اپنی پسند و ناپسند، اپنی علمیت اور اپنے مزاج و مذاق کے مطابق یہ فیصلہ نہیں کرے گا بلکہ مصنف کے زمانے، حالات، اس کی علمیت اور اس کے انداز فکر کو سامنے رکھ کر ایک صورت کو قبول اور دوسری کو مسترد کرے گا یعنی بہترین متن Best Text کا تعین مصنف کے نقطۂ نظر سے کیا جانا چاہیئے نہ کہ مدون کے خیال کے مطابق۔ مناسب یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ایک صورت کو اخذ کرنے اور دوسری کو ترک کرنے کی وجہ بھی حاشیے پر بیان کردی جائے تاکہ قاری کے لیے الجھن کی صورت نہ ہو۔ تذکرہ ہذا میں اس نوعیت کے اخذ اور ترک کے اسباب بتانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

۳۔ جہاں دو مخطوطوں میں اختلاف کی صورت ہو اور دونوں صورتیں اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے بامعنی اور مناسب بھی ہوں مناسب تر یہ ہے کہ مدون اس بات کا تعین بھی کر دے کہ ان دونوں میں کون سی صورت زیادہ صحیح ہے، اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ ہمیں دوسرے بہت سے مآخذ کا سہارا لینا ہوگا۔ یہی تدوین کی دقت بھی ہے اور اس فن کا حسن بھی۔

گلشن ہند کے جو دو مخطوطات دستیاب ہوئے ہیں ان کے متن میں بعض اہم اختلافات ملتے ہیں ممکن ہے کہ ان کی مدد سے دونوں کی اہمیت اور زمانۂ کتابت وغیرہ کا بھی تعین کیا جا سکے مثال کے طور پر:

افسوس کے حال میں یہ جملہ "اور اس خاکسار کو نہایت ان کی خدمت میں بندگی ہے" صفحہ ۳۸

بجوآن کے حال میں یہ جملہ "اس فقیر کو ان کی خدمت میں نہایت بندگی ہے" صفحہ ۴۸

، جملے نسخۂ لندن میں نہیں ہیں اسی طرح مولف کے اشعار تو ہیں لیکن "مولف کا ترجمہ" بھی نسخۂ لندن میں موجود نہیں ہے (حاشیہ صفحہ ۵۱) لتبہ نسخۂ لندن میں خاتمے کی عبارت ملتی ہے۔ یہ باتیں اہم ہیں اور ان سے سرسری نہیں گزرا جا سکتا۔

گلشن ہند کے زیر نظر مطبوعہ نسخے میں متن میں کچھ اضافے ملتے ہیں، یہ اضافے چار طرح کے ہیں۔ اول وہ جو دو میں سے کسی ایک لوطے کی مدد سے کیے گئے ہیں مثلاً

صفحہ ۲۹ پر آشنا کے حال میں ہے " (سراج الدین) علی خاں کے ہمعصر تھے" حاشیے پر ہے "اضافہ از نسخۂ لندن"

دوم وہ جو کسی دوسرے مآخذ کی بنیاد پر ہیں مثلاً

صفحہ ۶۸ "شاکر تخلص .... محمد علی (حشمت) کے دوستوں میں تھے"

حاشیے پر ہے "اضافہ از گلزار ابراہیم"

حشمت محمد علی کا تخلص ہے، ضروری نہیں کہ ہر موقع پر نام کے ساتھ شاعر کا تخلص بھی شامل کیا جائے۔ نام کی اپنی افادیت بھی لم ہے اور اس سے بھی کسی شخص کی شناخت ہو جاتی ہے۔

سوم وہ جن کی ذمہ داری "اضافۂ مرتب" یا "اضافہ از مرتب" لکھ کر فاضل مدون نے قبول کی ہے لیکن اپنے مآخذ کا حوالہ نہیں مثلاً

صفحہ ۹۰ پر ہے	مجنوں تخلص، نام (شاہ) مجنوں
" ۹۱ "	مشتاق تخلص نام (میر) حسن
" ۱۰۰ "	ہویدا تخلص نام (میر محمد اعظم)
" ۱۰۲ "	یار تخلص نام میر امجد شاہ، اللہ (یار) کے بیٹے

صورت میں بعض اضافے مثلاً آخر الذکر دو، تو مناسب اور اہم ہیں کہ ان سے متن کی تصحیح ہوئی لیکن بعض اضافوں کے لیے مناسب جواز معلوم نہیں ہوتی مثلاً اول الذکر دو، "شاہ" یا "میر" اصل نام کا جزو نہیں مصنف نے اگر شاہ مجنوں کو مجنوں اور میر حسن کو

حسن لکھا تو بظاہر یہ نہ اس کی غلطی ہے اور نہ کوئی قابل گرفت بات اور متن میں کسی غیر ضروری اضافے کو بہ مشکل ہی جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

اضافوں کی چوتھی صورت یہ بھی ہے کہ "اضافہ مرتب" وغیرہ الفاظ بھی نہیں لکھے گئے ہیں اس کی بھی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

مرزا جعفر (علی) حسرت صفحہ ۷۴
حسرت تخلص نام (میر) محمد حیات صفحہ ۵۴
حزیں تخلص نام میر (محمد) باقر صفحہ ۵۲
حیدر تخلص نام میر حیدر (علی) شاہ صفحہ ۵۳

جعفر علی کو جعفر، محمد باقر کو باقر، حیدر علی کو حیدر کہنا نہ روزمرہ میں غلطی کہی جائے گی اور نہ یہ بات ایسی ہے کہ متن میں اس کی تصحیح کی جائے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس نوعیت کی تصحیحات کا التزام بھی نہیں کیا گیا چنانچہ جعفر علی حسرت کا نام اسی تذکرے میں حسب ذیل صورت میں بھی لکھا ہوا ہے:

مرزا جعفر حسرت صفحہ ۶۴
میر جعفر علی حسرت صفحہ ۷۴

اول الذکر صورت میں جعفر کی تصحیح "جعفر علی" سے نہیں کی گئی، اور دوسری صورت میں مرزا اور میر کے اختلاف پر توجہ نہیں دی گئی کہ اس فرق سے بحث کرکے یہ متعین کیا جاتا کہ صحیح کیا ہے۔

اضافوں کی جو چار صورتیں اس تذکرے میں ملتی ہیں ان کے متعلق میرا خیال ہے کہ پہلی صورت تو مناسب ہے کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک مخطوطے میں جو الفاظ یا فقرے نہیں ہیں اور دوسرے میں ہیں اور وہ سیاق و سباق کے لحاظ سے مناسب اور ضروری بھی ہیں وہ مصنف نے لکھے ہوں۔ اور ایک نسخے کے کاتب سے سہواً چھوٹ گئے ہوں۔ دوسری صورت اس طور پر مناسب نہیں، ایک سے زاید مخطوطات میں (خصوصاً اس وقت جب کہ بظاہر ان میں سے ایک دوسرے کی نقل بھی نہیں) کسی عبارت کا مح ہونا غالباً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خود مصنف کا سہو ہو یا عمداً اس نے ان الفاظ کو نہ لکھا ہو۔ اگر سیاق و سبا اس لفظ یا فقرے کے لازماً مقتضی ہوں تو اسے متن میں شامل کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے حاشیے پر وجہ جواز بھی دی جائے تو بہ ہے۔ تیسری اور چوتھی صورت میں عملاً کوئی فرق نہیں۔ اس نوعیت کا اضافہ دوسری شکل کے مطابق کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ قوی دلیل ہو اور اضافہ ناگزیر ہو، محض عبارت کی توضیح، یا کسی ادھورے نام کی تکمیل یا اس کے تعین کے لیے اگر مدون اپنی علم کی بنیاد پر کوئی اضافہ کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق تو ہے لیکن حاشیے پر، متن میں کوئی لفظ (بجز اس کے کہ یہ بات کسی ذ سے متعین ہو جائے کہ وہ کسی سہو کی بنا پر ہو گیا ہے) شامل کرنا تصرف کے مترادف ہے۔ تذکرہ ہذا میں اضافوں یا بقول م "قیاسی اضافوں" کی مثالیں کافی ملتی ہیں سرسری طور پر چند اور درج ذیل ہیں۔

نام قزلباش (خاں) صفحہ ۲۳

سعادت .... مرید (شاہ) ولایت اللہ کے صفحہ ۶۷

" احدی تخلص .... نام احمد وارث " صفحہ ۳۵

حاشیے پر ہے " اصل احمد " ۔ اس تصحیح کا سبب کیا ہوا اور کس بنیاد پر یہ تصحیح کی گئی اس کا کوئی مذکور نہیں ہے ۔

تذکرہ ہذا میں متن کی تصحیح پر بھی بہت محنت کی گئی ہے چنانچہ بعض مثالیں درج ذیل ہیں ،

صفحہ ۳۱ ۔ اولی تخلص .... نام میر (اولاد علی) ..

حاشیے پر ہے " اصل اولاد ، اور پہلا مصرع اس طرح ہے :

بتاں ہر چند بہلاتے ہیں میرے دل کو میر اولاد "

اصل سے اختلاف کی وجہ نامعلوم ہے ۔

صفحہ ۲۶ " انصاف .... بعہد محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے تھے "

حاشیے پر ہے " اصل بعد ۔ سال وفات ۱۱۹۱ھ (بھگوان داس) تذکرہ مسرت افزا میں سال وفات ۱۱۸۶ھ "

محمد شاہ کا زمانہ ۱۱۶۱ھ تک رہا ۔ اگر مصنف نے انصاف کے متعلق یہ لکھا تھا کہ " بعد محمد شاہ .... کے تھے " تو یہ بات تصحیح طلب کیوں کر ہوئی ؟

صفحہ ۵۰ " جگنو خالہ زاد شیر افگن خاں کے "

حاشیے پر ہے " دونوں نسخوں میں " خانہ زاد " ۔ اس خانہ زاد کو " خالہ زاد " کیوں بنایا گیا اس کا کوئی ذکر نہیں ہے ۔

صفحہ ۲۵ " آبرو ۔ بعہد محمد شاہ .. رحلت کر گئے "

حاشیے پر ہے " دونوں نسخوں میں بعد درج ہے بعہد قیاسی تصحیح ..... آبرو کا سال وفات عام طور پر ۱۱۶۱ھ بتایا جاتا ہے (بیل ... ، سکسینہ .... ، نظامی ..) لیکن صحیح ۱۱۴۶ھ جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے ثابت کیا ہے .... ان پر تاریخ محمدی کا اضافہ کیا جائے جس میں تاریخ وفات ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ درج ہے ۔

اگر یہ بات صحیح ہے کہ " آبرو کا سال وفات عام طور پر ۱۱۶۱ھ بتایا جاتا ہے " اور حیدری نے بھی یہی کیا تو اس کی تصحیح متن میں کیوں کر لازم آئی ۔ حاشیے پر اس کے قول سے اختلاف کیا جا سکتا تھا ۔ ۱۱۶۱ھ میں محمد شاہ کا انتقال ہو چکا تھا ۔

صفحہ ۲۵ " آبرو تخلص ، نام شاہ نجم الدین "

حاشیے پر ہے " لندن اور آکسفورڈ کے دونوں نسخوں میں آبرو کا نام " شاہ نجم الدین علی خاں آرزو درج ہے قیاسی اضافے کی چار صورتیں اوپر پیش کی جا چکی ہیں ۔ آشنا کے حال میں کہا جا چکا ہے کہ مصنف نے خان آرزو کو " علی خان آرزو " لکھا ہے ظاہر

ان مصنف کا مقصد یہ تھا کہ

"شاہ نجم الدین (شاگرد) علی خاں آرزو"،

، امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا خصوصاً اس وقت جب کہ اسی تذکرے میں ہر نوعیت کے اضافے کئے گئے ہیں

سرب سکھ دیوآنہ کا نام مصنف نے ہر جگہ سرب سنگھ لکھا ہے ہر جگہ اس کی تصحیح اس طرح کی گئی ہے

صفحہ ۵۳ "حیران .... سرب سکھ کے شاگرد حاشیہ : "اصل سرب سنگھ"

، ۵۹ "دیوانہ تخلص نام رائے سرب سکھ" حاشیہ : "دونوں نسخوں میں سرب سنگھ۔ یہ غلطی بہت عام ہے"

دو کے کئی قدیم تذکروں میں اس کا نام سرب سنگھ ہی لکھا ہوا ہے، حیدری نے بھی ایسا ہی کیا، متن میں وہی صورت انسب ی، حاشیے پر بحث کی جاتی اور اس غلطی کی تصحیح کر دی جاتی ۔

مجھے اس پر ہرگز اصرار نہیں کہ حیدری نے جو کچھ لکھا تھا وہ سب صحیح ہی تھا لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ حیدری نے جو کچھ ماتھا متن اگر بجنسہٖ اسی کے مطابق پیش کیا جاتا اور حاشیے پر اس کے اختلافات سے بحث کی جاتی اس کی غلطیوں کی تصحیح کی جاتی بات اور ہوتی، متن کو دیکھ کر اہل تحقیق پھر مسائل پر غور کر سکتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ مزید تحقیق میں نتائج کچھ اور برآمد وتے۔ متن میں تحریف و تصرف خواہ نیک نیتی سے ہی ہو بہرحال تحریف و تصرف ہے ۔

اصلاح اور اضافوں کا سلسلہ ناموں تک ہی محدود نہیں بلکہ عبارت میں بھی یہ صورتیں ملتی ہیں اور زیادہ افسوس ناک قامات وہ ہیں جہاں مفہوم بھی بدل گیا ہے مثلاً

صفحہ ۸۷ "علم موسیقی (میں) بھی (مناسبت) رکھتے تھے"

سل فقرہ "علم موسیقی بھی رکھتے تھے" کا مفہوم دو لفظوں "میں" اور "مناسبت" کے اضافے کے بعد جس طرح بدل گیا ہے اس کا اندازہ ہل زبان بخوبی کر سکتے ہیں ۔ پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس اضافے کے بعد جملے کی ساخت اب سے ڈیڑھ سو سال قبل کے ماورے کے مطابق نہیں رہ گئی ۔

صفحہ ۹۳ "زبان ہندی میں دو ہزار چار سو دوہے کہے کبھی کبھی (اردو) شعر بھی کہتے تھے" جس زمانے کی یہ تحریر ہے س وقت اس زبان کے لیے "اردو" کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی ۔ مصنف نے ہر موقع پر اس زبان کے لیے لفظ "ہندی" ہی لکھا ہے مثلاً

"میرے پاس ہندی کے دیوان متعدد ہیں" صفحہ ۲۱

"اعلا علی ..... کبھی کبھی شعر ہندی کہتے تھے" " ۳۴

جملہ مذکور میں لفظ اردو کا اضافہ لسانی نقطۂ نظر سے بھی نامناسب ہے اور مفہوم بھی اس سے بدل گیا، مصنف کا مدعا یہ تھا کہ اس شاعر نے ہندی (اردو) میں دوہے بھی کہے تھے اور ہندی (اردو) میں شعر بھی کہتا تھا متن کی مطبوعہ صورت میں ایک ہی

جملے میں ہندی اور اردو دونوں الفاظ کا استعمال ان کے دو مختلف زبان ہونے پر دال ہے جب کہ یہ بات مصنف کے وہم و گمان ں بھی نہ رہی ہوگی ۔

دونوں نسخوں میں اختلاف کی صورت میں عموماً دونوں شکلوں کو پیش کر دیا گیا ہے لیکن نہ ان میں سے کسی ایک کی ترجیح اسباب بتایا گیا ہے اور نہ یہی متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ دونوں میں سے صحیح کیا ہے مثلاً

صفحہ ۹۱ پر مشتاق کا نام متن میں " ہاشم قلی خاں " لکھا ہے اور حاشیے پر نسخۂ آکسفورڈ کے حوالے سے " ہاشم علی خاں " تحریر یا ہے ۔ صحیح کیا ہے ؟ اس کا کوئی جواب اس تذکرے میں نہیں ملتا ۔

وہ چیز جسے تدوین میں تصحیح و تنقید متن کے بعد سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے تحشیہ ہے تذکرہ ہذا کی تدوین میں حاشیے ہت لکھے گیے اور غالباً اس پر فاضل مدون کو فخر بھی ہو ۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ایک شاعر کے متعلق اتنی زیادہ معلومات یک جا ردینا بڑا کام ہے اور اس سے تحقیقی کام کرنے والوں کو بلاشبہ بہت مدد مل سکتی ہے ۔ اس مضمون کے شروع میں میں نے یہ لکھا ہے کتابت دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید تحشیے کے سلسلے کا کچھ مواد فاضل مدون کے پاس باقی رہ گیا جو غالباً کسی عجلت یا بوری کے تحت اس میں شامل نہیں ہو سکا ۔ اس کا اعتراف مقدمہ (تمہید) میں اس طور پر کیا گیا ہے :

" حواشی کے کچھ حصے اور تمہید کا آخری حصہ جس میں تذکرہ حیدری پر گفتگو کی گئی تھی بوجوہ نکال دینا پڑا " موجودہ حواشی کا قصد اور انداز جو ہے اس کا اندازہ اقتباس ذیل سے کیا جا سکتا ہے :

> " حیدری کے تسامحات کی طرف ذیلی حاشیوں میں اشارے کر دیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ بحیثیت تذکرہ نگار اس نے اپنے فرائض کہاں تک ادا کیے ہیں " (صفحہ ۲۰)

خیال کہ تحشیے کا مقصد تسامحات کی طرف اشارہ کرنا ہے، بات محدود کر لینے اور تصویر کا ایک رخ دیکھنے کے مترادف ہے چونکہ تذکرے ل تدوین بظاہر اسی نقطۂ نظر سے عمل میں آئی ہے، اس میں فاضل مدون کو اضافے بھی کرنے پڑے، متن کی اصلاحات بھی کرنی پڑیں ر "تسامحات" کی طرف اشارے کرنے کے لیے مختلف اور متعدد مآخذ کی ورق گردانی بھی کرنی پڑی ۔ غرض اس طور پر حواشی مرتب رنے کے لیے " جتنی کھکھیڑ اٹھانی پڑی " اس کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ تحشیے سے میں نے کیا کچھ سمجھا ہے اس کا ذکر گزشتہ مضامین ں کر چکا ہوں، فی الحال صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ تحشیے کا مقصد صرف خامیوں کو شمار کرا دینا نہیں ہو سکتا، حواشی توضیحی بھی ہو سکتے یں، یہ بھی ممکن ہے کہ اب تک کی معلومات میں زیر تدوین کتاب کی کسی عبارت سے کوئی اضافہ ہوتا ہو، حواشی میں اس کا اعتراف ی مناسب ہے ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موجودہ اور مروجہ معلومات کے برخلاف زیر تدوین کتاب سے کوئی اطلاع ملتی ہو، اس ر بحث کی جا سکتی ہے غرض مدون ہی کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ روشن پہلوؤں سے بھی بحث کرے اور خامیوں کے ساتھ ساتھ وبیوں کو بھی منظر عام پر لائے ۔ اوپر جتنی گفتگو کی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ ہذا کا دوسرا رخ پیش کرنے کی طرف وجہ نہیں کی گئی اور یہی بات خود فاضل مدون کے مذکورہ بالا اقتباس سے بھی معلوم ہوتی ہے ۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ

صورت میں حیدری کے تمام تسامحات کی نشاندہی کردی گئی ہے چنانچہ اندراجات ذیل سے پتا چلتا ہے:

صفحہ ۱۹ پر مصیبؔ کو "شاہ خوب اللہ الہ آبادی کا بیٹا" لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ مصیبؔ شاہ محمد فاخر ابن شیخ محمد یحییٰ عرف شاہ خوب اللہ کے بیٹے تھے ۔

صفحہ ۲۰ پر محمد علی خاں کا تخلص متن میں "مرزائی" اور حاشیے پر نسخہ آکسفورڈ کے حوالے سے مرزا لکھا ہے یہ نہیں معلوم کہ صحیح کیا ہے ۔

صفحہ ۲۲ پر شاہ عالم آفتاب کے حال میں ہے ۔

"بیالیس برس سے تاحال سنہ بارہ سو چودہ ہجری اوپر سریر سلطنت کے . . . . جلوہ گر ہیں"

شاہ عالم ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہوئے بیالیس برس بعد ۱۲۱۵ھ ہوئے ۔ عبارت کا یہ سقم قابل لحاظ ہے ۔

تحشیے کا مقصد جو بھی ہو اتنی بات مسلّم ہے کہ اس سے قاری کے لیے سہولت پیدا ہونی چاہیے۔ تذکرہ ہذا میں ایسے حواشی کم ملتے ہیں جن سے اس کے برخلاف الجھن اور پیچیدگی کی صورت پیدا ہو صرف ایک مثال درج ذیل ہے ۔ امیدؔ کے حالات میں ہے :

"بہ عہد محمد شاہ . . . . ۱۱۵۹ ہجری کے رحلت کرگئے"

اس پر حاشیہ آرائی کی گئی کہ "وفات ۱۱۷۰ھ — (سفینۂ خوش گو صـ۲۵)"

صحیح یہ ہے کہ امیدؔ کا انتقال ۹ رجمادی الاول ۱۱۵۹ھ کو ہوا (تاریخ محمدی، سفینۂ ہندی وغیرہ) جو بات متن میں صحیح تھی حاشیے میں اس کے خلاف کہا گیا اور غلط ۔

یہ محض چند مثالیں ہیں اس نوعیت کی مثالیں متن کی عبارت، اشعار اور حواشی پر تلاش کیا جائے تو اور بھی مل سکتی ہیں ۔ لیکن اتنی بات کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس تذکرے کی تدوین میں بہت محنت سے زیادہ سے زیادہ مواد کو حاشیے پر جمع کر دینے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس نے اس تذکرے کو تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک اچھا ماخذ بنا دیا ہے ۔

وضع اصطلاحات

مولوی وحید الدین سلیم

یہ کتاب اردو کے نامور انشاپرداز و عالم مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے۔ یہ بالکل نیا موضوع ہے ۔ اس میں اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں ۔ اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ۔

قیمت : سات روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

اللہ بخش یوسفی

محمد ایوب قادری

ابھی کل کی بات ہے کہ کراچی سے مصنفِ شہیر جناب رئیس احمد صاحب جعفری ایک علمی و ادبی ماہنامہ "ریاض" نکالتے تھے جو غالباً ڈھائی سال اپنی بہار دکھا کر غائب ہوگیا۔ یہ پرچہ بڑا معیاری تھا۔ اس کے دو خاص شمارے "شوکت نمبر" اور "سلیمان نمبر" بھی نکلے تھے جو علمی و ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ "شوکت نمبر" جنوری سنہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا جس کی پاکستان و ہندوستان میں خوب دھوم رہی۔ میں نے "شوکت نمبر" کے مطالعہ کے بعد ایک خط مخدومی جعفری صاحب مدیر "ریاض" (کراچی) کی خدمت میں بھیجا تھا جس کو انھوں نے "بزمِ ریاض" کے عنوان کے تحت "ریاض" مجریہ فروری سنہ ۱۹۵۴ء میں شائع کر دیا۔ اس خط کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

> "اللہ بخش یوسفی صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا شوکت علی کا قول لکھا ہے "میں نے پٹھانی کا دودھ پیا ہے"۔ پھر یوسفی صاحب لکھتے ہیں "جب تحریکِ احیاء مسلم لیگ کے سلسلے میں پھر پشاور آئے تو انھوں نے اس گاؤں (مرغز ضلع مردان) کو خاص طور پر جا کر دیکھا جہاں سے ان کے بزرگ ہندوستان پہنچے (صفحہ ۳) قاضی عباس حسین دہلوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے "ان تحریکات کے روحِ رواں سید شوکت علی صاحب تھے" (صفحہ ۵) مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے "رام پور میں مولانا شوکت علی کا خاندان "پھنچوں کا خاندان" کہلاتا تھا" (صفحہ ۲۴) اس نمبر میں تین مضمونوں میں مولانا کے خاندان کو تین نسبتوں سے متعلق کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں آپ کی رائے اور رہبری کی ضرورت ہے۔"

اللہ بخش یوسفی کے نام سے تو میں بہت دنوں سے متعارف تھا۔ "شوکت نمبر" میں ان کا مضمون پڑھ کر ملاقات کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ ایک روز ایک دوست کی رفاقت اور رہنمائی میں ان کے مکان "یوسفی ہاؤس" واقع تین ہٹی (کراچی) پہنچا۔ بڑے اخلاق سے ملے۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر ان کا مضمون "مولانا شوکت علی" علی برادران اور تحریکِ خلافت رہا۔ میں نے علی برادران کے نسب کے سلسلے میں عرض کیا کہ مراد آباد و رام پور (روہیل کھنڈ) میں یہ حقیقت معلوم و مشہور ہے کہ ان کا تعلق اس علاقے

کے مشہور شیوخ (کلال) سے ہے۔ اور اس خاندان کے مورخ و تذکرہ نویس مصنف تذکرہ کاملان رام پور مولوی احمد علی شوق نے بھی جو علی برادران کے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں اپنے بزرگوں کو شیخ لکھا ہے۔ اور روہیل کھنڈ کے مشہور مورخ و نسّاب مولوی محمود احمد عباسی نے بھی تاریخ امروہہ میں ان کے سلسلے میں اس نظریے کی تائید کی ہے۔ یوسفی صاحب نے میری گفتگو کو بڑی توجہ سے سنا، مگر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میری رائے سے متفق نہیں ہیں۔

اس کے بعد عرصے تک یوسفی صاحب سے ملاقات نہ ہوئی مگر یہ معلوم ہوتا رہا کہ وہ پٹھانوں کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں اور اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں نظر سے گزریں۔ میں نے ان کی کتابوں کو بڑے شوق اور توجہ سے پڑھا کیونکہ راقم الحروف کا سابق وطن علاقہ روہیل کھنڈ ہے۔ جہاں اٹھارہویں صدی عیسوی میں رجال افاغنہ داؤد خاں، نواب علی محمد خاں، حافظ الملک حافظ رحمت خاں، بخشی سردار خاں، نواب دوندے خاں اور نواب نجیب الدولہ وغیرہ کا اقتدار رہا تھا۔ ان لوگوں کے واقعات و حالات اور افغانوں کی تاریخ سے مجھے دلچسپی ہے۔ یوسفی صاحب کی تصانیف میں جستہ جستہ ان لوگوں کے تذکرے بھی آتے تھے۔ اس طرح یوسفی صاحب سے ایک نوع کی فکری ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔

یکم جنوری ۱۹۶۵ء سے یوسفی صاحب کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار "آواز پختون" شائع ہونا شروع ہوا۔ اس اخبار کے بعض شمارے نظر سے گزرے تو اس میں اکثر فکر انگیز مضامین نظر آئے۔ غالباً نومبر ۱۹۶۶ء کی ایک شام کو اچانک یوسفی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ خوب گھل مل کر باتیں ہوئیں۔ تاریخ افاغنہ، پشتو زبان، اور روہیل کھنڈ کی تاریخ و آثار پر اظہار خیال ہوا۔ ستمبر ۱۹۵۳ء میں میرا ایک تفصیلی مقالہ "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا۔ روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات" العلم (کراچی) میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ یوسفی صاحب نے اپنے اخبار "آواز پختون" میں اس مقالے کی دوبارہ اشاعت کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے یہ مضمون نظر ثانی کے بعد ان کی خدمت میں پیش کر دیا جو "آواز پختون" کی مسلسل کئی قسطوں میں شائع ہوا اور اس اخبار کے حلقہ ناظرین میں یہ مقالہ پسند کیا گیا۔ اس کے بعد یوسفی صاحب نے خاکسار کے دو اور مضمون جہاد ہنومان گڑھی اور تحریک سید احمد شہید اپنے اخبار میں شائع کئے۔

یوسفی صاحب راقم الحروف پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے اپنی زیر تالیف کتاب "مولانا محمد علی جوہر" کی مبسو سوانح عمری کے جو انگریزی میں لکھی ہے، کئی باب خاکسار کو دکھائے۔ علمی و تاریخی موضوعات پر ان سے گفتگو رہتی۔ تاریخ اسلا سے ان کو خاصی دلچسپی تھی، اور وہ اس سلسلے میں ایک صحت مندانہ نقطہ نظر رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں تاریخ اسلام کی از سر ترتیب و تدوین ہونی چاہیے۔ اور تعصب و تنگ نظری سے بالاتر ہو کر یہ کام انجام دینا چاہیے۔ یوسفی صاحب فرماتے تھے کہ ام دور خلافت کی تاریخ خاص طور سے مسخ کی گئی ہے اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ وہ علماء کی تنگ نظری تعصب اور مصلحت کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور بسا اوقات اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔

اللہ بخش یوسفی جنگ آزادی کے نامور اور نڈر سپاہی تھے۔ انھوں نے برطانوی استبداد سے ٹکر لی، قید و بند کو لبیک

کیا۔ خلافت کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ مسلم لیگ کو مقبول بنایا۔ تحریک پاکستان کی نشر و اشاعت کی۔ وہ پاکستان کو ایک فلاحی مملکت دیکھنے کے متمنی تھے جس میں سارے پاکستانی، قوم، رنگ، نسل اور علاقے کے امتیازات کو ختم کرکے ایک "بنیانِ مرصوص" بن جائیں، موروثی تفرق اور اجارہ داریاں ختم ہوں اور ہر شخص آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔ ان کا اخبار "آوازِ پختون" ان ہی اصولوں کا مبلغ و مناد تھا۔

یوسفی صاحب کی صحت کچھ بری نہ تھی۔ رواں دواں چل رہے تھے۔ ۲۰ر فروری سنہ ۱۹۶۸ء کو خاکسار "یوسفی ہاؤس" حاضر ہوا تو ان کے بڑے صاحبزادے محمد علی صاحب سے معلوم ہوا کہ ان پر دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ سول ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ دو تین دن کے بعد میں سول ہسپتال عیادت کے لئے حاضر ہوا تو یوسفی صاحب کے پاس ان کی بیگم اور دونوں صاحبزادگان محمد علی و طارق موجود تھے اور وہ بہت خوش تھے۔ نہایت خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ بڑی محبت سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کسے معلوم تھا کہ مرحوم سے یہ آخری ملاقات ہے ۱۳ر مارچ بروز بدھ سنہ ۱۹۶۸ء یوسفی صاحب نے سول اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ و انا الیہ راجعون رہے نام اللہ کا۔

اللہ بخش یوسفی، غلزئے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام محمد شریف خان تھا۔ ان کے والد کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ اور وہ زیادہ تر افغانستان سے تجارت کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں محمد شریف خان کا انتقال ہوا۔

اللہ بخش یوسفی ۲۵ر دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء کو پشاور (محلہ کریم پورہ) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت پشاور میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں میٹرک کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں لندن چیمبر آف کامرس کا امتحان پاس کیا اور فرانٹیر کانسٹبلری میں ملازم ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ملک میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور جلیانوالہ باغ کے حادثہ فاجعہ کے بعد ملک میں آگ لگی ہوئی تھی اور انگریزوں کے اقتدار کی جڑیں ہلتی نظر آ رہی تھیں۔ اس موقع پر نوجوان یوسفی نے انگریزوں کے ظلم و استبداد کے خلاف کھلم کھلا اظہار نفرت کیا اور رولٹ ایکٹ کی مخالفت تحریک میں حصہ لیا۔ ظاہر ہے کہ گورنمنٹ ملازم کا یہ اقدام کسی طرح مناسب نہ تھا۔ لہٰذا ۱۱ر مئی سنہ ۱۹۲۰ء کو یوسفی صاحب کا کورٹ مارشل ہوا اور ان کو قلعہ شب قدر میں چھ ماہ کے لئے نظر بند کر دیا گیا اور رہائی کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفار دے دیا۔

صوبہ سرحد کی سیاسی بیداری میں یوسفی صاحب کا بڑا حصہ رہا ہے۔ جس کا اندازہ ان کی کتاب "جد و جہد آزادی میں صوبہ سرحد کا حصہ" سے ہوگا۔ انھوں نے ترک موالات کی تحریک میں بڑے زوروں سے حصہ لیا اور جب افغانستان کے لئے ہجرت شروع ہوئی تو یوسفی صاحب سکریٹری مقرر ہوئے اور شب قدر میں ان کا قیام رہا پھر پشاور آ گئے۔ خلافت تحریک کے تو گویا صوبہ سرحد میں وہ روح رواں تھے۔ خلافت کمیٹی کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ پرنس آف ویلز کی آمد پر انھوں نے شہر پشاور میں ایسی کامیاب ہڑتال کرائی کہ جس کا دوسرے شہر مقابلہ نہ کر سکے۔ اس کے نتیجے میں یوسفی صاحب اور ان کے رفقاء دو دو سال کے لئے داخلِ زنداں ہوئے۔ اس طرح انھوں نے سنت یوسفی کو بھی ادا کیا۔

۱۹۳۰ء میں میاں جعفر شاہ کی شرکت میں فرانٹیر ٹریجڈی (Frontier Tragedy) کتاب شائع کی جس میں صوبہ سرحد کے سیاسی حالات، وہاں کی بدانتظامیوں اور انگریزوں کے ظلم واستبداد کا مفصل واضح نقشہ کھینچا گیا تھا۔ یہ کتاب ہندوستان اور انگلینڈ سے بیک وقت شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد یوسفی صاحب کو مجموعہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت بمبئی سے گرفتار کر کے پشاور لایا گیا۔ اور ان پر مقدمہ چلایا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی پھر سیشن سپرد ہوئے اور بالآخر حالات سے مجبور ہو کر حکومت نے ان کو رہا کر دیا۔

اس کے بعد یوسفی صاحب خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہوئے ۱۹۲۲ء میں جب یونٹی کانفرنس (Unity Conference) ہوئی تو وہ اس میں مسلم ڈیپوٹیشن کے سکریٹری رہے۔ ابتدائی دور میں اس کانفرنس کے سربراہ مولانا شوکت علی اور بعد میں شیخ عبدالمجید سندھی رہے۔ جب ۱۹۳۸ء میں مولانا شوکت علی کا انتقال ہو گیا تو یوسفی صاحب مستقل طور سے بمبئی میں رہنے لگے اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہو گئے۔ انھوں نے بمبئی سے ہفتہ وار انگریزی اخبار "پروگریس" اور اردو اخبار "سرحد" نکالا۔

یوسفی صاحب صوبہ سرحد مسلم لیگ کے پراونشیل سکریٹری رہے۔ قائد اعظم نے جو پارلیمنٹری بورڈ بنایا تھا اس کے ایک رکن اللہ بخش یوسفی بھی تھے۔ جب ۱۹۴۳ء میں صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کا کنونشن ہوا۔ تو یوسفی صاحب اس کنونشن کے جنرل سکریٹری تھے جب صوبہ سرحد میں سردار اورنگ زیب خاں نے مسلم لیگ کی وزارت بنائی۔ تو یوسفی صاحب پبلسٹی افسر مقرر ہوئے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ایک سال کے بعد ہی مستعفی ہو گئے۔

اللہ بخش یوسفی کو "علی برادران" سے عشق تھا۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کی مبسوط سوانح عمری انگریزی زبان میں لکھی۔ ان کا مجموعہ کلام مرتب کیا۔ اپنے اور دوسرے قریبی اعزہ کے بچے اور بچیوں کے نام 'محمد علی، شوکت علی، ذوالفقار علی، جوہر یوسفی، گوہر یوسفی، خالد علی، گلنار اور خالدہ وغیرہ رکھے۔ انھوں نے کراچی میں ایک ادارہ "محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی" کے نام سے قائم کیا۔ جس کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں اور تقریروں کی اشاعت۔
۲۔ ملت اسلامیہ پاکستان کی تعمیر و تحفظ سے متعلق موضوعات پر تصنیف و تالیف۔
۳۔ نادر اور نایاب کتابوں کا حصول اور ان کی اشاعت۔
۴۔ بلند پایہ جرائد و رسائل کا اجراء
۵۔ رئیس الامرار کے شایان شان یادگار کا قیام
۶۔ کتب خانے اور دارالمطالعے وغیرہ کا قیام۔

ایک مدت تک اس سوسائٹی کے تحت ایک اسکول جاری رہا۔ یوسفی صاحب کی تمام کتابیں اسی سوسائٹی کے تحت شائع

بئی اور اس ادارے سے پروفیسر لطف اللہ کی ایک کتاب سنہ ۱۹۵۷ء (جنگ آزادی) کے نامور قائد اعظم اللہ خان کے
ت میں (Man Behind The war of independence) شائع ہوئی۔

اللہ بخش یوسفی صوبہ سرحد کے ایک نامور اور ممتاز صحافی تھے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے پشاور سے "سرحد" نام
یک ماہنامہ جاری کیا۔ انگریزوں کے خلاف اس رسالے کا لب و لہجہ دیکھ کر جعفر شاہ صاحب نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اس
لے کا اجرا آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ بعد کو یہ ماہنامہ روزنامے میں تبدیل ہو گیا اور ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ یوسفی
حب نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار "پروگریس" اور دوسرا اردو اخبار روزنامہ "سرحد" بمبئی سے نکالا۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۶۵ء
ان کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار "آواز پختون" جاری ہوا جو نہایت باقاعدگی سے سنہ ۱۹۶۷ء تک چلتا رہا۔ پھر
کا نام بدل کر "الاخبار" کر دیا گیا۔ غالباً فروری سنہ ۱۹۶۸ء میں اس اخبار سے ان کا تعلق منقطع ہو گیا۔ قائد اعظم کی ہدایت پر
فی صاحب نے پشاور سے ایک اخبار "ہلال پاکستان" نکالا تھا۔ جو قیام پاکستان تک جاری رہا۔ ان کے علاوہ یوسفی صاحب
ن دوسرے رسائل و جرائد مثلاً ادیب (پشاور) خلافت (بمبئی)، اتحاد (کراچی) اور مشعل راہ (کراچی) وغیرہ کی ادارت سے بھی
بستہ رہے۔

اللہ بخش یوسفی ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے صحافی تھے۔ اخبار کا اداریہ، خبریں، مضامین ہر چیز سے ان کی تجربہ
ی اور سلیقہ شعاری کا اندازہ ہوتا تھا۔ جب "الاخبار" سے یوسفی مرحوم کا تعلق ختم ہو گیا۔ تو اس میں وہ دلچسپی اور جاذبیت باقی
ری اور وہ "اخبار" محض ہو کر رہ گیا۔

اللہ بخش یوسفی کو اردو زبان سے بہت محبت تھی۔ وہ اردو زبان کو پاکستان کی سالمیت اور ارتقا کا بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ چند
بوں کو چھوڑ کر ان کی تمام تر تصانیف اردو زبان میں ہیں۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں یوسفی صاحب کراچی آ گئے۔ یہاں آ کر وہ سیاست سے علیحدہ رہے پہلے تو وہ ایک تجارتی فرم سے
منسلک رہے۔ پھر انھوں نے اپنا ایک پریس "شریف آرٹ پریس" کے نام پر قائم کر لیا۔ اور تمام تر توجہ تصنیف و تالیف
طرف لگا دی۔ مندرجہ ذیل تصانیف انکی دائمی یادگار ہیں۔

(۱) تاریخ یوسف آزاد پٹھان۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ فیلڈ مارشل
محمد ایوب خاں صدر پاکستان نے اس کتاب پر یوسفی صاحب کو ایک ہزار روپے اور
اباسین آرٹ سوسائٹی پشاور نے پانچ سو روپے انعام دیئے۔

۲۔ تاریخ آزاد پٹھان (جلد اوّل) پہلی جلد سنہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ تاریخ آزاد پٹھان (جلد دوم) دوسری جلد سنہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ افغان یا پٹھان، اس کتاب کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن سنہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔

۵۔ مختصر تاریخ کشمیر۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ۔
۶۔ تاریخ ریاست سوات ۔ ریاست سوات کی مختصر تاریخ ہے ۔
۷۔ حقیقت پختونستان اور ڈیورنڈر لائن، افغانستان اور پاکستان کے سرحدی تنازعے کے مسئلے پر ایک مفصل اور مدلل کتاب ہے ۔
۸۔ الامین (AL – AMIN) ۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر انگریزی میں ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی جس کو یوسفی صاحب نے اضافے کے ساتھ دوبارہ مرتب کیا ہے ۔ یہ کتاب انگریزی میں شائع ہوئی ہے ۔
۹۔ (Martial Law) (مارشل لا) (انگریزی) پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ پر یہ کتابچہ شائع ہوا ہے ۔
۱۰۔ (Meet The Frontier Gandhi) اس کتاب کا ترجمہ "سرحدی گاندھی سے ملاقات" کے عنوان سے اردو، پشتو اور گجراتی میں ہو چکا ہے ۔
۱۱۔ جدوجہد آزادی میں صوبہ سرحد کا حصہ ۔ مرکزی اردو بورڈ، (لاہور) اس کتاب کو شائع کر رہا ہے ۔
۱۲۔ (Life of Maulana Mohammad Ali) یہ کتاب بھی زیر اشاعت ہے ۔

اللہ بخش یوسفی کی مندرجہ ذیل تالیفات مسودات کی صورت میں ان کی صاحبزادگان کے پاس موجود ہیں ۔

۱۔ سوانح حیات علی عباس بخاری ۔ صوبہ سرحد کے ایک قومی کارکن کے سوانح حیات
۲۔ سلطان محمود غزنوی، یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے ۔
۳۔ آفریدی
۴۔ مہمند
۵۔ غلزئے
۶۔ عدالت سے خطاب ۔ فرانٹیر ٹریجڈی (Frontier Tragedy) کی ضبطی پر عدالت کو جو بیان دیا تھا۔ اس کو مرتب کیا ہے ۔
۷۔ سوانح حیات ۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی
۸۔ تاریخ پشاور
۹۔ تاریخ درہ کوہاٹ
۱۰۔ کلام جوہر ۔ مولانا محمد علی جوہر کا مجموعہ کلام
۱۱۔ لطیفے اور لغت

۱۲۔ تاریخ بلوچستان

یوسفی صاحب نے مندرجہ ذیل عنوانوں کے تحت چند مبسوط اور طویل مقالے، مختلف رسائل جرائد میں لکھے۔ جو مستقل تالیف کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

(۱) گاندھی جی کا پیش کردہ سادہ چیک (۲) وہ سرزمین جس پر دوست بھی بستے ہیں اور دشمن بھی۔ (۳) کشمیر پر ڈوگرہ راج کا ابتدائی دور۔ (۴) یادِ ایام (۵) چودھری خلیق الزماں کے دعوے۔ (۶) سیاسیات سرحد کے ارتقائی منازل۔

ایک عظیم الشان علمی کارنامہ

قاموس الکتب

کتابوں سے متعلق یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہو گی۔ پہلی جلد جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے۔ شائع ہو چکی ہے۔ یہ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مکمل فہرست ہے جس میں تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق بنیادی معلومات دی گئی ہیں۔

یہ کتاب ۲۰×۳۰/۸ تقطیع کے چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے، ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے، آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

قیمت:۔ چالیس روپے۔

انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ — کراچی

انجمن کی ایک نئی کتاب

تاریخ سلطنت مسلمانان روس

از

مزمّل یاسین

"روسی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں نے شروع سے آخر تک بغور پڑھی۔ یہ بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور مطالب کا احاطہ پورے طور پر کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ، روسی علاقے میں جو ترک آباد ہیں ان کی سیاسی جد وجہد اور نشاۃ ثانیہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی سے لے کر ۱۹۱۷ء تک کے انقلاب کا نقشہ اس میں پیش کیا گیا ہے۔ انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ کتاب پڑھتے وقت ذہن پر بوجھ ڈالنے کی بجائے ناول کی سی کشش پیدا کرتی ہے"

سید حسام الدین راشدی

آفسٹ کی طباعت
سفید عمدہ کاغذ
متعدد تصاویر اور نقشے
قیمت دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ کراچی

گلدستہ ہمایوں

لطف اللہ بدوی

یہ گلدستہ سال ۱۸۸۲ء میں بدایوں سے جاری ہوا۔ حقیقت میں یہ گلدستہ، بدایوں سے شائع ہونے والے اخبار سعید الاخبار کا ایک ضمیمہ تھا جو ہر مہینہ پابندی سے شائع ہوتا رہتا تھا۔ سرورق پر اس گلدستہ کی تاریخ اجراء اس طرح دی گئی ہے۔

"از نتیجۂ فکر جناب منشی عبدالمجید صاحب مجید ملازم فوجداری علی گڑھ"

جاری شد از بدایوں گلدستۂ ہمایوں   در قدر و قیمت افزوں از لعل و ز مکنوں
تاریخ و نام جایش گویم مجید اکنوں   گلدستۂ ہمایوں لاثانی از بدایوں!

۱۳۰۴ ہجری

اس گلدستہ اور سعید الاخبار کا ایڈیٹر اور مالک منشی محمد افضل علی ضو، تھا، جو بدایوں کا رہنے والا تھا۔ اسے شعر و شاعری سے خاص طور پر شغف تھا اور منیر لکھنوی (شکوہ آبادی) کے شاگردوں میں سے تھا۔ میرے سامنے گلدستہ 'ہمایوں' کی ماہ جون ۱۸۸۷ء کی اشاعت موجود ہے جس کی ابتداء میں مالک گلدستہ نے اپنے اُستاد منیر لکھنوی کی ایک غزل دی ہے۔

منیر لکھنوی:۔

سید اسمٰعیل حسین، منیر لکھنوی ابن سید احمد حسین شاہ 'شاد' شکوہ آبادی، شروع میں ناسخ کے تلامذہ میں شامل ہوا، لیکن بعد میں ناسخ کے مشورہ سے، اس کے ممتاز شاگرد رشک سے اصلاح لینی شروع کی۔ جہاں تک منیر اور اس کی زندگی کے واقعات کا تعلق ہے، اس نے بڑے مصائب جھیلے۔ غدر کے زمانہ میں، حاسدوں کے باعث بے گناہ قید ہو کر جزیرہ دریائے شور (انڈمان) میں مقید ہو گئے۔ سال ۱۲۸۲ ہجری تک وہاں رہے اور بعد میں رہائی پا کر، واپس ہندوستان میں پہنچے، اور بقیہ عمر، رامپور میں نواب یوسف علی خان کی ملازمت میں تمام کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منیر لکھنوی ایک قادر الکلام اور پرگو شاعر تھا۔ گلدستہ ہمایوں میں جو آپ کی غزل پیش کی گئی ہے۔ وہ مرزا جعفر علی صاحب نشتر لکھنوی کے تذکرہ آب بقا میں بھی موجود ہے۔ لیکن اس غزل کی ترتیب میں دونوں جگہ بہت کچھ رد و بدل نظر آتا ہے۔ شائد مکمل غزل دینے کے بجائے انتخاب ہی کیا گیا۔ بہر حال

ہم دونوں صورتوں کو نقل کرتے ہیں تاکہ منیر مرحوم کی غزل مکمل نظر آجائے اور ایک انتخاب کا دوسرے سے موازنہ ہو جائے:

گلدستۂ ہمایوں

اپنے رتبے سے جو منظور رہے بڑھ کر ہونا
اے قیامت قدم یار کی ٹھوکر ہونا

ضعف میں حوصلۂ دل سے نہ کمتر ہونا
لاکھ ہلکے سے بھی ہلکا ہو تو من بھر ہونا

دشمن جاں ہے فقیروں کو تونگر ہونا
لے اڑا سوئے عدم چیونٹیوں کو پر ہونا

خاک ہونا کہ بلا سے کوئی پتھر ہونا
یہ نہ بھولے سے کسی کا دل مضطر ہونا

دیکھنے والوں نے بے پردہ تمہیں دیکھ لیا
پھر بھی غصہ میں کبھی جامہ سے باہر ہونا

سج جاتے ہوں تو وہ شام ہی سے رستا ہیں
آہ ہو جائے جو کل حشر ہو مجھ پر ہونا

قتل کرنے کے لئے وعدۂ فردا کیسا!
ابھی ہو جائے اگر ہو کوئی محشر ہونا

زلف کی طرح تری عمر درازئ شب وصل
ایک رات اور بھی مہمان میرے گھر ہونا

بندہ عاجز نہ ہو تدبیر کے یہ معنی ہیں
اپنی تقدیر سے بھی چاہیئے بڑھ کر ہونا

ہنس کے کہتی ہے اجل زلف کے پابندوں سے
جی بچے اب کے تو دیوانے سمجھ کر ہونا

حسن و خوبی کی ترازو ہے دوپٹہ تیرا!
دونوں پلوں کو مناسب ہے برابر ہونا

نامہ بر کون ہو فرمائیے جز طفل سرشک
غیر معصوم کو مشکل ہے پیمبر ہونا

جی کے مرنے سے تو بہتر تھی بقا بعد فنا
خوب تھا ہو کے نہ ہونے سے تو ہو کر ہونا

چشم میگوں کی محبت نہیں آساں اے دل
ہوش ہیں آگے ذرا طالب ساغر ہونا

آہیں ہم کرتے ہیں ، لازم ہے تمہیں ہشیار کا،
ایسی آندھی ہیں نہ تم آپ سے باہر ہونا

حضرتِ رشک کے بھی لیں گے قدم چل کے منیر
کربلا میں کئی رتبے ہیں میسر ہونا

”تذکرۂ آبِ بقا“

اپنے رتبہ سے جو منظور رہے بڑھ کر ہونا
اے قیامت قدم یار کی ٹھوکر ہونا!

دشمن جاں ہے فقیروں کو تونگر ہونا
لے اڑا سوئے عدم چیونٹیوں کو پر ہونا

منعو خاک نشینوں سے تعلی کب تک
ایک دن ارض و سما کو ہے برابر ہونا

دیکھنے والوں نے بے پردہ تمہیں دیکھ لیا پھر بھی غصہ میں کبھی جامے سے باہر ہونا
ہر جگہ سختی و نرمی نہیں زیبا اے دل شیشہ میخانے میں بتخانے میں پتھر ہونا
جی کے مرنے سے تو بہتر تھی بقا بعد فنا! خوب تھا ہو کے نہ ہونے سے تو ہو کر ہونا
قتل کرنے کے لئے وعدۂ فردا کیسا ابھی ہو جائے اگر ہو کوئی محشر ہونا
ایک تم جینے میں سب سے نکیلے نکلے نہیں آتا ہے کسی پھانس کو نشتر ہونا
بندہ عاجز نہ ہو تدبیر کے یہ معنی ہیں اپنی تقدیر سے بھی چاہیے بڑھ کر ہونا
چار دن روح کو تکیہ ہے بدن پہ ناحق صاحب خانہ کی قسمت میں ہے بے گھر ہونا
دین و دنیا کے مزے سے رہے محروم اے دل خضر ہونا ہمیں آیا نہ سکندر ہونا
ذبح کر ڈالئے پر سب میں نہ گنئے ہم کو سر سے درگذرے گوارا نہیں ہمسر ہونا
حسن و خوبی کی ترازو ہے دوپٹہ تیرا دونوں پلوں کو مناسب ہے برابر ہونا

حضرت رشک کے بھی لیں گے قدم چل کے منیر
کربلا میں کئی رتبے ہیں میسر ہونا !

ان دونوں تحریروں کے موازانہ سے معلوم ہوتا ہے یہ ایک طویل غزل ہے۔ جس کا انتخاب ہی پیش کیا گیا۔ یہ علیحدہ دو غزلیں تو ہو نہیں سکتیں کیونکہ مطلع اور مقطع ایک ہی ہیں۔ اور بعض درمیانی اشعار میں یکسانیت بھی موجود ہے۔ واللہ علم بالصواب

گلدستہ ہمایوں کے اس شمارہ میں دو علیحدہ علیحدہ طرحیں موجود ہیں۔ ایک تو غالب کی مشہور غزل سے دی گئی ہے۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

دوسری طرح یہ ہے

کیا التجا کریں خضر راہبر سے ہم "

ان طرحوں پر جن شعرائے کرام کا شعر پیش کیا گیا۔ ان کو گلدستے کی ترتیب کے موافق پیش کیا جاتا ہے :-

طرح - کیا التجا کریں خضر راہبر سے ہم

(۱) عنایت۔ راجہ عنایت سنگھ صاحب خلف راجہ لعل جی صاحب الکالی، فخرالدولہ دبیر الملک مہاراجہ رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ زخمی تخلص میر منشی دیوان اودھ کے وارث و جانشین ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ راجہ بھگوان داس بہادر، عہد نواب آصف الدولہ میں صوبہ بریلی ہو کر آئے تھے۔ ابتک یہیں بود و باش ہے۔ رئیس لکھنؤ، تعلقدار، ڈسٹرکٹ و میونسپل بورڈ بریلی ہیں۔ فارسی و انگریزی دان، صاحب تصانیف قوم کایستھ۔ شاگرد جناب منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی، اہلکار ریاست بلرام پور۔

گھایل ہوئے کسی کے خدنگِ نظر سے ہم　　دیکھا کہ لوٹنے لگے زخمِ جگر سے ہم
کیا جانے راہِ عشق کی وہ سیدھے سادے لوگ　　کیا التجا کریں خضرِ راہبر سے ہم
دشمن تو کیا کہ اپنے بھی آنکھیں دکھاتے ہیں؛　　ایسے گرے ہوئے ہیں کسی کی نظر سے ہم!
جب لطف جذبِ دل ہے کہ مل جائیں راہ میں　　وہ بھی چلیں ادھر سے بصد شوق ادھر سے ہم
ارض و سما نظر میں ہوں اک بحرِ موجزن　　اشکوں کا تار باندھیں اگر چشمِ تر سے ہم
پہلو میں دل خزانۂ معمورِ عیش ہے　　رکھتے ہیں ارتباط کسی سیم بر سے ہم!
چھیڑینگے تجھکو پہلوئے اعدا میں دیکھکر　　اے جاں بشر ہیں کاہے کو ڈر جائیں شر سے ہم
ہے خوف غش نہ آئے انہیں دیکھکر لہو　　نامہ تو لکھنے بیٹھے ہیں خونِ جگر سے ہم
آہِ شرر فشاں سے جلا دینگے چرخ کو　　لینگے عوض ستانے کا اس فتنہ گر سے ہم

لکھی عنایت آج غزل چھ مہینے بعد
غمگیں رہے جو مرگِ جناب پدر سے ہم

(۲) **مذنب**۔ قاضی حکیم مولوی علی احمد صاحب ابن جناب حافظ حاجی علی اسد اللہ صاحب قبلہ رئیس بدایوں۔ جامع علوم و فنون، شیخ صدیقی، صاحب تصانیف کثیرہ۔ مولانا نور احمد صاحب عثمانی و سید شاہ آل رسول صاحب مارہروی سے علوم تحصیل کئے۔ جناب مولانا مذاق بدایونی سے شاعری و علم باطنی حاصل کیا۔ مہتمم گلدستہ کے عم زاد بھائی اور ہمزلف ہیں۔

آگے بہت بتنگ ہیں اس دل و جگر سے ہم؛　　بدلیں اسے کہیں کسی اہلِ نظر سے ہم
دوزخ ہمارے اشکوں سے ٹھنڈا ہو کہیں　　پھونکیں فلک کو شعلۂ سوزِ جگر سے ہم
لالہ کھلا ہے داغ کا پر جوشِ اشک سے　　خوں کی ندی بہائینگے، باغِ جگر سے ہم
وہ آئیں یا نہ آئیں، مگر لو لگی رہے!　　رکھیں امید جذبۂ دل کے اثر سے ہم

مذنب زکوٰۃ حسن کی، خیرات ناز کی
محشر میں لینگے حضرت خیر البشر سے ہم

(۳) **ظہیری**۔ ظہیر احمد صاحب خلف شیخ فتح محمد سہسوانی، شاگرد جناب مذنب بدایونی

مجبور ایسے کچھ ہوئے زخمِ جگر سے ہم　　زخموں کو چھیلنے لگے اب نیشتر سے ہم
قاتل کا کچھ قصور نہ قسمت کا کچھ گلا!　　گھائل ہوتے ہیں آپ کی ترچھی نظر سے ہم
پڑھنے میں تا کہ شوخ کو کچھ پیش و پس نہ ہو　　اکثر خطوط لکھتے ہیں زیر و زبر سے ہم
جب جانیں ہم اثر ترا اے جذبِ اشتیاق　　آ جائیں وہ ادھر سے جو نکلیں ادھر سے ہم

کیوں آئے ہو لحد میں نکیرین چھیڑنے
دیکھو ابھی تو آئے ہیں چلکر سفر سے ہم

آئے ہو سہسوان سے ظہیرؔ بدایوں کیوں
واقف نہیں ہیں آپ کے دل کی خبر سے ہم

۴) زورؔ۔ شیخ اعجاز الدین صاحب متولی بدایوں شاگرد مذنب بدایونی

خود ہی رفو کرینگے دل زخم خوردہ کا
درخواست کیوں کرینگے کسی بخیہ گر سے ہم

۵) سائلؔ۔ شیخ ممتاز الدین صاحب فاروقی صاحب فریدی شیخوپورہ، شاگرد مذنب بدایونی

سائلؔ ہماری بات کا کیا اعتبار ہو
انکو نظر نہ آئیں اگر معتبر سے ہم

۶) زیرکؔ۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شاگرد جناب مذنب بدایونی

ہر شب مثال شعلہ بھڑکتی ہے اپنی آہ
مثل ابر کے فراق میں ہر روز برسے ہم

۷) تسلیمؔ۔ جناب رام سہائے صاحب ڈپٹی کلکٹر بدایوں

رکھتے ہیں انس کیا کسی نازک کمر سے ہم
آنکھیں لڑا رہے ہیں جو نار نظر سے ہم

کہتے ہیں آسماں سے مرے نالہائے دل
سوزش زیادہ رکھتے ہیں برق و شرر سے ہم

صد شکر بعد مرنے کے آئے وہ قبر پر
رہتے تھے جن کی یاد میں اک عمر بھر سے ہم

میخانہ پر ادھر سے گھٹا آئے جھوم کر
یارب شراب پینے چلیں جب ادھر سے ہم

اچھے برے ہو اگرچہ یہ رند و پارسا
خواہاں دعائے خیر کے ہیں ہر بشر سے ہم

کیا غم ہے خفتہ بختی سے سو جائیں لاکھ پاؤں
تسلیمؔ کوئے یار میں جائیں گے سر سے ہم

۸) ماہؔ مرزا عنایت علی بیگ صاحب لکھنوی، شاگرد آتش مرحوم

دھو بیٹھے ہاتھ ہجر میں دل سے جگر سے ہم
ہر وقت رونا روتے ہیں یہ چشم تر سے ہم

جو کچھ مرے نصیب کا ہونا ہے ہو چکا
یہ امر چاہتے ہیں قضا و قدر سے ہم

ہستی سے کوچ ہو جو عدم کا تو اے کریم
مجبور ہوں نہ راہ میں زادِ سفر سے ہم

پھولا پھلا رہا جو خزان و بہار میں
قیدِ قفس میں آئے ہیں ایسے شجر سے ہم

یاروں سے اپنے رونے کا کیا ماجرا کہیں
اے ماہؔ ابر کیطرح خوب برسے ہم

اس طرح کے بعد دوسری طرح آتی ہے یہاں ان سے انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

طرح۔ دوست غمخواری میں میرے سعی فرمائینگے کیا

(۱) سبدؔ۔ سیّد محمد صاحب بدایونی

خط میں لکھا ہے انہوں نے اپنے آنے کیلئے   دلبری کا یہ بھی فقرہ ہے بھلا آئیں گے کیا
دیکھ لی تھی پہلے ہی سب حیلہ سازی شیخ کی   اب کرشمہ دیکھئے آکے دکھلائینگے کیا

غیر کے ہمراہ سیّدؔ قصد گلشن ہے انہیں
دیکھئے کیا گل کھلے گا، خار داں پائینگے کیا

(۲) سحرؔ۔ جناب منشی دیبی پرشاد صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس

شرم کی اب تک بہت کچھ اب بھی شرمائینگے کیا   آج ان سے حال کہدینگے وہ فرمائینگے کیا
قصۂ غم گر سنائیں بھی تو پھل پائینگے کیا!   ہم کہے جائینگے سمجھے وہ کہے جائینگے کیا!
ابتدائے عشق میں کیا غم جدا ہے گر صنم   مل بھی جائے گا ابھی سے ایسے گھبرائینگے کیا
کہکے حالِ زار میرا تو بھی رو دیتا حبیب   قاصدا تو خود ہے عاقل تجھکو سکھلائینگے کیا
کم سنی میں کرتے ہیں عشاق پر کیا کیا ستم   جب جواں ہونگے خدا جانے غضب ڈھائینگے کیا
ہمنشیں دیتا ہے کیا ترغیب سیرِ بوستاں   دل ہی کسکے پاس ہے واں جاکے بہلائینگے کیا
دور ہیں اغیار سرگوشی میں پھر کیا خوف ہے   کان میں باتیں کرونگا وہ بھی سن پائینگے کیا
کرتے ہیں منعم مکاں تعمیر کیوں اپنی بلند   بعد مردن سر پہ رکھکر ساتھ لے جائینگے کیا
جیسے آئے تھے یہاں ویسے ہی خالی جائینگے   واں سے کیا لائے تھے یاں سے ساتھ لیجائینگے کیا

رو کے جب میں نے کہا دیجئے نہ غم مجھکو بہت
ہنس کے بولے سحرؔ صاحب آپ پھر کھائینگے کیا

(۳) ضوؔ۔ منشی محمد افضل علی صاحب ضو بدایونی مالک و مہتمم گلدستہ

مرتے ہیں جو تیرے وعدوں پر وہ گھبرائینگے کیا   وسعت اخلاق میں جینے سے تنگ آئینگے کیا
ساتھ میرے نعش کے دو اک قدم جائینگے کیا   عمر رفتہ کو منا کر آپ لے آئیں گے کیا
کیوں سبک مثلِ صبا ہیں ناتوانِ عشقِ زلف   خانۂ زنجیر سے باہر نکل جائیں گے کیا
اشک سیل آگیں ترقی پر ہیں دیکھا چاہیئے   چار دیوار عناصر کو گرا جائیں گے کیا
ایک وعدہ نیم جاں رکھنے کو بس ہے تابحشر   ہجر میں ہم کیا جئینگے اور مر جائیں گے کیا

ہاں زبان و طبع میں کیونکر نہ پیدا زور ہو
ہم بھی ضوؔ، اہل سخن سے نام رکھوائینگے کیا

[redacted]

گلدستے کے ایڈیٹر ہیں، مالک گلدستہ "ضو"، چند تاریخیں دی گئی ہیں، جو مختلف موقعوں پر اس نے لکھی ہیں۔ یہاں سید محمد حشمت حسین حشمت یل و فوجدار ریاست جودھپور کی تاریخ وفات دی جاتی ہے۔ وہ ادجیانی بدایوں کے رہنے والے تھے، اور اچھے شعرا میں سے تھے۔

رئیس ادجیانی بدایوں امیر ذی جاہ خاندانی
میان دہلی نمود در عجب غریب الدیار سید
دو مادۂ ہجری و عیسوی ز نکر دو معرّی نوشتم
رفیق سردار مارواڑ و شفیق ضو بہ شد ارسید

۱۳۰۳ ہجری ـــــ ۱۸۸۶ء

گلدستۂ ہمایوں میں سب کے آخر میں، ماہ جون ۱۸۸۷ء کی خبروں کی تلخیص موجود ہے۔ ان میں سے بعض خبریں نہایت اہم، ن یہاں ان کے نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تلخیص الاردو

سید ہاشمی فریدآبادی

یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی "اردو" کے تیس سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل علمی و ادبی مقالات شامل ہیں

اصول وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم
ہجو سلطان محمود	حافظ محمود شیرانی
کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ	مولوی عبدالحق
بنگالی زبان و ادب کی نشو و نما	دنیش چندر سین
ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی	مرزا فرحت اللہ بیگ
عماد الملک بگرامی	عبدالحلیم شرر
بنگالی اور اردو	محمد اجمل خاں
رومی، نطشے اور اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
اردو میں دخیل الفاظ	مولوی عبدالحق
ولی کے سن وفات کی تحقیق	مولوی عبدالحق
پرانی اردو میں کتبے	مولوی عبدالحق

قیمت:۔ پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

گلشن ہمیشہ بہار

نصر اللہ خاں خویشگی نے یہ تذکرہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے تذکرے "گلشن بے خار" کے جواب میں لکھا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں یہ پہلی بار شائع ہوا تھا۔ پہلی اشاعت کے بہت کم نسخے اب دستیاب ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی (استاد شعبۂ اردو، کراچی یونی ورسٹی) نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں ۴۱۹ شاعروں کے حالات ہیں۔ مرتب نے جا بجا حواشی لکھ کر اس میں افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ آفسٹ کی طباعت۔

صفحات ۳۴۳۔ قیمت:۔ آٹھ روپے

انجمن ترقی اردو
بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

ادب اور ادبی قدریں

آفاق صدیقی

ادب مختلف قسم کے خیالات، احساسات اور جذبات کا مرکب ہے اور قدر اس مرکب کا معنوی جوہر۔ ادب اور ادبی اقدار کا تعلق جسم اور حواس کے رشتے کی طرح ہے۔ جس طرح ہم کسی خبط الحواس شخص کو کام کا آدمی کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اسی طرح اس ادب کو بھی ادب کہتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے جو ان اقدار سے عاری ہو جن کو ہم ادبی اقدار کہتے ہیں بالفاظ دگر یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ ادب صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیش نظر ہر دور اور ہر زمانے میں کچھ سنجیدہ مقاصد بھی رہے ہیں۔ مجموعی طور پر اگر ان مقاصد کو یکجا کیا جائے تو حاصل حصول شاید یہی ہوگا کہ

ادب ہی سے انسان ہے   ادب جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے
جہاں میں نہ پیارا ہو کیونکر ادب   کہ ہے آدمیت کا زیور ادب

آدمی اور آدمیت کے ساتھ ادب کا رشتہ کوئی نیا نہیں۔ ہزاروں سال پہلے بھی کسی نہ کسی شکل میں ادب کی تخلیق ہوتی رہی اور اب بھی ہوتی ہے۔ بعض ادبی تخلیقات پرانی ہوتے ہوئے بھی ہمیں نئی محسوس ہوتی ہیں اور کچھ نئی ہوتے ہوئے بھی پرانی نظر آتی ہیں۔ فرق و امتیاز کا یہ شعور ہمیں ادبی اقدار کے تعین اور تقابلی تجربہ سے حاصل ہوتا ہے

زندگی میں جو کچھ ہمارے پاس ہے اور جو کچھ ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے عام طور پر مقداری تعدادی اور توصیفی پیمانے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً جب کسی کو بھوک لگتی ہے تو روٹیوں کی تعداد اور سالن کی مقدار کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور جب پیٹ بھرا ہو تو گلاب کی خوشبو، چاندنی کا نظارہ، نور جہاں کی آواز اور غالب کی غزل مزا دے جاتی ہے۔

تعدادی اور مقداری پیمانوں سے جن قدروں کا تعین کیا جا سکتا ہے انھیں مادی اقدار کہیے اور محض توصیفی طور پر جن اقدار کو ہم پسند یا ناپسند کرتے ہیں انھیں غیر مادی اقدار کہا جا سکتا ہے۔ ادب کی ناپ

ے انھیں غیر مادی پیمانوں سے کی جاتی ہے ۔

بیسویں صدی کی ادبی درآمدات میں جہاں کچھ نئی اصناف ادب اور کچھ نئے تنقیدی میلانات ہمارے ب نے قبول کیے وہاں یہ ادبی قدروں کا معاملہ بھی ادب کی کسوٹی بن کر شعر و ادب کی تخلیقات پر حاوی ونے لگا ۔

انیسویں صدی کے وسط سے یورپی ممالک میں اشتراکیت اور اشتمالیت کی جو تحریکیں زور پکڑنے لگیں ۔ ھوں نے زندگی اور ادب کے تمام شعبوں کو بھی مادی وسائل اور مادی پیداوار کی قدر و قیمت کے مطابق جانچنا ور پرکھنا شروع کر دیا اور قدر یا VALUE کا اطلاق ہر چیز اور ہر عمل پر کیا جانے لگا ۔ نتیجتہً ادب بھی اس ی نوازشات سے محروم نہ رہا ۔ خاص طور پر تنقیدی ادب میں اس کی اہمیت دن بدن بڑھتی گئی ۔ اور بڑھتے بڑھتے بدیسی ادب کے ساتھ اردو ادب میں بھی آگئی ۔

اردو ادب میں ۱۹۳۶ء کے بعد کی تنقیدی تحریروں میں جو ادبی اصطلاحات بہت زیادہ برتی گئی ہیں ۔ ان میں ایک خاص اصطلاح یہ ادبی اقدار کی بھی ہے ۔ اس اصطلاح کی تعریف مختصر الفاظ میں یہ ہو سکتی ہے کہ قدر ایک ایسا لفظ ہے جس کا استعمال تحریری طور پر اشیا کے تبادلے اور تقابل کے سلسلے میں ہوتا ہے ۔

درحقیقت ادب اور ادبی قدروں کا رشتہ معنوی نوعیت کا ہے ۔ اس رشتے کو اگر ہم اپنے ادبی ورثے میں تلاش کریں تو ہر دور اور ہر زمانے کے ادب میں مختلف قسم کی ادبی قدریں ملتی ہیں ۔

اردو ادب کے بالکل ابتدائی دور میں متصوفانہ اقدار کا دور دورہ رہا ۔ دکن کے قدیم صوفی شعرا اور مذہبی مبلغین نے زیادہ تر مذہبی و اخلاقی اقدار کو ادبی اقدار کے طور پر اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ۔ رفتہ رفتہ مذہب کی اسلامی قدروں کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافت اور ثقافتی قدروں نے بھی اردو ادب پر اپنا گہرا اثر ڈالنا شروع کیا ۔ جس کا ثبوت نثر میں ملا وجہی کی "سب رس" اور شاعری میں 'ولی دکنی' کے کلام سے مل سکتا ہے ۔

دبستان دکن سے قطع نظر ابتدائی دور میں دبستان دلی کی ادبی اقدار کا خمیر بھی تصوف اور تصوف پسندی سے ہی اٹھا تھا ۔ اور جب تک شاہی درباروں اور امرا کی محفلوں میں فارسی ادب کا بول بالا رہا ۔ اردو ادب اور بالخصوص شاعری کے لیے صوفیوں کی خانقاہیں اور عوامی محفلیں ہی زیادہ ساز گار ثابت ہوتی رہیں ۔ لیکن جب شاہی محلوں اور امرا کی مجلسوں میں بھی اردو ادب کی قدر افزائی ہونے لگی تو ظاہر ہے کہ تصوف پسندانہ اخلاقی اقدار پر وہ جاگیردارانہ تہذیبی اقدار حاوی ہونے لگیں جو مادی عیش و عشرت اور پر تکلف آرائش و زیبائش کی پیداوار تھیں اور جن کے لئے درباری قصیدوں، عشقیہ مثنویوں فاسقانہ غزلوں، واسوختوں اور ایسی داستانوں کی ضرورت تھی جو سطحی تفننِ طبع اور عیش کوشانہ ذہنیت کو تقویت دے سکیں ۔

اردو شعر وادب میں اس قسم کے ادب کی ابتدا تو دکنی درباروں ہی سے ہو گئی تھی، لیکن اس کا نقطۂ عروج دبستانِ لکھنؤ کے اس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی جھلکیاں اس طرح کے اشعار میں ملتی ہیں مثلاً

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا
آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھکو
کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا
اُٹھ گئے ساقینِ جاناں سے جو شب کو پائنچے
اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہو گیا۔

ایک طرف تو اس قسم کا ادب تھا جس کی اقدار کو آج ہم منفی قدروں کا نام دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ اعلیٰ اخلاقی اور تہذیبی قدریں بھی اردو ادب کے خمیر میں شامل رہیں جو سنجیدہ رجحانات کی غمازی کرتی ہیں مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
غیرتِ یوسف ہے یہ وقت عزیز
میرؔ اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا
چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

برصغیر میں انگریزوں کی عملداری نے جب ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کر کے اپنی سیاسی اغراض کے لئے فارسی کی بجائے اردو کو فروغ دینا شروع کیا تو منجملہ اور کتابوں کے میر امنؔ کی باغ و بہار بھی منظرِ عام پر آئی جس نے اس دور کی معاشرتی قدروں کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنی داستانوں میں پیش کیا۔

انگریزی اقتدار کی توسیع کے ساتھ ساتھ مغربی ادب اور مغربی تہذیب کے اثرات بھی نمایاں ہونے لگے اور ۱۸۵۷ء کے بعد تو ہمارے شعر و ادب پر ان اثرات کی کارفرمائی روزِ روشن کی طرح آشکار ہو گئی۔ سر سیدؔ اور ان کے ساتھیوں نے اصلاحی تحریک کے سلسلے میں جو ادبی کارنامے سرانجام دیئے ان میں مشرق کی مذہبی و اخلاقی اقدار کے دوش بدوش مغربی ادب و ثقافت کی سائنسی اقدار بھی موجود ہیں۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو سماجی بیداریوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ذہنوں میں سیاسی بیداری کا تصوّر بھی پیدا ہوا۔ پہلی جنگ عالمگیر کی کرم فرمائیوں نے سیاسی بیداری کے مبہم تصورات کو نسبتاً اجاگر کر دیا اور رفتہ رفتہ سیاسی تحریکیں ایسی شدت اختیار کر گئیں کہ ادب میں بھی سیاسی قدروں کا رچاؤ کہیں ہلکے اور کہیں گہرے رنگوں میں ظاہر ہونے لگا۔

سیاسی قدروں کی شعوری پذیرائی کے لئے سماجی قدروں کا تغیر و تبدل بھی لازمی سمجھا گیا۔ اور ادب کے راستے میں آخر وہ موڑ آ گیا جسے ہم انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام و عمل کا نام دیتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۶ء کا یہ موڑ ہمارے کاروانِ ادب کے لئے کئی حیثیتوں سے بڑا اہم موڑ ثابت ہوا۔ افسانہ، ناول، نظم ور خاص طور پر تنقید نگاری کے میدان میں جولانیٔ فکر و نظر کی وہ راہیں ہموار ہونے لگیں جن کی افادیت اور یت کا اعتراف ہر مکتبۂ خیال کے اہلِ قلم نے کیا ہے ۔

دوسری جنگ عالمگیر کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں نے ساری دنیا کے دانشوروں اور اہل قلم کو یہ سوچنے مجبور کر دیا کہ مستقبل میں ادب کا رویہ کیا ہو، نقل و حرکت، آمد و رفت اور نشر و اشاعت کی نت نئی آسائیوں نے اس رجحان کو تقویت دی کہ ایک زبان یا ایک ملک کا ادب دوسری زبانوں اور دوسرے ملکوں کے ادب ر ادبی قدروں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن دوسری عالمگیر جنگ سے کچھ پہلے ور بعد کا زمانہ ہمارے ادب کے لئے کڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ خاص طور پہ یہ آزمائش سنہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء لئے تخلیقی ادب کے لئے بڑی صبر آزما اور بعض حالتوں میں صبر شکن ثابت ہوئی۔ فسادات، قتل و غارتگری ور مذہبی منافرت نے سیاسی اور سماجی طور پہ انتشاری کیفیات پیدا کی تھیں۔ ان کا اثر ادب پر بھی پڑا اور بہت سے لکھنے والوں نے کچھ نہ لکھنے ہی میں عافیت محسوس کی لیکن قیام پاکستان کے بعد جیسے جیسے حالات سازگار ہوتے گئے۔ ادب میں نئے رجحانات اور نئی معاشرتی و ثقافتی قدروں کا اشتراک رونما ہوتا گیا ۔

سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اردو کا تمام سرمایۂ ادب ہندوستانی ادب ہی کا ایک اہم جز تھا۔ لیکن ہندوستان بننے کے بعد 'پاکستانی ادب' کا مسئلہ پیدا ہوا اور اس ادب میں نئے زمانے اور نئے تقاضوں کے مطابق پاکستانی قومیت اور پاکستانی معاشرے کا نیا خون جوش مارنے لگا۔

اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ادب کی نئی قدریں کیا ہیں اور ان نئی قدروں کو کن ادبی رجحانات نے پیدا کیا ہے۔ یہاں میں یہ بات بھی کہتا چلوں کہ ادبی رجحانات اور ادبی قدروں کا رشتہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے ۔

نئے رجحانات کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشی محرکات کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس وقت تو صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے بہت سے ملے جلے محرکات نئے رجحانات پیدا کرتے ہیں۔ اور ان رجحانات کی عکاسی کے لئے جو ادب تخلیق کیا جاتا ہے وہ محض روایتی بازگشت نہیں ہوتا بلکہ اس کے نئے پن میں نئے معنوی جوہر بھی شامل ہوتے ہیں۔ کچھ دیرپا ہوتے ہیں اور کچھ ہنگامی کچھ مثبت ہوتے ہیں اور کچھ منفی۔ انھیں معنوی جوہروں کو ہم نئی ادبی قدریں کہتے ہیں۔ یہ نئی قدریں سائنس کی بھی ہو سکتی ہیں اور مذہب و اخلاق کی بھی۔ ان نئی قدروں میں کچھ قدریں مادی آسائشوں سے بھی منسوب ہو سکتی ہیں اور کچھ ماورائی عقیدوں سے بھی۔ یہ نئی قدریں مثبت بھی ہو سکتی ہیں اور منفی بھی۔ اب یہ کام ادبی تحقیق اور تنقید نگار

ا ہے کہ وہ ان کا احتساب کرتے رہیں اور ادب تخلیق کرنے والے خود احتسابی کو بھی روا رکھیں ۔

موجودہ دور میں کسی بھی زبان کا ادب بین الاقوامی روابط اور عالمگیر انسانی برادری کے تصورات سے خود کو الگ ں دکھ سکتا ۔ مختلف قسم کے علوم وفنون کی حیرت انگیز ترقی نے انسانی فہم وفراست کو اتنا عروج بخشا ہے کہ ادب بہت سی پرانی قدریں اب قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی ہیں ۔ مذہب اخلاق اور معاشرت کی بہت سی قدریں دم توڑتی ئی محسوس ہوتی ہیں ۔

سائنس کے ارضی، فلکی اور بحری انکشافات نے انسانی ذہن اور عقل وآگہی کو ایسی ہوا دی ہے کہ یہ وسیع و یض کائنات بھی اس کے خرام ناز کے لئے ناکافی نظر آتی ہے ۔ اب سائنس کے سامنے نہ فلسفہ کی دال گلتی ھائی دیتی ہے اور نہ ادب کی یہ بات الگ ہے کہ ادب کی ناقدری کے باوجود ہم ادبی قدروں کی باتیں کر کے پنے دلوں کو تسلّی دے لیتے ہیں ۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مادّی تہذیب کی ہزار رخی جلوہ گری نے مشرق ومغرب کے ہر آدمی کو گرویدہ بنا رکھا ہے اور انسان کی بنیادی احتیاجات کا دائرہ تمام آسائشات اور تعیّشات کے دائروں کا بھی احا نا چاہتا ہے ۔

بظاہر تو اس میں بھی عیب کی کوئی بات نہیں لیکن خرابی یہ ہے کہ حرص و ہوا کی اس دوڑ میں چیرہ دست تحصالی قوتیں بھی بروئے کار آرہی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن ملکوں میں سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے وہاں معاشرتی تری اپنی انتہا کو پہنچنے لگی ہے ۔ جس کا اثر فراریت، قنوطیت، تشکیک وتذبذب سطحی لذتیت، جنسی کجروی ر مجرمانہ ذہنیت کی شکل میں ادبی تخلیقات پر بھی پڑ رہا ہے ۔ اور اس قسم کی منفی اقدار سے ہمارا ادب بھی فوظ نہیں ہے ۔ اس لئے اہل ادب کا عالم یہ ہے کہ ۔

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس شاعری میں عزت سادات بھی گئی

اردو کا قاعدہ
آسان قاعدہ جس سے بچے بہت جلد الفاظ اور جملوں کا لکھنا اور پڑھنا سیکھ جاتے ہیں ۔
قیمت :۔ پچیس ۲۵ پیسے
انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

سرشار کی ناول نگاری

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

رتن ناتھ سرشار اردو کے عظیم ناول نگار ہیں، ان کی حیات اور کارناموں پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے ہیں اور وہ بھی نہایت تشنہ۔ ڈاکٹر ادیب نے بڑی محنت سے اس کتاب میں سرشار کے حالاتِ زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالی۔ ان کے اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو الہ آباد یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی تھی

قیمت: پندرہ روپے پچاس پیسے

غالب۔ فکر و فن

ڈاکٹر شوکت سبزواری

مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی شخصیت، اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں، وہ اس کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں، یہ مقالات حسب ذیل ہیں۔

غالب محقق کی حیثیت سے
میر و غالب
غالب کے اردو کلام کی اشاعت
غالب، خطوط کے آئینے میں

ذال معجمہ فارسی میں
غالب اور میرٹھ
غالب کی شخصیت

قیمت: پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

چنچل نار اور کشن پرشاد شاد

ڈاکٹر سید محمد عقیل

انجمن ترقی اردو پاکستان کے ماہانہ جریدے "قومی زبان" کراچی کے جولائی ۱۹۶۸ء کے شمارے میں جناب تحسین سروری کا ایک مقالہ "چنچل نار — ایک ناول — ایک بحث" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ چنچل نار کچھ لوگ سرشار کی تصنیف بتاتے ہیں اور کچھ مہاراجا کشن پرشاد شاد کی۔ اس مقالے میں جن حضرات کے خیالات سے بحث گئی ہے ان میں خاص طور پر جناب پریم پال اشک اور ڈاکٹر قمر رئیس ہیں، جن کی عبارتوں اور اثباتات سے یہ بات ثابت وتی ہے کہ "چنچل نار" شاد کی تصنیف نہیں۔ یہ اثباتات زیادہ تر داخلی، خارجی شہادتوں اور قرائن سے پیش کیے گئے ہیں ناب تحسین سروری صاحب نے، اس بات سے اختلاف کیا ہے۔ وہ "چنچل نار" کو شاد ہی کی تصنیف مانتے ہیں لیکن غالباً چل نار" اور شاد کے دوسرے ناول موصوف کی نظر سے نہیں گزرے اس لیے مختلف بحثوں سے اور قرائن سے نتیجے نکالنے کوشش کی ہے کہ یہ ناول شاد ہی کا ہے۔ تحسین سروری صاحب نے جو نتیجے نکالے ہیں وہ بالکل درست ہیں۔ اس میں گز کوئی شک و شبہ نہیں کہ چنچل نار شاد ہی کی تصنیف ہے لیکن بہتر ہوتا کہ یہ نتیجے چنچل نار اور شاد کے دوسرے ناولوں نظر میں رکھ کر اور ان کے اقتباسات کے حوالے دے کر نکالے جاتے۔ پریم پال اشک صاحب نے جو دعوا کیا ہے کہ :

> "حضرت شاد نے اپنی زندگی میں "چنچل نار" کے سوائے اور کوئی ناول نہیں لکھا اور
> اگر لکھا ہو تو جناب حکم چند نیر فرمائیں کہ انھوں نے حضرت شاد کے کون کون سے ناول
> کب اور کہاں دستیاب کیے"

رست نہیں۔ شاد کے ناول "چنچل نار" سے پہلے بھی شائع ہوئے اور بعد کو بھی۔ ان کے چھپے ہوئے نمونے موجود ہیں۔ ہم ل میں ان کے ایسے ناولوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہمیں حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں سے دستیاب ہوئے لیکن خلط لث کو بچانے کے لیے یہ قضیہ چنچل نار ہی سے شروع کیا جاتا ہے۔

چنچل نار کا سلسلہ حیدرآباد دکن سے نکلنے والے ایک علمی اور ادبی رسالے "دبدبۂ آصفی" سے شروع ہوا جس کا

پہلا نمبر ۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو حیدرآباد سے شائع ہوا - سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں یہ نمبر محفوظ ہے - اس نمبر کا کور (COVER) گلابی رنگ کا ہے اور اس کا ایڈیٹوریل یوں ہے -

> "کئی سال ہوئے کہ راجہ رایان مہاراجہ کشن پرشاد مہاراجہ بہادر وزیر فوج آصفی دام اقبالہٗ کی آرزو تھی کہ ایک اعلیٰ درجے کا رسالہ ماہواری اردو زبان میں اس طرح شائع ہو جس طرح انگریزی رسالے نکلتے ہیں . . . . مہاراجہ بہادر محتشم الیہ کی صدق نیت اور صفائی ہے قلب کا پورا ثبوت دے، اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اس رسالے کو ایسے وقت میں شائع کیا جس سے بہتر اور موزوں تر اور مبارک زمانہ چشم فلک نے دیکھا اور نہ گوشِ فلک نے سنا - حضور لامع النور خاقان ابن خاقان - خسرو جم جاہ قلمرو دکن کی سالگرہ مبارک جیسے زمانے اور مبارک دن . . . . ہم حیدرآباد کا دعا یا نمک خوار جاں نثار رعایا اور نمک خوار و جاں نثار شہریار کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے . . . . . .
> یہ بھی اس رسالے کی فرخندہ طالعی اور ناظرین باریک بین کی خوش قسمتی کی دلیل قاطع ہے کہ ایسا موقع تقریب سعید ہاتھ آیا"

یہ اداریہ دو ادیبوں میں سے کسی ایک کا ہو سکتا ہے - یا تو ٹھاکر پرشاد صاحب شوق کا جن کی نگرانی میں رسالہ نکلتا تھا یا پھر رتن ناتھ سرشار کا جن کے نام اس رسالے کے جملہ حقوق محفوظ تھے - رسالے کے آخری صفحے پر یہ نوٹس ہے -

"نوٹس

یہ رسالہ ہر مہینے کی ۲ تاریخ ماہ ہلالی کو شائع ہوگا - کل حقوق بحق پنڈت رتن ناتھ سرشار صاحب لکھنوی محفوظ ہیں - اس کا منافع عالی جناب مہاراجہ پیشکار بہادر نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کو بطیب خاطر عطا فرمایا اور پنڈت صاحب نے قیمت سالانہ حسب ذیل قرار دی -

(۱) امرائے عظام سے عشہ ر
(۲) پبلک سے ے ر
(۳) باہر والوں سے اس کے علاوہ محصول ڈاک ۲ ر"

'چنچل نار' نمبر ۲ (دوسرے) بابت ماہ یکم جمادی الاول ۱۳۱۵ھ سے شائع ہونا شروع ہوا (اگرچہ نوٹس میں ۲ تاریخ ماہ ہلالی کا اعلان اشاعت ہے) اس نمبر میں ایڈیٹوریل کے بعد ہی فہرست میں بھی "اعلان چنچل نار" چوتھے صفحے پر ہے اور پانچویں صفحے سے ناول شروع ہے - اعلان نامہ یوں ہے :-

"چنچل نار

اس نام کا ایک ناول جو مہاراجہ پیشکار بہادر دام اقبالہٗ نے حال میں تصنیف کیا ہے آج کے پرچے کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین رسالہ پہلے ہی سین scene سے کوئی رائے اچھی یا بری قائم کرلیں گے۔ اس میں بڑا مارل نکلتا ہے۔ جب ناول پورا طبع ہو لے گا تو کتاب کے قالب میں آئے گا۔ ناول قابل دید ہے۔ انگریزی طرز پر ناول لکھا گیا ہے۔

ایڈیٹر"

اس عبارت کے بعد ہی ایک سرخی کے ساتھ دوسرے صفحے سے ناول شروع ہے۔

"چنچل نار

پہلا چھلاوہ

گنگا اشنان"

اس شمارے میں یہ حصہ ص۵ سے ص۱۵ تک درج ہے اور آخر میں "کشن پرشاد عفی عنہ" تحریر ہے۔ ناول کا یہ حصہ ۳۱ ویں ان سطروں پر ختم ہوتا ہے۔

"اس طرح دو دو گال ہنستی۔ چومکھا لڑتی۔ بی پاروتی صاحب مع ہمجولیوں کے
اپنے نوخرید مکان میں پہونچیں"

اس نمبر میں کل باون۵۲ صفحے ہیں اور کور COVER زرد رنگ کا ہے۔ یہ ناول دبدبۂ آصفی میں سلسلہ وار چھ۶ شماروں تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد ساتویں شمارے میں جو یکم شوال ۱۳۱۲ھ کو شائع ہوا، اس میں 'چنچل نار' کے لیے حسب ذیل اشت ملتا ہے۔ صفحہ ۳ (تین) کے حاشیے پر اوپر لکھا ہوا ہے۔

"اعلان چنچل نار"

پھر عبارت یوں ہے:

"چنچل نار

اس مقبول اور عام پسند ناول کے اشتیاق نے ناظرین کو اس قدر والہ بنا رکھا ہے کہ ایک ماہ تک انتظار کرنا ناگوار ہوتا چلا۔ چنانچہ اکثر احباب اور شائقین نے اس امر کی شکایت کی اور اپنی خواہش ظاہر کی کہ بہت جلد اختتام پا کر کتاب کے قالب میں آئے اور گلہائے معانی تازہ کے اس دلکش باغ کی سیر سے ناظرین حظ وافر اٹھائیں۔

اس لیے اس مہینے سے اس ناول کے کتاب کے قالب میں لانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ جن جن ناظرین اور شائقین کے ہاں رسالہ "دبدبۂ آصفی" پہنچا ہے ان کی خدمت میں ماہِ آئندہ کے رسالے دبدبۂ آصفی کے ساتھ بقیہ حصہ کتاب کے قالب میں پہنچ جائے گا۔ لہٰذا اس مہینے میں مذکور درج رسالہ نہیں کیا گیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک مہینے کا انتظار بھی شائقین کو شاق گزرے گا مگر آئندہ مہینے میں کامل کتاب کے ملاحظہ کے بعد یقین ہے کہ ناظرین بہت خوش ہوں گے اور اس انتظار کا نعم البدل ہو جائے گا۔ ہم مہاراجہ پیشکار بہادر دام اقبالہٗ کو بصد ادب مبارک باد دیتے ہیں کہ جناب عالی کا کلام لطافت التیام اتنی جلد مقبول خاص و عام ہوا۔

ایڈیٹر"

کے معنی یہ ہوئے کہ "چنچل نار" کو مکمل کتابی صورت میں اس اعلان کے مطابق ذیقعدہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں شائع ہو جانا چاہیئے وقت سرشار زندہ تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۹۰۲ء میں ہوتا ہے۔ یہ اعلان بھی سرشار ہی کا کیا ہوا تھا۔ اب لگے ہاتھوں پریم پال صاحب کی ایک عبارت اور دیکھتے چلیے۔ اپنی کتاب "سرشار ایک مطالعہ" میں ص ۸۶ پر لکھتے ہیں۔

> "گور غریباں ناول چھپ نہیں سکا لیکن دبدبۂ آصفی میں پنڈت جی نے ایک ناول "چنچل نار" شروع کیا۔ یہ سلسلے وار شائع ہوتا رہا۔ چکبست فرماتے ہیں کہ یہ ناکام رہا اور اچھا ہوا کہ ناتمام رہا۔"

اس سلسلے میں کچھ اختلافات ہیں یہی ناول مہاراجا کشن پرشاد کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے دیباچے میں بھی یوں لکھا ہے "وہی ناول ہے جو دبدبۂ آصفی میں سلسلے وار شائع ہو چکا ہے۔" کہتے ہیں مہاراجا صاحب کسی وجہ سے سرشار سے بدظن ہو گئے تھے جس کی بنا پر سرشار کو لکھنؤ لوٹ آنا پڑا لیکن بعد ازاں پھر بلا لیے گئے۔ ہو سکتا ہے سرشار نے اپنی تصنیف کو ناکام سمجھ کر مہاراجا کشن پرشاد شادؔ صاحب کے نام منسوب کر دیا ہو۔ لیکن ایسا ہوتا تو "دبدبۂ آصفی" میں پنڈت جی کے نام کے بجائے مہاراجا صاحب کا نام ہوتا (اگرچہ ایسا ہی ہے) اس کے برعکس سبھی مصنف ایک رائے ہیں کہ سرشار کا ناول "چنچل نار" "دبدبۂ آصفی" میں سلسلے وار چھپتا رہا یا پھر ہو سکتا ہے مہاراجا صاحب نے سرشار سے اس ناول کو اپنے نام سے منسوب کرنے کو کہا ہو لیکن سرشار نے اسے قطعاً گوارا نہ کیا ہو اور اسی وجہ سے اختلافات بڑھے ہوں اور آخر ان کی وفات کے بعد مہاراجا نے استفادہ کر لیا ہو۔ ثبوت میں مہاراجا صاحب کی اپنی تحریر "یہ چنچل نار دبدبۂ آصفی میں سلسلے وار

چھپ چکا ہے" ہی کافی ہے - علاوہ ازیں اس میں سرشار کا رنگ پوری توانائی کے ساتھ جھلکتا ہے۔ (صفحہ ۸۶)

اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ پریم پال اشک صاحب نے دبدبۂ آصفی کی نہ جلدیں دیکھی ہیں اور نہ چنچل نار کا کتابی صورت میں مطالعہ کیا ہے - اگر چنچل نار اعلان کے مطابق ۱۸۹۹ء میں شائع ہوگئی تو سرشار کے انتقال سے ۴ سال پہلے انھی کے سامنے چھپی، سرشار نے کوئی اعتراض کہیں نہیں کیا - پھر سب سے پرانا نسخہ چنچل نار کا ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۱ھ کی چھپی ہوئی ہے جس پر جلیل کی کہی ہوئی تاریخ ۱۳۲۰ھ یعنی ۱۹۰۲ء کی موجود ہے۔ کیا حیدرآباد یا حیدرآباد سے باہر بھی قارئین "دبدبۂ آصفی" میں سے کوئی صاحبِ نظر اور حق گو ایسا نہ تھا جو اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس پر اعتراض کرتا کہ یہ سرشار کی تصنیف ہے۔ "چنچل نار" کے ۱۳۲۱ھ والے ایڈیشن کا ٹائٹل پیج یوں ہے -

"چنچل نار

ایک پُر اثر اور پُر مغز ناول

مصنفہ

عالی جناب معلی القاب راجۂ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے سی - آئی - ای
یمین السلطنت پیشکار و وزیر اعظم دولت آصفیہ المتخلص بہ شاد تلمیذ حضرت آصف خلد اللہ ملکہ،
در مطبع شمسی حیدرآباد دکن باہتمام محمد ابراہیم خاں اکبرآبادی طبع شد ۱۳۲۱ھ "

دوسرے صفحے پر شاد کے قلم سے یہ عبارت ملتی ہے:

> "یہ ناول "چنچل نار" جو اس وقت زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر ہدیۂ ناظرین ہوتا ہے، کوئی نیا ناول نہیں ہے بلکہ سابق میں نصف حصہ تک ماہانہ رسالہ دبدبۂ آصفی کے ساتھ نکل چکا ہے اس وقت یہ خیال تھا کہ بقیہ حصہ مع طبع شدہ حصے کے، کتاب کے قالب میں لاکر شائع کیا جائے گا مگر کم فرصتی مانع رہی -
>
> چونکہ اکثر احباب اور شائقین کا تقاضا ہوا کہ یہ ناول کامل طور سے طبع ہوجائے لہٰذا اب بقیہ حصہ مع حصۂ اولیٰ کے جس پر نظرِ ثانی کی گئی ہے کتاب کی صورت میں شیرازہ بند کرکے اربابِ نظر کے سامنے لایا جاتا ہے - کیا بات ہے اگر اہلِ زبان و زباں داں جو اردو زبان کی پیاری صورت پر والہ و شیدا ہیں اور وہ اہلِ دل جو حسن و عشق کے دل کش واقعات سے ایک خاص مناسبت رکھتے ہیں اور وہ صاحبانِ بصیرت جو الفاظ کے پردے
>
> [illegible]

کی نگاہ سے ملاحظہ کریں۔

شادؔ عفی عنہٗ "

"اس کے بعد ناول "پہلا تچار دہ" کی سرخی سے شروع ہوتا ہے۔ ناول کے آخر میں بہت سی تاریخیں لکھی ہیں۔ ایک تاریخ خود شادؔ کی بھی لکھی ہوئی ہے اور بقیہ اس وقت کے مشاہیر کی لکھی ہوئی ہیں۔ تاریخوں کی سرخی یوں ہے۔

"قطعات تاریخ و ترتیب و طبع چنچل نار"

(۱) شادؔ۔ "کھِلا کیا پری نقشۂ حسن و عشق" سنہ ۱۳۲۱ھ

(۲) فصیح الملک داغؔ دہلوی :-

خوب ہی ناول ہمارا جو بہادر نے لکھا   جس کا ہر ہر لفظ نادر ہے مثالِ دُرِ خوشاب

پھر تین شعر اور ہیں اس کے بعد تاریخ یوں ہے۔

داغؔ نے یہ مصرعۂ تاریخ برجستہ کہا   "چلبلی البیلی چنچل نار ہے وقتِ شباب"
سنہ ۱۳۲۱ھ

(۳) (۳) جلیلؔ شاگرد امیر مینائی :-

تو زبانی خوش بیانی شادؔ کی ہو کیا بیاں   داستاں سب رنگ رنگیں، دل نشیں سارا بیاں
ختم ناول کی کہی تاریخ میں نے اے جلیلؔ   "کتنی پاکیزہ زباں ہے صاف ہے کتنا بیاں
سنہ ۱۳۲۲ھ

ولہٗ

میں نے بھی جلیلؔ اس ناول کی تاریخ کہی کیا گرما گرم
اک برقِ جفا، اک سوزِ نہاں پرکالۂ آتش چنچل نار
سنہ ۱۹۰۳ء

(۴) از نواب میر عثمان علی خاں متخلص بہ عثمان (موجودہ نظام)

مصرعۂ تاریخ عثماں سے یہ ہاتف نے کہا   گوہرِ یک دانہ ہے ناول گلشن پرشاد کا
سنہ ۱۳۲۱ھ

(۵) عبدالجبار خاں آصفی نظام الشعرا نے اس ناول کی تعریف اور تاریخ کے لیے دو سو چالیس[۲۰] شعر کی ایک مثنوی فارسی میں کہی جو چنچل نار کے آخر میں شامل ہے۔ آخری شعر ناول کی تاریخ سے متعلق ہے۔

[redacted]

اتنے بہت سے اقتباسات اور تاریخیں اس وجہ سے نہیں پیش کی گئیں کہ مضمون کو طویل بنایا جائے بلکہ ان سے بہت سے دل چسپ اور کارآمد نتیجے نکلتے ہیں۔

(۱) ناول اعلان کے مطابق غالباً ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء میں شائع نہیں ہو سکا کیونکہ ان تمام تاریخوں کی سرخی پھر یوں نہ ہوتی۔

"قطعات تاریخ ترتیب و طبع چنچل نار"

اور اگر ہوتی تو طبع اول و دوم کی وضاحت ہوتی۔ غالباً شاد نے ساتویں شمارے میں اعلان تو کر دیا تھا کہ ایک ماہ میں پورا ناول شائع کر دیا جائے گا۔ مگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا اور پھر یہ ناول پہلی مرتبہ ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا لیکن ۱۳۲۰ھ ہی میں تیار ہو چکا تھا جیسا کہ جلیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اگر پریم پال اشک صاحب کی بات مان لی جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جن حضرات کی تاریخیں اس ناول میں شامل ہیں سب کے سب اس راز سے بے خبر تھے کہ یہ ناول شاد کا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میر عثمان علی خاں نظام دکن بھی، جن کو اپنی ریاست کی معمولی معمولی باتوں کا علم ہوا کرتا تھا وہ بھی اس معاملے میں بے خبر رہے۔ اور اگر سب اس راز سے واقف تھے کہ یہ ناول شاد کا نہیں، سرشار کا ہے تو اس سفید جھوٹ بولنے اور غیر دیانت داری سے کام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ "دبدبۂ آصفی" میں اس ناول کے جو حصے شائع ہوتے تھے اور جو اس کی مکمل اشاعت کا اعلان ہے۔ وہ سرشار کی زندگی ہی میں ہوا تھا۔ آخر انھوں نے یا کسی نے اشارے کنائے میں یہ بات کیوں واضح نہ کی۔ شاد کا نام اشتہار کے آخر میں "شاد عفی عنہ" لکھا ہے۔ اور ناول کے جو حصے دبدبۂ آصفی" میں چھپتے تھے ان کے نیچے بھی لکھا ہوتا تھا۔ مگر کبھی کسی نے شک اور شبہے کی نظر سے نہ دیکھا۔ آخر پریم پال اشک صاحب یا دوسرے حضرات کو آج یہ شک کیوں ہو رہا ہے کہ "چنچل نار" شاد کی تصنیف نہیں۔ قبل اس کے کہ کوئی فیصلہ کیا جائے ایک نظر اس پر بھی ڈال لی جائے کہ چنچل نار سے قبل اور اس کے بعد بھی شاد کے ناول شائع ہوئے یا نہیں۔

میری معلومات کے مطابق کشن پرشاد شاد کا پہلا ناول (سرمایۂ سعادت) ہے جو پہلی مرتبہ دارالطبع فنون (حیدرآباد) سے ۱۳۰۵ھ میں شائع ہوا۔ مجھے اس کا ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں ملا۔ اس کتاب میں کل چونتیس ۳۴ صفحے مع قطعات تاریخ ہیں۔ سرورق پر عبارت یوں ہے۔

"ہو اللہ تعالیٰ شانہٗ
من تصنیفات
عالی جناب فیض مآب راجہ کشن پرشاد تخلص شاؔد
بار اوّل
دار الطبع فنون میں چھپ کر شائع ہوا"

آخر میں قطعۂ تاریخ درج ہے۔

"شد چو سرمایۂ سعادت طبع   اندریں روزہا بفضلِ خدا
سال تاریخِ طبع ایں اے شاؔد   خوش بگفتیم "باغِ روح افزا"
۱۳۰۵ھ

ابتدا میں حمد و نعت کے بعد نواب میر محبوب علی خاں کی تعریف ہے اس کے بعد مقدمے کی عبارت یوں شروع ہوتی ہے۔

> "مجھ کو مدت سے تصنیف کا شوق تھا، مگر چونکہ زبان کی صلاحیت پورے طور سے نہ تھی اس لیے جرأت نہ ہوئی۔ ہاں تس پر بھی دو کتابیں تالیف کیں ایک تاریخی میں "باغ و بہار" دوسری اردو میں "لطائف بے نظیر" جو ناظرین کی نظروں سے گزری ہوں گی۔ بعد ازاں میں نے اپنی زبان کی صلاحیت کی فکر کی۔ اکثر کتب کا جو بہ طرز ناول زبان اردو میں لکھی گئی ہیں، مطالعہ کرتا رہا اور اخبارات کا دیکھنا ایک ضروری کام سمجھا۔ پھر کچھ شعر و سخن کا محاورہ کیا۔ فضل الٰہی سے رفتہ رفتہ اپنی زبان کسی قدر درست کی اور صلاحیت کی امید قوی ہوئی۔ ناظرین خوب جانتے ہیں کہ میری پیدائش حیدرآباد کی اور میری تعلیم بھی یہاں کی۔ پس اس حالت میں میری زبان اہل زبان سے کیا لگا کھا سکتی ہے ...... یہ پہلی ہی کتاب ہے جو میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں چھپوا کے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ...."

(سرمایۂ سعادت ص۳)

شاؔد کا مطلب پہلی کتاب سے ناول کی پہلی کتاب ہے ورنہ اس مقدمے میں اس بات کا اقرار ہے کہ "لطائف بے نظیر" اردو میں لکھ چکا ہوں ۔۔ اب یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یہ ناول، چنچل نار کے چھپنے سے سولہ سال قبل شائع ہوا۔ اگرچہ نواب مہدی نواز جنگ صاحب نے جو اپنی کتاب "مہاراجا کشن پرشاد" میں فہرست تصانیف دی ہے اس میں "سرمایۂ سعادت" کے متعلق لکھا ہے۔۔

"یہ دونوں رسالے (باغ و بہار عجیب اور سرمایۂ سعادت) نظر سے نہیں گزرے ہیں"

کتاب حیدرآباد میں اب بھی موجود ہے۔[1]

"سرمایۂ سعادت" دو بھائیوں کی کہانی ہے جس میں ایک کا نام شریف ہے اور دوسرے کا فریس۔ دونوں حیدرآباد کے رہنے والے ہیں۔ بڑے کا نام شریف اور چھوٹے کا فریس۔ شریف محض نکما، کام چور اور اوباش ہے۔ چھوٹا، عقل مند، محنتی اور ہوشیار۔ چھوٹے نے اپنی محنت سے تعلیم حاصل کی اور ملازمت کر لی۔ اپنی تنخواہ کا ایک معتدبہ حصہ شریف کو دینے لگا لیکن شریف، اس روپے کو عیاشی میں اڑانے لگا پھر بعد کو چند بدکرداروں کے کہنے سے اس نے اپنے چھوٹے بھائی پر مقدمہ دائر کر کے آبائی جائداد کا بٹوارا کر کے سب کچھ فروخت کر ڈالا اور یہ رقم بھی اڑا ڈالی۔ قرض خواہوں کے چکّر میں پھنس گیا اس وقت پھر چھوٹے بھائی نے مدد کی۔ پھر کچھ دن پریشان رہنے کے بعد بڑا بھائی سدھر جاتا ہے اور دونوں مل کر حیدرآباد میں تجارت کر کے آرام کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

اس کتاب میں مکالموں کا انداز بالکل حیدرآبادی عوام کے انداز کا ہے۔ حیدرآباد میں عورتیں بھی تذکیر کے افعال سے خاطب کی جاتی ہیں۔ یہ کیفیت اس ناول میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ حکیم صاحب، قمرالنسا سے پوچھتے ہیں:

حکیم صاحب۔ "کیوں صاحب۔ آپ کیوں تشریف لے آئے؟" (ص۔۔)

قصہ اور اقتباس اس لیے پیش کر دیا گیا ہے تاکہ "سرمایۂ سعادت" کے متن سے واقفیت ہو سکے اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ کتاب "ناول" ہی ہے۔

شاد کا دوسرا ناول "مطلع خورشید" ہے جو ۱۸۹۷ء مطابق ۱۳۱۵ھ محبوب پریس حیدرآباد دکن علاقہ پیشکاری سے شائع ہوا جس کے آخر میں داغ دہلوی، درگاپرشاد مہر سندیلوی اور امیر مینائی کی تاریخیں شامل ہیں۔ داغ کا شعر جس سے تاریخ نکلتی ہے یوں ہے۔

داغ نے لکھا ہے مصرع سال "آفتاب سخن بھی اب نکلا"
۱۳۱۵ھ

ناول کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے۔

"ناول نامیدہ بہ "مطلع خورشید"

تصنیف منیف عالی جناب راجۂ راجایاں مہاراجہ کشن پرشاد شاد بہادر پیشکار و وزیر
فوج سرکار آصفی المتخلص بہ شاد تلمیذ حضرت آصف خلد اللہ ملکہٗ باغ شاد "لطائف بے نظیر"

---

[1] حیدرآباد کی ایک ملاقات میں جب میں نے نواب صاحب مرحوم سے اس کتاب کا ذکر کیا تو انھیں بڑی خوشی ہوئی اور دوسرے دن وہ ادارۂ ادبیات حیدرآباد میں اس کتاب کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ جون ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے۔ (سید محمد عقیل)

باغ و بہار عجیب، سرمایۂ سعادت، چنچل نار، افسانۂ شیدا، عطر گل زیر طبع

۱۳۱۵ھ

محبوب پریس حیدرآباد دکن ملاقہ پیشکاری سے شائع ہوا "

کور COVER کے بعد، اندرونی صفحے پر بھی یہی عبارت ہے لیکن آخری سطر میں ' عطر گل ' کا نام نہیں ہے - پھر کتاب کے آخر کور COVER پر عبارت یوں درج ہے -

" اشتہار مطلع خورشید

یہ دلچسپ ناول اعلیٰ درجے کی شستہ اردو زبان میں فوج دکن کے وزیر اور حضور نظام کے پیشکار ارسطو تدبیر مہاراجہ کشن پرشاد شاد بہادر دام اقبالہٗ نے تصنیف فرمایا ہے اور بعد نظر ثانی، پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی، محبوب پریس میں طبع ہوا ہے - ناول قابل دید ہے بلکہ دید ہے نہ شنید ہے ۔ مصنف باوقار، مہاراجہ گردوں مدار کو فن ناول نویسی میں سات آٹھ برس سے تجربہ حاصل ہے - اس فن کے مبصروں کی رائے ہے کہ زبان اور طرز بیان دونوں میں اپنی ہی نظیر ہیں - ناول کیا ضیافت طبع اہل سخن ہے - قیمت

فی جلد عہ

المشتہر

ٹھاکر پرشاد شوق، مہتمم رسالہ دبدبۂ آصفی از ڈیوڑھی مہاراجہ بہادر "

کتاب کے آخر میں جو قطعات تاریخ شامل ہیں ان میں دو قطعے خود سرشار کے ہیں - عبارت اس طرح پر ہے -

" از پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی کاشمیری مصنف فسانۂ آزاد وغیرہ

مہاراجہ کشن پرشاد صاحب   عجب پائی ہے تم نے طبع وقاد
پرکھتے خوب ہو کھوٹے کھرے کو   اس اردو کی زباں کے تم ہو نقاد
لکھا کیا خوب ناول واہ وا واہ   اہا ہا ہا جزاک اللہ استاد

پھر چار شعر اور ہیں اس کے بعد تاریخ کا یہ شعر ہے

کہی ہے طبع عطار تاریخ   معنبر گلستانِ ناول شاد

سنہ ۱۳۱۵ھ

اس کے بعد سولہ شعر کا ایک قصیدہ نما قطعۂ تاریخ ہے اس کے آخری اشعار یوں ہیں -

بانکی نکلی دلہن یعنی عروس سخن   رونق ہر انجمن ناول گوہر نثار

مطلعِ خورشید نام رشکِ وہ صبحِ عید نورفگن، نوربیز، نورفشاں، نوربار
اس کا مصنف ہے وہ ناثرِ معجز بیاں شاعرِ رنگیں مقال، ناظمِ جادو بیاں
راجۂ گردوں سریر بیلتن و شیر گیر فوجِ دکن کا وزیر فخرِ زمن پیشکار
گلشنِ افسانہ کے سال کو ہنگامِ سیر
بلبلِ دل نے کہا، باغِ دکن کی بہار
۱۳۱۵ھ

اس کے بعد داغ دہلوی، ٹھاکر پرشاد شوق، امیر مینائی، تاج الدین حیدرآبادی، راجہ سری رنگ پرشاد بہجت حیدرآبادی سری کشن کاشمیری یاس لکھنوی وغیرہ کی تاریخیں درج ہیں۔

مطلعِ خورشید کے کور COVER پر جن ناولوں کے نام لکھے ہیں اُن میں 'چنچل نار' بھی شامل ہے۔ سرشار نے جب مطلعِ خورشید دیکھا ہوگا تو 'چنچل نار' کا نام بھی ان کی نظر سے گزرا ہوگا۔ لازماً انھیں اس پر اعتراض کرنا چاہیئے تھا کہ چنچل نار شاد کا نہیں میرا ناول ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے عیاں ہوئے کہ یہ محض مفروضہ ہے کہ 'چنچل نار' سرشار کا ناول ہے۔

مطلعِ خورشید، تین سو بارہ ۳۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈمائی سائز پر قدرے جلی خط میں چھپا ہے۔ ناول ختم ہونے کے بعد چوبیس صفحے میں الگ سے قطعات تاریخ وغیرہ شامل کئے گئے ہیں۔ مطلعِ خورشید کا قصہ حیدرآباد کے ایک نواب خاندان کی کہانی ہے۔ میری معلومات کے مطابق حیدرآباد کی تفصیلی سماجی زندگی کے متعلق یہ پہلا بڑا ناول ہے جو لکھا گیا۔ اس میں شادی بیاہ کی رسمیں اور بہت سے دیگر رسم و رواج کا تفصیلی اور دلچسپ تذکرہ ملتا ہے۔ جس سے یہاں کی سماجی زندگی پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ مقامی بولیوں اور حیدرآباد کے بعض نیز محلوں اور دوسری جگہوں کے بیانات نے اس ناول کو حقیقی زندگی سے بہت قریب کر دیا ہے۔

شاد کا ایک تیسرا ناول 'بزمِ خیال' ہے جو تین جلدوں میں تصنیف کیا گیا ہے۔ یہ ناول ۱۹۱۲ء میں محبوب پریس ملقبہ پیشکاری سے شائع ہوا۔ پہلی جلد میں کل تین سو تین ۳۰۳، دوسری میں تین سو سڑسٹھ ۳۶۷ اور تیسری جلد میں دو سو چھیاسی ۲۸۶ صفحات ہیں۔ 'بزمِ خیال' بھی حیدرآباد کی نوابی زندگی سے متعلق ہے یہاں کی سرزمین، اطوار و عادات، تہذیبی جلسوں، میلوں، مقامی تفریح گاہوں کے تذکرے اس میں موجود ہیں۔ ابتدا اس ناول کی اس طرح ہوتی ہے کہ نواب نامی رئیس اپنے ایک دوست رفیق سے انگریزی تہذیب پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزی سوسائٹی میں عورتوں کی جو عزت ہوتی ہے اور ہندوستانی سوسائٹی میں انھیں کم تر درجے کا سمجھا جاتا ہے۔ رفیق انگریزی تہذیب سے متاثر ہو کر سکندرآباد کے کلب کا ممبر ہونا چاہتا ہے جو یہاں کا بہت پرانا کلب ہے۔

'چنچل نار' میں بہت سی اندرونی شہادتیں بھی ایسی موجود ہیں جو شاد کی افتادِ طبع اور ان کے فکر و فن کے لیے دلیل

تی ہیں۔ شاد کے تمام ناولوں میں ایک طرف تو بذلہ سنجی، اور دلچسپ مزاح پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ تو دوسری طرف معرّفت اور الٰہیات کی بحثیں ملتی ہیں اور یہ باتیں اُن کے تقریباً تمام بڑے ناولوں میں ہیں۔ 'چنچل نار' میں سے تصوّف ا ایک موقع ملاحظہ ہو۔ گوشائیں جی سے چندر سین کا باپ، رتن سین ملنے جاتا ہے اس موقعے پر اُن کے خیالات یوں پیش کئے جاتے ہیں۔

"گوشائیں — بابا تم اس بکھیڑے میں نہ پڑو اور نہ کسی کے مذہب و ملّت کی ٹوہ میں اپنا وقت عزیز ضائع کرو ..... مذہب جو مختلف ہیں، اسی روپ کے بہروپ ہیں۔ کوئی کسی شکل میں کوئی کسی شکل میں۔ دراصل مذہب پوچھو تو یہ ہے۔

ملّت عشق از ہمہ ملّت جداست
عاشقاں را ملّت و مذہب خداست

...... یہی مذہب ہے فقرا اور مجذوبوں کا اور یہی مسلک ہے سالکانِ طریقت کا اور یہی مشرب ہے عارفانِ حقیقت کا۔ باقی مذہب یا اسلام تبدیل لباس اور تبدیل نام کا نام نہیں ہے اور نہ منشا ہر مقصود اس پردے میں حاصل ہو سکتا ہے:

(چنچل نار' ۳۹ – ۲۳۸)

اس کے بعد لمبی لمبی بحثیں ہیں اور پھر آخر میں بحث یوں چلتی ہے۔

"فرق یہی ہے کہ ہر صاحبِ ملّت اپنی ملّت کے مقابل دوسرے کو گمراہ سمجھتا ہے مثلاً ایک دائرہ کھینچئے (دائرہ یوں بنا ہے) اور دیکھئے مرکز تو نقطہ ہے۔ اب اسی نقطے سے اگر ہم سو لکیریں کھینچیں تو ایک لکیر کے مقابل دوسری لکیر ٹیڑھی معلوم ہوگی مگر درحقیقت ہر لکیر اپنے اعتبار اور حد تک سیدھی ہے اور آگے چل کر اسی مرکز سے ملتی ہے جو اصلی مرکز ہے۔ صوفیہ کے نزدیک کسی دین کو برا کہنا ممنوع ہے۔" (ص ۲۱۴)

پھر بارہ سال بعد لکھے گئے ناول 'بزم خیال'، میں جب کہ سرشار فوت ہو چکے تھے اسی طرح کی تصوف کی بحث پھر ملتی ہے۔ میاں نصیر اور بی سپہر آرا بیگم کے عشق کے موقعے پر پہلی جلد میں ایسی بحثیں ملاحظہ ہوں۔

"اب سنیئے۔ ہر شے کے لیے چار وجود ہیں۔

(۱) وجود ذہنی (۲) وجود عینی
(۳) وجود لفظی (۴) وجود کتبی

صوفیہ مانتے ہیں اور یوں نہ مانیں قرآن خود شاہد ہے اس کا۔ کُلٌّ آمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ لَا تُفَرِّقُ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ۔ یہاں تو حکم ہے کہ جس قدر رسول ہوئے ان

میں فرق نہ کرو۔" (بزم خیال ص ۱۱)

مطلع خورشید جو ۱۸۹۵ء کی تصنیف ہے اس میں فتح گڑھ کی تقریر اور حرکتیں جو وہ شاہ صاحب کی صورت میں کرتے ہیں ان یں تصوف کے نکات موجود ہیں۔

(۲) 'چنچل نار' میں ایک جگہ گنگا کے کنارے کے میلے میں پنڈت جی کا حلیہ یوں بیان ہوتا ہے:

"پنڈت جی نے دروازے پر پہنچ کر پگیا درست کر کے سر پر رکھی۔ دھوتی کے پیچ کو ایک
مار کسا اور گاڑھے کا نیلا انگرکھا جو ہاتھ میں تھا اسے آپا شاہی (آپاجی بھونسلا) جوتیوں
پر پھٹکار کے کاندھے پر ڈال دیا۔ انگرکھے کے بند باندھتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے۔"

یہ پہناوا مرہٹوں کے دیس کا ہے۔ شمالی ہندوستان میں گنگا کے کنارے کے پنڈتوں کا نہیں۔ دراصل شاد پر ان کا حول حاوی ہے اور بے خیالی میں حیدرآباد اور مہاراشٹر کے پنڈتوں کی تصویر گنگا اشنان کے موقع پر پیش کر دیتے ہیں

(۳) سرشار نے اگر یہ قصہ لکھا ہوتا اور لکھنؤ یا نواح لکھنؤ کا قصہ ہوتا تو گنگا اشنان کیوں لکھتے جب کہ وہ اقف تھے کہ لکھنؤ میں گومتی بہتی ہے گنگا نہیں۔ اگر گنگا اشنان سے الہ آباد مقصود ہوتا تو دسہرے کے دن الہ آباد میں دی میلہ گنگا کے کنارے یا سنگم پر نہیں لگتا۔ اور گنگا اشنان کی اہمیت صرف الہ آباد ہی میں ہے۔ سرشار اس نزاکت سے واقف رہے ہوں گے۔ 'چنچل نار' کا قصہ اسی گنگا اشنان سے شروع ہوتا ہے اور دسہرے کے دن گنگا اشنان ں میلے کا ذکر بڑی اہمیت اور تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔

(۴) 'چنچل نار' میں راوی کا ذکر بار بار ہے۔ یہی راوی 'مطلع خورشید' اور 'بزم خیال' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

(۵) 'چنچل نار' کا مزاحیہ انداز ملاحظہ ہو۔ پاروتی اور گھبرو (ایک حلوائی کا لڑکا) کی گفتگو شاد یوں تحریر رتے ہیں۔ پاروتی گھبرو سے پوچھتی ہے۔

"کیوں جی گھبرو کہو، تمھاری شادی وادی بھی ہوئی ہے یا ابھی چھٹیل ہی ہو۔"
اتنا سننا تھا کہ اس کی رال ٹپک پڑی۔ باچھیں کھل گئیں۔ مسکرا کر جواب دیا "ابھی
تو ہمارا بیاہ نہیں ہوا ہے اب خدا چاہے تو ہو جائے گا۔ ایک بھڈری نے میرا ہاتھ
دیکھ کر کہا تھا کہ مہینے سوا مہینے میں تیرا بیاہ ہو جائے گا۔ کسی میلے میں ہو گا۔

پاروتی۔ تو اس سے بڑھ کر میلہ کیا ہو گا۔ تمھارا نام کیا ہے؟ اور تم کون ہو۔
گھبرو۔ ہمارا نام گھبرو ہے اور جات کے ہم باہمن ہیں۔ مکان کچھو۔
پاروتی۔ قنوجیا باہمن تو ہم بھی ہیں۔
گھبرو۔ (بہت خوش ہو کر) آپ کا کیا نام ہے۔

پاروتی۔ ہمارا نام سنو لیا ہے۔

گھبرو۔ واہ واہ پھر کیا پوچھنا۔ ہم گھبرو تم سنو لیا۔ ہم بھی با مکھن۔ تم بھی با مکھن۔ (صـ۱۳-۱۲)

اب بزم خیال سے چند اقتباسات مزاحیہ انداز کے ملاحظہ ہوں۔

قلندر۔ تمھاری یہی سزا تھی۔ ہاتھ پاؤں تو پڑے کے اور خنگوں سے لڑتے ہیں۔

ہٹ تری۔ اچھا ہوا۔ کاش رگڑ ہی ڈالتا۔

ظریف۔ واللہ ہڈیاں چورا کر دیتا۔ مسل ڈالتا۔

رفیق۔ جی ہاں گرے بھی اور ناک بھی اونچی۔

(پھر ہنسی ہوتی ہے۔ آہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔) (بزم خیال صـ۳ جلد دوم)

"جان صاحب نے اُٹھتے ہی دھم سے پیٹ پر ایک گھونسا جما دیا۔ ظریف نے یا خدا کہہ کر بل کھایا اور جھٹ پینترا بدل کر سرو ہی کھینچی اور کہا اڑا دوں پنگوڑی۔ نامعقول۔ اُلّو کی دُم فاختہ ... کیا کہوں رحم آتا ہے ورنہ دو ہی ٹکڑے کر دیتا" (بزم خیال صـ۲)

شاد نے سرشار کی تقلید ضرور کی تھی "مطلع خورشید" پر اُن کی نظرِ ثانی بھی تھی چنانچہ اکثر "بزم خیال" اور "مطلع خورشید" میں سرشار کا رنگ اس قدر غالب آتا ہے کہ قلندر اور پیر مرد بالکل خوجی کا چربا معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً سرشار کی صحبت اور خود شاد کا مزاحیہ رجحان تھا۔ فسانۂ آزاد اس وقت کا سب سے مقبول ناول تھا اور اس کی تقلید کرنا ہر مزاح نگار شاید اپنے لیے معراج سمجھتا تھا چنانچہ شاد نے بھی سرشار کے رنگ میں مزاحیہ مکالمے لکھے اور دو ایک جگہ تو باقاعدہ خوجی کے حوالے تک موجود ہیں۔ دو ایک مثالیں اس کی وضاحت کریں گی۔ بزم خیال کے پیر مرد کے جی میں آئی کہ شکار کیا جائے۔ میاں نسیم کے گھر بندوق لینے جاتے ہیں اتفاقاً اُسی وقت پیر مرد کی بیگم انھیں بلا بھیجتی ہیں۔ بلانے والے نے واپس آکر یہ بھی بتایا کہ پیر مرد بندوق لینے گئے ہیں۔ بیگم نے جیسے ہی بندوق کا نام سُنا دوڑ کر کمرے میں ڈر کے مارے چھپ گئیں۔

"بندوق کے نام کے ساتھ ہی بیگم "میرے اللہ، میں مرگئی" کہہ کر چیختی ہوئی حجرے میں جا گریں اور دروازہ کھٹ سے بند کر لیا۔

پیر مرد۔ ائیں یہ کیا۔ کم بخت بندوق کے نام سے اس قدر ڈر ....

بیگم۔ حجرے کے اندر سے۔ خدا کے واسطے بندوق ہٹاؤ۔

پیر مرد۔ ائیں۔ یہ بندوق ہٹاؤ کیا معنی۔ اری نیک بخت بندوق ہے کس کے پاس۔ واللہ بندوق کی ایک ہی کہی۔ اب میاں پیر مرد کو مذاق سوجھا۔ اپنی سروہی رومال سے چھپا کر بندوق بنالی۔

بیگم۔ بخدا ضرور تمھارے پاس بندوق ہوگی۔ قسم ہے تمھیں میرے لہو کی بندوق باہر بھیج دو۔

پیر مرد۔ (حجرے کی طرف سر دہی بندوق کی طرح چھتیا کر) اب تو ضرور رخشانہ لگاؤں گا۔

بیگم۔ (زور سے چیخ کر) اے ہے لوگو ۔ میں مرگئی ۔ یہ بڈھا آج میرے سو برس پورے کرنا چاہتا ہے۔

(ص۲۳۵-۳۶)

یر شریفہ نوکرانی دوڑی ہوئی آتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ بندوق کہاں ہے بلا وجہ آپ پریشان ہوتی ہیں ۔ پیر مرد میاں خوجی

ربا ہیں جیسا کہ ناول نگار نے خود ایک جگہ اشارہ کیا ہے ۔

> "ہمارے پیر مرد میاں خوجی کے مرید پوپلے منہ سے اپنی بڈھی بیگم کے ساتھ چھپا رہے تھے
> اس وقت میاں نعیبر نے جو یاد کی، فوراً جامدانی کا انگرکھا در بر، خنجر کمر میں سر دہی ہاتھ میں
> لئے ہوئے میاں نعیبر کے باغ میں ایسے پہنچے جیسے تیر از کمان جستہ[1]"

ان کے بیٹے کو پاتے ہوئے میاں قلندر، نعیبر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ۔

> "قلندر۔ واللہ بوڑھے کی اکثر باتیں فسانۂ آزاد کے خوجی کی سی ہیں ۔
>
> پیر مرد۔ لا حول ولا قوۃ ۔ وہ تو کوئی مسخرہ تھا ۔ ڈھول ڈھپتے کھاتا تھا ۔ ہم شریف بہادر، جیالے سپاہی، ہاشمی النسل، بھلا چہ نسبت خاک را با عالم پاک ۔
>
> قلندر۔ جی سب کچھ سہی ۔ مگر آپ بھی وہیں کی خاک سے ہیں جہاں کی خاک خوجی کی تھی ۔
>
> پیر مرد۔ خبردار ۔ پھر نہ نسبت دینا خوجی سے "[2]

نار جیسا، ایک اور رنگ ملاحظہ ہو ۔

> "ہمارے حیدر آباد فرخندہ بنیاد کو خدا نظرِ بد سے بچائے ۔ یہاں کے میلوں کی جیسی رونق ہر سال ترقی پر ہے، شاید کہیں ایسی ...... میاں نعیبر اپنے خیمے میں داخل ہوئے ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ سال گزشتہ جو رونق میلے کی تھی اب کے اس کی آدھی بھی نہیں لیکن تب بھی سواریاں ہیں کہ چلی آتی ہیں ۔ غٹ کے غٹ، ٹھٹ کے ٹھٹ، بانکے، شہدے، گرہ کٹ، اٹھائی گیرے، چرسیے، مدکیے، گنجیڑیے، سوانگ بھرنے ہیے شریف و نجیب امڈے چلے آتے ہیں ۔ تامدان، ہوادار، بوچہ، پالکی، رہوار باد رفتار، ہاتھی، ٹٹو، گھوڑے، سب خراماں خراماں پُر قدمے رنگیلے، چھیل چھبیلوں کی بن آئی ہے ۔ بانکے جلوہ نمائی میں مصروف ہیں .... اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک رتھ سامنے سے گزرا ۔ اس میں رنڈیوں کا ایک طائفہ تھا ۔ ان میں سے ایک شاہد نسترن ..... ستمگر نے میاں نعیبر کو جو دیکھا جھک کر سلام کیا

---

[1] زم خیال ص۲۴۳-۲۴۴ ۔ [2] بزم خیال ص۲۵۴-۲۵۵ ۔

پیرمرد۔ (ہنستے ہوئے) مجھے سلام کرتی ہے۔

رنڈی۔ اوئی۔ خدا نہ کرے (انگوٹھا دکھا کر) سلام کرے میری پاپوش۔

پیرمرد۔ بھئی واللہ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سراپا بقعۂ نور ہے۔ نور بھی) اس لئے آگے چکنا چور ہے

راوی۔ سبحان اللہ۔ نور اور چکنا چور، کہ قافیہ تو مل گیا مگر کس محل پر۔ سبحان اللہ قربان ہو جیئے اس سمجھ کے

پیرمرد۔ اس وقت تمہاری رفتار گربک دری سے کم نہ تھی سینے میں خود را آنا ہم کو مبارک اور ہم تم کو مبارک

مہوش۔ مگر آپ کی وضع مجھے نرالی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کہیں آپ کو دیکھا ہے مگر آج کے اور اس روز کے لباس میں کچھ فرق ہے

پیرمرد۔ وہ کس روز تم نے دیکھا تھا۔ میں نے تمہیں آج ہی دیکھا ہے۔

مہوش۔ (اپنی ہمجولی سے کچھ بات کرکے) آپ بابا شرف الدین کے حرم میں چائے کی دکان لگا کر بیٹھے تھے ہم نے چار پیالیاں چائے کی بھی آپ سے لے کر پی تھیں۔ آج یہ صاحب کہاں آرہے گئے؟ (میاں نشیر مسکرا کر خاموش)

قلندر۔ (پیرمرد سے) کیوں میاں یہ کیا ہے؟

پیرمرد۔ بخدا اس وقت خون آنکھوں میں اتر آیا۔ کیا کروں حضور تہ ہے ورنہ ذد کر دیتا"[1]

بالکل سرشار کے خوجی کا نقشہ ہے بس ترد لی کی کسر ہے۔

اوپر کے اقتباسات بزم خیال سے پیش کئے گئے ہیں اب ایک دو اقتباسات مطلع خورشید سے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ ا میں بھی خوجی کی طرح کا ایک کردار، ایک کوزہ پشت ہے۔ وہ بھی خوجی کی طرح بار بار اپنی فارسی دانی کا اعلان کرتا ہے اور ا اسی طرح فارسی کی ٹانگ توڑتا ہے جس طرح سرشار کا خوجی۔ ملاحظہ ہو۔

"کبڑے ۔ اللہ اس کی کو کہا دے اور آں زن را در محلِ حضور نشستن گرداند"

"نانا۔ نانا۔ حضورنا۔ اردو زبان مادر من کہ زوجۂ مکرمۂ پدر بزرگ من بودند۔ ہندوستانی نبودن می شود۔ ایرانی مو شود۔ شما بہ بنید کہ کالِ اوور یں اوقاتہائے پیری لال بھبھوکا است کہ بہ ٹیٹ نری استر شما بہتر و سرخ تر می شود"

"فرخ۔ ہاں کبڑے صاحب کیا فرمایا۔ زوجۂ پدر جو آپ کی ہیں وہ آپ کی کون ہوئیں۔

کبڑے۔ اجی آپ کے باپ کی جورو میری والدہ ہوئیں (بہت غصہ ہو کر) کمزور مار کھانے کی نشانی۔ مردود۔

---

[1] بزم خیال ۲۵۵-۳۱

ذرا چھوڑ دینا مجھ کو ۔ ذرا چھوڑ تو دینا ۔ خوب پی لوں گا[1]

نواب ۔ ارے میاں یہ مسخرہ کبڑا کہاں ہے ۔

مرزا ۔ پڑے ہوں گے کہیں افیم کی پینک میں ۔

اتنے میں ایک آواز آئی " ایسی تیسی شما ۔ من در پینک افیم ؟ سر شما ۔ ایں فرخ مرزا را از من لاگ ڈانٹ است[2]

خورشید، ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی ۔ اوپر کے مکالمے سے پیر تمرد کی طرح میاں کبڑے بھی سوا مسخری کے اور کچھ نظر نہیں آتے بلکہ چنچل نار داس طرح کی مطابقت بھی نہیں ۔ تعجب ہے کہ مطلع خورشید اور بزم خیال کو سرشار کی تصنیف کیوں نہیں کہا گیا ۔ پریم پال اشک صاحب دیگر حضرات نے چنچل نار کے لئے جو اشتباہات پیش کئے ہیں وہ ان دونوں ناولوں میں بدرجۂ اتم ملیں گے اور یہ ناول سرشار کے رنگ سے زیادہ قریب ہیں ۔ تو پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ شاد کے تمام ناول سرشار کی تصنیف ہیں چنچل نار ہی کیوں ؟ کچھ چنچل نار سے پہلے منسوب کر دیئے گئے ، کچھ چنچل نار کے بعد ۔ اس طرح پھر ایک منزل وہ بھی آئے گی کہ شاد کی تمام تخلیقات دوسروں کی تخلیقات ہوں گی اور کشن پرشاد شاد ایک فرضی ادبی شخصیت کے سوا اور کچھ نہیں رہ جائیں گے ۔ شاد کی صحبت میں بیٹھنے والے ابھی حیدرآباد میں حیات ہیں جن سے شاد کے حسن مذاق، مزاح اور تبحر علم و ادب کی تصدیق ہو سکتی ہے ۔ نواب مہدی نواز جنگ کی چار سو بارہ ۴۱۲ صفحات کی ہائل مآثر پر لکھی ہوئی کتاب " مہاراجا کشن پرشاد" اور اس میں ان کی چھبیس تصنیفات کا مذکور، شاد کے حالات اور ان کی ادبی زندگی پر سب سے بڑی اور مکمل دستاویز ہے ۔

سعادت یار خاں رنگین
ڈاکٹر صابر علی خاں

یہ کتاب سعادت یار خاں رنگین کے حالات زندگی اور جائزہ تصانیف پر مشتمل ہے ۔ فاضل مصنف کو اس تحقیقی کارنامے پر پنجاب یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی ۔

قیمت : پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

---

[1] مطلع خورشید، صفحہ ۲۳-۲۵ ۔ [2] مطلع خورشید، صفحہ ۱۲۶-۱۲۵

"سہ ماہی اردو"

اکتوبر ۱۹۶۸ء کے شمارے کی ایک جھلک

ہمارا ثقافتی ورثہ ——— مصوری	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
قدیم گجراتی ادب	غلام حسین مصطفےٰ
میرا افسانہ	ملا واحدی
بادۂ کہن	شاہ عالم آفتاب
واجد علی شاہ اختر	مرزا علی اظہر برلاس
اقبال کا نظریۂ زمان و خودی	سید محمد تقی

مسلسل مضامین

لغت کبیر اردو	بابائے اردو
قطعہ منتخب	مصنف : عبدالغفور خان نساخ مرتب : ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر

قیمت فی شمارہ :- تین روپے پچاس پیسے

قیمت سالانہ :- بارہ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی ۱

شوق قدوائی

فریدہ نقوی

حضرت شوقؔ قدوائی کا زمانہ

۱۸۵۷ء کا انقلاب ہندوستان کی معاشی، سیاسی اور سماجی زندگی میں نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سیاسی اور سماجی ہنگامے کے اثرات مسلمانوں کے لئے بے انتہا ہلاک ثابت ہوئے۔ ایسے وقت میں اگر سرسیّد احمد خان مسلمانوں کی دست گیری نہ کرتے تو معلوم نہیں ان کا انجام کیا ہوتا۔ چنانچہ سرسیّد مع اپنے رفیقوں کے اُٹھے اور شعر و ادب کو اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنا کر سارے ہندوستان پر چھا گئے۔

آزاد اور حالی کی سرپرستی میں اُردو شاعری نئی نئی منزلوں کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ غزل میں واقعیت اور سچائی کی ترجمانی پر زور دیا جانے لگا۔ نظم کی ترویج ہوئی اور اس نئی فضا میں لکھنؤ اور دہلی دونوں کی آوازیں مدھم پڑنے لگیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ امتیازات مٹ کر ان سے ایک نیا رنگ پیدا ہوا جو لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کی خوبیوں کا حامل تھا۔

شوقؔ قدوائی نے لکھنؤ کے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جب کہ اَودھ کی سلطنت دم توڑ چکی تھی مگر امارت اور حکومت کی شان کچھ باقی تھی اور اس گہوارۂ تہذیب و تمدن کے طرزِ معاشرت میں چنداں فرق نہ آیا تھا۔ حفظِ مراتب، علمِ مجلس، باہمی تعلقات اور وضعداری کے قدیمی پہلوؤں پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اہالیانِ لکھنؤ کو اپنی زبان پر بڑا ناز تھا۔ لکھنؤ کے بے مثال مشاعرے ہی وہ چیز تھے جو ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے تھے۔ سیاسی انتشار کی پراگندہ ہوا تک لکھنؤ کے نازک دماغوں کو نہیں لگی تھی۔

یہی حال سرزمین رام پور کا تھا۔ وہاں تدبیر الدولہ، مدبر الملک نواب منشی مظفر علی خاں اسیرؔ لکھنوی کا عروج تھا اور لکھنؤ کا بھرم انہیں شعراء کے دم سے قائم تھا اور غالبؔ جیسا ماہرِ فن بھی ان کی صلاحیتوں کی قدر کرنے لگا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مرزا کی وفات کے بعد نواب یوسف علی خاں ناظمؔ بھی اسیرؔ سے

اصلاح لینے لگے تھے۔ اسی طرح نواب واجد علی شاہ اختر بھی اسیر کے تلامذہ میں سے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ اساتذہ کے سامنے شعر پڑھنا خلافِ ادب سمجھتے تھے لہٰذا شوق نے بھی خفیہ مشق جاری رکھی اور رامپور میں جلال، منیر، عروج اور حیا وغیرہ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ لکھنؤ میں انیس، دبیر، برق، قلق اور آتش کے سے چوٹی کے شاعر سخن سرا تھے ان کے کلام کو دیکھا اور سنا۔ قلق کی مہربانیاں آپ پر بہت زیادہ تھیں بیگماتی زبان آپ نے انہیں کی صحبت میں سیکھی۔

لکھنؤ میں اُستاد امانت کا رنگ چھایا ہوا تھا لیکن اسیر اور قلق نوعمر طبقے کو اپنا ہم نوا بنا رہے تھے۔ اسیر کے شاگردوں نے ان کا نام روشن کیا۔ اسیر کے بعد امیر مینائی[2] کا عروج رامپور میں ہوا اور وہ وہیں کے ہو رہے۔ شوق مرحوم ان کی صحبتوں[1] سے مستفید ہوتے تھے انہوں نے ان محفلوں سے بہت کچھ سیکھا اور بہت فائدہ اٹھایا۔

شوق قدوائی کو نوعمری کے زمانے میں رامپور آنے کا اتفاق ہوا تھا اور اسی زمانے میں اسیر کے معتقد ہو چکے تھے جب آپ تعلیم ختم کر کے لکھنؤ آئے تو اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آپ نے اسیر کی شاگردی اختیار کی جب ہی سے وہ شاعری کے میدان میں آئے۔ پہلی غزل انہوں نے چودہ سال[3] کی عمر میں بدایوں میں کہی تھی۔

سوانح حیات

وطن فیض آباد ریلوے لائن پر لکھنؤ سے تقریباً ۱۱ میل مشرق میں ایک چھوٹا سا اسٹیشن جگور ہے یہ ہزار بارہ سو آبادی کا چھوٹا سا قصبہ ہے یہاں کے شرفا نسبتاً شیخ قدوائی ہیں۔ یہ قصبہ بہت قدیم ہے اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل اس کا نام جگدیو پور تھا۔ جو کثرتِ استعمال سے جگور ہو گیا۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریاآبادی قدوائی خاندان کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

قدوائی خاندان۔

یعقوب | قدوائی[4] اسرائیل نسل سے ہیں سلسلۂ نسب لاوی بن یعقوب تک پہنچتا ہے۔ حضرت ہارون بن

---

[1] حضرت شوق بیان کرتے تھے کہ اسیر کے پاس میں نے مرزا غالب کے دو خطوط دیکھے جن میں مرزا نے اپنے ضعف اور مجبوریوں کا ذکر لکھ کر دوستانہ استدعا کی تھی کہ میں تو اب کسی قابل نہیں رہا آپ طالبانِ فن کو راہِ راست پر لگائیے اور مشتاقوں کی پیاس بجھایئے۔ دیوانِ شوق صفحہ ۸۰

[2] امیر مینائی قصبہ کاکوروی کے خاندان سے اور کسی واسطے سے حضرت شوق کے رشتہ دار بھی تھے۔ بحوالہ دیوانِ شوق

[3] بحوالہ دیوانِ شوق صفحہ ۹

[4] ۔ الاقتباس ۔ آپ بیتی ۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی

> عمران کے واسطے سے مورث اعلیٰ قاضی معزالدین معروف بہ قدوۃ العلم والدین کہا جاتا ہے کہ خواجہ اجمیری کے عہد میں ہندوستان آئے اور اجودھیا میں آکر مقیم ہوئے۔ اجودھیا اب فیض آباد کے متصل ایک قصبہ ہے اور ہندوؤں کا مشہور تیرتھ۔ قدوائیوں کو اولادِ انبیاء ہونے کی بناء پر ہندوستان کے شیوخ (عثمانی و صدیقی وغیرہ) نے بلکہ خود سادات نے اپنا ہم کفو قرار دیا اور آپس میں شادی بیاہ کا کثرت سے رواج دے دیا۔ قدوائیوں کی نسل لکھنؤ کے قصبہ جگور اور بارہ بنکی کے قصبوں، رسولی، بڑاگاؤں، گدیہ، مسولی وغیرہ میں خوب پھیلی اور بڑے نامور ان میں پیدا ہوتے رہے۔[1]

مولاناؒ زبیری نے قاضی قدوہ کی سوانح حیات لکھتے ہوئے انہیں نسباً سید بتایا ہے جو خلافِ واقعہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ مولانا ممدوح نے سلاطین روم کو بنی اسرائیل بتایا حالانکہ وہ سلجوقی ترک تھے اور انہیں میں قاضی قدوہ کی ننھیال تھی چونکہ قاضی قدوہ کے ددھیال والے عربی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور تمام عربی نسل لوگ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اس لئے ممکن ہے کسی تذکرہ نویس نے احتراماً سید لکھ دیا ہو۔ ورنہ قدوائی خاندان کے افراد اپنے نام سے پہلے شیخ لکھتے ہیں سید نہیں لکھتے۔

حضرت قاضی قدوہ بنی اسرائیل نسل سے تھے۔ اور ان کے بزرگوں کا یہودیوں سے تعلق تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یثرب اور خیبر میں آباد تھے۔ آپ کے والد سلطان میرک بلادِ روم میں ایک ریاست کے فرمانروا تھے۔ آپ کے بھائی سلطان نصرت الدین باپ کی جگہ ریاست پر قابض ہوئے اور حضرت قاضی قدوۃ عہدۂ قضا پر متمکن ہوئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد بھائی سے خفا ہو کر ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے اور آخر یہیں اجودھیا میں ۸۰۵ھ میں اجل کو لبیک کہا۔

اب قاضی قدوہ کی اولاد لکھنؤ کے قصبہ جگور اور بارہ بنکی کے بہت سے قصبات میں آباد ہے یہ لوگ متمول اور رکھ رکھاؤ والے زمیندار ہیں۔ اس خاندان کے تمام افراد تعلیم یافتہ ہیں اور ہر دور میں ان میں نامور پیدا ہوئے۔

کاظم علی شوقؔ قدوائی کے والد کا نام کاظم علی اور تخلص قیس تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۲۴۱ھ ہے۔ وہ قصبہ

---

[1] ماہنامہ قومی زبان کراچی ماہ دسمبر۔ شوقؔ قدوائی ڈاکٹر عقیل طاہر قدوائی

اور ———

معین الارواح، نظر ثانی شدہ۔ مرتبہ خادم زبیری بنی گدڑی شاہی مرادآبادی۔ مہاجر۔ اجمیر المقدس (از صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۵) مطبوعہ آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ۔ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۵۲ء پنجشنبہ

ذریں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد کا نام وحدت علی تھا۔ شیخ کاظم علی قدوائی کا شمار با اقتدار روسا میں ہوتا تھا اور
ہدعلی شاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ سپاہی منش آدمی تھے اور بادشاہ کی طرف سے باغی تعلقہ داروں اور سرکش زمینداروں
سزا دینے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ ان کا قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہتا تھا اور وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں اچھے خاصے
دلعزیز تھے۔ انہوں نے نو عمری ہی میں ناسخ کے نامور شاگرد بلکہ جانشین میر وسط علی رشک لکھنوی کی شاگردی اختیار کی اور
ستاد کے مشورہ سے قیس تخلص اختیار کیا۔ کاظم علی کے اعداد میں اگر قیس کے اعداد شامل کر دیئے جائیں تو ہجری تاریخ
لادت نکل آتی ہے۔ پرانے قلمی نسخے میں کہیں کاظم علی قیس قدوائی اور کہیں کاظم علی قیس جگوری کے نام سے ان کا ذکر
وجود ہے۔ شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اور اپنے زمانے میں اُن کا شمار اچھے شعرا میں ہوتا تھا۔ دیوان جوانی
ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ زندگی نے وفا نہ کی۔ صرف بتیس سال کی عمر پائی تھی آپ کا انتقال ۱۸۵۵ء[لہ] میں ہوا تھا۔

آپ کا خاندانی شجرہ مندرج ہے

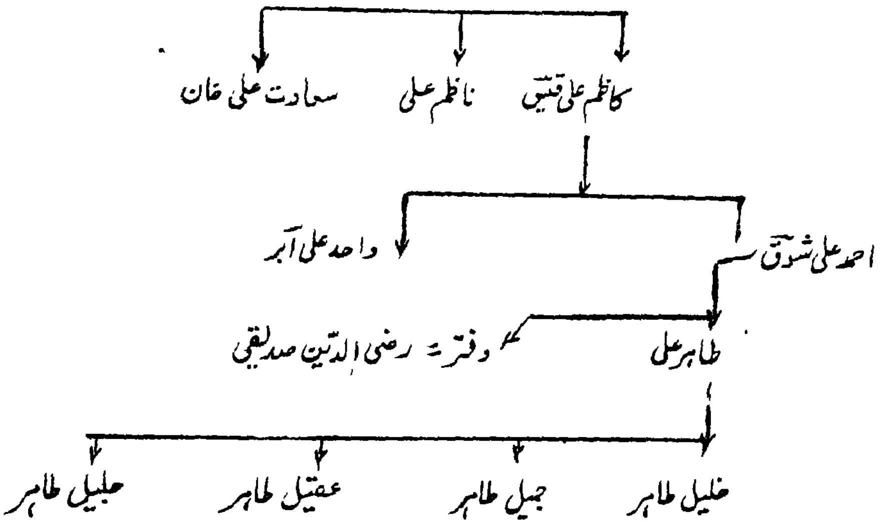

شیخ کاظم علی قیس کا ذکر حسب ذیل تذکروں[ٹہ] میں موجود ہے۔

(۱) تذکرہ "سراپا سخن" [سید محسن علی محسن شاگرد خواجہ وزیر مرقومہ ۱۸۵۳ء]
نمبر شمار ۴۴۲ پر شیخ کاظم علی کا ذکر ہے اور نام کے ساتھ قدوائی بھی درج ہے۔

(۲) گارساں ۔ ڈی ۔ تاسی (فرانسیسی مستشرق) کی تاریخ ادب ہندوستانی (بزبان فرانسیسی) ڈی ۔ تا ۔ سی ۔ کی اس کتا

[لہ] آپ کی اچانک موت سے آپ کی شریک حیات کو شبہ تھا کہ مرحوم کو دشمنوں نے زہر دیا ہے۔

کا ترجمہ ایک فرانسیسی خاتون نے چند برس پہلے کراچی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے کیا تھا نمبر شمار ۱۸۴۳

(۳) تذکرۂ سخن شعرا (مولفہ عبدالغفور نساخ) مرقومہ سنہ ۱۸۶۳ء نمبر شمار ۱۷۹

(۴) جلوۂ خضر (مؤلفہ صفیر بلگرامی) جلد دوم ص ۱۵۷۔ (تالیف سنہ ۱۳۰۲ھ)

(۵) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔ از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

قیس قدوائی کا قلمی دیوان اب ناپید ہے۔ لیکن پرانے تذکرہ نویسوں نے جو غزلیں نقل کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اُن کی عمر وفا کرتی تو ان کا شمار اچھے شعراء میں ہوتا۔

نمونۂ کلام یہ ہے [1]

حلق پر جب مرے شمشیر پھری — لب پہ آتی ہوئی تقریر پھری
یار نے یار سے لکھا خط کا جواب — نامہ بر پھر مری تقدیر پھری
پئے تشہیر گلی کوچے میں — ماری ماری مری تصویر پھری
نکہتِ زلفِ معنبر نہ ملی — جو صبا آتے ہی دلگیر پھری
سیمبر گھر سے نہیں میرے پھرا — ہاتھ آئی ہوئی اکسیر پھری
میں وہ مجنوں ہوں کہ صحرا صحرا — وحشتِ دل لیے زنجیر پھری
پھر گیا ایک زمانہ مجھ سے — جب نگاہِ بتِ بے پیر پھری

دفعتاً گھر جو ہوا قیس جنوں !
کس کی آنکھوں میں یہ تصویر پھری

-۵-

کس [2] درجہ اوج پر ہے مرے یار کا دماغ — ہے ساتویں فلک پہ ستمگار کا دماغ
بیجا بھی ہم نے اُس کے اُٹھائے غرور و ناز — اس پر نہ کم ہوا بتِ عیار کا دماغ
یہ ڈھنگ ہیں بُرے بخدا چھوڑ دے مری جان — نخوت غرور کبر یہ ہر بار کا دماغ
ہوتا ہے دردِ سر اسے صندل کے نام سے — کتنا ضعیف ہے مرے بیمار کا دماغ

---

[1] تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی) سعادت علی خاں ناصر۔ تصنیف ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء - مخزونہ انجمن ترقی اردو، کتب خانۂ خاص۔ کراچی

[2] تذکرہ سراپا سخن مرتبہ مؤلفہ سید محسن علی شاگرد وزیر اشک صفحہ ۲۵ مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۲۸۸ء

دشوار قیسؔ ہے ترے دیوان کا جواب ۔ پایا کسی نے کب ترے اشعار کا دماغ

—۵—

ہجرِ خوباں میں بہاتی ہیں جو دریا آنکھیں[1] کیا ہوئی تھیں اسی دن کے لئے وا آنکھیں
دشتِ غربت میں نہ کس طرح ہوں طوفاں انگیز کثرتِ گریہ سے ہیں غیرتِ دریا آنکھیں
شعلہ رویوں کا تجسّس اسے کیونکر نہ رہے دل پُر داغ ہے داغوں سے سراپا آنکھیں
خواہشِ دید ہے ان کو نہ تمنائے وصال رکھتی ہیں پیشِ نظر یار کا نقشا آنکھیں
ترک کیوں کر کروں نظارۂ گل رو ناصح کہ بنائی ہیں مری بہرِ تماشا آنکھیں
چھوڑ کر کوئے محبت کو کہاں جاؤں قیسؔ
اور کوچے سے نہیں میرے شناسا آنکھیں

آبائی جائداد | کاظم علی قیسؔ کی وفات کے وقت ان کے بڑے بیٹے شیخ احمد علی قدوائی کی عمر ڈھائی سال کی تھی اور چھوٹے بیٹے واجد علی صرف چھ مہینے کے تھے ان کی وہ تمام جائداد جو ان کو شاہی خدمات کے صلہ میں ملی تھی ان کی وفات کے بعد اودھ حکومت کے دستور کے بموجب ضبط کر لی گئی تھی لیکن آبائی جائداد ان کے خاندان والوں کے قبضہ میں رہی اور اب بھی ہے۔ یہ جائداد ان کی اولاد میں تقسیم ہو جانے کے بعد بھی اتنی ہے کہ ان کی اولاد کا شمار متوسط درجے کے زمینداروں میں ہوتا ہے اس جائداد پر ان کے چھوٹے بھائی شیخ ناظم علی مرحوم عرصۂ دراز تک قابض و متصرف رہے اس لئے یہ کہنا کہ ان کی ساری جائداد غدر کے زمانے میں تلف ہو گئی بالکل غلط ہے۔ اس قسم کی غلطی عام تذکرہ نویسوں سے سرزد ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شوقؔ صاحب کے دیوان کے مقدمہ کی سند پر دیگر تذکرہ نویسوں نے بھی یہی لکھا ہے۔ یہ مقدمہ مولوی معین الدین انصاری صاحب نے تصنیف فرمایا تھا بدقسمتی سے اس وقت جائداد کے سلسلے میں کچھ تنازعات موجود تھے اس لئے مولوی صاحب نے مصلحتاً یہی لکھا کہ شوقؔ صاحب کوئی صاحبِ حیثیت آدمی نہ تھے اس غلط فہمی کی تصحیح ڈاکٹر عقیل طاہر قدوائی صاحب نے کی ہے جو شوقؔ صاحب کے حقیقی پوتے ہیں اور سکھر مغربی پاکستان میں سکونت پذیر ہیں وہ رسالہ "قومی زبان" ماہ دسمبر ۱۹۶۲ء میں لکھتے ہیں:

> "یہ بیان کہ جائداد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران تلف ہوئی یا اسے غیر ملکی حکومت نے ضبط کر لیا غلط ہے۔ شوقؔ قدوائی کی موروثی جائداد اور زمینداری ان کے صاحبزادے کے قبضے میں زمانہ حال تک رہی اور خدا کے فضل سے اس کا ایک تنکا بھی تلف یا ضائع نہ ہوا۔"

---

[1] سراپا سخن ص۵۲

س یش ص

سید وصی احمد بلگرامی

باب سوم در بیان ص

حضرت غالب کے مطبوعہ خطوط میں چودھری عبدالغفور کے نام جو خطوط ہیں روئے سخن ان کا دراصل حضرت صاحب عالم صاحب بلگرامی سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی طرف ہے۔ چنانچہ ایک خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں:

"تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نساب جامع مدارج جمع الجمع، بزم وحدت کی فروزندہ شمع مستغرق مشاہدۂ شاہدِ ذات، حضرت عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک دوسرے خط میں فرماتے ہیں:

"جناب چودھری صاحب آؤ! ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں۔ اور اپنی آنکھیں ان کے کفِ پائے مبارک سے ملیں۔

میں سلام کروں گا۔ تم معرف ہونا کہ غالب یہی ہے! اہلِ دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے! میں نے عزم قدم بوسی کیا۔ پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا!۔

فرماتے ہیں۔ غالب تو اچھا ہے؟۔ عرض کرتا ہوں کہ الحمدللہ! حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟

ارشاد ہوا کہ مولوی سید برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔

جناب! یہ ان کی خوبیاں ہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے ضعفِ قویٰ و اضمحلال کہتے ہیں۔ تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا۔ ان کی غمخواری اور دردمندی کا دم بھرتا ہے ؎

دلکشا کشش منعم نگسلد رواں از تن اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ماست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں
اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں
حضرت! سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا ہے
اتنا تنگ کر دیا ہے ... ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے"

یہ خط دہلی سے مارہرہ گیا تھا۔ مگر اس کو تعلق آرہ سے ہے۔ آرہ میں حضرت صاحب عالم صاحب کے نواسے، اور حضرت غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نے بوستان خیال کی اٹھارہ جلدوں کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا اور دو جلدیں شائع ہوئیں تو غالب نے مبارک باد دی۔

نور نظر لخت جگر۔ زبدۂ اولاد پیغمبر۔ مولوی سید فرزند احمد زاد مجدہٗ اس درویش گوشہ نشیں
کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستان خیال کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک
حضرت! یہ آپ کا احسان عظیم ہے۔ مجھ پر خصوصاً۔ اور بالغ نظران ہند پر عموماً۔

(غالب ۸ ذلقعدہ ۱۲۸۱ھ جلوۂ خضر جلد دوم ص ۲۴۳)

اسی بوستان خیال اردو کی دو جلدیں صفیر بلگرامی کے نانا حضرت صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ نے غالب کو دیکھنے کے لیے بھیجیں تو چودھری عبدالغفور کے خط میں ۵۹ جواب آیا جو اوپر لکھا گیا۔

صفیر بلگرامی کے بارے میں جوہر شناس کیا کہتے تھے اور کیا کہتے ہیں اس کا بیان قصیدۂ زلف لیلیٰ ہے۔ اس قصیدے کا چہرہ یہ ہے۔

مولانا محمد عباس ایرانی جہاں ہست[1] آلنگ خوش شہریور انوشہ بجوشہ فروزندہ ہور

---

[1] النگ : سبزہ زار
شہریور : بھادوں کا مہینہ
انوشہ : شاداں و خنداں

گیہوں کے کھیت میں ایک کنواری لڑکی ہے۔ داہنا ہاتھ کندھے تک۔ ہاتھ میں مٹھی بھر گیہوں کی بالیاں البیلی ایسی کہ پاؤں رکھتی کہیں اور پڑتا کہیں ہے۔ سر پچھم اوتر۔ پاؤں پورب دکھن!

اہل نجوم نے آسمان کا بارہ حصوں (بارہ برج) میں تقسیم کیا ہے۔ ان بارہ برجوں میں چھٹے برج کا نام ایران میں سنبلہ رکھا گیا سنبلہ یعنی خوشۂ گندم۔ ہندوستان میں پکارا گیا۔ کنیا کنواری لڑکی۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

بھادوں کی جھڑی ہے ۔ ہریالی ہے ۔ جبھی تو سورج مہاراج تک ایک کنیا کے پھیرے میں آگئے !

بہ پیشم شتاباں بیا موبدا   بجشنی چہ خوانی برائے خدا

اے اگنی دیوتا کی آنکھوں کے تارے ! تیری پوتھی جائے چولھے بھاڑ میں ۔ ہمارے پاس آتا کیوں نہیں؟

چہ از بر سرائی نسک ہائے ژند   ببین و بخواں نامۂ دل پسند

ہم پوچھتے ہیں کہ وہاں بیٹھا ہوا کیا الاپ رہا ہے ؟ تیری پوتھی میں آخر رکھا کیا ہے ؟ دیکھنا ہو تو ادھر آ ۔ پڑھنا ہو تو ادھر آ ۔

کہ فرزند احمد ہمایوں منش   گرامی نژاد و خجستہ روش

فرزند احمد کو دیکھ ۔ جس کا سبھاؤ اچھا ۔ جس کی پیڑھی اونچی ۔ جس کی چال ڈھال اچھی ۔

بہشت است زیبا تر از گلستاں   نگر ۔ تا دلت شاد گردد از آں

پھلواڑی میں وہ پھول کہاں جو اس کے پاس ہیں ؟ آکر دیکھ لے ۔ جھولی بھر لے ۔

کہ فرزند احمد دبیر کبیر   جوان است و خوش فکر و بلبل صفیر

فرزند احمد قلم کا دھنی ہے ۔ جگت گرو ہے ۔ جوان ہے ۔ کبیشر ہے ۔ بلبل ہے ۔ صفیر ہے ۔

مرزا دبیر لکھنوی (۱) خطیب منابر فصاحت و نکتہ دانی ۔ عندلیب حدائق بلاغت و رنگیں بیانی سلمک اللہ تعالیٰ ”

(۲) نمک خوان سخن ، محک امتحان طرز ممتحن ، فصاحت سرمایہ ، بلاغت پیرایہ ، سید فرزند احمد صاحب متخلص بہ صفیر زاد قدرہ ۔
مادۂ تمنا در جام و زلال مدعا ہموارہ بکام بادہ”

مرزا محمد باقر صحبت شیرازی   از قصیدہ در مدح حضرت صفیر بلگرامی

(بقیہ صفحہ سابقہ)

اس مصرعے میں خوشہ سے مراد برج سنبلہ یعنی کنیا ہے اس لیے بخوشہ فروزندہ ہور کا مطلب یہ ہوا کہ آفتاب برج سنبلہ میں ہے ۔ یعنی سورج مہاراج ایک کنیا کے پھیرے میں آگئے ۔

ہور : آفتاب
موبد : جس طرح ہندوؤں میں پنڈت اسی طرح پارسیوں میں موبد
یجشنی : پارسیوں کی کتاب وظائف
نسک : سورہ
ژند : صحیفۂ زردشت

ہزار مرتبہ گر مدح حضرت تو سرایم یک از ہزار نگویم چہ جلی و چہ مبہم
ہم آسمانِ جلالی۔ ہم آفتابِ جمالی ہم آسمانِ کمالی۔ جلیل قدر و معظم
جناب سید فرزند احمدی و صفیری ہمی بزمرۂ ساداتِ بلگرام مفخم
گرم بلطف بخوانی۔ ورم بقہر برانی سر اندرم بکمند تو است۔ و حکم تو محکم
بپاس محبت و فضل و کرم کنی سوئے صحبت رسد بزخم درونش زخاک پائے تو مرہم

مرزا حاتم علی مہر لکھنوی : نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

الحمدللہ علی احسانہ کہ از صریرِ خامہ صفیرے بگوش خورد و دلم از دست برد ؎

برین مژدہ گر جاں فشانم رواست کہ ایں مژدہ آسائش جانِ ماست

مکرمت نامہ وی کہ یکم اگست بود با یک جلد علی بند و حسین بند برائے بندہ، و دو تا برائے برادر عزیزم مرزا عنایت علی ماہ سلمہ اللہ، و نور چشم آغا سخاوت علی ضیا اسسٹنٹ کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ ایں ضلع ایدہ اللہ اعلی اللہ درجاتہم، مع یک جلد سفیر صفیر و یک جلد تذکرہ تلامذہ بلند فکر خیر الذکر بسبیل ڈاک رسید۔ و ایں خمسہ چوں خمسہ نظامی بر حواسِ خمسہ ام نظام تازہ بخشید۔ ماشاء اللہ ہر تصنیف شریف لطفے دارد کہ دل شیدائے سخن می خارد ؎

بمانا و آں دوست کو دوستاں را غذائے دل و راحتِ جاں فرستد

مہجورِ از عالی دودمان و والا شان اعزّ اعزّا امیر بادشاہ علی صاحب بقا صہر مرزا سلامت علی صاحب دبیر مغفور خلف الصدق جناب میر وزیر صاحب مبرور محامد و مدیح جناب بیشتر از بیشتری شنفت۔ اکنوں از کلام بلاغت نظام بہ ازاں دریافتم کہ عزیزم میگفت۔ بہ تعالیٰ شانہ سلامت داشتہ باشد۔ بحق محمد و آل محمد۔ میخواہم کہ گاہ گاہ بخاطر مبارک رسیدہ باشم
زرد چہرہ مہر عفی عنہ۔

حضرت امیر مینائی : بلبلِ شیراز و طوطیِ ہند کے ہم صفیر سلامت۔ سلام مسنون اخلاص و سپاس مشحون۔ سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماروں کی پرستاریوں نے مجھ سے جی بھر کے اُن آسائشوں کا عوض لیا جو میں نے ملاقاتِ احباب سے سفر میں پائی تھیں۔ وہ سرگزشت لکھوں تو خط مرثیہ ہو جائے۔ کتنے ہی عزیز چل بسے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

اس اجمالی اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے فقیر نام کے امیر کو یہ نہ سمجھیں کہ وطن پہنچ کر آپ کی مہربانیوں اور قدر دانیوں کی لذت بھول گیا۔ نہیں نہیں۔ سب ازسرے یاد ہے۔

امیر اللغات کے اصول سے متعلق ایک کاپی بھیج کر آپ کے دل و دماغ سے جواب با صواب کی آرزو ہے۔ زیادہ حاجت تصدیع نہیں۔

امیر احمد عفی عنہ

اجی حضرت! جلوۂ خضر کی دوسری جلد چھپنے میں کیا دیر ہے؟ ضرور لکھئے کہ کب تک مشتاقوں کو تڑپایئے گا۔ فقط

والسلام بالاکرام - ۹؍ دسمبر ۱۸۸۸ء

اس خط میں جس سفر کا حوالہ ہے۔ اس سے مراد عظیم آباد ہے۔ ۱۳۰۵ھ میں حضرت امیر مینائی اپنے شاگرد مہدی حسن خاں شاداب رئیس رسول پور ضلع مظفر پور کے طلبیدہ عظیم آباد تشریف لائے۔ اور ریاض و کوثر کے ساتھ لال کوٹھی میں ٹھہرے۔

اُردو کا سب سے پہلا لغت سید اوحد الدین بلگرامی نے، اور اسی زمانے میں میر علی اوسط رشک لکھنوی نے لکھا رشک کا لغت غیر مطبوعہ رہا۔ اس کے تقریباً ۳۰ سال کے بعد حضرت امیر مینائی کا یہ خط صفیر بلگرامی کو آیا۔ آرہ سے اس کا جواب ۲۲؍ دسمبر کو چالیس صفحوں میں گیا۔ خط کیا ہے کہ دریائے تحقیق موجیں مار رہا ہے۔ صفیر بلگرامی کا جواب پانے کے چار سال بعد حضرت مینائی نے امیر اللغات کا پہلا حصہ شائع کیا۔

جلوۂ خضر جس کے بارے میں امیر مینائی لکھتے ہیں کہ مشتاقوں کو کب تک تڑپایئے گا۔ صفیر بلگرامی کی وہ بلند پایہ تالیف ہے جس پر صوبۂ بہار ناز کر سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بیلی۔ پروفیسر لندن یونیورسٹی۔ اپنی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر (تاریخ ادب اردو) مطبوعہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۹۲ میں تحریر فرماتے ہیں: -

SAFIR BILGRAMI.... .... HE LIVED A LARGE PART OF HIS	صفیر بلگرامی ... زندگی کا زیادہ حصہ
LIFE IN ARA' AND WROTE MUCH VERSE PRINCIPALLY	ان کا آرہ میں گزرا۔ نظم میں ان کا کلام
LOVE LYRICS HIS PUBLISHED BOOKS INCLUDE AN ANTH-	بہت کچھ ہے۔ بالخصوص غزلیات۔
OLOGY, SALAVAT-I-KHIZR, AND VOLUMES OF LYRICS	ان کی مطبوعہ کتابوں میں صلوات خضر
CALLED— SAFIR-I-BULBUL AND KHUMKHANA-E-SAFIR.	بیاض اشعار اور صفیر بلبل و خمخانۂ صفیر
HE WROTE A NOVEL, RUHAFZA, WHICK WAS NOT PUB-	دیوان غزلیات بھی ہیں۔ ایک ناول
LISHED. PERHAPS HIS MOST IMPORTANT WORK WAS JALVA-	روح افزا بھی لکھا تھا جو طبع نہیں ہوا
E-YHIZR, A HISTORY OF URDU LITERATURE WHICH HE	مگر ان کی اہم ترین تالیف جلوۂ خضر
WROTE WITH A VIEW TO CORECTING WHAT HE CONSIDERED	ہے۔ یہ تاریخ ہے ادب اردو کی اور
THE MIS-STATEMENTS OF AZAD'S AB-I-HAYAT.	مولف کے خیال میں آزاد کی آب حیات
"A HISTORY OF URDU LITERATURE" BY DR. T	میں جو غلط بیانیاں تھیں انھیں کی
G BALLEY, MA	تصحیح کے لیے یہ کتاب لکھی گئی۔

شوق نیموی (۱) جناب فیض مآب سخنور نامی گرامی حضرت سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی مد فیضکم۔ محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی شاگرد حضرت تسلیم لکھنوی بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ جلال لکھنوی نے ایک رسالہ کار آمد شعرا تانیث و

تذکیر میں لکھا ہے ۔ ایک روز فخراً کہنے لگے کہ اس رسالے کا موجد میں ہوں ۔ اس پر حضرت استاد نے فرمایا کہ سبحان اللہ صفیر بلگرامی اس قسم کا رسالہ پہلے لکھ چکے ہیں ۔ . . . . . تب جلال کچھ طعن کی باتیں کہنے لگے . . . . . چند روز ہوئے کہ میں حضرت استاد کی خدمت میں رامپور گیا تھا ۔ اس کا ذکر آیا ۔ میں نے کہا کہ عرصہ ہوا کہ اصل رسالہ چھپ گیا ۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر وہ مل سکے تو ایک جلد بھیج دینا کہ جلالؔ کو دکھاؤں اس سبب سے التماس ہے کہ اب آپ کے پاس کوئی نسخہ رشحات کا موجود ہے یا نہیں . . . .

(۲) سخنور نامی گرامی ۔ چاشنی بخش مائدۂ شیریں کلامی ۔ جناب سید فرزند احمد صاحب صفیرؔ بلگرامی مدظلکم اللہ السامی ۔ خاک پائے اربابِ ذوق محمد ظہیر احسن شوق بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ آپ کا نامہ نامی ورود ہوا . . . . . . آپ نے در باب رشحات جو کچھ تحریر فرمایا ہے سب بجا درست ہے ۔ میرے ایک عم زاد برادر کے پاس وہ رسالہ ہے ۔ میں نے اس کی خوب سیر کی ہے ۔ فی الحقیقت آپ اس کے موجد ہیں ۔ رشحات اور کار آمد شعرا میں آسمان و زمین کا فرق ہے ۔ جلال کا دعویٰ محض بے بنیاد ہے ۔ حضرت تسلیم کے پاس تسہیل تانیث و تذکیر تھی ۔ میں نے عند التذکرہ ان سے کہا کہ جس طرح اس میں متقدمین و متاخرین کے اختلاف بیان کئے گئے ہیں اسی طرح اصل میں بھی ہر ایک کی مثالیں بھی اس قسم کی موجود ہیں کہ جن کی بنا قوافی و ردیف پر ہے ۔ اس میں اغلاط کاتب کے گمان کو بھی گنجائش نہیں، اور کار آمد شعرا میں اس کا التزام نہیں ہے ۔ یہ سن کر جناب ممدوح نے آپ کی جاں فشانی کی کمال داد دی اور بہت مداح رہے ۔ . . . . . ہر چند آپ ایسے لائق لوگ کی خدمت میں اپنا کلام بے نظام مورد کلام بھیجنا سراسر گستاخی ہے ۔ . . . مگر دو غزلیں جو فی الحال کہی ہیں ارسال کرتا ہوں۔ اگر خدا نے چاہا تو اب کے مرتبہ جب وطن کو جاؤں گا تو آرہ ہوتے جاؤں گا ۔ ملاقات کی کمال آرزو ہے . . . . ،،

از شہر لکھنؤ ۔ کشمیری محلہ ۔ متصل چاہ حیدر بیگ خاں

رشحات صفیر تانیث و تذکیر کی تحقیق میں صفیر بلگرامی کی ایک دوسری بلند پایہ تالیف ہے ۔ اس پایہ کی کتاب اب تک ہندوستان میں نہیں لکھی گئی ۔ حضرت جلالؔ لکھنوی کو دعویٰ تھا کہ وہ اس کے موجد ہیں ۔ حضرت تسلیمؔ لکھنوی اور شرف نیموی نے صفیر بلگرامی کی کتاب اسی دعوےٰ کو رد کرنے کے لیے منگائی تھی ۔

رشحات صفیر کے بارے میں حضرت غالبؔ کا فیصلہ ملاحظہ ہو ۔

حضرت غالب : سید سندی، نور بصر، لخت جگر، قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبدء فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے . . . . . . سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں . . . . . قوتِ علم اور حسنِ فہم اور لطفِ طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہنچائے ہیں مجھے دل سے پسند آئے ہیں ۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظور انظار و اولو الابصار رہے گا ۔

مولف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر آرہ ۔ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہرہ) کے نواسے ہیں ۔ سید واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی، اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں ۔ الخ

حضرت کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمہ کا بیان ہے ؎

مادح خورشید مداح خوداست — کہ مرادو چشمم سرنا مرمداست

داد کا طالب غالب

ایک اور خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں:

بعلاقۂ مہر و محبت نور چشم و سرور دل۔ اور برعایت سیادت مخدوم و مطاع۔ مولوی سید فرزند احمد .... اشعار گہر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ سب اچھے ہیں۔ مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں ؎

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا — ابھی کچھ بات کر نہیں آتی
ورق ہیں جوششِ مضمونِ گریہ سے بادل — بسانِ ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب
کبھی ہوں گرم۔ کبھی سرد۔ حسب موقع وقت — صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ اور موحدانہ مضمون۔ اور بالغانہ الفاظ ؎

تم سلامت رہو قیامت تک — صحت و لطف طبع روزافزوں

نجات کا طالب غالب۔ شنبہ ۲۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۱ھ

نواب سید رضا علی خاں عظیم آبادی نبیرۂ جعفر حسن خاں فیض شاگرد مصحفی علیہ الرحمہ:۔

خوشا اے رضا ایں کلامے کہ ازوے — بدل ہست قوت و بجاں ہست قوت
بود از تصانیف سحبانِ دوراں — بلیغ الکلام و کلام البلاغت
گرامی دل و بلگرامی توطن — صفیر سخن سنج عالی طبیعت
بریں خوان یغما چہ یاراں چہ اعدا — ہمہ بہرہ گیرند صدگونہ لذت

جناب راز عظیم آبادی: سید عزیز الدین احمد بلخی راز عظیم آبادی مولف تاریخ شعرائے بہار لکھتے ہیں:

ادب اردو کی تاریخ میں صفیر بلگرامی بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظم میں غالباً آٹھ دیوان کے قریب ان کے کلام مرتب ہو گئے تھے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

مشق تیری یہ بیالیس برس کی ہے صفیر — آٹھواں فضلِ الٰہی سے ہے دیواں تیرا

نثر میں تالیف و تصنیف کی تعداد نظم سے بھی زیادہ ہے۔ فہرست تصانیف حسب ذیل ہے۔

جناب راز عظیم آبادی کی فہرست نامکمل ہے کیونکہ اس میں صرف بیس کتابوں کا حوالہ ہے۔ حالانکہ سنہ ۱۲۹۹ھ تک نظم میں ۵۷ اور نثر میں ۴۷ کتابیں تصنیف و تالیف ہو چکی تھیں۔ اور ان ایک سو چوہتر کتابوں میں تین کتابیں، مجموعۂ فیض صفیر، گلبن موزوں اور بوستانِ خیال اردو بہت ہی ضخیم جلدوں میں تھیں۔

نواب خیال عظیم آبادی : مکتوب نواب سید نصیر حسین خاں خیالؔ عظیم آبادی بنام سید وصی احمد بلگرامی

پرنسپ اسٹریٹ کلکتہ ۔ ۲۴ر جولائی ۱۹۱۵ء

عزیز محترم ۔ میں مرثیہ گویانِ ہند کا ایک تذکرہ مرتب کرنے کی فکر و کوشش کر رہا ہوں ۔ چونکہ جناب غفران مآب مولوی سید فرزند احمد صاحب مغفور نے بھی مرثئے کہے تھے اس لحاظ سے اُن مرحوم کا ذکرِ خیر بھی اس تذکرے میں ضرور واجب ہے ۔ میں نے کوشش کی مگر اُن جناب کا کوئی مرثیہ مجھے اب تک نہیں مل سکا ۔ آپ کا پتہ بھی معلوم نہ تھا جو قبل آپ کو لکھ سکتا ۔ کسی طرح آپ کا نشان حاصل کرکے آج اس طرف متوجہ کر سکا ہوں ۔ فرمائش ہے کہ اس کام میں خاطر خواہ میری مدد کیجئے اور آپ کے ذریعے سے اگر پرانے مراثی کہیں مل سکیں تو اُن کو حاصل کرنے کی فکر کیجئے اور اپنے دادا صاحب (صفیرؔ بلگرامی) مرحوم کے مراثی میں سے دو ایک بھی مل سکیں تو مجھے فوراً بھیجئے . . . . . جو تعلقات ان مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُس کا اقتضایہ ہے کہ میرے قلم سے اُن کے صحیح و ضروری حالات نکلیں ۔ واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو ۔ اور مجھے تو ایسا قلق ہوگا کہ اپنی باقی کل محنت کو رائگاں سمجھوں گا . . . . . . مرحوم نے ایک تذکرہ بھی تالیف کیا تھا جس کا نام ہے جلوۂ خضر ۔ مجھے اس کی بے حد ضرورت ہے ۔ کسی طرح اس کو بھی فراہم کرکے مجھے بھیجئے ایک فرنچ گارسن دی تاسی تذکرہ نویس خبر دیتا ہے کہ مرحوم نے سنہ ۱۲۷۶ھ میں گلبن منظوم اور خلاصۂ فیض صفیر دو تالیفیں پٹنہ سے شائع کیں ۔ یہ دونوں کتابیں بھی کسی طرح مل جاتیں تو معلومات میں اضافہ ہو سکتا . . . . . .“

اس خط میں ایک جملہ غور طلب ہے ، ” جو تعلقات ان مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُس کا اقتضایہ ہے . . . واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو“

یہ تعلقات کیا تھے ؟ ۔ جواب یہ ہے کہ نواب خیالؔ کے حقیقی چچا میر جعفر حسین فرہادؔ اور حقیقی ماموں سید علی محمد شادؔ و سید آمیر حسن ایجادؔ کو صفیرؔ بلگرامی کی شاگردی کا (ایک زمانے میں) فخر حاصل تھا ۔

خواجہ عشرت لکھنوی : خواجہ محمد عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی تذکرۂ آبِ بقا میں فرماتے ہیں :

” زبان کی خدمت کرنے والوں کے نام دنیا کے صفحات سے بہت جلد مٹ رہے ہیں ۔ انھیں میں ایک سید فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی ہیں جن کی خدمات کو بھلا دینا بڑا ستم ہے ، میر صاحب نے ابتدائی سن سے اردو زبان کی خدمت کی ، اور بہت سی کتابیں تصنیف کرکے خود چھپوائیں اور پورب (یعنی صوبۂ بہار) میں زبان کی خدمت کا شوق پیدا کیا . . . . صفیرؔ نے آرہ کا رہنا کم کیا ۔ پٹنہ میں قیام کیا ۔ یہاں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا ۔ اور لوگ قدردانِ سخن تھے ۔ یہاں رہ کر تیس۳۰ مثنویاں اور پانچ قصے اردو میں لکھے ۔ ایک کتاب رشحاتِ صفیر تذکیر و تانیث میں تالیف کی ۔ ایک تذکرہ جلوۂ خضر لکھا . . . . . . پٹنہ میں اُن کے بہت سے شاگرد ہوئے . . . . . . صفیرؔ نے نثاری کی طرف رخ کیا تو سب سے پہلے بوستانِ خیال کی اٹھارہ جلدوں کو فارسی سے اردو میں لانا چاہا ۔ کچھ جلدیں ترجمہ کیں ۔ دو جلدیں اپنے ہاتھ سے کاپی لکھ کر اپنے مطبع میں چھپوایا ۔ دوسرا دیوان

خمخانۂ صغیر مطبع نگار نامہ لکھنؤ میں چھپا .... صغیر بہت پُرگو تھے ۔ پیام یار میں ان کی غزلیں برابر چھپتی رہیں ...... اب کوئی صغیر جیسا زبان کی خدمت کرنے والا آرہ میں نہیں ہے جس کے دم سے شاعری کا چرچا رہے ..... صغیر مرحوم اگلی وضع کے آدمی تھے ۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے ۔ دراز قد تھے ۔ کسی قدر ہکلاتے تھے ۔ شعر پڑھنے کا بھی انداز اچھا تھا ۔ کلام عاشقانہ ہوتا تھا اور بندش چست .. ایسا شخص جس کی تمام عمر اردو کی خدمت میں صرف ہوئی ۔ اس کا اکثر کلام غیر مطبوعہ پڑا رہے نہایت افسوس کی بات ہے ۔ امید ہے کہ ان کے تلامذہ توجہ کریں گے ۔"

یہاں تک تو دوسروں کا بیان ہوا ۔ اب خود صغیر بلگرامی کا بیان اپنے بارے میں یہ ہے :

"ہیچدان ۔ ہیچمیرز ۔ مقلدِ گمر شتگان ۔ معتقد فصحائے زمان ۔ مدغرور سے منزلوں دور ۔
شاگردِ خاندانِ ناسخ مغفور فیض یاب خدمت شیخ امان علی سحر دبرق دبحر ۔ کوچہ گردِ شہر شہیر
زلہ ربائے خوانِ فیض غالب ودبیر ۔ روشناس برنا وپیر ۔ شعرا کا دوست غمخوار یار ۔ باوجود
ہیچمدانی مشہور دیار وامصار ۔ کشتۂ تیغ ستم تلامذہ ۔ موردِ مراحم اساتذہ بندہ حقیر سید فرزند احمد
صغیر بلگرامی مقیم قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد ۔"

اس بیان میں مرثیہ کا ایک ٹکڑا بھی ہے ۔ یعنی "کشتۂ تیغ ستم تلامذہ" ! شاگرد اپنے استاد کو ستم کی تیغ سے کیوں ذبح کرتا ہے اُس کو پوچھنا چاہیئے افضل الدین خاقانی سے جس نے ابوالعلا سے بغاوت کی ۔ اور شریف سے جس نے لسانی سے بغاوت کی اور بساطی سے جس نے کمال خجند سے بغاوت کی ۔ اور مومن دہلوی سے جس نے شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی اور سکندر شاہجہانپوری سے جس نے مومن دہلوی سے بغاوت کی ۔

(۱) خاقانی کو ابوالعلا نے لکھایا پڑھایا ۔ بتایا سکھایا ۔ جب کسی قابل ہوا تو اس کو ہاتھ پکڑ کے خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں لے گیا ۔ اور خاقان کی رعایت سے خاقانی تخلص بخشا ۔ ان احسانوں کا صلہ خاقانی نے یہ دیا کہ ابوالعلا کی ہجو کہی اور کہا کہ تو ہوتا کون ہے جو ہمارا استاد بنے ؟ مرادل پیر تعلیم است و من طفل زباں دانش ! پھر کہا کہ ؎

آخر ابوالعلا کو کہنا پڑا ؎

از فکر حادثات سخت شکستہ دلم　　بست خیالم کہ ہست ایں خلل از بوالعلا
خاقانیا ! اگرچہ سخن نیک دانیا　　یک نکتہ گویمت ۔ بشنو رایگانیا
ہجو کسے مکن کہ ز تو مہ بود بہ سن　　شاید ترا پدر بود و تو ندانیا

(۲) اسی طرح شریف نے اپنے استاد لسانی سے بغاوت کی تو اس کے دیوان پر اعتراض کئے اور سہو اللسان نام کتاب لکھی ۔ ان اعتراضوں کا جواب حیدری شاگرد لسانی نے لسان الغیب میں دیا ۔

(۳) اسی طرح بساطی شاگرد کمال خجند نے شوخ چشمی کی ؎

غزلہائے بساطی را کمال از خود مداں کمتر　　کہ پروردست چوں خواجہ کاتب دیدہ سلامش

کمال خجند نے جواب دیا ؎

اے خواجہ تو مردِ خود فروشی　　رخت تو دریں دکاں نگنجد

(۴) اسی طرح حکیم مومن خاں دہلوی نے اپنے استاد شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی تو شاہ نصیر نے کہا ؎

کمان و تیر نمط ربط تھا مجھے اس سے　　جب اس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا

(۵) اسی طرح سکندر خاں سکندر شاہجہاں پوری نے اپنے استاد مومن خاں سے بغاوت کی۔ قصہ یہ تھا کہ سکندر اپنی غزل اصلاح کے لیے لایا۔ اس غزل میں ایک شعر تھا ؎

دم لینے میں ہے مجھ کو تو آئینہ کا لحاظ　　اور یار یہ سمجھتے ہیں۔ مجھ میں ہے دم نہیں

مومن نے کہا یہ شعر بے معنی ہے۔ قابل اصلاح نہیں۔ سکندر نے کہا کہ آئینہ میلا ہو جانے کا خوف تھا۔ اس لحاظ سے ہم نے دم سادھ لیا۔ دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اس میں دم ہی نہیں۔ مومن نے کہا کہ آئینہ کا لایا جانا خود بتا رہا ہے کہ اس وقت عالم کیا ہے۔ پھر دم سادھنا کیسا؟ سکندر کو آئینہ پر ناز تھا حجت کرنے لگا۔ بات بڑھی۔ آخر سکندر نے مومن سے کہا کہ آپ کو استاد کس نے بنایا؟ اصلاح کو پوچھیے تو بات اتنی ہے کہ ہم آپ کا کلام دیکھتے تھے۔ آپ ہمارا کلام دیکھتے تھے۔ استادی اور شاگردی کیسی؟

علامہ تفتازانی اپنے شاگردوں سے اس قدر نالاں تھے کہ پاؤں میں ایک مرتبہ کانٹا گڑ گیا تو علامہ نے آبدیدہ ہو کر پوچھا "اے کانٹے! سچ سچ بتا۔ کیا تو نے بھی ہم سے کچھ سیکھا تھا؟ پھر حضرت صفیر بلگرامی نے اپنے کو کشتہ تیغ ستم تلامذہ کہا تو کون سی انوکھی بات کہی؟ بقول مولف آبِ حیات:

> "شعرا میں اپنے لیے خود پسندی اور دوسرے کے لیے ناتواں بینی ایک ایسی عادت ہے کہ اگر اسے قدرتی عیب کہیں تو کچھ مبالغہ نہیں۔ بلکہ شاگردوں کو استادوں سے دست و گریباں ہوتے دیکھا تو اکثر اسی فن (شاعری) میں"

اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۲۵۵ھ جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی پٹنہ سے مرشد آباد گئے۔ قیام تین سال۔

۱۲۵۸ھ جناب فریاد مرشد آباد سے کلکتہ گئے۔ قیام بیس سال۔

۱۲۶۲ھ ولادت میر علی محمد شاد عظیم آبادی۔ اسی سال صفیر بلگرامی نے شاعری شروع کی۔

۱۲۷۶ھ حضرت فریاد صرف چار ماہ کے لیے کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ پھر کلکتہ واپس گئے۔ قیام تین سال۔

حیات فریاد ص ۱۶-۱۷ میں جناب شاد فرماتے ہیں:

اڑتیس سال اپنی عمر گراں بہا کے حضرت (فریاد) نے مرشد آباد کلکتہ میں بسر کیے۔ منجملہ جس کے

پینتیس سال کلکتہ میں صرف ہوئے۔ اس طویل مدت میں حضرت تین دفعہ عظیم آباد آئے۔ تیسری دفعہ تو اخیر دفعہ تھی۔ اور اس کے قبل دو دفعہ تشریف لائے۔ ایک دفعہ تو سنہ ۱۸۵۵ء میں غدر کے دو سال قبل جب کہ راقم کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ اور چار ماہ صرف عظیم آباد میں قیام فرمایا۔ راقم اس زمانے میں شرح مسلم پڑھتا تھا۔ ایک روز ناظر وزیر علی عبرتی مرحوم کے ہاں سے مشاعرہ کی طرح "جب سے اس ابرو نے پیدا تیغ عالمگیر کی" آئی اس وقت تک راقم نے کبھی ایک شعر غزل کا نہیں کہا تھا ...... حضرت فریاد نے والد سے ارشاد فرمایا کہ طرح میں چند شعر اس لڑکے کو کہنے دو ... (میں نے) گیارہ شعر کہہ کر حاضر کئے۔ ..... یہی بنیاد راقم کی شاعری اور حضرت (فریاد) کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہونے کی شرف یابی کی ہے۔"

تاریخ لکھنے میں جناب شاد سے سہو ہوا ہے۔ کیونکہ سنہ ۱۸۵۵ء میں ان کی عمر دس سال کی تھی۔ نہ کہ چودہ پندرہ سال کی۔ اور شاعری انھوں نے نہ تو دس سال کی عمر میں شروع کی نہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں۔ جناب شاد کے دست وقلم کی تحریر مورخہ اپریل ۱۹۲۶ء ہمارے پاس موجود ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: "سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شاعری وتصنیف کا شوق ہوا۔" اس تحریک کے آٹھ ماہ بعد شاعری کی شمع خموش ہوگئی۔ الغرض حضرت فریاد کلکتہ سے چار ماہ کے لیے جب پٹنہ آئے تھے اس وقت تک جناب شاد نے شاعری شروع نہیں کی تھی۔

۱۲۷۹ھ حضرت فریاد دوسری دفعہ کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ اس سال جناب شاد نے شاعری شروع کی۔ اور اٹھارھویں برس میں پہلی غزل کہی۔

۱۲۸۰ھ صفیر بلگرامی کا پہلا دیوان سنہ ۱۲۷۳ھ میں مرتب ہوا تھا۔ سال ترتیب سے "جمع شد مایہ حیات صفیر" اس وقت جناب شاد کو بارھواں سال تھا۔ اس کے سات برس بعد سنہ ۱۲۸۰ھ میں دیوان صفیر بلبل پٹنہ سے شائع ہوا تو جناب شاد کو انیسواں سال تھا اور انھوں نے تاریخ طبع دیوان کہی ؎

چو ایں دیوانِ رنگیں طبع گردید	پُر از معنی والفاظ خوش اسلوب
بجستم سالِ طبعش شاد از طبع	شدہ شیریں سخن تاریخ مرغوب

۱۲۸۱ھ حضرت فریاد عظیم آباد سے کلکتہ گئے۔ وہاں قیام گیارہ سال رہا۔

اسی سال جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین صاحب مظہر رئیس حاجی گنج کے ساتھ میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی کے مکان پر صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لیے حاضر ہوئے۔ اور ان کی درخواست قبول کی گئی۔

سنہ ۱۲۸۱ھ سے سنہ ۱۲۸۷ھ مسلسل سات برس تک جناب شاد نے صفیر بلگرامی سے اصلاح لی۔

۱۲۸۷ھ صفیر بلگرامی عظیم آباد سے مظفر پور تشریف لے گئے۔ وہاں قیام تین سال رہا۔

۱۲۸۸ھ صفیر بلگرامی کو استادی راس نہیں آئی ۔ جناب شاد نے شاگردی سے انحراف کیا اور اس انحراف کے بعد حضرت فریاد سے ملنے کے لیے کلکتہ گئے ۔ کلکتہ میں صرف دو ماہ قیام رہا ۔

۱۲۹۰ھ صفیر بلگرامی مظفر پور سے عظیم آباد واپس آئے ۔ آئے تو کیا دیکھا؟ اس کا حال خود صفیر بلگرامی کے قلم سے سنئے:

" ...... غرض ۱۲۸۵ھ تک جناب شاد کو مجھ سے برابر تلمذ رہا ...... آخر میں طبیعت ان کی منحرف ہوئی ۔ اور میری شان میں کچھ فرمانے لگے ۔ اگرچہ واقف کاروں کی روک ٹوک سے کبھی کبھی خاموشی بھی اختیار کرتے تھے ۔ مگر ناواقفوں میں اپنی تعلی کی لیتے تھے ۔ میں تین برس کے بعد مظفر پور سے آیا ۔ جناب شاد کا رنگ ہی اور پایا ۔ مگر میرے سامنے کچھ نہیں کہتے تھے میں نے بھی کچھ نہ چھیڑا ۔ آخر کشمیری کوٹھی میں انھیں کی فرمائش سے مشاعرہ شروع ہوا ۔ پہلی دفعہ ہے کہ انھوں نے مشاعرہ کی غزل میرے ہوتے بے اصلاح پڑھی ۔ خدا کے کارخانے! غیر طرح میں جناب بحر لکھنوی کے دو چار شعر پڑھ گئے ۔ شعرا نے گرفت کی ۔ اور یہ غلغلہ تمام پٹنہ میں پھیلا ۔ دوسرے مشاعرے میں اسی زمین میں ایک غزل کہہ کر لائے ۔ اس پر بھی اعتراض ہوئے ۔ مومن خاں کی رباعیاں ۔ سحر کے قصیدے کے اشعار پکڑے گئے ۔ آخر مشاعرے کا آنا چھوڑ دیا ۔

دو چار مشاعروں کے بعد ایک دن مشاعرے کے وقت میرے پاس آئے ۔ میں ہمراہ جناب نکہت کھانا کھاتا تھا ۔ مجھ سے فرمایا کہ آج صبح سے لوگ مجھے دق کرتے ہیں کہ تم نے صفیر سے اصلاح لینے سے انکار کیا ۔ اور میں کہتا ہوں کہ میں انکار کب کرتا ہوں ۔ اس لیے آپ کے پاس بھی آیا ہوں کہ مجھے انکار نہیں ہے ۔ میں بے شک آپ کا شاگرد ہوں ۔ میں نے کہا " میر علی محمد صاحب! میں بھی سنتا تھا ۔ مگر جب آپ کہتے ہیں تو خیر میرا شک نکل گیا ۔ بولے اگر فرمائیے تو میں اس مضمون کی رباعی کہہ کر مشاعرے میں پڑھ دوں ۔ میں نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے ۔ غرض یہی باتیں کر کے چلے گئے ۔ اس کی شہادت جناب نکہت نے اپنے دستخط سے دی ہے ۔ اور میں نے بھی اس کی یاد جناب شاد کو نمیقہ محبت دوثیقہ میں دلائی ہے ۔ غرض یہ کہ جناب شاد مشاعرے میں نہ گئے ۔

اب انھوں نے مشاعرے میں آنا چھوڑا ۔ مگر میں اسی طرح اکثر ملاقات کو جایا کرتا ۔ وہ اپنی غزلیں پڑھتے تھے ۔ سن لیتا تھا ۔ کبھی کبھی کچھ بول بھی دیتا تھا ۔ طبیعت تیز تھی ۔ اچھا کہنے لگے ۔ ۱۲۹۱ھ میں انھوں نے مثنوی نالۂ شاد تصنیف فرمائی ۔ اس پر شعرائے عظیم آباد نے اعتراض کیے ۔ مگر جناب شاد کو مجھ پر گمان ہوا ۔ ایک دن مجھے چھیڑ کر پوچھا ۔ میں نے انکار کیا ۔ اور کہا بھلا میر علی محمد صاحب میں آپ پر اعتراض کروں گا؟ یہ البتہ کہتا ہوں کہ جناب شاد میرے شاگرد ہیں ۔ یہ سن کر بولے اب میرا دل صاف ہوا ۔ لوگوں نے مجھے ناحق بدظن کیا تھا ۔ غرض پھر وہ باتیں رفع ہوئیں "

۱۲۹۱ھ " اور اب جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد بھی کلکتہ سے پٹنہ تشریف لائے ۔ پھر جناب شاد کو وہی سوجھی ۔ اور اب برملا کہتے پھرے ۔ مشاعرے میں تو خود نہیں آتے تھے مگر چند شاگرد درست کیے ۔ اور میرے پڑھنے میں خلل ڈالنا شروع کیا ۔ آخر میں آدمی ہوں ۔ یہ ادا ناپسند ہوئی ۔ البتہ اشعار مشتمل بر تعریض کے میں نے پڑھے، اور محمد ہاشم (عزیز و شاگرد صفیر بلگرامی و مہتمم آرہ نور الانوار آرہ) سے کہا کہ ایک مجموعہ اسنادِ شاگردان کا درست کریں اور اس کا نام نشانِ فیض رکھا۔

س میں جمیع شاگردوں کے اسنادِ دستخطی اور کلامِ اصلاحی موجود ہیں۔ اور واقفِ کارانِ شاگردیٔ جناب شاؔد کے سامنے پیش یا کہ حقاً اور ایماناً جو کچھ جانتے ہوں لکھ دیں۔ چنانچہ بیک جلسہ چودہ حضرات نے دستخط بلا اکراہ، بے تامل، بدون میری لجاجت ور سماجت کے اپنے دستِ مبارک سے فرمائے۔ اور جو کچھ جانتے تھے تحریر کیا۔

یہ خبر جناب شاؔد کو پہنچی۔ اکثر اہلِ دستخط کے پاس جاکر فرمایا کہ میں آپ لوگوں کا ہم وطن ہوں۔ آپ نے دستخط کیوں لئے؟ انھوں نے فرمایا کہ ایمان کے باب میں کسی کا پاس نہیں کیا جاتا۔ جو ہم جانتے تھے لکھ دیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اب ز دستخط ہوگئے۔ پھر کشمیری کوٹھی میں آکر جناب نکہؔت کے سامنے میری شاگردی کا اقرار کیا جس کو جناب نکہؔت نے اپنے دستخط ں تحریر کیا ہے :-

۱۲۹۳ھ (۱) العبد سید حامد حسین نکہت۔ باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاؔد رو بروئے من اصلاحے چند ز میر صفیؔر صاحب گرفتہ اند۔ انکار ازاں انحراف از ایمان است۔ و اقرار زبانی، بعد انکار ہم، دو دفعہ در غریب خانہ کردہ ند۔ یکبار کہ ہمراہ شاہ حفاظت حسین صاحب وقت شب در مشاعرہ کشمیری کوٹھی تشریف آوردہ بودند۔ و بار دگر وقتیکہ یہ فرزند احمد صاحب صفیؔر ایں اسناد استادیٔ خود دریں شہر شائع کردند، خود نزد حقیر آمدہ گفتند کہ ایں چنیں اصلاح از اظر عبرتی مرحوم نیز گرفتہ ام۔ پس ازیں چہ حاصل کردم؟ مگر میدانم کہ اصلاح دادن صفیر سلمہ اللہ القدیر مثل اصلاح ناظر صاحب رحوم نیست کہ از خطوط کہ نوشتۂ شاں است ظاہر است۔ فقط بقلم خاص نکہت ۔"

(۲) ہمارے علم میں میر علی محمد شاد صاحب شاگرد میر فرزند احمد صاحب کے ہیں۔ آغا مرزا عفی عنہٗ

(۳) العبد علی مرزا عفی عنہ۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دو بار اصلاح لیتے دیکھا ہے۔ اور یہ بھی یقینی کہہ سکتے ہیں کہ اکثر ا صلاح لی ہے بقلم خاص اور یہ بھی واضح ہو کہ چند رقعات اور غزلیں اور مرثیہ جو دستخط خاص جناب میر علی محمد شاؔد سے ہیں ہم بقسم لہ سکتے ہیں کہ یہ سب ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اصلاح بھی جناب میر فرزند احمد صاحب صفیؔر کے ہاتھ کی ہے۔ فقط

اور یہ بھی یاد بہت اچھی طرح ہے کہ جس وقت یہ مرثیہ جو اس کتاب میں موجود ہے، جناب میر علی محمد صاحب، ہمراہ جناب میر فرزند احمد صاحب کے واسطے اصلاح پاس جناب مرزا دبیر صاحب مرحوم کے لے گئے تھے۔ ہم بھی حضور میں جناب مرزا دبیر صاحب حاضر تھے۔ فقط

(۴) ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سید علی محمد صاحب شاؔد نے ہمارے مکان میں بروزِ مشاعرہ اکثر اصلاح لی ہے اور ہم کو اس وقت شوقِ غزل گوئی کا نہیں تھا۔ فقط محمد عسکری خاں عرف حسن نواب صاحب عفی عنہٗ

اور جس وقت اس مرثیہ کو جناب مرزا دبیر صاحب کے حضور میں واسطے اصلاح کے سید علی محمد صاحب کو، ساتھ میر فرزند احمد صاحب لے گئے تھے، ہم بھی موجود تھے۔ بلکہ میر بادشاہ علی صاحب بقا نے ہم سے پوچھا کہ یہ مرثیہ میر علی محمد صاحب نے کہا ہے یا میر فرزند احمد نے کہہ دیا ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ نہیں میر علی محمد صاحب نے کہا۔ مگر شاید میر فرزند احمد صاحب نے

دیکھا ہو تو عجب نہیں ۔ فقط"

(۵) فی الحقیقت ہم واقف ہیں ۔ اکثر غزل دکھاتے ہوئے بچشم خود دیکھا ۔ بلکہ اصلاح، اور غیر اصلاح، قبل اصلاح اکثر غزلیں میر علی محمد صاحب کی دیکھنے میں آئیں ۔ اور اکثر رقعہ بنام میر فرزند احمد صاحب صفیر تحریر میر علی محمد صاحب دیکھے ۔ اور ہم حرف بھی پہچانتے ہیں ۔ چنانچہ مرثیہ کی تمام وکمال کیفیت سے ہم خوب واقف ہیں ۔ بقلم خاص سید محمد حسن صاحب عرف منجھلے صاحب ــــ فطنتی"

واضح ہو کہ نواب سید محمد حسن خاں فطنتی اور نواب سید محمد حسین خاں ہجرتی دونوں ناظر وزیر علی عبرتی کے شاگرد تھے۔ ہجرتی وہی ہیں جن کے ہاں امتحان موج ے کا معرکہ ہوا تھا ۔ اور فطنتی وہ ہیں جن کے صاحبزادے نواب سید محمد رضا خاں عرف بنا صاحب موج عظیم آبادی جناب شاد کے شاگرد تھے ۔

(۶) ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے بھی دیکھا ۔ اور خوب واقف ہیں ۔ اور جلسے مشاعرے میں بھی غزل دکھلاتے ہوئے میر علی محمد صاحب شاد میر فرزند احمد صفیر سے اپنی آنکھوں سے خاص مشاعرے میں دیکھا ہے ۔ اکثر سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب متخلص بہ ہجرتی ۔

اور ان کے رقعہ وغیرہ بھی لکھے اور مرثیہ وغیرہ بھی اصلاح دیا ہوا دیکھا ہے ۔ بقلم خاص سید محمد حسین خاں رضوی عرف چھوٹے صاحب متخلص بہ ہجرتی"

(۷) میر علی محمد صاحب اور ہم ایک ہی ہفتے میں جناب استادی میر فرزند احمد صاحب قبلہ وکعبہ کے شاگرد ہوئے۔ اور اکثر ہم اور وہ ساتھ اصلاح لیا کئے ۔ پانچ سات برس برابر یہی کیفیت رہی ۔ سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان مرزا ۔ بقلم خاص"

(۸) میں نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے حاجی گنج کے مشاعرے میں دیکھا ہے ۔ اور خطوط بھی ان کے لکھے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں ۔ بقلم خاص سید علی اصغر عفی عنہ ۔ عرف سید وزیر نواب صاحب عفی عنہ"

واضح ہو کہ انھیں سید وزیر نواب کے صاحبزادے سید مرتضی نواب مفتوں عظیم آبادی ۔ جناب شاد کے شاگرد تھے۔

(۹) ہم لے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے دیکھا ہے اور رقعہ بھی ان کا دیکھا ہے کہ اس میں لفظ استادی لکھتے ہیں اور لفظ تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد بھی لکھے ہیں ۔ سید مظفر حسین خاں عرف سید نصیر نواب عفی عنہ"

(۱۰) ہم خوب جانتے ہیں کہ ابتدائے مشاعرات کشمیری کوٹھی سنہ ۱۲۸۱ھ تا مشاعرہ حاجی گنج بمکان میر علی محمد صاحب شاد کہ جس میں مولوی وحید صاحب الہ آبادی بھی شریک تھے، اس وقت میر علی محمد صاحب میر فرزند احمد صاحب سے اصلاح لیتے تھے ۔ اور شاگردی میر فرزند احمد صاحب کی اپنا فخر جانتے تھے ۔ جب میر فرزند احمد صاحب مظفر پور تشریف لے گئے اور تین برس تک وہاں بذریعہ چھاپہ خانہ کتب کے وہیں تشریف فرما رہے اسی عرصے میں میر علی محمد صاحب نے ان کی شاگردی

سے انکار کیا ۔ العبد سید عبدالحکیم ۔

واضح ہو کہ یہ وہی عبدالحکیم تمکین قنوجی ہیں جو معرکۂ شاد و احسن کے زمانے میں سید محبوب شیر کے ہاں جاسوس بنا کر بھیجے گئے تھے

(۱۱) العبد یوسف حسین ماہر لکھنوی ۔ خوب می دانم کہ جناب میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر صفیر ہستند ۔ چنانچہ در ۱۲۸۲ھ کہ فقیر شریک صحبت مشاعرہ جناب میر حامد حسین صاحب نکہت شد موصی الیہ را اقرار شاگردی جناب میر موصوف کما ینبغی بود ۔ تازمانہ ۱۲۹۳ھ کہ با میر عطا حسین صاحب و میر علی حسن صاحب نزاع کلی رو داد فقط "

واضح ہو کہ مرزا یوسف حسین ماہر لکھنوی کے تین صاحبزادے مرزا الیاس حسین ۔ مرزا ممتاز حسین نہرا ور مرزا محدث حسین ۔ بڑے نے انتقال کیا ۔ دوسرے اور تیسرے بقید حیات ہیں ۔

حضرت صفیر بلگرامی فرماتے ہیں :۔ جناب شاد نے دیکھا کہ اب تو میری شاگردی ثابت ہوئی تو ۱۲۹۳ھ میں اور لوگوں کو ابھارا . . . . " یہ اشارہ خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی کی طرف ہے ۔ وہی خواجہ سخن جو آرہ میں ۱۲۷۵ھ میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے تھے ۔ اور جن کی تصنیف سروش سخن ۔ استاد نے بعد اصلاح حضرت غالب کی خدمت میں بھیجی تھی ۔

خواجہ سخن کی دوسری شادی عظیم آباد میں میر نجف علی وکیل کی صاحبزادی سے ہوئی ۔ میر نجف علی کے چھوٹے بھائی میر سید علی حضرت فریاد عظیم آبادی کے داماد تھے ۔ اور خود میر نجف علی حضرت فریاد کے شاگرد تھے ۔ اور جناب شاد و حضرت فریاد میں صرف شاگردی و استادی کا رشتہ نہیں تھا بلکہ عزیز داری بھی تھی ۔ چنانچہ جناب شاد کی دادی حضرت فریاد سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور حضرت فریاد اُن کو باجی صاحبہ کہتے تھے ۔ ان تعلقات کی وجہ سے شاد و سخن میں یکجہتی تھی ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جناب سخن نے جناب شاد کا ساتھ دیا ۔ اور اس طرح ساتھ دیا کہ خود بھی شاگردی سے انکار کیا ۔

بقول صفیر بلگرامی ؎

گھر کیا دل میں جوان کے تیر نے وہ لگے میرا کلیجا چیرنے !

اشاریہ مضامین اردو

یہ رسالہ " اردو " کے بیالیس برسوں کے مضامین کی مکمل فہرست ہے ، اس اشاریے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ " اردو " میں کن کن موضوعات پر مضامین شائع ہوئے اور وہ کن مصنفین کے لکھے ہوئے تھے ۔ ہر مضمون کے مندرجات کی وضاحت کی گئی ہے ایسا مفصل اور جامع اشاریہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے ۔ (زیر طبع)

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ

آپ جو الفاظ استعمال کریں انکے معنی سے آپ پوری طرح واقف ہوں

اِس سلسلے میں

اسٹوڈنٹس سٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

آپ کی بہترین معاون ہوسکتی ہے

آپ گھر میں ہوں
دفتر میں ہوں
یا سفر میں
ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی رفیق ہوگی۔

طلبہ ، اساتذہ ، وکلا ، اطباؔ ، مترجمین اور سرکاری کارکنوں کے لئے۔
اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری بہترین تحفہ ہے!

خوبصورت طباعت ، اعلا درجے کا بائبل پیپر
ڈیڑھ ہزار صفحات۔ مضبوط جلد۔ قیمت صرف ۱۲ روپے

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ کراچی ۱

نئی کتابیں

ماہنامہ ہلال

شمارہ ممتاز

ایران اور پاکستان کے گہرے روابط کی بنیاد فارسی زبان ہے۔ ماضی میں اس زبان کو برصغیر میں جو اہمیت حاصل رہی ہے اور اس کی بنا پر جو ادب وجود میں آیا۔ اسے ہم تو فراموش کر چکے ہیں لیکن اہل ایران اس ادب کی بنا پر ہمیں اپنے سے جدا نہیں سمجھتے۔ فارسی کی وہ کتابیں جنہیں ہم نقش و نگار طاق نسیاں بنا چکے ہیں، ایران میں آج بھی ان کی بہت اہمیت ہے اور وہاں کے اہل علم انہیں جدید تحقیق کے اصولوں کے مطابق مدوّن کر کے شائع کر رہے ہیں۔ اس روشن حقیقت کا ایک تاریک پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل ایران تو ہمارے ماضی کی اس روایت سے آج بھی مستفید ہو رہے ہیں لیکن ہم خود اس روایت سے رشتہ توڑ چکے ہیں۔ فارسی ہماری زندگی کا جزو نہیں رہی پہلے پڑھا لکھا آدمی اسے سمجھا جاتا تھا جو فارسی سے بھی واقف ہوتا تھا۔ اور اب کوئی فارسی میں دلچسپی لے تو معاملہ دگرگوں ہو جاتا ہے اس کی ایک وجہ تو معاشی ہے کہ اب صرف فارسی کے سہارے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اور دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ماضی کی کس روایت کو اپنی زندگی کا جزو بنایا ہے جو ہم فارسی زبان اور ادب سے بھی دلچسپی لیں۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم اردو کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو کیا اس وقت ہم یہ سوچتے ہیں کہ فارسی سے قطع تعلق کر کے ہم اردو کی ترقی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔ زندہ زبانوں میں فارسی ہی وہ واحد زبان ہے جو اردو کے نہایت قریب ہے اردو کی تعمیر و تشکیل میں فارسی کا جو حصہ ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم آئندہ بھی فارسی سے اپنا تعلق استوار رکھیں۔ ہم اردو کے لئے جن مسائل پر آج سوچ رہے ہیں۔ فارسی والے انہی مسائل کو مدت ہوئی طے کر چکے ہیں۔ اگر فارسی سے تعلق کی روایت برقرار رہتی تو کم از کم علمی اصطلاحات جیسے بنیادی مسئلے پر ہم آج بھی مشاورتی کمیٹیوں کے بجرم میں "جاؤں کدھر کو میں" کے عالم میں سوالیہ نشان نہ بنے ہوتے۔ اردو اب لاکھ ترقی یافتہ زبان سہی لیکن اردو والے فارسی زبان سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ کم از کم ان لوگوں کو تو فارسی ضرور آنی چاہیے جو اردو میں لکھتے ہیں۔ اگر ادبی سطح پر ہی ہم وہ تعلق باقی رکھ سکیں تو یہ بڑی بات ہوگی۔

اس وقت پاکستان میں فارسی زبان وادب کا جو تھوڑا بہت چرچا ہے وہ کچھ تو یونیورسٹیوں کی وجہ سے ہے جن میں فارسی کے شعبے قائم ہیں ۔ اور کچھ پیر حسام الدین راشدی جیسے علما کی وجہ سے ہے جو فارسی زبان وادب سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں ۔ فارسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ نہ ہونے کی حد تک ہے ۔ پھر بھی سندھی ادبی بورڈ یا اسی قسم کا ایک اور ادارہ کچھ نہ کچھ شائع کرتا ہی رہتا ہے ۔ لے دے کے پورے ملک میں ایک علمی جریدہ شائع ہوتا ہے جیسے "مجلہ عربی وفارسی" کے نام سے پنجاب یونیورسٹی شائع کرتی ہے ۔ "پارس" کے نام سے گزشتہ برس مجلس روابط فرہنگی ایران وپاکستان کی طرف سے ایک رسالہ جاری ہوا تھا اس کا ایک ہی شمارہ منظر عام پر اب تک آیا ہے دوسرا اہم رسالہ "ہلال" ہے جو ہماری حکومت شائع کرتی ہے ۔ یہ رسالہ خالص علمی جریدہ تو نہیں لیکن اس اعتبار سے غنیمت ہے کہ پاکستان میں فارسی زبان سے عام دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا رسالہ نہیں ہے ۔ یہ رسالہ حکومت نے ۱۹۵۲ء میں جاری کیا تھا ۱۹۶۴ء تک یہ ہر تیسرے مہینے شائع ہوتا تھا ، ۱۹۶۹ء سے اسے ماہنامہ کر دیا گیا ہے ۔ گزشتہ سولہ برسوں میں اس رسالے نے فارسی زبان وادب سے اہل پاکستان کی دلچسپی برقرار رکھنے کی جو کوشش کی ہے وہ قابل تحسین ہے اب اس کا ایک خاص نمبر شائع کیا گیا ہے جس میں سابقہ شماروں کی تحریروں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے ۔

یہ خاص شمارہ جو متعدد مفید تحریروں پر مشتمل ہے دو حصوں میں منقسم ہے ۔ پہلے حصے میں پاکستان کے ماضی ، فنون لطیفہ ، معاشی ترقی اور خواتین کی سرگرمیوں کے بارے میں مقالات ہیں ۔ چند مقالات علاقائی تعاون برائے ترقی کے بارے میں بھی ہیں ۔ دوسرا حصہ ادبی ہے جو مقالات ، افسانوں اور منظومات پر مشتمل ہے ۔ بیشتر مقالات ایرانی اہل قلم کے ہیں جن میں سے "ادبیات جدید فارسی" (ڈاکٹر لطف علی صورت گر) "لاہور مرکز ادبیات فارسی" (سعید نفیسی) اور "مولانا جلال الدین رومی" (ڈاکٹر شجاع الدین شفا) خاص اہمیت کے حامل ہیں ۔ صرف ایک پاکستانی دانشور ڈاکٹر غلام سرور کا مقالہ جو "کشف المحجوب" کے بارے میں ہے اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے مقالات ہی کے حصے میں دو ایرانی ادیبوں آقائے مطیع الدولہ حجازی اور ڈاکٹر مہدی روشن ضمیر کے انشائیے بھی شامل ہیں ۔

مختصر افسانوں میں پاکستان کی علاقائی لوک کہانیوں کے ساتھ ساتھ غلام عباس اور زیب النسا حمید اللہ کے دو افسانوں کے تراجم بھی شامل ہیں ۔ حصہ نظم میں بیشتر تخلیقات ایرانی شعرا کی ہیں ۔

یہ انتخاب اگرچہ موجودہ صورت میں بلند معیار کا حامل ہے لیکن بہرحال انتخاب کا مسئلہ بڑی حد تک ذاتی ہے ۔ جہاں تک پاکستان سے متعلق حصے کا تعلق ہے اس میں فریقین نے تمام اہم تحریروں کو پیش نظر رکھا ہے ۔ لیکن ادبی حصے میں انھوں نے زیادہ توجہ ایرانی مصنفین پر دی ہے جس کی وجہ سے پاکستانی مصنفین کی متعدد اہم تحریروں کے لئے گنجائش نہ نکالی جا سکی ۔ "ہلال" کے سابقہ شماروں میں فارسی زبان وادب سے متعلق پاکستانی اہل قلم کے بہت قابل توجہ مضامین شائع ہو چکے ہیں ۔ اگر اس قسم کے مضامین میں سے چند اس انتخاب میں شامل کر لئے جاتے تو بہت اچھا ہوتا ۔ یہ محض ایک مشورہ ہے اعتراض نہیں ۔ ورنہ موجودہ صورت میں بھی یہ انتخاب اپنی افادیت کے اعتبار سے قابل قدر ہے ۔

یہ جریدہ جناب اے بی راجپوت کی نگرانی میں مرتب کیا گیا ہے۔ موصوف کو ایران اور فارسی ادب سے جو دلچسپی ہے اس کی وجہ سے اس رسالے سے ان کی وابستگی خود رسالے کے معیار کی ضامن ہے۔

یہ انتخاب اچھے کاغذ پر روشن اور جلی ٹائپ میں چھاپا گیا ہے۔ ۲۳۲ صفحات ہیں۔ متعدد تصاویر ہیں جن میں چند رنگین ہیں۔ قیمت پانچ روپے ہے۔ ملنے کا پتا:۔ ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۔ کراچی۔ (م۔ خ)

نگار پاکستان۔ کراچی

اصناف سخن نمبر۔

تاریخ زبان و ادب کی ترتیب و تدوین کے لئے اگر کسی ایک ہی ایسے رسالے کا انتخاب کرنا پڑے جس کے مطالعے کے بعد اردو زبان کی ابتدا سے جدید شاعری کے موجودہ عہد تک زبان و ادب کی پوری تاریخ، ارتقا، مختلف عہد اور فن کی خصوصیات شعراء اور ادبا کے تذکرے، خدمات، انتخاب کلام غرض کہ زبان و ادب کے ہر پہلو پر قابل اعتماد اور تمام ضروری مواد میسر آ جائے تاکہ تاریخ زبان و ادب ہر جہت سے جامع اور مستند ہو تو اس مقصد کے لئے تنہا ایک رسالہ "نگار" کا انتخاب کافی ہوگا۔

"نگار" کو جاری ہوئے تقریباً سینتالیس برس ہو چکے ہیں۔ اس مدت میں اس نے معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے زبان و ادب کے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کا مواد مہیا کر دیا ہے۔ "نگار" ایک شخصی رسالے کی حیثیت سے جاری کیا گیا تھا لیکن اس کے ایڈیٹر کی ہمہ جہت شخصیت نے جلد ہی اسے اردو ادب کی ایک تحریک بنا دیا۔ نگار نے ادب، شعر، تنقید میں ایک مستقل اسکول اور مکتب فکر کی بنیاد ڈالی۔

"نگار" کا موجودہ دور پاکستانی دور ہے ۱۹۶۵ء میں نیاز فتح پوری کے انتقال کے بعد اس کی ادارت کی تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر فرمان فتح پوری پر آئی ہے۔ اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ موصوف نے "نگار" کی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ معیار کو برقرار رکھا ہے اور اس میں تنوع پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

"نگار" کے بہت سے نمبر شائع ہو چکے ہیں اور یہ تمام نمبر اپنے اپنے موضوع پر مستند اور محققانہ مواد پر مشتمل ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر "نگار" کا "اصناف شاعری نمبر" ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ نمبر اس موضوع پر نہایت مفصل اور جامع ہے اور شاعری کی ہر صنف پر ملک کے ادیبوں اور نقادوں کا نہایت بیش قیمت مقالات پر مشتمل ہے۔ اس میں اصناف شاعری کی صرف تعریف ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی تاریخ، روایت، ارتقا، قدیم و جدید انداز کا فرق غرض کہ ہر صنف کے تمام پہلوؤں پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اس طرح اس نمبر کی معمولی حیثیت ہی نہیں بلکہ اس کی حقیقت "کتاب حوالہ" کی ہو گئی ہے۔ اصناف میں غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، دوہا، گیت، ریختی، قطعہ، شہر آشوب، منظوم ڈراما اور سانیٹ پیروڈی تمام ہی اصناف پر لکھا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں ملک کے تمام مشہور نقاد اور ادبا شامل ہیں ان کے ساتھ چند نئے لکھنے والوں کے نام بھی ملتے ہیں لیکن انہوں نے بھی اپنے

موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے اور ان کے مقالات دیکھ کر مشکل سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ اس میدان میں نووارد ہیں۔ یہ نمبر عام اخباری کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ اس کی قیمت چار روپے ہے اور سالانہ قیمت دس روپے ہے۔

پتا:۔ نگار پاکستان ۲۳ گارڈن۔ کراچی نمبر ۳۔ (ابوسلمان شاہجہانپوری)

تذکرہ شیخ سید جلال مجرد کنیائی

مصنف:۔ محمد عبدالجلیل بسمل دربھنگوی۔

ناشر:۔ محمد غلام حسین، درگاہ محلہ کالونی، سلہٹ، مشرقی پاکستان۔

ضخامت:۔ ۴۷ صفحات۔

قیمت:۔ ایک روپیا پچیس پیسے۔

آپ چھٹی صدی ہجری کے اواخر یا ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں برصغیر پاک وہند میں تشریف لائے اور سلہٹ میں قیام کیا۔ آپ نے تقریباً ڈیڑھ سو سال کی عمر پائی اور ۷۴۰ھ کے قریب آپ کا انتقال ہوا۔ ابھی تک حضرت مجرد کنیائی کا کوئی مستند تذکرہ اردو میں موجود نہیں تھا۔ جو چیزیں اردو، فارسی وغیرہ میں تھیں وہ افراط و تفریط سے خالی نہ تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی شخصیت، خدمات اور تعلیمات پر بہت سے پردے پڑ گئے تھے۔ ایک مدت سے اس امر کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ حضرت مجرد کنیائی کے مستند حالات جمع کیے جائیں۔ صحیح ماخذ سے استفادہ کرکے ان کے حالات و افکار اور ان کی خدمات کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کیا جائے اور غلط بیانیوں کا پردہ چاک کردیا جائے۔

خوشی ہے کہ محمد عبدالجلیل بسمل دربھنگوی نے تمام اہم اور بنیادی مآخذ سے کام لے کر اس ضرورت کو بحسن و خوبی پورا کرکے ایک نہایت مفید علمی خدمت انجام دی ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے موضوع سے بڑی حد تک انصاف کیا ہے۔ انہوں نے حضرت مجرد کنیائی کی شخصیت، عہد، وطن، خاندان، خدمات، مجاہدات، افکار، تعلیمات، سن وفات وغیرہ کے بارے میں نہایت محققانہ بحث کی ہے اور بڑی حد تک ان کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کردیا ہے

میرا خیال ہے کہ کتاب کی بڑی خوبی اس کا یہی علمی انداز بیان ہے۔ حالات و واقعات پر تحقیقی و تنقیدی نظر کے باوجود عقیدت کہیں مجروح نہیں ہوئی۔ فاضل مصنف اولیا کی کرامات پر یقین ضرور رکھتے ہیں لیکن وہ انسانی شرف و عظمت کو ان کی سیرت ہی میں تلاش کرتے ہیں۔ (ابوسلمان شاہجہانپوری)

ہفت روزہ "قندیل"

اقبال نمبر۔

یہ نمبر اس سال یوم اقبال کے موقع پر ۲۴ر اپریل ۱۹۷۶ء کو شائع ہوا تھا۔ اس میں حکیم الامت حضرت علامہ اقبال مرحوم کی شخصیت، افکار اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر مضامین ہیں۔ ان میں سے چند خاص مضامین اور ان کے لکھنے والے یہ ہیں۔ اقبال کا نظریہ فن از محمد عالم، اقبال کا تصور خودی از محمد سرور، اقبال کا نظریۂ تعلیم از حکیم اختر، نوجوان نسل اور اقبال از صفدر حسین مردہ زندہ نگروند دفتر داؤد از مرزا صابر بیگ صابر، اقبال، صاحب حال و کامل از منیر کمال، اقبال اور ان کی تعلیمات از فاروق احمد شاہین اقبال اور اسلامی سوشلزم کے عنوان سے ایم ایس ناز کے قلم سے ڈاکٹر جاوید اقبال سے ایک ملاقات کی تفصیل ہے۔ ناز صاحب کے سوالات اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے جوابات انتہائی فکر انگیز ہیں۔ یہ مضمون ہمیں حالات و رفتار وقت اور حضرت حکیم الامت کے بارے میں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ دوسرے مضامین بھی نہایت مفید، اہم اور لائق مطالعہ ہیں۔ مذکورہ مضامین کے علاوہ اور بھی کئی مضامین نظم و نثر ہیں۔

ایڈیٹر نے "اقبال کا پیغام اور قومی تقاضے" کے عنوان سے جو اداریہ لکھا ہے وہ انتہائی فکر انگیز اور سبق آموز ہے۔ موصوف فرماتے ہیں۔

"اقبالؒ نے ملت اسلامیہ کی ذہنی تعمیر اور اصلاح کی ضرورت جس شدت سے محسوس کی تھی آج بھی اس ضرورت کو اس شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس لئے ہمیں علامہ اقبال کی تعلیمات کو زیادہ شدت سے دہرانے کی ضرورت ہے کیونکہ ایک طبقہ اپنی ذہنی اغراض کے مطابق ان تعلیمات کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں!

"حضرت علامہ اقبال کے ارشادات کی روشنی میں ہم اگر معاشرتی زندگی کے خدوخال دیکھیں تو ہمیں از خود یہ محسوس ہونے لگے گا کہ کہاں کہاں "بار دل و دماغ" کی لکیریں موجود ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب خامیاں معلوم ہو جائیں تو پھر ان کا دور کرنا چنداں مشکل نہیں۔"

شیر محمد اختر صاحب نے یہ بات کتنی سچی کہی ہے کہ

"ہم قومی کردار کی تشکیل پر بار بار زور دیتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہم حالات کے جس گرداب میں اس وقت پھنسے ہوئے ہیں ان میں سے نکلنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ کردار کی تعمیر میں فکر کو اولین مقام حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ فکر کو ذہن کا کردار کہا جاتا ہے اقبال نے بھی قوم کو ایک فکر دیا تاکہ اس کے ذہنی کردار کی تشکیل کی جا سکے۔ اور پھر اس سے قومی سطح پر ایک ایسا کردار ابھرے جسے اقبال مرد مومن کا نام دیتے ہیں۔ آج قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے اسی مرد مومن کی ضرورت ہے"

چوبیس صفحات کا یہ پرچہ آفسٹ میں شائع ہوا ہے۔ سرورق حضرت علامہ اقبال کی جوانی کی ایک تصویر سے مزین ہے۔ قیمت صرف ۳۲ پیسے ہے۔

(ابو سلمان شاہجہانپوری)

ماہنامہ **قومی زبان** کراچی

کا

بابائے اردو نمبر ۔ ستمبر ۱۹۶۸ء

لکھنے والے

اختر حسین ۔ قدرت اللہ شہاب ۔ ممتاز حسین ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ابن انشا ۔ محمد انصار اللہ نظر ۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۔ حبیب اللہ رشدی۔
سید صلاح الدین ۔ سعادت مرزا ۔ سید معین الرحمان ۔ جمیل نقوی ۔ فضل احمد صدیقی
شمیم احمد ۔ احفاظ الرحمان ۔ نرگس صادق ۔ اکبر رحمانی ۔ حافظ بشیر احمد غازی آبادی
محمود الرحمان ۔ غیور عالم ۔ آنسہ اختر اخلاق ۔

قیمت فی پرچا ———— ایک روپیا

قیمت سالانہ ———— دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان ۔ بابائے اردو روڈ کراچی ۱

گرد و پیش

اردو اور سائنس

لاہور میں ۷؍ اکتوبر کو ایک تعلیمی سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے مغربی پاکستان کے سابق جج جناب جسٹس نذیر احمد محمود نے فرمایا ہے کہ اردو زبان میں سائنسی مضامین کی تعلیم دینے کی سلاحیت موجود ہے آپ ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی موثر توسیع پر زور دے رہے تھے۔ جناب نذیر احمد محمود نے یہ بھی فرمایا کہ سائنس کے مضامین کی تعلیم دینے کے لئے اردو زبان میں آسانی سے مزید نصابی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔

اردو کانفرنس کی قرارداد

بھاولپور میں ۳؍ اکتوبر کو اردو کانفرنس کے سہ روزہ پروگرام کے اختتامی اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ بھاولپور میں جو صوبے کے بالکل وسط میں ہے اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ دوسری قرارداد میں بھاولپور میں اردو ہال تعمیر کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ کانفرنس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ مغربی پاکستان کے تمام اسکولوں میں چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک فارسی یا عربی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے تاکہ طلبہ اردو زبان پر زیادہ قدرت حاصل کرسکیں۔ خواتین کے ایک علیحدہ اجتماع میں ڈویژنل کمشنر کی اہلیہ نے اردو کو سائنسی مضامین کا ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا اردو ایک ایسے اتحاد کی علامت ہے جس کی بنیاد علاقائی زبانوں پر ہے۔ کانفرنس کا اختتام مشاعرے پر ہوا جس کی صدارت سید ہاشم رضا کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو کو بین الاقوامی زبان قرار دیا اور کہا پاکستان میں اردو کا مستقبل تابناک ہے۔

ڈاکٹر قریشی کا بروقت انتباہ

جامعہ کراچی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ۴؍ اکتوبر کو کراچی میں اساتذۂ اردو کالج کے سالانہ عشائیے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سیاست میں الجھے بغیر میں اس بات کا پر زور مؤید ہونگا کہ ثقافت اور زبانوں کو سیاست میں ملوث نہیں کرنا چاہئیے۔ آپ نے نظریۂ پاکستان کی تشریح کی اور کہا کہ حالات اردو کے حق میں سازگار ہیں اور مغربی پاکستان میں اردو کا جائز مقام ملنے کے امکانات پیدا ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے کہا کہ اردو کے لئے مسلسل اور انتھک کام کرنے کی ضرورت ہے اور اب اردو کالج کی ذمہ داری پہلے سے بڑھ گئی ہے [illegible]

اس سے پہلے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے ادارۂ مصنفین پاکستان کے معتمد عمومی جناب جمیل الدین عالی نے کہا کہ آج اردو کو نعرے بازی اور زبانی ہمدردی کے بجائے ٹھوس امداد کی ضرورت ہے ۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کے افق پر اردو کا پرچم بلند ہو رہا ہے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اردو کی علمی ، ادبی اور تدریسی سرگرمیاں تیز تر کر دینی چاہئیں تاکہ کم سے کم مغربی پاکستان میں اردو کو سرکاری اور تدریسی زبان کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے ۔

جسٹس عطا اللہ کے ارشادات

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس عطا اللہ سجادؔ نے مجلس مشاورت کی چوتھی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری مذہبی ، ثقافتی ، تہذیبی اور معاشرتی یکجہتی کی ضمانت ہے ۔ آپ نے کہا کہ جب بھی مسلمانوں نے اپنے سیاسی مستقبل کی راہیں متعین کرنا چاہی ہیں تو اس میں اردو کے مقام کو لازماً سامنے رکھا ہے ۔ آپ نے کہا کہ اس کے ساتھ جب اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے دشمنوں نے کوئی سازش کی ہے تب بھی انہوں نے تعلیمی یا سیاسی کسی طرح بھی اردو کو متنازعہ مسئلہ بنا لیا ہے ۔ جناب جسٹس عطا اللہ سجادؔ نے فرمایا جب تک تمام شعبوں میں اردو زبان مروّج اور غالب نہیں ہو جاتی ہماری آزادی کی تکمیل نہیں ہو گی اور ہمیں اپنے نصب العین کے حصول کا بھرپور احساس نہیں ہو گا ۔ آپ نے علاقائی زبانوں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان میں اور اردو میں یہ فرق ہے کہ اردو ہماری قومی وحدت کی مظہر ، ہمارے ماضی کی آئینہ دار اور آئندہ نسلوں کے اتحاد کی ضمانت ہے اور علاقائی زبانوں کو اردو کے مقابلے میں لانے کی حکمت عملی ملّی مقاصد کے منافی ہے ۔ آپ نے اس سلسلے میں دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ تلقین کی کہ مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں ۔ رائے عامّہ کے سیلاب کے سامنے مخالفت کے بڑے بڑے ستون خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں ۔ آپ نے اردو کے اداروں سے کہا کہ وہ مسلسل کام کریں تاکہ ۱۹۶۲ء میں کمیشن کے تقرر کے وقت ہم یہ ظاہر کر سکیں کہ ہمیں انگریزی کی بیساکھیوں کے سہارے کی ضرورت نہیں ۔ آپ نے کہا کہ قانون کے طلبہ کے نصاب میں اردو دستاویز نویسی اور بی ۔ اے ۔ پی ایس سی کے امتحانوں میں اردو اختیار کر لینی چاہیئے ۔ جسٹس عطا اللہ سجاد نے مزید کہا کہ ہمیں بنگالی کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے ۔ پاکستان کے دونوں صوبوں کے باشندوں کو دونوں قومی زبانوں سے آگاہ ہونا ضروری ہے آپ نے کہا کہ مغربی پاکستان میں پرائمری سے مڈل تک بنگالی اختیاری مضمون کی حیثیت سے فوراً اختیار کر لینی چاہیے ۔ آپ نے آخر میں اردو کے تمام بہی خواہوں سے بے لوث خدمات انجام دینے کی درخواست کی ۔

اردو کانفرنس کی قرار دادیں

مغربی پاکستان کی اردو انجمنوں کی دو روزہ کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی ۔ جس میں متعدد اہم قرار دادیں اتفاق رائے سے منظور ہوئیں ۔ کانفرنس میں ان تمام افراد کا شکریہ بھی ادا کیا گیا جو وقتاً فوقتاً اردو اور بنگالی کی حمایت میں مہم چلاتے رہتے ہیں ۔ کانفرنس نے یہ بھی یقین دلایا کہ قومی زبانوں کا مقصد مختلف علاقائی زبانوں کو کچلنا نہیں جن کو ترقی کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے ۔ قرار دادوں میں پہلی قرار داد جو منظور کی گئی اس میں صدر ایوب کے اس نقطۂ نظر کی مکمل حمایت کی گئی ہے کہ ملک میں دونوں حصّوں میں ایک زبان ہونی چاہیئے ۔ دوسری قرار داد میں اردو کو پاکستان کی قومی اور عدالتی زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے ۔ ایک اور قرار داد میں مطالبہ کیا گیا کہ

اردو کو فوری طور پر سرکاری اور نیم سرکاری مواصلات کے لئے ذریعہ اظہار بنایا جائے۔ ایک قرار داد کے ذریعے اس پر اظہار افسوس کیا گیا کہ تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے باوجود اردو کو ذریعۂ تدریس بنانے کی بہت معمولی کوششیں کی گئی ہیں۔ کانفرنس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر شدید نکتہ چینی کی۔ جو بگڑی ہوئی اردو کو عوام پر مسلط کر رہے ہیں۔ ایک اور قرار داد میں دونوں قومی زبانوں کے لئے آزادانہ ترقی کے مواقع فراہم کرنے پر زور دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے مندوب نے اردو کے سلسلے میں اپنے صوبے کے عوام کے جذبات پہنچائے اور کہا کہ وہ اردو کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ کانفرنس نے مطالبہ کیا کہ انگریزی کو اسکولوں اور کالجوں میں صرف اختیاری مضمون کی حیثیت سے رکھا جائے۔ کانفرنس نے کامل اتفاق رائے سے حکومت پر زور دیا کہ مرکزی اور صوبائی سروسوں کے امتحانات میں اردو کو انگریزی کے مساوی درجہ دیا جائے۔ تاکہ بے شمار باصلاحیت افراد پر حکومت کی ان ملازمتوں کے دروازے بند نہ ہو جائیں۔ کانفرنس میں صوبے بھر سے اردو کی انجمنوں کے نمائندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور مشرقی پاکستان اور آزاد کشمیر کے مندوبین بھی شریک ہوئے۔

جامعہ پنجاب اور ذریعہ تعلیم

جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر جناب پروفیسر حمید احمد خاں نے ایک مذاکرے میں بتلایا کہ حکومت پاکستان کے واضح فیصلے کے مطابق اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے پنجاب یونیورسٹی نے سنہ ۱۹۶۲ء میں ایک ادارۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں بی۔ اے۔ بی ایس سی۔ ایم۔ اے۔ ایم ایس سی کی سطح پر یونیورسٹی نے اردو کو انگریزی کے ساتھ تعلیم و امتحان کا اختیاری ذریعہ قرار دیدیا۔ اسی دوران ادارۂ تالیف و ترجمہ نے معاشیات۔ فلسفے۔ تاریخ معاشیات۔ نفسیات۔ اور سیاسیات وغیرہ کی تیس ہزار سے زیادہ اصطلاحات کو ماہرین کی کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ جناب حمید احمد خاں نے بتایا کہ یونیورسٹی نے فلکیات، حیوانیات اور اقتصادیات وغیرہ میں بی۔ اے۔ بی ایس سی کی معیاری کتابیں بھی مرتب کرائی ہیں۔

ہفتۂ اردو منایا جائے گا

انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر جناب اختر حسین نے "اردو ہفتہ" منانے کی تنظیمی کمیٹی کی سربراہی قبول کرلی ہے۔ یہ بات کراچی میں ۲۲ ستمبر کو مرکز حروف کے ڈائرکٹر جناب تمنائی نے بتائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ عنقریب ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کا جلسہ ہوگا جس میں ہفتۂ اردو کی مختلف تقریبات اور نشستوں کے بارے میں تفصیلی پروگرام مرتب کیا جائے گا۔ جناب تمنائی نے کہا ہے کہ ہمارے ملک میں گزشتہ دس سالوں میں اردو کی ترقیاتی رفتار بہت تیز رہی ہے یہ ہفتہ اسی ترقی کا آئینہ ہوگا۔

علمی، ادبی، تعلیمی اور تہذیبی خبریں

تعلیمی شعبے میں ترقی

حکومت مغربی پاکستان کے چیف سکرٹری جناب ایس آئی حق نے امید ظاہر کی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی اپنے تعلیمی نصاب کو قومی زبان اور وقت کی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش جاری رکھے گی۔ تاکہ ہمارے طلبہ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہوکر اقوام عالم کی برادری میں نمایاں مقام حاصل کرسکیں۔ آپ نے کہا کہ ثقافتی

ورثے کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی ملک کے جغرافیائی حدود کا تحفظ ۔ قائم مقام گورنر نے سماجی علوم کی تحقیق اور اردو کو اعلا مدارج میں ذریعۂ تعلیم بنانے پر یونیورسٹی کی خدمات کی تعریف کی ۔

آکسفورڈ ڈکشنری

ڈھاکا کے جناب ایم ۔ اے اعظم کے ایک احتجاجی مراسلے پر کلیرنڈون پریس آکسفورڈ نے مشہور عالم آکسفورڈ ڈکشنری کے مدیروں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ ڈکشنری میں دیئے گئے لفظ "اردو" کے بارے میں نظرثانی کریں ۔ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ضروری ترمیمات کی جاسکیں ۔ اس ڈکشنری میں "اردو" کو "ہندوستانی" قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس کا ماخذ مسلم فاتح اور رعایا ہیں ۔

یونیسکو کا انعامی مقابلہ

قومی کتاب مرکز پاکستان نے ایک اعلان کے ذریعے یونیسکو کے لئے کتابوں کے مسودوں کے مقابلے کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ اس کی رو سے بچوں اور نوخواندہ بالغوں کے مطالعے کے لئے موزوں کتابوں کے مسودوں پر دو ۔ دو ہزار روپے کے انعامات دیئے جائیں گے ۔ دو انعامات اردو اور دو انعامات بنگلا کے لئے مخصوص ہیں ۔ یہ مسودے ثقافتی ۔ ادبی اور روزمرہ سائنس کے موضوعات پر ہونے چاہئیں ۔ جن کی ضخامت تقریباً ۲۵ ہزار الفاظ ہو ۔ مسودے داخل کرنے کی آخری تاریخ ۳۰ جنوری ۱۹۶۹ء ہے ۔

نذرل اکادمی کو عطیہ

صدر پاکستان نے ڈھاکا میں ۲۴ ستمبر کو نذرل اکادمی ڈھاکا کے لئے ۵۰ ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا ہے ۔ صدر نے یہ اعلان اس ثقافتی شو کے اختتام پر کیا جو اکادمی کے زیراہتمام صدر کے اعزاز میں پیش کیا گیا تھا ۔

جامعہ کراچی میں نوادر کی نمائش

جامعہ کراچی میں نوادر کی نمائش اور مختلف شعبوں کی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک تقریب ہوئی جس میں تقریر کرتے ہوئے شیخ الجامعہ نے کہا کہ اب جامعہ علم و تحقیق کا ایک باوقار مرکز بن چکی ہے ۔ انھوں نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ مالی مشکلات سے نجات دلانے میں ہمیں مخیر حضرات مایوس نہیں کریں گے ۔ چیرمین بلدیہ کی جانب سے اس موقع پر ہر امکانی امداد کا یقین دلایا گیا ۔

کاپی رائٹ کے تحت ابراہیم جلیس کا مقدمہ

کراچی میں ۴ اکتوبر کو جناب محمد ابراہیم ڈبلیو قریشی ایس ۔ ڈی ۔ ایم کینٹ کی عدالت میں مشہور ادیب ابراہیم جلیس کی طرف سے دائر کردہ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی ۔ جناب ابراہیم جلیس نے یہ مقدمہ مقامی پبلشر رئیس محسن کے خلاف کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت دائر کیا ہے جس کی رو سے ان کی ایک کتاب اجازت اور اطلاع کے بغیر شائع کی گئی تھی ۔

موئن جو دارو کو خطرہ

موئن جو دارو کا قیمتی ورثہ اور یادگاریں بچانے کے لئے یونیسکو مشن کے قائد جناب مورٹیمر ویلر نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس قدیم تہذیب کو تباہی سے بچانے کے لئے فوری اور دانشمندانہ اور ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے سر مورٹیمر عالمی شہرت یافتہ برطانوی ماہر آثار قدیمہ ہیں ۔ جو چھ رکنی وفد

کے قائد ہو کر کراچی پہنچے ہیں اور جن کا مقصد ان آثار قدیمہ کو سیم و سیلاب سے بچانے کی تدابیر کا جائزہ لینا ہے جو حکومت پاکستان کو پیش کی جائیں گی۔ اور یونیسکو بھی اس کام کے لئے مناسب فنڈ مہیا کرے گا۔ برطانوی ماہر آثار قدیمہ نے کہا کہ یہ آثار صرف پاکستان ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے انتہائی اہم سرمایہ ہیں۔

اس آئینہ خانے میں

پاکستانی شاعر کو اعزاز

برطانیہ کے ادبی میلے میں نظم گوئی کا پہلا انعام ایک پاکستانی شاعر جناب حسین کو دیا گیا ہے برطانوی دفتر اطلاعات کے مطابق مسٹر حسین کی نظم "ساحل سمندر پہ مکان" کو ۴۴۵ نظموں میں بہترین نظم قرار دیا گیا ہے اور انھیں ۵۰ پونڈ کا پہلا انعام تفویض ہوا ہے۔ مسٹر حسین ایک ماہر ملبوسات اور شہباز شرٹ فیکٹری کے مالک ہیں۔ انھوں نے برطانیہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ مسٹر حسین بہت جلد اپنی انگریزی نظموں کا مجموعہ شائع کرا رہے ہیں۔ روس میں پاکستان کے سابق سفیر جناب اختر حسین کے صاحبزادے ہیں۔

صدر مملکت کا ارشاد

صدر مملکت پاکستان نے اپنی ماہانہ نشری تقریر میں ارشاد کیا ہے کہ پاکستان کی علاقائی زبانیں ایک ہی کنبے کی زبانیں ہیں۔ کنبے کے افراد میں راہ و ربط اور میل ملاپ بڑھانے سے آخر ایک ایسی قومی زبان پیدا ہو گی جس کا ماخذ تمام علاقائی زبانیں ہوں گی۔ صدر نے کہا کہ ہماری ثقافت علاقائی نہیں بلکہ پاکستانی ہے۔ صدر مملکت نے کہا کہ جو لوگ اردو بنگالی، پشتو سندھی اور پنجابی کو مختلف زبانیں کہتے ہیں وہ یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ان زبانوں کے علما اور مفکرین کے دل و دماغ زندگی کے ایک ہی فلسفے سے دھڑکتے ہیں۔ اقبال۔ نذر الاسلام۔ بلھے شاہ۔ بابا فرید اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے افکار میں ایک ہی پیغام ہے۔

یادوں کے چراغ

غالب کی صد سالہ برسی

امریکہ کی ایشیا سوسائٹی نے جشن غالب کی صد سالہ برسی کے پیش نظر ڈاکٹر داؤد رہبر کو خطوط غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر کے انگریزی ترجمے پر مامور کیا ہے۔ ڈاکٹر داؤد رہبر بوسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر تاریخ ادیان کے عہدے پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر رہبر نے مولانا مہر کے مرتب کردہ مجموعے کے پہلے حصے کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے اور اب دوسرے حصے کے ترجمے میں مشغول ہیں۔ یہ دونوں حصے ایشیا سوسائٹی شائع کریگی جو ۱۹۶۹ء تک اس کی اشاعت کا اہتمام کر رہی ہے۔

روس میں اقبال اور غالب کی مقبولیت

روس میں جب سے اقبال اور غالب کے کلام کا ترجمہ ہوا ہے ان کے مداحوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ روسی زبانوں میں اب تک پاکستانی مصنفین

کلام اقبال کا عربی ترجمہ

حکومت پاکستان نے متحدہ عرب جمہوریہ کے ممتاز شاعر جناب شیخ شلان کو علامہ اقبال کی تصانیف کا عربی میں منظوم ترجمہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ شیخ شلان اس سے قبل علامہ اقبال کا "شکوہ" عربی میں منتقل کر چکے ہیں جسے عرب جمہوریہ کی گلوکارہ ام کلثوم گا چکی ہیں۔ شیخ شلان ثقافتی تبادلے کے پروگرام کے تحت ۱۰ اکتوبر سے پاکستان کا دورہ کریں گے۔ اور ایک سال تک یہاں قیام کریں گے۔

قرار داد تعزیت

بزم سیماب نے ایک تعزیتی قرار داد کے ذریعے حضرت شفا گوالیاری مرحوم کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ حضرت شفا کے کلام کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ فن شعر پہ پوری طرح حاوی تھے ان کا پانچواں مجموعہ "زخم گل" شائع کرانے کی طرف بزم سیماب نے توجہ دلائی ہے۔

جشن فرید کا دو روزہ پروگرام

سرائیکی زبان کے عظیم شاعر خواجہ فرید کی یاد میں دو روزہ جشن ملتان میں منایا گیا۔ اس موقع پر وزارت تعلیم کے معتمد جناب قدرت اللہ شہاب نے فرمایا کہ صوفی شعراء نے قوم میں یکجہتی پیدا کرنے کی لازوال خدمات انجام دی ہیں۔

آئینہ ہند

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ وسکانسن میں

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ وسکانسن یونیورسٹی کے شعبہ علوم ہند نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ایک سال کے لئے اردو زبان و ادب کی وزیٹنگ پروفیسر شپ کی پیشکش کی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ اس سے قبل بھی اس یونیورسٹی میں کام کر چکے ہیں جہاں سے ان کی مرتب کی ہوئی کتاب "ریڈنگز ان اردو پروز" شائع ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر علیم کا خطبۂ صدارت

جامعہ اردو علی گڑھ کا جلسہ تقسیم اسناد جناب راج ناتھ کنزرو کی صدارت میں ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء کو منعقد ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر علیم نے فرمایا کہ اردو کے تحفظ و بقا کی تحریک کو کسی قسم کی فرقہ واریت سے منسوب کرنا رجعت پسندی کا بدترین مظاہرہ ہے۔

مسعود حسین خاں علی گڑھ یونیورسٹی میں

اردو کے چوٹی کے محقق، نقاد، شاعر اور ماہر لسانیات جناب پروفیسر مسعود حسین خاں کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں ہو گیا ہے۔ موصوف علی گڑھ یونیورسٹی کے پرانے طالب علم اور استاد ہیں اور اب تک عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر تھے جہاں انھوں نے اہم تحقیقی اور علمی موضوعات پر کام کیا ہے۔

صد سالہ جشن غالب

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی ہے جس کے صدر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر جناب محمد فضل الرحمان صاحب ہیں اور

آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے ہیں۔ کمیٹی کے اراکین میں ڈاکٹر عبدالعلیم۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ ہربنس لال شرما۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر منیب الرحمان کے نام شامل ہیں۔

شعبۂ اردو کو وظائف یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے حال ہی میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لئے جن وظائف کا اعلان کیا ہے ان میں شعبہ اردو کے ڈاکٹر اسلم رضوی (سینیئر فیلوشپ) اور جناب امیر عارفی (جونیئر فیلوشپ) کے نام شامل ہیں۔ یہ دونوں حضرات بالترتیب "معیاری تلفظ کی اردو ڈکشنری" اور نیاز فتحپوری کی حیات اور کارناموں پر کام کر رہے ہیں۔ یہ رقم ۵ سو روپے اور تین سو روپے ماہانہ پر مشتمل ہے۔

ماتم میں ہم شریک

عبداللہ بٹ کا انتقال :- مشہور مصنف، صحافی اور ہفت روزہ "حرف و حکایت" کے مدیر جناب عبداللہ بٹ لاہور میں ۲۹ ستمبر کو انتقال فرما گئے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر صرف ۴۸ سال تھی۔ ان پر ستمبر میں فالج کا حملہ ہوا تھا۔ جس کے بعد انھیں بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ادارہ "قومی زبان" مرحوم کی بے وقت موت پر انتہائی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

نازلی بیگم کی رحلت :- بیگم عطیہ فیضی کی بڑی ہمشیرہ ہر ہائنس نازلی رفیعہ سلطان آف جنجیرا کا انتقال کراچی میں ۱۸ ستمبر کو ۹۲ سال کی عمر میں ہو گیا۔ جناب ممتاز حسن نے ہر ہائنس نازلی بیگم کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کے اٹھ جانے سے ہماری ثقافت، معاشرت اور روایات کا ایک دور ختم ہو گیا۔ یہ وہ خاتون تھیں جن سے اقبال اور شبلی متعارف تھے۔ اور ان کے علم و ادب اور شاعرانہ صلاحیتوں کے قدر داں تھے۔

ادارہ "قومی زبان" اس غم میں برابر کا شریک ہے اور ان کی رحلت پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

اردو آپ کی
اردو کالج آپ کا
اس کی تعمیر میں ایک اینٹ آپ بھی لگائیے

اردو تھیٹر

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

ڈاکٹر نامی نے اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ مرتب کی ہے جس میں ڈراموں، ڈرامانگاروں، اور ڈراما کمپنیوں وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ یہ کتاب دراصل ڈرامے کی انسائکلوپیڈیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے جن میں سے تین چھپ چکی ہیں اور چوتھی زیر طبع ہے۔

قیمت:۔ فی جلد سات روپے

سیّد احمد خاں۔ حالات وافکار

بابائے اردو

ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار سیّد احمد خاں کی شخصیت اور علمی کارناموں کا جائزہ، جس میں بابائے اردو نے سرسید کے حات اور افکار کے بعض پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو مولانا حالؔی کی کتاب "حیاتِ جاوید" کا ضمیمہ سمجھنا چاہیئے۔

قیمت:۔ چار روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی۱

نئے خزانے

جنوری تا جون کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ

ابوسلمان شاجہاں پوری

غوری، ضمیر احمد خان	بیرونی سے پہلے علم المثلثات کا ارتقا	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۷۱ تا ۸۰، جون ۱۹۶۱ء علی گڑھ
فرحت شاہجہان پوری	۲۳ مارچ اور قرارداد پاکستان	امروز، ص ۸، ۲۳ مارچ لاہور
فرقان، عظیم الرحمان	ویت نامیوں کی جنگ آزادی	جہاں نما، ص ۹ تا ۱۲، ۱۰ فروری "
فروغ احمد	اشتراکی اور مغربی سامراج	چراغ راہ، ص ۴۲ تا ۴۴، مئی کراچی
فضل الرحمان صواتی، مولانا حکیم	جنوبی ہند علم و فضل اور ذہانت و فطانت کے میدان میں	برہان، ص ۴۴ تا ۵۱، جنوری دلی
کامل شریف		
عارفہ اقبال (مترجمہ)	جہاد فلسطین اور اخوان	چراغ راہ، ص ۱۳۷ تا ۱۴۸، جون کراچی
کرار حسین، پروفیسر	فرد کی آزادی	افکار، ص ۳۱ تا ۵۴، جنوری فروری "
کشفی، میر غلام احمد	کشمیر — دینی تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے	امروز، ص ۲ تا ۳، ۲۳ مارچ لاہور
کلیم اختر	برصغیر میں پاکستان کا نعرہ	قندیل، ص ۵، ۲۰ مارچ "
گوپال متل	کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی	تحریک، ص ۷ تا ۲۹، جون دلی
لطیف اللہ	حصول آزادی میں علی گڑھ تحریک کا حصہ	فکر و خیال، ص ۴۵ تا ۵۰ کراچی
مجیب الدین، سید	نقش و نگار کا شہر — ملتان	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۰ تا ۱۴، [illegible] "
محمد احسن، چودھری	تاج محل — اسلامی دور کی تاریخی یادگار	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۳، ۱۷ جنوری لاہور
محمد اکبر، قاضی	سندھ میں تحریک آزادی	جنگ، ص ۲۰، یکم اپریل کراچی
" "	" "	" " ۲۰، ۸ " "
" "	" "	" " ۲۰، ۱۵ " " "
" "	" "	" " ۳، ۲۳ " " "
" "	" "	" " ۲۰، ۲۹ " "
" "	" "	" " ۲۰، ۶ مئی " "
" "	" "	" " ۲۰، ۲۰ " "
" "	" " (۹)	" " " ۲۰، ۳ جون "
"	" " (۱۰)	" " ۹، ۱۰ " " "
"	" " (۱۱)	" " ۹، ۲۲ " "
محمد جعفری، سید	ایران جدید	العلم، ص ۶۷ تا ۸۰، اپریل "

[illegible]

محمد حیدری، سید	حیدرآباد اور ایران	العلم، ص ۱۲۵ تا ۱۲۹، جنوری کراچی
محمد تقی، سید	کربلا کا المیہ — تہذیبی تجزیے کی روشنی میں	جنگ، ص ۲، ۲۰ مئی کراچی
محمد خلیق، ڈاکٹر		
معروف شاہ شیرازی (مترجم)	ماسکو اور اسرائیل	چراغ راہ، ص ۹۹ تا ۱۲۶، جون کراچی
محمد سعید	اسرائیل کیسے وجود میں آیا؟	مشرق کراچی، ص ۳، ۶، ۲۸ جنوری
محمد علی، چودھری	ہماری خارجہ پالیسی	ایشیا، ص ۱۰ تا ۱۱ + ۱۸، ۲۴ مارچ لاہور
محمد علی جالندھری، مولانا	کیا واقعی مودودی (مولانا سید ابوالاعلیٰ) صاحب اسلامی دستور چاہتے ہیں؟	شہاب، ص ۶ تا ۷، ۲۱ جنوری لاہور
محمد عمر، ڈاکٹر	مسلمانوں میں حقہ نوشی	جامعہ، ص ۲۵۲ تا ۲۶۷، مئی دہلی
محمود الحق	شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک	مجلہ علوم اسلامیہ، ص ۶۲ تا ۹۲، جون [illegible] علی گڑھ
محمود خاں، محمد	بھوپال کی مختصر تاریخ	نوائے سیفیہ، ص ۸۳ تا ۹۳، [illegible] بھوپال
مرغوب صدیقی	قرارداد پاکستان کا پس منظر	کوہستان، ص ، ۲۳ مارچ لاہور
مسکین حجازی	"	" " " "
مشتاق احمد	پاکستان کی خارجہ پالیسی — دورِ لیاقت سے آج تک	جنگ، ص ۹، ۵ فروری کراچی
منیر الحق، ڈاکٹر	عالمی قومیت — تاریخ اور پس منظر	جامعہ، ص ۲۳۸ تا ۲۵۱، مئی دہلی
مطلوب احمد شیخ	بیوروکریسی نظام	قندیل، ص ۲۰، ۱۷ جنوری لاہور
"	"	" " ۲۰، ۲۷ " "
معروف شاہ شیرازی	سوڈان میں اسلامی دستور کی جدوجہد	چراغ راہ، ص ۶۷ تا ۸۶، فروری و مارچ کراچی
مقبول جہانگیر	بھارت کی خفیہ دستاویز — اوپریشن یوبو (آخری قسط)	اردو ڈائجسٹ، ص ۴۹ تا ۵۶، فروری لاہور
مختار احمد	آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کا رول	چٹان، ص ۱۲ تا ۱۴، ۲۶ فروری "
منظور حسن، کیپٹن	بہاول پور کی علم پرور سرزمین	کوہستان، ص ۳، ۲۶ اپریل "
ناز، ایم ایس	قرارداد پاکستان کا پس منظر	قندیل، ص ۲، ۲۰ مارچ "
" "	قلعہ لاہور	" " ۱۲ تا ۱۳، ۵ جون
" "	"	" " ۱۲ تا ۱۳، ۱۲ "
نصرت بانو	بس چہ باید کرد	مجلہ سیفیہ، ص ۲۰۳ تا ۲۰۶، [illegible] بھوپال

یعقوب حسن، سید	پاکستان کا قیام	کوہستان، ص ، ۲۲ر مارچ لاہور
دورج پتی شرما	دورِ ماضی میں ہندوستان میں سیر و سفر	ہمایوں، ص ۱۱۹ تا ۱۲۱، فروری دہلی
ـــــ	شیخ عبداللہ سے انٹرویو کی روداد	مشرق، ص ، ۱۰ر فروری کراچی

تعلیمات

اخلاق حسین زبیری	تعلیم و تربیت کے بنیادی نظریئے	الجامعہ، ص ۴۰ تا ۴۸، مارچ مکہ
افضل صدیقی	قومیت، ثقافت اور نظام تعلیم	قومی تعلیم، ص ۲۷ تا ۳۰، ۱۹۶۸ء کراچی
اقبال احمد، مولانا	دینی تعلیم ـــ ایک بنیادی ضرورت	زندگی، ص ۴۸ تا ۵۰، مارچ رامپور
بیتاب بریلوی	روسی نظام تعلیم	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۴۱ تا ۴۴، مئی کراچی
ثناء اللہ انصاری، ڈاکٹر ایم	ابن سینا کے تعلیمی نظریات	فکر و خیال، ص ۱۶ تا ۱۷، نمبر ۱، ۲، ۱۹۶۸ء
حمید احمد خاں، پروفیسر	اردو ذریعہ تعلیم	لاہور، ص ۶ تا ۷، ۱۷ر فروری لاہور
خالد، علاء الدین	نظام تعلیم کا مقصد	کتابی دنیا، ص ۱ تا ۲، جنوری تا مارچ کراچی
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	اردو ذریعہ تعلیم (پنجاب یونیورسٹی کی خدمات کا جائزہ)	مشرق، ص ۲، ۱۴ر جنوری ،،
راشدی، پیر علی محمد	تعلیمی کونسل	جنگ، ص ۲، ۱۶ر اپریل ،،
،، ،،	مسئلہ تعلیم	،، ،، ۲ر مارچ
،، ،،	،،	،، ،، ۹ر ،،
ساجد حسین، سید	تعلیم میں معاشرتی شعور کی اہمیت و افادیت	قومی تعلیم، ص ۴۳ تا ۸۸، ۱۹۶۸ء کراچی
سرور، آل احمد	علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم اور اردو	ہماری زبان، ص ۱ تا ۲، ۸ر فروری علی گڑھ
سعید انصاری	چھوٹے بچوں کی تعلیم کا ایک نیا تجربہ	جامعہ، ص ۱۷۵ تا ۱۸۳، اکتوبر ۱۹۶۷ء دہلی
،،	فروئبل ـــ کنڈرگارٹن کا بانی	،، ،، ۱۳۳ تا ۱۴۴، مارچ ،،
،،	،، ،،	،، ،، ۱۸۵ تا ۱۹۲، اپریل ،،
شبلی نعمانی، مولانا	مولانا شبلیؒ کی ایک تقریر[1]	معارف، ص ۶۵ تا ۷۰، جنوری اعظم گڑھ

---

[1] اس رزولیوشن کی تائید میں کہ بی اے کے نصاب میں فارسی بطور اختیاری مضمون رہنی چاہیئے۔

عبداللہ، ڈاکٹر سید	ہمارے تعلیمی ادارے اخلاق کے مرقد[1]	چٹان، ص ۱۲ تا ۱۴، ۱۳ مارچ	لاہور
کوثر نیازی	اسلام اور اس کا نظام تعلیم ۔	شہاب، ص ۳ تا ۴، ۱۲ مئی	״
محمد حسین خان زبیری	تعلیم کا مقصد	فکر و خیال، ص ۲۵ تا ۳۰، مارچ	کراچی
محمد صدیق، خواجہ	اسلامی معاشرہ اور تعلیم	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۷ تا ۱۰، ۲۰ مئی	״
مصطفیٰ علی بریلوی، سید	مولانا محمد علی جوہر کی تعلیمی تقریریں	علیگ، ص ۵ تا ۱۸، فروری	״
ممتاز حسن، ڈاکٹر	تعلیم اور قومی تعمیر	قومی زبان، ص ۵ تا ۱۴، اپریل	״
منیر احمد شیخ	تعلیم اور قومی نقطۂ نظر	قندیل، ص ۱۹ + ۱۲، ۱۰ جنوری	لاہور
مینا زبیری	سر سید کی تعلیمی تحریک	تہذیب الاخلاق، ص ۷ تا ۱۹، فروری	״
نذیر احمد	پاکستان میں دینی درس گاہوں کی ضرورت	الجامعہ، ص ۳۵ تا ۴۰، اپریل مئی	محمدی
نذیر احمد، حافظ	دینیات کی تعلیم	المعارف، ص ۹۵ تا ۱۰۷، جنوری فروری	لاہور
״	مدارس عربیہ اور ان کا نصاب تعلیم	״ ״ ۴۴ تا ۴۹، مارچ	״
نعیم اسلم احمد	تصور تعلیم کی فکری اساس اور اس کی تلاش	چٹان، ص ۲ تا ۱۴، ۵ اپریل	لاہور
نعیم عارفی، محمد	برطانیہ میں ثانوی تعلیم کا نظام	فکر و خیال، ص ۱۸ تا ۲۶، ستمبر	کراچی

تہذیب و تمدن

احرار نقوی	ایرانی تہذیب	الشجاع، ص ۸ تا ۱۹، مئی جون	کراچی
احمد ندیم قاسمی	کلچر کا مسئلہ	اردو زبان، ص ۱۳ تا ۱۶، جنوری	سرگودھا
بشیر احمد، میاں	پاکستانی ثقافت — ایک اہم سوال	المعارف، ص ۸۱ تا ۸۴، جنوری فروری	لاہور
جمیل الدین احمد	مسلم معاشرہ اور ہندو معاشرہ	مشرق، ص ۵، ۳ مارچ	کراچی
راشدی، پیر علی	پاکستان کی تاریخی اور تمدنی میراث	جنگ، ص ۱۲، ۳۰ مارچ	״
غوری، شبیر احمد خاں	قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی تمدنی جھلکیاں	برہان، ص ۲۲۰ تا ۲۳۲، اپریل	دہلی
״ ״	״ ״	״ ״ ۳۱۳ تا ۳۲۹، مئی	״
״ ״	״ ״	״ ״ ۳۹۵ تا ۴۰۰، جون	״

---

[1] یوم حمید نظامی پر ڈاکٹر صاحب کا صدارتی خطبہ

محمد عمر، ڈاکٹر	ہندو تہذیب اور مسلمان	برہان، ص ۱۰۰ تا ۱۱۹، فروری دہلی
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۱۸۱ تا ۱۸۹، مارچ 〃
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۲۷۵ تا ۲۸۵، اپریل 〃
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۳۴۴ تا ۳۵۶، مئی 〃
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۳۰۰ تا ۳۹۴، جون 〃
ممتاز حسن، ڈاکٹر	پاکستان کی ثقافتی میراث[1]	قومی زبان، ص ۵ تا ۱۰، مئی کراچی
نور الصباح بیگم	دہلی کی تہذیب	اخبار جہاں، ص ۴۴ تا ۵۲، ۳۱ جنوری کراچی
وحید قیصر زیدی، سید	مغل بادشاہوں کی شادی کے دلچسپ حالات	〃 〃 ۲۴ تا ۲۵، ۲۰ مارچ 〃
یقین الدین	قدیم طریق تدفین کی جھلکیاں	ہمدرد صحت، ص ۱۲۹ تا ۱۳۴، فروری 〃

سفرنامے

اختر، محمد خالد	سواقی نہم (آخری قسط)	فنون، ص ۵۳۴ تا ۵۴۰، جنوری و فروری لاہور
قریشی، الطاف حسن	میں عرب عوام سے ملا	اردو ڈائجسٹ، ص ۸ تا ۲۱، فروری 〃
〃	〃	〃 〃 ۸ تا ۲۱، 〃 〃
حسین حسینی	اجنبی بالاکوٹ میں	〃 〃 ۱۲ تا ۱۳+۲۰، ۳۱ جنوری
〃	〃	〃 〃 ۱۲ تا ۱۳، ۷ فروری
سلیم، حضور احمد	شیراز — چند یادیں	نیرنگ خیال، ص ۲۵ تا ۳۱، مارچ لاہور
سیف، مولانا غلام باری	دیار عرب میں ایک سال	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۲، ۲۳ جنوری 〃
〃	〃	〃 〃 ۵+۱۰، ۱۹ فروری 〃
عبدالماجد دریابادی، مولانا	دو دن بھوپال میں	نوائے سیفیہ، ص ۲، بھوپال نمبر ۷۸ء بھوپال
محمد اکبر خان، میجر جنرل	میرا سفر چین نمبر ۸ و ۹	سیارہ ڈائجسٹ، ص فروری مارچ لاہور
محمد حسین خان زبیری	مشاہدات ایران	قومی زبان، ص ۱۵ تا ۱۶، مارچ کراچی

---

[1] یہ مضمون ہفت روزہ "لاہور" لاہور کے شمارہ ۳ جون ۱۹۷۸ء میں بھی نقل ہوا ہے۔

شخصیات

اجمل خاں، حکیم محمد

رئیس احمد جعفری، سید	حکیم اجمل خاں کی غیرت ملی کے چند پہلو	جنگ، کراچی، ص ۲، ۱۸ مارچ
سجاد باقر رضوی، پروفیسر	حکیم اجمل خاں کی شاعری	" " ۱۰، ۵ فروری
کوہستان	مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں	کوہستان، لاہور، ص ۱، یکم فروری
محسن قریشی، حکیم	" "	" " " ۳، "
" "	" "	مشرق، " " ۳، ۳ "
مہر، مولانا غلام رسول	ایک محبوب اور دل آویز شخصیت ۔ حکیم محمد اجمل خاں	جنگ، کراچی، ص ۱۰، ۵ فروری

اقبال، حکیم الامت علامہ

احمد ندیم قاسمی	اقبال سے میری پہلی اور آخری ملاقات	جہاں نما، لاہور، ص ۱۱، ۲۴ اپریل
اختر، شبیر محمد	اقبال کا پیغام اور قومی تقاضے	قندیل، " " ۳، ۲۴ "
اختر جمال خانم	اقبال کے نثری سرمائے کی اہمیت	ادبی دنیا، " " ۱۶۱ تا ۱۷۲، اقبال نمبر ۱
" "	بال جبریل ـــ ایک کارنامہ	قندیل، " " ۱۴۳، ۲۴ اپریل
اشرف بن ایوب	تحریک پاکستان اور علامہ اقبال	ساغر، کراچی، ص ۱۶ تا ۱۸، ۱۲ اپریل
اصغر حسین، سید	اقبال اور ملت اسلامیہ	" " " ۴، ۱۱ مئی
اطہر ندیم	روزگار فقیر (اقبال پر فلم) کا توڑ	نصرت، لاہور، ص ۱۵ تا ۱۶، ۲۸ اپریل
امجد کندیانی	اقبال کے ہاں خون جگر کی اصطلاح	ادبی دنیا، " " ۸۹ تا ۹۳، اقبال نمبر ۲
ام عمارہ	اقبال کی شاعری میں عورت کا تصور[1]	قومی زبان، کراچی، ص ۱۳ تا ۱۶، جون
انعام اللہ خاں	علامہ اقبال اور اتحاد عالم اسلامی	ساغر، کراچی، ص ۷، ۱۲ اپریل
آرتھر آربری، پروفیسر	جاوید نامہ کا نیا انگریزی ترجمہ	ادبی دنیا، لاہور، ص ۱۱۹ تا ۱۲۰، اقبال نمبر ۲
آزاد، جگن ناتھ	اقبال اور مفکرین مغرب	آج کل، دہلی، ص ۲۸ تا ۳۰، جون
آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر	اقبال کا پیغام	قومی زبان، کراچی، ص ۹ تا ۱۱، جون

---

[1] یہ مضمون ہفت روزہ لاہور، لاہور کی اشاعت ۲۴ جون ۱۹۶۸ء میں بھی نقل کیا گیا ہے صفحہ ۲۰

ناشر، ڈاکٹر محمد دین	کلام اقبال	ادبی دنیا، ، ۹۸ تا ۱۰۲، اقبال نمبر ۳۸ء
چغتائی، عبدالرحمان	علامہ اقبال کا مصور ایڈیشن	نیرنگ خیال، ، ۴۳ تا ۴۴، ستمبر و جنوری ۳۸ء
حنا، سیدہ	اقبال اور تصوف	ادبی دنیا، ، ۱۰۳ تا ۱۱۲، اقبال نمبر ۳۸ء
خالد خلد	علامہ اقبال کے خادم خاص علی بخش سے ایک ملاقات	اخبار جہاں، کراچی، ،
خالد کاشمیری	پاکستان میں ذکر اقبال	قندیل لاہور، ص ۱۴، ۸ر مئی
خسرو، سخاوت علی	حکیم الامت	ساغر، کراچی، ص ۱۲ تا ۱۴، ۲۱ر اپریل
خلوق راز	اقبال قلندر نہیں تھا ۔ علامہ اقبال کے خلاف ایک کتاب ۔ ایک تحریک	چٹان، لاہور، ص ۱۱ - ۱۲، یکم جنوری
ڈار، بشیر احمد	اقبال کی اہمیت	ساغر، کراچی، ، ۱۰ تا ۱۱، ۲۱ر اپریل
رشید کامل	اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب	امروز، لاہور، ، ۴، ۲۱ر اپریل
رفعت، سید مبارز الدین	اقبال کا ایک شعر[1]	شہاب، ، ۴۲۸، ۲۱ر ،
،	اقبال کا "حرف شیریں"	قومی زبان، کراچی، ص ۵ تا ۲۰، اپریل
ریاض صدیقی	اقبال کا شعور ارتقا	نگار پاکستان، ، ،
زرینہ ثانی، پروفیسر	اقبال، سیماب اور ظفر علی خاں	شاعر، بمبئی، ص ۵ تا ۱۸، اپریل مئی
ساقی، ف ۔ م	اسلامیات اور اقبالیات	ساغر، کراچی، ، ۵ تا ۶، ۲۱ر اپریل
سالک، مولانا عبدالمجید	علامہ اقبال	جہاں نما ۔ لاہور، ص ۱۳ تا ۱۵، ۲۴ر اپریل
سرور، پروفیسر آل احمد	اقبال کی یاد میں	ہماری زبان، علی گڑھ، ص ۱، ۲۲ر ،
سعید انور	نشر لب دھرتی اور یوم اقبال	لاہور، لاہور، ص ۱۱، ۳ر جون
سول اینڈ ملٹری گزٹ	سر محمد اقبال وفات پا گئے[2]	ہمدرد صحت، کراچی، ص ۴۳ تا ۴۸، اپریل

---

[1] محمد بھی ترا جبریل بھی قرآں بھی تیرا   مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

کلام اقبال کی مختلف شرحوں میں اس کے معنی ۔

[2] حضرت علامہ اقبال کی وفات پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کی رپورٹ ۔ بیماری، وفات، تجہیز و تکفین کے حالات اور ہندو مسلم رہنماؤں کے تاثرات (مترجم عبدالمجید نظامی)

سلیم اختر	اقبال اور آرٹ	ادبی دنیا، لاہور، ص ۴۹ تا ۷۰، اقبال نمبر ۱۹۶۲ء
شاہین، فاروق احمد	اقبال اور ان کی تعلیمات	قندیل، ″ ″ ۱۱، ۲۲ اپریل
شمس الدین، الحاج میجر	فلسفہ اقبال پر ایک طائرانہ نظر	انجمن اسلامیہ میگزین، کراچی، ص ۳۳ تا ۴۴، فروری
شورش کاشمیری	علامہ اقبال کے فرضی احباب اور ان کی افسانہ طرازیاں	چٹان، لاہور، ص ۷، ۱۴، ۵ فروری
″ ″	علامہ اقبال کے نام پر قائم شدہ ادارے[1]	″ ″ ″ ۹، ۱۸، ۲۲ جنوری
شہاب الدین، خواجہ	فکر اقبال کے دو روشن پہلو	فکر و خیال، کراچی، ص ۷۶ تا ۸۰،
شیدائی، پروفیسر اسد الحق	اقبال کا فلسفۂ عقل و عشق	سیارہ، لاہور، ص ۲۷ تا ۳۰، اپریل
صابر، مرزا صابر بیگ	مردہ زندہ گر دوز نغمہ داؤد	قندیل، ″ ″ ۱۴، ۲۴ اپریل
صادق کاشمیری، خواجہ	ڈاکٹر جاوید اقبال	چٹان، ″ ″ ۱۲-۱۴، ۱۵ جنوری
صارم الازہری، مولانا عبد الصمد	چار ہم عصر اسلامی شاعر۔ اقبال، متوقی، حافظ اور	
صالحہ عابد حسین	عورت ـــ اقبال کی نظر میں	جامعہ، دہلی، ″ ۳۰۸ تا ۳۱۴، جون
	زہاویؒ	المنبر، لائل پور، ص ۷-۸، ۱۶ فروری
صفدر حسین، سید	اقبال اور اس کی ہمہ گیر شخصیت	چٹان، لاہور، ″ ۸، ۱۹، ۸ اپریل
″ ″	فکر اقبال کی راہنمائی	سیارہ ڈائجسٹ، لاہور، ص ۹۲، جون
″ ″	نوجوان نسل اور اقبال	قندیل، لاہور، ص ۱۱، ۲۲ اپریل
ضیا، ضیا احمد و محمد اسلم	کلام اقبال میں تصرف	چٹان، ″ ″ ۱۹، یکم جنوری
طاہر فاروقی، پروفیسر محمد	اقبال اپنے خطوط کے آئینے میں	افکار، کراچی، ″ ۲۷-۲، جنوری فروری ۱۹۶۲ء
عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر	اقبال کے استاد ـــ ڈاکٹر میک ٹیگرٹ	ادبی دنیا، لاہور، ″ ۳۰ تا ۴۴، اقبال نمبر
″ ″	اقبال کی خدمت چند لمحے	جہاں نما، لاہور، ص ۱۲، ۲۴ اپریل
عباد اللہ فاروقی، حافظ	اقبال ابلیس کے حریم ناز میں	سیارہ، لاہور، ص ۳۷ تا ۴۴، اپریل
″ ″	اقبال اور ٹالسٹائی	امروز، ″ ″ ۵، ۲۱ ″
″	خواجہ حافظ اور اقبال میں نصب العین کی وحدت	ادبی دنیا، ″ ″ ۱۲۱ تا ۱۳۸، اقبال نمبر
عبد القادر، شیخ	رموز بیخودی	″ ″ ″ ۵۷ تا ۶۴، ″
عبد القوی دسنوی	علامہ اقبال بھوپال میں	مجلہ سیفیہ، بھوپال، ص ۲۰۷ تا ۲۲۰، ۶۲-۱۹۶۱ء

---

[1] تاریخی مجلس کی ایک تقریب میں شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان کی تقریر۔

عبدالقوی دسنوی	اقبال بھوپال میں	قومی زبان، کراچی، ص ۳۵ تا ۴۰، اپریل
عبداللہ، ڈاکٹر سید	حکیم الامت علامہ اقبال	جہاں نما، لاہور، " ۷ تا ۱۰، ۲۴ر "
" "	علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کے چند موقعے	ادبی دنیا " " ۲۴ تا ۴۸، اقبال نمبر ۷۷
عبداللہ قریشی، محمد	اقبال اکیڈیمی	" " " ۲۲۲، "
" "	اقبال اور انجمن کشمیری مسلمانان	" " " ۱۹۲، "
" "	اقبال اور طریقت	" " " ۲۴۹، "
" "	اقبال اور فوق	" " " ۲۳۳، "
" "	اقبال اور کشمیر	" " " ۲۱۱، "
" "	من باتوں میں موہ لیتا ہے	" " " ۲۵، "
" "	ہسپانیہ میں اقبال کے مشاہدات	" " " ۱۵، "
عبداللہ قریشی	حکمت رفاعی[1]	اقبال ریویو، کراچی، ص ۷۳ تا ۸۱، جنوری
علیم، سبط نبی	گراں بہا ہے ترا گریۂ سحرگاہی	امروز، لاہور، ص ۳، ۲۱ اپریل
فکری سلطان پوری	نقش غالب و اقبال	فروغ اردو، ص ، ص ۱۳ تا ۱۹، مئی
" "	" "	" " " ۲۵ تا ۳۰، جون
کرم حیدری	اقبال کا فلسفہ تعلیم	ادبی دنیا، لاہور، ص ۶۵ تا ۷۵، اقبال نمبر
کلیم اختر	اقبال کا نظریۂ تعلیم	قندیل، لاہور، ص ۷+۸، ۲۴ اپریل
کمال، عبدالعزیز	اقبال اور انتخاب زبان	ادبی دنیا، " " ۱۳۹ تا ۱۴۴، اقبال نمبر ۷۷
ماہر القادری	اقبال کا پیام	فاران، کراچی، " ۱۳ تا ۱۶، جون
"	کیا لوگ اقبال کو شاعر اسلام کہنا پسند نہیں کرتے	اخبار جہاں، کراچی، ص ۱۶، یکم مئی
محمد احسن علیگ	قلم روزگار فقیر	قندیل، لاہور، ص ۱۴، ۳ اپریل
محمد احمد	علامہ اقبال اور عملی سیاسیات	اخبار جہاں، کراچی، ص ۱۸ تا ۱۹، ۲۲ اپریل
محمد اسلم، تابش	اقبال کے متعلق میری یادیں	لاہور، لاہور، ص ۶ تا ۹، ۲۲ اپریل
محمد حسین، چودھری	اسرار خودی	ادبی دنیا " " ۴۹ تا ۵۴، اقبال نمبر ۷۷

---

[1] شیخ احمد کبیر رفاعی کو حضرت علامہ اقبال کا خراج عقیدت اور تعارف

رسرور ایم اے	اقبال کا نظریۂ خودی	قندیل، لاہور، ص ۶ + ۲۰، ۲۴ر اپریل
دعالم	اقبال کا نظریۂ فن	〃 〃 〃 ۵، ۲۴ر 〃
شتی خواجہ	بزم اقبال (مولوی احمد الدین اور علامہ اقبال کے تعلقات کی سرگزشت)	قومی زبان، کراچی، ص ۲۱ تا ۴۴، اپریل
〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃 ۵۹ تا ۶۸، مئی
〃	〃 〃	〃 〃 〃 〃 ۶۵ تا ۷۱، جون
رکمال	اقبال — صاحب حال و قال	قندیل، لاہور، ص ۱۷ - ۱۸، ۲۴ر اپریل
ر، ایس ایم	اقبال اور سوشلزم — جاوید اقبال سے ایک ملاقات	〃 〃 〃 ۱۲ تا ۱۳، ۲۴ر 〃
ر نصیر احمد	اقبال کا فلسفۂ غم دیگر	ادبی دنیا، 〃 〃 ۷۶ تا ۸۸، اقبال نمبر ۷۸ء
یب نیاز	علامہ اقبال	قومی تعلیم، کراچی، 〃 ۹۲ تا ۹۷،
ت قریشی	اقبال اور نظام پاکستان	ادبی دنیا، لاہور، ص ۱۹۵ تا ۲۱۰، اقبال نمبر ۷۸ء
〃	قصائد اقبال	〃 〃 〃 ۱۴۵ تا ۱۵۵، 〃
ف اللہ خاں	تکوین عالم کا مفہوم اور نظریہ حدوث عالم اقبال کی نظر میں	اردو ادب، علی گڑھ، ص ۵۳ تا ۶۴،
یم صدیقی	خودی در عصیاں	ادبی دنیا، لاہور، ص ۱۱۳ تا ۱۱۸، اقبال نمبر ۷۸ء
	سوشلزم اقبال کی نظر میں	سیارہ، لاہور، ص ۳۱ تا ۳۶، اپریل
〃	سوشلزم اور اقبال	آئین، 〃 〃 ۹ + ۱۵، ۱۴، ۱۸ر 〃
حسن، پروفیسر	اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ	ادبی دنیا، 〃 〃 ۵۵ تا ۵۶، اقبال نمبر ۷۸ء
شاد نوری	اقبال کی تاریخی عظمت	قومی زبان، کراچی، ص ۱۷ تا ۲۰، جون
یوزہ سدھری	اقبال کے اساتذہ کرام	قومی تعلیم، 〃 〃 ۶۴ تا ۷۵،
الرب بر	شکوہ اور جواب شکوہ	ادبی دنیا، لاہور، ص ۱۷۳ تا ۱۷۶، اقبال نمبر ۷۸ء
ار احمد رضوی	اقبال بحیثیت غزل گو	الشجاع، کراچی، ص ۵۲ تا ۵۳، اپریل
زدانی، خواجہ عبدالحمید	اقبال ایرانیوں کی نظر میں	ادبی دنیا، لاہور، ص ۱۷۷ تا ۱۹۵، اقبال نمبر ۷۸ء
وسف محمود	ذکر اس پری وش کا[1]	〃 〃 〃 ۲ تا ۸، اپریل مئی ۷۸ء
——	اقبال خدا کے حضور میں	امروز، 〃 〃 ۷، ۱۲ر اپریل

---

[1] انجمن اشاعت اردو میسور کے زیر اہتمام اقبال کی تصاویر، خطوط اور نوادر کی نمائش کی روداد

——	اقبال کا اصل کارنامہ (مذاکرہ) [1]	فنون، لاہور، ص ۱۲۸ تا ۱۳۴، جنوری فرد

آزاد، مولانا ابوالکلام

ابو سلمان شاہجہاں پوری	سرسید احمد خاں —— مولانا آزاد کی نظر میں	قومی زبان، کراچی، ص ۴۵ تا ۵۴، فروری
"	نقوشِ امام الہند (۲) خود نوشت وجرائد	اردو ادب، علی گڑھ، ص ۳۳ تا ۵۲،
اطہر، پروفیسر غلام حسین	غبارِ خاطر —— ایک مطالعہ	چٹان، لاہور، ص ۱۰ تا ۱۲، ۸ جنوری
آفاق حسین صدیقی	غبارِ خاطر اور آزاد	مجلہ سیفیہ، بھوپال، ص ۷۹ تا ۸۷، ۶۶-۶۷
سرور، پروفیسر آل احمد	اردو نثر میں مولانا آزاد کا اجتہاد	جامعہ، دہلی، ص ۱۹۸ تا ۲۰۴، اپریل
"	مولانا آزاد کی دسویں برسی	ہماری زبان، علی گڑھ، ص ۱ تا ۲، ۲۲ فروری
شعیب عمری، محمد	الہلال کے مقالاتِ افتتاحیہ پر تحقیقی نظر (۴) [2]	مدینہ، بجنور، ص ۳، ۹ مارچ
ضیاء الحسن فاروقی	افکارِ آزاد اور چند قومی مسائل (۲) [3]	جامعہ، دہلی، ص ۲۸۷ تا ۳۰۴، جون
"	مولانا ابوالکلام آزاد (شذرات)	" " ص ۱۱۵ تا ۱۱۸، مارچ
طیب انصاری	مولانا ابوالکلام کے بارے میں	ہماری زبان، علی گڑھ، ص ۸، ۲۲ اپریل
عبدالغفار خاں، خان کے بی نارنگ (مترجم)	مولانا آزاد نے مجھے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لیے کہا تھا	مدینہ، بجنور، ص ۳، ۲۸ مئی
عبداللطیف اعظمی	مولانا آزاد کی دسویں برسی	جامعہ، دہلی، ص ۱۵۶ تا ۱۶۴، مارچ
غلام السیدین، پروفیسر خواجہ	مولانا آزاد بحیثیت انسان	" " ص ۲۰۹ تا ۲۱۷، اپریل
قیصر سرمست	مولانا ابوالکلام آزاد	شاخسار، پٹنہ، ص ۲۳ تا ۳۰، نمبر ۱، ۲
کرپلانی، آچاریہ جے بی	مولانا آزاد	آج کل، دہلی، ص ۳ تا ۵، فروری
مالک رام	مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات	جامعہ، " ، ص ۱۴۲ تا ۱۵۵، مارچ
محمد علی کاظمی، سید	جمال الدین، ابوالکلام آزاد، اقبال اور قاضی عبدالغفار	ہماری زبان، علی گڑھ، ص ۵ تا ۶، ۲۲ اپریل

---

[1] اس بحث میں صفی الدین صدیقی، وارث میر اور شمیم احمد صاحبان نے حصہ لیا۔

[2] اس مضمون کی ابتدائی تین قسطیں اس سے قبل کے شماروں میں یعنی ۲۰، ۲۸ فروری اور ۵ مارچ کو شائع ہو چکی ہیں۔

[3] اپریل ۱۹۶۸ء میں مولانا آزاد سیمینار منعقدہ دہلی میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔

ماہنامہ قومی زبان کراچی

جنوری ۱۹۶۹ء

JAMIA LIBRARY
JAMIA ISLAMIA

شمارہ ۱ جلد ۳۴

اس شمارے کے لکھنے والے

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
ریندر پرشاد سکسینہ
محمد ایوب قادری
لطف اللہ بدوی
سخاوت مرزا
ملک احمد نواز
شمیم احمد
ناظر انصاری جلگانوی
ابوسلمان شاہجہان پوری
فریدہ نقوی

قیمت فی پرچا	ایک روپیا
قیمت سالانہ	دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو [illegible]، کراچی ۱

فہرست

جنوری ۱۹۶۹ء

آج کچھ درد ...	شمیم احمد	۳
مفتی انتظام اللہ شہابی	محمد ایوب قادری	۷
غزال و غزل	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۳
خطبات گارساں دتاسی پر ایک نظر	ملک احمد نواز	۱۷
دیوان بیدل اردو	لطف اللہ بدوی	۲۵
راز یزدانی	ویریندر پرشاد سکسینہ	۳۷
شوق قدوائی (۳)	فریدہ نقوی	۴۱
ملک الشعرا غواصی کا نام	سخاوت مرزا	۴۷
شاعر بزم دلبراں، مجاز	ناظر انصاری جلگانوی	۵۱
مراسلات		۷۷
گردوپیش		۷۹
نئے خزانے	ابوسلمان شاہجہانپوری	۸۹

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
مشفق خواجہ

انجمن ترقی اردو نے انجمن پریس سے چھپوا کر شائع کیا

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

شمیم احمد

ہمارے ملک میں یہ دستور ہو گیا ہے کہ چھوٹے بڑے مسائل پر وقتی ہڑبونگ تو بہت مچایا جاتا ہے مگر اکثر ایسے واقعات اور مسائل سے آنکھیں چرائی جاتی ہیں جنکا تعلق تصورِ پاکستان کے بنیادی مقاصد سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے اس وطیرہ میں ہماری اجتماعی جدید نفسیات کا بھی ہاتھ ہو کیونکہ بہر حال ہم اپنے ماحول سے جدا نہیں ہیں۔ لیکن اس کا ذرا سا تجزیہ کیا جائے تو اس کے پیچھے ہماری اجتماعی بے حسی، سرد مہری اور سہل انگاری کا ہاتھ سب سے زیادہ نظر آئیگا۔ ماحول کی شکایت تمام تر اس لئے نہیں کی جا سکتی کہ ماحول بھی ہمارا پیدا کیا ہوا ہے۔ ہم اگر سنجیدگی سے اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل پر توجہ کرتے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بھی ہمیں ہوتی تو ہمارا ماحول بھی ایسا مایوس کن نہ ہوتا جتنا اب نظر آ رہا ہے۔ دنیا میں شاید انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اپنے عمل کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتی۔ حد یہ ہے کہ عمل ہی کی نہیں بلکہ بے عملی کی ذمہ داری بھی ہے۔

پاکستان کے قیام سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کے پاس دنیا کی تمام بڑی تحریکات اور مذاہب کی طرح چند ایسے مقاصد اور تصورات تھے۔ جن کے بغیر وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ تحریک پاکستان کے بھی تین نکات تھے۔ پاکستان۔ اسلام۔ اُردو۔ اور یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے اتنی پیوست تھیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خیر یہ باتیں تو پرانی ہیں۔ یہاں تو اب کچھ یہ حال ہے ؎

ہوس ہے اہلِ زمانہ کو ورنہ یاں تو میاں !   سُنے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں !!

پاکستان کے دانشور کہتے ہیں کہ تحریک پاکستان ایک سیاسی اور وقتی تحریک تھی۔ جو تاریخ کا ایک ورق بن گئی۔ اور بس۔ اب آگے چلئے۔ اس کا مقصد پاکستان کا قیام تھا۔ جو عمل میں آگیا۔ اب اس کو ان باتوں سے اُلجھانا ایک ناعاقبت اندیشی ہے۔ مگر ہم نے تو دنیا کی تمام تحریکات، مذاہب اور انقلابی ادوار کے مطالعہ سے اتنا معلوم کیا تھا کہ ان تمام تحریکات کی کامیابی دراصل اُن مقاصد، نصب العین اور تصورات کی کامیابی تھی۔ جس کو سامنے رکھ کر کوئی تحریک شروع کی گئی تھی اور مقبول ہوئی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ ہمیں یہ سبق بھی پڑھایا گیا تھا کہ کسی تحریک کے بنیادی مقاصد ہی آگے چل کر معاشرے کی زندہ اقدار تعمیر کرتے ہیں مگر ہمارے دانشور اور اربابِ حل و عقد کہتے ہیں کہ تحریک پاکستان ایک سٹنٹ تھی۔ خیر بات عملی اور بے عملی کی ہو رہی تھی اور اس سے پہلے کہ میں آپ کو "کرتے کی بدیا" کے معنی سمجھاؤں۔ اپنے قوم کی بے حسی اور سرد مہری کا ایک واقعہ سنا دوں

پاکستان میں ایک ایسا فعال اور زندہ گوشہ بھی موجود ہے جہاں اب بھی تحریک پاکستان کے مقاصد اسٹنٹ بازی، یا وقتی اور سیاسی مصلحت نہیں سمجھے جاتے ۔ لیکن میں اس عظیم کارنامہ سے زیادہ اس بات کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں کہ اس واقعہ پر پاکستان کے کسی حلقے، سطح، طبقہ اور گروہ کی طرف سے کوئی ردّ عمل نہیں ہوا حتیٰ کہ کسی روز نامہ نے اسے اپنے ادارتی کالم میں بھی جگہ نہ دی اور نہ صحافت اور ادب کے نمائندوں نے اسے درخور اعتنا سمجھا ۔ اس بات پر غیر معمولی بے اعتنائی کا مظاہرہ کس چیز کی نشان دہی کر رہا ہے ۔ اسے آپ اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ خدانخواستہ کسی بہت بڑے نقصان سے نہ دوچار ہو جائیں ۔ مٹنے والے معاشروں نے اپنے زوال کا آغاز اسی بے حسی سے کیا تھا لیکن نہیں شاید بات اردو کی ہے ۔ اس لئے یہ بے اعتنائی ہے ـــ مگر اردو تو تحریک پاکستان کے تین بڑے مقاصد میں ایک تھی ۔

مجھے یہاں قومی زبان کے لئے حاصل کردہ وہ تمام انٹرویو یاد آ رہے ہیں ۔ جو میں نے ملک کے ممتاز اہل فکر، ماہرین تعلیم اور سائنسدانوں سے لئے ہیں ـــ جن میں ایک ہی بات مشترک ہے کہ اردو کے مسئلہ کو ابتدا ہی سے منفی طریقہ پر اٹھایا گیا تھا اور ایک نہایت صاف، سیدھے اور واضح مسئلہ کو دوسرے سیاسی معاملات اور عصبیتوں کے حصول کے لئے استعمال کیا گیا ہے خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے لیکن واقعہ یوں ہے کہ پاکستان کے ایک بہت ہی مختصر اور چھوٹے سے گوشے میں تحریک پاکستان کا آدرش زندہ ہے ۔ اور وہاں پاکستان کی نئی اقدار کی تشکیل کا آغاز ہو چکا ہے ۔

اس بات پر شاید پاکستان کے غالب علاقوں کے ارباب حل و عقد طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہیں گے ۔ "جو چیز ناقابل عمل" ہو وہ "عمل" میں کیسے آ سکتی ہے ۔ جناب "کہنے" اور "کرنے" میں بہت فاصلہ حائل ہے ـــ لیکن نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ جس کام کو آزاد کشمیر میں جتنی آسانی سے اختیار کیا گیا ہے وہ "محض" کاغذی" نہیں ہے ۔ عمل کی اس ذمہ داری کا جلوہ دکھانے سے پہلے آپ کو یہ بھی معلوم ہو کر حیرت ہو گی کہ حکومت آزاد کشمیر نے یہ تاریخی کارنامہ انجمن ترقی اردو مظفر آباد کی استدعا پر کیا ہے ۔ یعنی وہاں انجمن ترقی اردو کے بھی ایک معنی ہیں ۔ انجمن ترقی اردو مظفر آباد کی جانب سے ۱۷ جولائی ۱۹۶۶ء کو ایک یادداشت صدر و معتمد اعلیٰ آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کو پیش کی گئی جس میں استدعا کی گئی تھی ۔

> "اب یہ بے حد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زبان اردو کی حیثیت کو بلا تاخیر آزاد کشمیر کے سرکاری دفاتر میں تسلیم کر لیا جائے ۔ اگر ڈوگرہ حکومت کے دوران، ریاست کے محکمۂ جنگلات، محکمۂ انصاف، محکمۂ مال، محکمۂ کسٹم، محکمۂ پولیس اور محکمۂ امداد باہمی وغیرہ کئی سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں اردو کام دے سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ آزاد کشمیر کے سرکاری دفاتر میں سود مند نہ ہو سکے ۔"

اس بیان کو پڑھ کر بے ساختہ یاد آیا کہ حکومت برطانیہ نے ایک بار اردو کو پورے ہندوستان میں رائج کرنے کا فیصلہ کر دیا تھا ۔ مگر بعد میں حکومت کی نئی مصلحتوں اور میکالے کی تعلیمی پالیسی کے پیش نظر اس فیصلے کو واپس لے لیا گیا ـــ مگر پاکستان کے ارباب حل و عقد کی سمجھ میں یہ بات مشکل سے آئے گی اور وہ انتظامی امور کی دشواریوں کا حوالہ دے کر اس ناممکن العمل بتائیں گے ۔ حکومت آزاد کشمیر کو بھی یہی دشواریاں پیش آئی ہوں گی ۔ مگر میں نے اوپر یہ کہا ہے کہ ساری بات کرنے کی نیت کی ہے ۔ انجمن ترقی اردو کی یادداشت پر دفتر معتمد اعلیٰ سے ۴ اپریل ۱۹۶۷ء کو یہ حکم جاری ہوا ۔

> "آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر نے آزاد کشمیر میں انگریزی کی جگہ اردو کو دفتری زبان قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے ۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل ہدایت جاری کی جاتی ہے ۔"

" حکم نمبری ۱۷۳ - ۶۷/پی - اے/۶۷ مجریہ ۴ر اپریل ۱۹۶۷ء آزاد حکومت ریاست کشمیر نے مندرجہ ذیل فیصلہ جات کئے ہیں۔ جن پر فوری طور پر عمل کیا جاوے۔

۱۔ انگریزی میں چھپے ہوئے موجودہ رجسٹروں اور نقشہ جات وجدول میں تمام اندراجات اردو میں کئے جاویں اور آئندہ رجسٹر اور نقشہ جات انگریزی کے بجائے اردو میں چھپوائے جاویں۔

۲۔ تمام اشتہارات اور خبرنامے اردو میں لکھے اور جاری کئے جائیں۔

۳۔ تمام سرکاری شعبوں کو شناختی تختیاں اور جملہ حکام کے نام تختیاں جو اس وقت انگریزی میں ہیں۔ اردو میں بدل دی جاویں۔ اور آئندہ ہمچو قسم کی تمام تختیاں اردو میں لکھوائی جاویں۔

۴۔ ہر قسم کی سرکاری خط وکتابت پر اُردو میں دستخط کئے جاویں۔

۵۔ تمام تجارتی اداروں سے خواہ وہ شراکتی ادارے ہوں محدود یا غیر محدود ذمہ داری کی کمپنیاں ہوں یا انفرادی ادارے ہوں تمام خط وکتابت اردو میں کی جاوے اور مالکان کو پابند کیا جاوے کہ وہ اپنے اداروں کے نام اردو میں رکھیں اور ان کی رجسٹریشن صرف اُردو میں کی جاوے۔

۶۔ تمام سرکاری گاڑیوں کی نمبر تختیاں اُردو الفاظ و ہندسوں میں لکھوائی جاویں اور آئندہ سرکاری گاڑیوں کی کتاب معائنہ اُردو میں لکھی جاویں اور آئندہ گاڑیوں کی رجسٹریشن کرنے والے احکام سرکاری و غیر سرکاری گاڑیوں کو رجسٹریشن نمبر اُردو میں بھی دیا کریں۔"

جن دقتوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور اُن پر حقیقت پسندی سے سوچنے کی دعوت دی جاتی ہے ان کے بارے میں آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر نے کیا موقف اختیار کیا ہے اور وہ ۴ر مئی ۱۹۶۵ء کے حکم نامہ کے مطابق ایک حقیقت پسندانہ اقدام کیسے بنتا ہے اسے یہاں ملاحظہ کیجئے۔

"۱۔ آئندہ انگریزی مختصر نویس کی آسامی پر کوئی بھرتی نہ کی جائے اور ایسی تمام آسامیوں کو خالی رکھا جائے۔

۲۔ انگریزی مختصر نویس اور موجودہ سٹینو ٹائپسٹ جس دفتر میں ہوں اُردو کی مختصر نویسی کا کورس کرنے کے تیار رہیں۔

۳۔ ہر دفتر میں کم ازکم دو کلرک اُردو ٹائپ مشین کے حصول کے بعد اُردو ٹائپ کی مشق کرنے کے ذمہ دار ہوں گے

۴۔ تمام معتمدان اور سربراہان محکمہ جات سے گزارش ہے کہ وہ ان ہدایات کی روشنی میں اپنے ماتحت عملے کو احکام جاری کریں۔"

لیکن وہ بے عملی یا قول وفعل کا تضاد جو ہمارا خاصہ بن چکا ہے۔ شاید اس نئے نظام عمل کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ مگر عمل کی ذمہ داری کا احساس درس ہر اس جگہ اس کمزوری کو دریافت کرلیتا ہے جہاں وہ بے عملی کی صورت میں نظر آتا ہے۔

مورخہ ۲۰ر جون ۱۹۶۷ء کو شعبۂ انتظامیہ کی جانب سے یہ مراسلہ حکومت کے فرائض منصبی کا آئینہ دار بن کر سامنے آتا ہے۔

" زیر دستخطی کے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ بعض معتمدان حکومت و سربراہان محکمہ جات اُردو میں خط وکتابت کے حکومتی فیصلے پر پوری طرح عملدرآمد نہیں کرتے ہیں اور بدستور انگریزی زبان استعمال کر

محکمہ جات کو بالخصوص اور تمام معتمدان حکومت و سربراہان محکمہ جات کو بالعموم آگاہ کیا جاتا ہے کہ حکومت اس خلاف ورزی کا سختی سے نوٹس لے رہی ہے اور اگر اسے دوبارہ دہرایا گیا تو متعلقہ افسران کے خلاف تحت ضابطہ کارروائی کی جائیگی۔"

کرتے کی بدّیا کا عمل آپ نے دیکھ لیا۔ اب صرف اتنی بات رہ جاتی ہے کہ ایک "محدود علاقہ" اور ایک "چھوٹی سی حکومت" کے ان بڑے فیصلوں اور عظیم عملی ذمہ داریوں کو ایک بڑی مملکت کیسے اپنے لئے ایک نمونہ بنائے۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اس انداز فکر سے حکومت تو چھوڑ دیجئے ایک گھر میں بھی کوئی انتظام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر ذمہ داری، حقیقت پسندی، حب وطن، آدرش پرستی، قومی خودداری اور کسی قوم کے مستقبل کی کامیابی کے کوئی معنی ہیں تو دنیا کی بڑی سی بڑی قوم اور بڑے سے بڑے خطے میں بھی قومی آرزوؤں اور خواہشوں کی افادیت کے پیش نظر سب کچھ ممکن ہے۔ کیا ہم حکومت آزاد کشمیر اور انجمن ترقی اردو مظفر آباد سے وہ سبق نہیں لے سکتے جو چیونٹی سے تیمور جیسے صاحب قران نے حاصل کیا تھا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی !
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اردو تھیٹر

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

ڈاکٹر نامی نے اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ مرتب کی ہے جس میں ڈراموں، ڈراما نگاروں اور ڈراما کمپنیوں وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ یہ کتاب دراصل اردو ڈرامے کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے تین چھپ چکی ہیں اور چوتھی زیر طبع ہے۔

قیمت فی جلد سات روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

مفتی انتظام اللہ شہابی

محمد ایوب قادری

پڑھنے لکھنے کے اعتبار سے جب میں نے ہوش سنبھالا تو "حیات خواجہ ، تذکرہ صابر اور فاطمہ کا لال" وغیرہ کتابیں میرے گھر کے ذخیرۂ کتب میں نظر سے گزریں جن پر بحیثیت مصنف "مفتی انتظام اللہ شہابی" کا نام درج تھا مگر ان کتابوں کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوئی جب مفتی صاحب کی کتاب "معلومات قرآن" پڑھی تو اس کتاب کے مولف کا ایک نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران میں ان کی کتابیں مولانا فضل حق خیرآبادی و عبدالحق خیرآبادی (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)، غدر کے چند علما، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما اور علمائے حق کی مظلومیت کی داستانیں وغیرہ دیکھیں تو مفتی صاحب سے غائبانہ عقیدت ہوگئی کہ یہ شخص کیا خوب صاحب قلم ہے کہ غازیوں اور مجاہدوں کی داستان کو روشناس عوام و خواص کر رہا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد جنوری سنہ ۱۹۵۱ء سے میرا قیام عثمانیہ کالونی سے متصل وحید آباد (کراچی) میں ہوا۔ کبھی کبھی عثمانیہ کالونی (رحمانی کوارٹرس) سے گزرتا تو دیکھتا کہ ایک بزرگ ایک بچے کو کندھے پر ڈالے گھوم رہے ہیں، لباس و وضع سے بھی بے پروا اور آزاد معلوم ہوتے ہیں، میں کبھی کبھی ان صاحب کو سلام کر لیتا۔ اسی زمانے میں ایک روز میں سید الطاف علی بریلوی مصنف "حیات حافظ رحمت خاں" و "مدیر العلم" سے ملنے ان کے دفتر واقع سندھ مدرسہ پہنچا۔ میں نے انھی بزرگوار کو ایک میز پر کتابوں کے مطالعے میں غرق پایا۔ بعد میں بریلوی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ صاحب ملک کے نامور مصنف اور اہل قلم مفتی انتظام اللہ شہابی ہیں۔

اس کے بعد مفتی صاحب سے علیک سلیک کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اکثر بریلوی صاحب کے ہاں ملاقات ہوتی۔ اس دوران میں ان کی ملازمت کا تعلق قاموس الکتب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو سے ہو گیا (سنہ ۱۹۵۳ء تا سنہ ۱۹۵۹ء) اکثر اردو کالج اور انجمن میں ملاقات ہوتی، کتابوں کا تبادلہ اور علمی مذاکرات رہتے۔

جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء کی صد سالہ برسی کے موقع پر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء کی مکمل و جامع تاریخ چار جلدوں میں مرتب کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ راقم الحروف ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کی تحریک پر آٹھ سال کی گورنمنٹ ملازمت (محکمہ رسد و ترقیات، وزارت صنعت) چھوڑ کر سوسائٹی سے منسلک ہو گیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر معین الحق صاحب کے ہاں مفتی صاحب کی آرجار بہت بڑھ گئی اور سنہ ۱۹۵۹ء میں

تو وہ سوسائٹی میں ملازم ہی ہو گئے لہٰذا اب ان سے رفاقت و معیت کا تعلق ہو گیا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی ۱۸۹۲ء میں آگرے میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولوی اکرام اللہ (ف ۱۹۰۴ء) مختاری کا مشغلہ رکھتے تھے کچھ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا۔ مفتی صاحب کا خاندان اودھ کے مشہور قصبہ گوپامئو (ضلع سیتاپور) کا رہنے والا تھا ان کے دادا انعام اللہ صاحب بسلسلہ روزگار آگرے آئے تھے مفتی صاحب اکثر اپنے نام کے ساتھ "گوپاموی ثم اکبرآبادی" لکھا کرتے تھے۔

مفتی صاحب نے مروجہ طریقے پر عربی فارسی کی تحصیل کی، مفتی محمد رمضان مولوی سعادت اللہ بنی اسرائیلی سنبھلی (ف ۱۷ نومبر ۱۹۱۷ء) اور مولوی عبدالغنی ساکن قائم گنج ان کے اساتذہ میں تھے، مفتی صاحب کی تعلیم متوسطات سے آگے نہ بڑھ سکی قدیم طریقہ تعلیم اور وہ بھی نجی طور پر غرض مفتی صاحب کماحقہ مستفید نہ ہو سکے مگر یہ حقیقت ہے کہ مفتی صاحب علمی ذوق، مبدائے فیاض سے لے کر آئے تھے ان کی تعلیم کی کمی کو بڑی حد تک ان کی کتب بینی اور مطالعے نے پورا کر دیا۔ کچھ دنوں سرویر کا کام سیکھا اور کلابھون بڑودہ سے ۱۹۰۹ء میں سروے کا سرٹیفکٹ حاصل کیا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی کے بہنوئی منشی ارشاد حسین ابن ولایت علی مرادآبادی اچھے کھاتے پیتے شخص تھے، ان کا ہاتھی اور شیر وغیرہ کی تجارت کا مشغلہ تھا وہ یہ جانور روسا، امرا اور عجائب گھروں کو فراہم کرتے تھے، وہ بھی اپنے بہنوئی کے اس کاروبار سے وابستہ ہو گئے اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۵ء تک مفتی صاحب کا یہ مشغلہ رہا۔ اس سلسلے میں وہ تقریباً تمام شمالی ہند اور رجواڑوں میں گھومے پھرے۔ چونکہ علمی ذوق طبیعت میں رچا بسا تھا لہٰذا جہاں جاتے وہاں کے علما، مشائخ اکابر اور مشاہیر سے ملتے، کتب خانے اور آثار قدیمہ دیکھتے اور اپنے ذوق کی تسکین کرتے،

مفتی صاحب ایک ثقافتی اور مجلسی انسان تھے، ان کی طبیعت و مزاج کی تعمیر میں اس پیشے اور سیاحت کو بڑا دخل تھا۔ وہ مختلف دیار و امصار میں گھومے پھرے، ہر مجلس اور سوسائٹی کو دیکھا، سفر اور تجربے نے ان کو "مرد جہاندیدہ" بنا دیا تھا وہ لوگوں سے نباہنا خوب جانتے تھے اور پھر مختلف و متضاد ماحول میں نباہتے تھے، مشرقی تہذیب کا نمونہ اور وضعداری کے پابند تھے۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۹ء تک مفتی صاحب دہلی کے ایک اشاعتی ادارے "نیا کتاب گھر" سے وابستہ رہے ایک سو پچیس روپے مشاہرہ ملتا تھا، اس ادارے سے ان کی کئی کتابیں، نظیر اور ان کے معاصر، بیگمات اودھ کے خطوط، غدر کے چند علما، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، اسلامی معاشرت، احکام القرآن، لطائف الشعرا، صنادید ہند، علمائے حق کی مظلومیت کی داستانیں، سلطان رضیہ، تاریخ خاندان مغلیہ اور آتش بے دود وغیرہ شائع ہوئیں۔

مفتی صاحب کچھ وقت ندوۃ المصنفین (دہلی) کو بھی دیتے تھے پچاس روپے ماہوار معاوضہ ملتا تھا چنانچہ اس ادارے کے لیے سلاطین ہند (دو حصے) اور تاریخ ملت (آٹھ جلد) لکھیں۔ ندوۃ المصنفین کے ارباب حل و عقد مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمان اور دوسرے اکابر مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولوی محمد میاں، مولانا امداد صابری، مولوی عبدالرؤف بانی نذیریہ لائبریری (نبیرہ شیخ الکل شمس العلما میاں نذیر حسین سرگروہ اہل حدیث) عزیز حسن بقائی ایڈیٹر "پیشوا" کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور ملنا جلنا رہتا تھا۔ جب مفتی صاحب موڈ میں ہوتے تو ان حضرات کے اکثر واقعات مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں انجمن اسلامیہ (آگرہ) کی بیس ہزار روپے کی رقم خطیر مولوی ریاض الدین سکریٹری جناح کالج اپنے اور مفتی صاحب کے دستخط سے برآمد کر کے کراچی لے آئے۔ حکومت اس "جرم" میں مفتی صاحب کو ماخوذ کرنا چاہتی تھی کہ وہ سن گن لگتے ہی فوراً راہی پاکستان ہوئے اور ٹنڈو آدم میں قیام کیا۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں کراچی پہنچے۔ مفتی صاحبؒ صاحب قلم تھے۔ مختلف اشخاص اور اداروں سے رجوع کیا مگر کوئی مستقل تعلق پیدا نہ ہو سکا۔ وقت گزرنے اور حالات سدھرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ادارے، انجمن اسلامیہ، ایجوکیشنل کانفرنس، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور جناح کالج وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ اور اب مفتی صاحب اور یہ ادارے لازم و ملزوم تھے۔

مفتی صاحب کی "زندگی" "ادارہ و قلم" سے عبارت تھی وہ درحقیقت "انجمن ساز" اور "ادارہ باز" شخص تھے، تقسیم سے قبل ہندوستان میں مختلف اداروں اور تحریکات سے وابستہ رہے۔ کانگریس، خلافت کمیٹی، مسلم لیگ، امن سبھا، وار فنڈ کمیٹی حد یہ ہے کہ فری میسن سوسائٹی میں بھی شریک ہوئے۔ اسی طرح پاکستان آنے کے بعد مختلف اداروں اور انجمنوں سے منسلک رہے۔ ان ہنگاموں پر موقوف تھی ان کی زندگی، وہ نہایت مرنجان و مرنج اور باغ و بہار شخصیت تھے۔

مفتی صاحب جب موج میں ہوتے تو اپنے لئے "یار خاں" کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "یار خاں" کے بغیر کوئی "ادارہ" ادارہ نہیں اور کوئی انجمن، انجمن نہیں، چاہے انھیں صدر بنایئے یا سکریٹری، چاہے خازن یا عام ممبر، یہ ارباب حل و عقد بلکہ "رب انجمن" پر منحصر تھا کہ مفتی صاحب کو کونسا عہدہ دیا جائے، وہ ہر ایک میں راضی، بڑے بڑے کائیاں لوگ مفتی صاحب کا اشتراک ضروری سمجھتے تھے، بڑی صفت یہ تھی کہ وہ مخالف و متضاد ماحول میں مقبول و معزز، انجمن ترقی اردو، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن اسلامیہ، مفتی صاحب ہر ادارے سے منسلک اور ہر جگہ معتمد و محترم، ان کی نظر تنظیم و تعمیر پر رہتی تھی، بُرائی اور بدگوئی سے گریزاں اور اختلاف و انشقاق سے دور، جب دو دوستوں میں رنجش یا اختلاف ہو تو مفتی صاحب مصالحت کراتے، آڑے وقت میں مفتی صاحب کی بردباری و تحمل اور تدبیر و رائے کام آتی، پھر تواضع و انکسار کا یہ عالم کہ جلسے میں سب سے پیچھے کسی گوشے میں ٹکے ہوں گے، مگر نظر انتخاب کی رسائی کا یہ حال کہ اپنے مطلب اور گوں کے آدمی کو بھرے مجمع میں سے چھانٹ لیتے، غرض وہ بڑے باصلاحیت انسان تھے۔

مفتی صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق تھا، علمی ماحول اور علمی فضا میں آنکھیں کھولیں، گھر میں ایک اچھا کتب خانہ تھا۔ لہذا تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی سب سے پہلی کتاب سنہ ۱۹۱۴ء میں "داعی اسلام" چھپی، اور آخری کتاب "قافیہ سنجان اکبرآباد" تھی جو "انجمن اسلامیہ میگزین" ستمبر سنہ ۱۹۶۸ء میں مکمل ہوئی، چون سال تک ان کا قلم حرکت میں رہا۔ اور انھوں نے بہت کچھ لکھا وہ "بسیار نویس" اور "زود نویس" تھے۔ انھوں نے اپنی حالیہ تصنیف "مشاہیر اکبرآباد" میں اپنی ایک سو انتیس (۱۲۹) کتابوں کے نام لکھے ہیں اس میں بعض کتابیں کئی کئی حصوں میں ہیں، اور پھر بھی یہ فہرست نامکمل ہے۔ مفتی صاحب نے مذہب، تاریخ اسلام، تاریخ ہند و پاکستان، تحریک آزادی، تاریخ تعلیم و علما، ادب، سوانح اور کتابیات، غرض بہت سے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ وہ "جمع و تدوین" کا کام خوب کرتے تھے، ان کا وسعت مطالعہ اور قوت حافظہ ان کو خوب مدد دیتے تھے۔ اخذ و قبول روایات میں وہ بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے لہذا ان کے اکثر مندرجات جرح و تنقید کی زد میں آجاتے تھے مفتی صاحب ان باتوں کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے۔

جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء پر اردو میں بعض لوگوں نے کام کیا تھا مگر ان کی حیثیت انگریزوں کے مداحین سے زیادہ نہ تھی خواجہ حسن نظامی نے اس

مواد کو افسانوی رنگ میں پیش کیا مگر اس موضوع پر قومی تحریک کی حیثیت سے مفتی صاحب ہی نے قلم اٹھایا انھوں نے اس تحریک میں علمائے ہند و پاکستان کی شرکت کا سراغ لگایا اور تاریخی شواہد اور ہم عصر تحریرات کی روشنی میں ثابت کیا کہ اس تحریک کے قائدین میں مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی، عظیم اللہ شاہ مدراسی، عظیم اللہ خاں کانپوری، مولوی لیاقت علی الہ آبادی اور مولوی سرفراز علی گورکھپوری وغیرہم سر فہرست تھے اور اس تحریک میں مسلم زعماء، امرا اور عوام نے بھرپور حصہ لیا۔

مفتی صاحب کو آگرے اور اودھ سے خاص تعلق تھا، انھوں نے آگرے اور مشاہیر آگرہ پر کئی کتابیں لکھیں وہ اپنے کو سلسلۂ علمائے فرنگی محل اور مدرسۂ خیرآباد سے وابستہ سمجھتے تھے انھوں نے ان دونوں خانوادوں کے متعلق بھی لکھا ہے بلکہ مولانا فضل حق خیرآبادی کو نئی نسل سے متعارف کرانے میں مفتی صاحب کا خاصا حصہ ہے۔

مفتی صاحب کی کتابیات پر اچھی نظر تھی اور وہ اس فن کی تکنیک سے خوب واقف تھے۔ ان کا ذہن اور حافظہ خوب تھا۔ کتاب، مصنف اور موضوع ان کو ازبر تھے اگر ان سے ان کے کسی موضوع پر گفتگو کی جائے تو وہ پہلی ملاقات میں تو مخاطب پر ایسا چھا جاتے تھے کہ ان کا لوہا ماننا پڑتا تھا انگریزی کی بھی شدبد تھی کتب حوالہ جات سے کام نکال لیتے تھے۔ ابن خلکان (انگریزی)" مطبوعہ ہسٹاریکل سوسائٹی" کا انھوں نے انڈکس بنایا۔

مفتی صاحب کی کتابیں آئے دن بازار میں آتی رہتی تھیں ان کی کتابیں تبصرہ و تعارف سے مستغنی تھیں وہ کبھی تبصرے کے لئے کتاب نہیں بھیجتے تھے، اگر کوئی ان کی کتاب پر تنقید کرتا یا ان کے کسی بیان کی تردید کرتا تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے انھیں کیسا ہی بھرے پر چڑھایا جائے مگر وہ برف کی سل ہو جاتے تھے، کہا کرتے تھے "میاں! آگے بڑھو پیچھے مت دیکھو، ہم غلطی کرتے ہیں دوسرا صحیح کرے گا۔ کبھی نہ کسی عنوان سے "یار خاں" کا ذکر تو آرہا ہے" ایک واقعہ میرے ساتھ ہوا۔ مفتی صاحب کی کتاب "جغرافیہ قرآن" انجمن ترقی اُردو سے شائع ہوئی میں نے اس پر تنقیدی تبصرہ کر دیا۔ میں نے سوچا کہ وہ ناراض ہوں گے مگر ان کے طرز عمل میں کوئی فرق نہ آیا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ یہ تبصرہ ان کی نظر سے نہیں گزرا ہوگا مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تبصرہ دیکھ چکے ہیں اور ان کے طرز عمل کو حسب معمول مشفقانہ و محبت آمیز پایا تو مجھے حیرت بلکہ پشیمانی ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی کتابیں دینی بند کر دیں مگر اپنی تصانیف میں پیش لفظ یا دیباچے میں میرا ذکر ضرور کرتے رہے۔

ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو، مفتی صاحب ایک کتاب "آخری بزم" لکھ رہے تھے کسی واقعے کے متعلق کمزور یا مشکوک ماخذ کی بنا پر مدیر "قومی زبان" نے کہا کہ مفتی صاحب اگر آپ نے یہ واقعہ لکھا تو میں تنقید و تردید کروں گا۔ انھوں نے متبسم ہو کر فرمایا کہ میاں آپ کیا تردید کریں گے؟ کتاب چھپ کر آئی تو وہ واقعہ موجود، اور کتاب کے پیش لفظ میں مدیر "قومی زبان" کی اعانت اور مشورے کا بھی شکریہ ادا کیا گیا ہے ظاہر ہے مفتی صاحب کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے اور بگاڑ کی بجائے بناؤ کی بات کرتے تھے وہ جس سے ربط و تعلق بڑھاتے اس کو تصنیف و تالیف کا ضرور چسکا لگا دیتے تھے چاہے وہ رئیس ہو یا زمیندار، افسر ہو یا تاجر، میجر شمس الدین اور سید رضوان اللہ وغیرہ انھی وجوہ سے ان پر جان چھڑکتے تھے بہت سے مضامین اور کتابیں دوسروں کے نام سے لکھ دیں اور ان کو مضمون نگار اور مصنف بنا دیا۔ اس سلسلے میں وہ بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے۔

مفتی صاحب کے مزاج میں بڑی لچک تھی۔ ایک مرتبہ فضل الرحمان مرحوم سابق صدر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے کسی مقالے کی ترتیب کے سلسلے میں

ان سے واقدی کے حالات لکھنے کے لئے فرمایا انھوں نے خاصا مواد واقدی کے مناقب میں جمع کر دیا۔ جب فضل الرحمان نے اس کو دیکھا تو کہا کہ بھئی یہ کیا آپ اس کے ہر پہلو پر لکھئے کمزور پہلو کو کیوں چھوڑ دیا؟ چنانچہ اب مفتی صاحب نے واقدی کے کمزور پہلو پر لکھ ڈالا۔

جب ڈاکٹر معین الحق صاحب نے دائرۂ معین المعارف کے قیام کا ارادہ کیا تو مفتی صاحب نے اس ادارے کے قیام اور ترقی و بقا کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ دائرے کیلئے کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ ہونے کے باوجود مفتی صاحب کی کوششوں کی بنا پر دائرے کا کام رواں دواں چلتا رہا۔ دائرے کا سہ ماہی مجلہ تصاویر بھی نکلتا رہا اور کتابوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہ مایوس ہونا تو جانتے ہی نہ تھے کہیں نہ کہیں سے کوئی سبیل نکالتے ہی رہتے تھے۔

مفتی صاحب مختلف رسائل و اخبارات سے بھی وابستہ رہے۔ دربار اخبار (آگرہ)، اردوئے معلیٰ (دہلی)، پیام حق (کراچی)، ان کی ادارت میں نکلے۔ کچھ دن برہان (دہلی) سے بھی متعلق رہے۔ دس سال سے انجمن اسلامیہ میگزین کے مدیر تھے۔ جناح لٹریری اکیڈیمی ان کی بدولت زندہ تھی۔ چونکہ اکیڈیمی کا مستقل فنڈ یا گرانٹ وغیرہ نہ تھی اس لئے وہ متعدد کتابیں، انجمن اسلامیہ میگزین میں بالاقساط شائع کرتے رہتے تھے اس طرح اس اکیڈیمی سے مفتی صاحب کی ایک درجن سے زائد تصانیف (۱) نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت (۲) آخری بزم (۳) اسلامی نظام تعلیم کا چودہ سو سالہ مرقع (۴) مسلم فلاسفہ (۵) حیات خان آرزو (۶) چند مسلم سائنسداں۔ (۷) شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی اور ان کے علمی و سیاسی کارنامے (۸) شعرائے دربار رسالت (۹) مشاہیر اولیائے ہند و پاکستان (۱۰) مشاہیر اکبرآباد (۱۱) اسوۃ الرسول من القرآن (۱۲) حیات نظیر (۱۳) قافیہ سنجان اکبرآباد طبع و شائع ہوئیں۔

جب مفتی صاحب عثمانیہ کالونی میں رہتے تھے تو میرے ہاں ان کی اتنی آمد بھی نہ تھی مہینے دو مہینے میں آنا ہوتا تھا۔ جولائی ۱۹۶۶ء میں میں اپنے نو تعمیر شدہ مکان (نارتھ ناظم آباد) میں منتقل ہو گیا۔ اتفاق کی بات کہ سال بھر کے بعد جون ۱۹۶۷ء میں مفتی صاحب بھی نارتھ ناظم آباد ہی میں آگئے۔ ان کا مکان بھی اس بلاک میں تعمیر ہوا تھا۔ اب میرے ہاں مفتی صاحب کا آنا جانا دوسرے تیسرے دن ہو گیا۔ جمعے اور اتوار کا آنا تو لازمی تھا، آتے، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ مختلف اسکیمیں بنتیں، کتابوں اور مصنفوں کی باتیں ہوتیں اور خوب گھلتی۔

۱۲ر جون ۱۹۶۸ء کو میرے ہاں چند احباب مدعو تھے مفتی صاحب بھی تشریف لائے دو تین روز کے بعد معلوم ہوا کہ وہ علیل ہیں اور ان کو بخار آگیا ہے۔ میں خیریت طلبی کے لئے گیا تو پتا چلا کہ اس دن دوپہر کو دفتر (ہسٹاریکل سوسائٹی) میں بخار آگیا تھا اور وہاں سے رکشا میں آئے یہ ایسا بخار تھا کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ مختلف ڈاکٹروں اور اطبا کے زیر علاج رہے۔ ایک ڈیڑھ ہفتے سول اسپتال میں بھی رہے ۱۶ر اگست کو وہاں سے گھر آگئے۔ ۲۰ر اگست کو میں شان الحق صاحب کی معیت میں عیادت کے لئے گیا تو حسب معمول ڈرائنگ روم میں آکر ملاقات کی۔ اس کے بعد ایسے صاحب فراش ہوئے کہ پھر باہر نکلنا نصیب نہ ہوا اور نکلے تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نکلے مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے رفقا نے دوران علالت میں حق رفاقت پورا ادا کیا۔

۶ر ستمبر ۱۹۶۸ء کو میں عزیزی سید فرید الحق اور پروفیسر مرتضیٰ جعفری کے ہمراہ دیکھنے کے لئے گیا۔ آج حالت سخت مایوس کن تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اب "مجلس تصنیف و تالیف" درہم برہم ہوا چاہتی ہے اور مصنف کی کتاب حیات کا آخری ورق الٹا جا رہا ہے دوسرے دن مفتی صاحب کی بستر مرگ کی دو تصویریں لیں ۸ر ستمبر بروز اتوار ساڑھے چھ بجے شام مفتی صاحب کی کتاب حیات تمام ہوئی۔ اللّٰھم اغفر لہ۔

سہ ماہی اردو کراچی

اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۸ء کا شمارہ شائع ہو چکا ہے

فہرست مضامین

ہمارا جمالیاتی ورثہ۔ مصوری	عبداللہ چغتائی
قدیم گجراتی ادب	غلام حسین مصطفیٰ
بادۂ کہن	شاہ عالم آفتاب
میرا افسانہ	ملّا واحدی
واجد علی شاہ اختر	مرزا علی اظہر برلاس
اقبال کا تصورِ زمان و خودی	سید محمد تقی

مسلسل مضامین

قطعہ منتخب	تصنیف:-	عبدالغفور خان نساخ
	ترتیب:-	ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر
لغت کبیر		بابائے اردو

قیمت فی پرچا: تین روپے پچاس پیسے
سالانہ قیمت: بارہ روپے

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ کراچی ۱

غزال وغزل

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

غزل کی روایت اردو میں فارسی سے آئی اور آج تک اردو غزل میں فارسی غزل کی روایات کا عکس جھلکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو غزل گو شعرا کا اپنا غزل کا سرمایہ صرف اِنھی روایات پر مبنی ہے۔ حضرت امیر خسرو، سلطان محمد قلی قطب شاہ، وؔلی۔ حاؔتم، میرؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، غالؔب و مومنؔ، ظفرؔ، داؔغ اور امیرؔ، حاؔلی اور ان کے بعد اقبالؔ تک اردو غزل کا روپ اور رنگ ایک سا نہیں، نہ موضوعات کے اعتبار سے اور نہ اسالیب کے نقطہ نظر سے، بات صرف یہاں تک نہیں پہنچتی کہ ان اکابر غزل گو شعرا کا کلام اپنے منفرد لب و لہجہ کی بنا پر الگ پہچانا جا سکتا ہے یا ان کے کلام سے ان کے اپنے اپنے ماحول کی ترجمانی ہوتی ہے بلکہ غزل کی تاریخ جس میں یہ سنگِ میل ملتے ہیں غزل کے موضوع اور ہیئت کی ترقی کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ترقی کبھی خط مستقیم میں نہیں ہوتی اس میں نشیب و فراز بھی آتے ہیں۔ اس میں شعلوں کے ساتھ خس و خاشاک کے انبار بھی ملتے ہیں۔ جذبات اور احساسات کے ساتھ محض الفاظ کے تانے بانے کی مثالیں بھی ملتی ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی غزل اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے ایک مسلسل روایت کی نشان دہی کرتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ غزل کی یہ روایت کیا ہے اور کن عناصر سے اس کا خمیر اٹھا ہے کیا بہ حیثیت ایک صنف سخن غزل کا کوئی اپنا خاص مزاج ہے، کیا اس کا ایک مخصوص آہنگ ہے کیا اسکی اپنی زبان ہے، کیا اسکے اپنے استعارے، علائم اور اشارات ہیں یا صرف ہیئت کے اعتبار سے ایک خاص قسم کے کلام موزوں کو غزل کہہ سکتے ہیں اور غزل کی تاریخ کے مطالعے سے ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے۔ غزل صرف اپنی مخصوص ہیئت کے اعتبار ہی سے غزل نہیں ہوتی بلکہ اسکا مزاج، آہنگ، اسلوب، زبان، علامات اور اشارات اسے غزل بناتے ہیں۔ ہمارے ایک تذکرہ نگار نے سوؔدا کی غزل کے باب میں کیا پتے کی بات کہی تھی کہ "غزلش قصیدہ طور" تو گویا غزل کا ایک طور ہوتا ہے۔ جو اسے دیگر اصناف سے ممتاز اور ممیز کرتا ہے۔

اس وقت اس طور کی تفصیلات کی گنجائش نہیں، مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ غزل بنیادی طور پر جذبے کی شاعری ہے۔ جذبے کی شدت اور صداقت اس کی پہلی شرط ہے۔ ہونے کو جذبہ شاعر کا ذاتی اور انفرادی ہوتا ہے۔ لیکن غزل گو اسے آفاقی بنا دیتا ہے یہ آفاقیت دروں بینی، خلوص اور موثر انداز بیان سے پیدا ہوتی ہے۔ غزل گو کو قطرہ میں دجلہ اور جز میں کل نظر آئے تو پھر غزل غزل نہیں لڑکوں کا کھیل ہی رہ جاتا ہے۔ جو بیت بازی کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے غزل کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس طور میں جذبے کو سلیقے سے ادا کرنے کی بھی شرط ہے۔ غزل کا آبگینہ قصیدے کی زبان کی ٹھیس برداشت نہیں کر سکتا، متقدمین نے غزل کی تعریفوں میں ایک تعریف یہ بھی کی تھی کہ غزل محبوب سے کلام کرنے کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ بیان کی نرمی اور نزاکت اس کی لازمی شرط ہو گی جن غزل گو شعرا نے بیان کی اس لطافت و نزاکت کو رفعت بیان پر قربان کر دیا ان کی غزل پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گئی۔ سودا، آتش ناسخ، امیر کو ان کے معاصرین۔ میر، مصحفی، آتش اور داغ کے سامنے رکھیئے تو یہ بات واضح ہو جائے گی۔

غزل کا تعلق غزال سے اصلاً ہو یا نہ ہو یہ الگ بحث ہے لیکن غزل میں غزال کا حسن خرام اور اس کا جسمانی تناسب اس کی شوخی رفتار، اس کی اچپلاہٹ اس کی آنکھوں کا جادو ضرور پایا جاتا ہے۔ ہماری اصناف شاعری میں ایسی نازک کوئی اور صنف نہیں، اس کے مضامین اور اس کے آہنگ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ؎

آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔

اس اعتبار سے غزل بظاہر جس قدر آسان صنف ہے اسی قدر اچھی غزل کا لکھنا دشوار ہے۔ ایک غزل وہ بھی ہے۔ جس کے تیار کرنے کا نسخہ حالی نے اپنے مقدمے میں بتایا ہے کہ پہلے کوئی مصرع طرح لے لیا اور پھر قافیہ سامنے رکھ کر قوافی کی فہرست بنا لی پھر ایک ایک قافیہ لے کر ایک ایک مصرع موزوں کیا اور ہر مصرعے سے ایک مصرع اولیٰ چپکا دیا لیجئے غزل تیار ہو گئی۔ ممکن ہے ہر زمانے میں اسطرح غزل بنانے والے کاریگر موجود رہے ہوں اور آج بھی ہوں لیکن میر، مصحفی غالب، مومن اور اقبال کی غزل ایسے نہیں بنتی۔ اس کے لئے سوز دروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزاج میں غزل سے مناسبت اور رس اور رچاؤ کی ضرورت ہے۔ ایک آہنگ اور نغمگی کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھکر اُس اسلوب پر دسترس ضروری ہے جو غزل کا اسلوب ہے

ہمارے معاصر شعرا میں سراج الدین ظفر صاحب خاص غزل کے شاعر ہیں اور یہ بھی بڑی اہم بات ہے۔ اور غزل پر خاص طور سے حالی کی تنقید کے بعد ایک زمانہ بڑا سخت گزرا ہے کہ غزل گوئی اور رجعت پسندی گویا مترادف چیزیں بن گئی تھیں، پھر ترقی پسند اور جدید شاعری کا دور آیا تو غزل کے مقابلے کے لئے نظم جدید اور ہیئت کے بہت سے نئے سانچے استعمال ہوئے۔ لیکن اردو زبان کی طرح، اردو غزل بھی بڑی سخت جان ثابت ہوئی اور حسرت و اصغر، فانی اور جگر، عزیز اور اثر سے لیکر فراق اور ناصر کاظمی تک غزل کی یہ روایت نکھرتی ہی چلی گئی۔ یہ طوفانی دور گزر گیا اور ہیئت، اسلوب اور موضوعات کے نئے تجربے اپنی بہار دکھا کر رخصت بھی ہو گئے لیکن غزل آج بھی زندہ اور پائندہ ہے اور اس کا مستقبل مایوس کن نہیں ہے

سراج الدین ظفر صاحب کی غزل میں اردو کی تمام روایات کا حسن موجود ہے، مثلاً ان کی ایک غزل کے یہ چند اشعار سنئے۔

آؤ آغوشِ گل میں سو جائیں
صبح تک نوبہار ہو جائیں!
ہائے وہ لالہ رخ کہ بے موسم
دل میں تخمِ بہار بو جائیں
یہ ارادہ ہے اے سمن اندام
حل تری دلکشی میں ہو جائیں
کیا کرے گی نسیمِ صبح بھی یاد
اس میں خوشبو تری سمو جائیں
ختم ہوگا کہیں تو سیلِ بہار
آؤ ہم تم بھی ساتھ ہو جائیں
کیا سفینے کا بحرِ عشق میں کام
اسے ساحل یہ ہی ڈبو جائیں

ان اشعار میں آغوشِ گل، نوبہار، لالہ رخ، سمن اندام، نسیم صبح، خوشبو، سیل بہار، سفینہ، بحر عشق ساحل، ایسے الفاظ، تراکیب اور علامات ہیں جو اردو غزل کی زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ اور ان میں سے ہر لفظ اور ترکیب سامع اور قاری کے سامنے ایک پوری تصویر پیش کرتے ہیں۔ جس کا کینوس لا محدود ہے۔ ان کے مجموعہ غزال و غزل میں ایسی تصویریں بہت ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ ان کا مجموعی تاثر کیا ہوتا ہے۔ یک قدح بادہ و یک صحرا ہو۔ ہمہ اسباب و ہمہ اشیا ہو، ہر قدم دام فنا ہر جا ہو، عالم شوق ہے سرتاپا ہو، غنچہ ادراک طلسم لوح ابد، خزاں کا حجلۂ ویراں، کتاب نسخۂ شفا، فریب معنی و صورت، سیاست نگہِ چشمِ سرمہ سا، لب زمزمہ سرا، نقوش سحر و شام، نقطہ حسن سے ہے گردشِ پرکار نیاز، شوق سیاحی گیسو، خلوت بادہ، وظائف خلوت، سنبل کدۂ زلف، نوغنچگی غنچہ فروشاں، وغیرہ وغیرہ۔

ان تراکیب کا سلسلہ اردو غزل کی روایت سے ملتا ہے۔ لیکن مجموعے میں کوئی غزل پڑھیے جانے پہچانے الفاظ اور تراکیب میں بھی جو بات سب سے نمایاں ہوتی ہے وہ لب و لہجہ اور آہنگ کی انفرادیت ہے۔ بڑے فنکار کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنا کر پیش کرتا ہے اور سننے والے کو اس کی داستان اپنی ہی کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن اس آفاقیت میں فنکار کی عظیم شخصیت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سراج الدین ظفر صاحب کے کلام میں بھی سب سے نمایاں چیز ان کے لب و لہجہ کی یہی انفرادیت ہے۔ جس میں روایت کے ساتھ عصر حاضر کا شعور اور ان کے ذاتی تاثر کی بڑی اچھی الکہران ہے۔ ان کی فارسی تراکیب بلاشبہ ان کا سلسلہ اردو کے ان اکابر غزل گو شعرا سے ملاتی ہیں۔ جن کی ایک مثال غالب ہے لیکن غالب محض اپنی فارسی تراکیب کی وجہ سے غالب نہیں، ان کے لب و لہجہ کی انفرادیت ہی نے انھیں اردو غزل کی تاریخ میں ایک مقام عطا کیا ہے۔ اسی طرح ظفر کے ہاں صرف ان تراکیب کا کھیل نہیں۔ ان کے پس پردہ جو شخصیت ہے وہ ان کی اپنی ہے۔ کورانہ تقلید نے غالب کے بہت سے پرستاروں کے قدم ڈگمگا دیئے۔ ظفر کا ذہنی رشتہ غالب سے قائم ہے لیکن ان کے قدم ڈگمگاتے نہیں۔ ان کے ہاں ایک توازن نظر آتا ہے جو سلامتِ طبع اور سلامتی ذہن کی علامت ہے۔ روایت کا احترام ایک الگ چیز ہے اور بغاوت کا جذبہ الگ۔ ظفر کے ہاں پہلی چیز

موجود ہے۔ غزل دوسری چیز کی متحمل نہیں ہوتی اس لیے اس کی تلاش یہاں بےسود ہوگی۔

ظفرؔ نے اپنے شعری مجموعے کے تعارف میں اپنی زندگی اور شاعری کو ایک طوفان شوق کہا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ اس مجموعے کی غزلوں میں شوق اور ولولے کے بڑے حرکی مناظر ہیں۔ غزل کے بارے میں ایک عام تاثر یہ بھی ہے کہ اس میں حسرت و یاسؔ اور سوز و گداز کے مضامین کی کثرت ہوتی ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ بعض اکابر غزل گو شعرا مثلاً میرؔ، غالبؔ حسرتؔ اور فانیؔ کے ہاں زندگی نام ہے حسرت اور سوز و گداز کا ہے۔ لیکن اس سوز و گداز اور حسرت و ناکامی میں بھی زندگی کی عظمت اور زندگی کا ولولہ جھلکتا ہے۔ میرؔ کی شاعری کے تیور، غالبؔ کی خودنگری اور حسرتؔ کی عظمت بھی غزل ہی کے جوہر ہیں۔

ظفرؔ صاحب کے اس ولولہ شوق میں زندگی کی رعنائی بھی ہے اور اس کے طوفان بھی۔ یہ شوق کہیں شوق ناتمام ہے اور کہیں آسودہ لیکن جیساکہ انھوں نے خود فرمایا ہے اس شوق میں کہیں ٹھیراؤ نہیں ہے۔ ہر منزل کے بعد ایک نئی منزل آتی ہے۔ اقبالؔ کی ایک مشہور غزل ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں !

مراد ظفرؔ کا اقبال سے مقابلہ یا موازنہ نہیں۔ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ ظفرؔ نے اپنے منفرد انداز میں اسی سفر کا ایک اور طرح بیان کیا ہے۔

موسم گل ترے انعام ابھی باقی ہیں   شہر میں اور گل اندام ابھی باقی ہیں !
اور کھل جا کہ معارف کی گزرگاہوں میں   پیچ اے زلف سیہ فام ابھی باقی ہیں
اک سبو اور کہ لوح دل مے نوشاں پر   کچھ نقوش سحر و شام ابھی باقی ہیں !
ٹھیر اے باد سحر اک گل نورستہ کے نام   اور بھی شوق کے پیغام ابھی باقی ہیں
کم ہو کیا قدر غزالانِ برہمن کہ یہاں   ہم سے کچھ بندۂ اسلام ابھی باقی ہیں
کھول کر مصرعِ کاکل کی ہے لازم تشریح   اس نوشتے میں کچھ الہام ابھی باقی ہیں

اس منفرد انداز نے کلام ظفرؔ کو ایک تازگی اور جدت بخشی ہے۔ جس سے ان کی آواز صاف الگ پہچانی جاتی ہے آپ ظفرؔ کی شاعری اور فن کے بارے میں سن ہی چکے ہیں۔ یہ چند باتیں میں نے اس تقریب کے عنوان سے کہی ہیں۔ ویسے ظفرؔ صاحب کا کلام ایسا نہیں جس کے لئے تعارف کی ضرورت ہو، اچھا کلام خود اپنا سب سے بہتر تعارف ہوتا ہے اور بلاشبہ ظفرؔ صاحب کا کلام اسی قبیل کا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مجموعہ بڑے سلیقے سے شائع ہوا ہے۔ اردو کی عام تصانیف اکثر اس طرح شائع ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے کو ندامت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو آپ فخر سے کسی بھی ملک کی بہترین مطبوعات کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔

JAMIA LIBRARY
JAMIA MILLIA ISLAMIA.
DELHI.

خطبات گارساں دتاسی پر ایک نظر

ملک احمد نواز

گارسین دتاسی فرانس کی بندرگاہ مارسیل میں ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوا . . . . . عام تعلیم حاصل کرنے کے بعد پیرس پہنچا اور السنہ مشرقیہ کے پروفیسر سِلوسترد دی ساسی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوا اور عربی اور ترکی زبان کا مطالعہ شروع کیا . . . . مشرقی السنہ کے شوق ہی نے اسے اردو کی طرف متوجہ کیا۔ آخر اس میں اس نے ایسا کمال حاصل کیا کہ پیرس کے السنہ مشرقی کے کالج میں ہندوستانی زبان کی پروفیسری کی ایک جدید خدمت قائم کی گئی اور اس پر گارسین دتاسی کا تقرر کیا گیا۔

بہ حیثیت پروفیسر کے گارسین دتاسی کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ ہر سال کے آخر میں ایک لیکچر دیتا تھا جس میں وہ اس سال کے ادبی ارتقا پر تبصرہ کرتا تھا یعنی اس سال ہندوستانی اور ہندی میں کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں؟ کون کون سے نئے اخبار یا رسالے جاری ہوئے۔ کتنے جدید مطابع قائم ہوئے۔ کن کن مصنفین نے ادب میں اضافہ کیا۔ یہ تمام معلومات وہ مختلف ذرائع سے اور خصوصاً ہندوستان کے عہدے داروں کے توسط سے بذریعہ خط وکتابت برابر حاصل کرتا رہتا تھا۔ وہ صرف نام گنوانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ تبصرہ ایک طرح کی تنقیدی حیثیت بھی رکھتا ہے . . . . مختلف ادبی مباحث کے ضمن میں وہ بعض اوقات ملک کے سیاسی اور معاشرتی حالات کا تذکرہ بھی خاص انداز سے کر جاتا ہے . . . .

ان خطبوں کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسے اردو زبان سے دلی لگاؤ ہے۔ وہ اسے ہندوستان کی ترقی پذیر اور عام زبان خیال کرتا ہے اور ہر موقع پر ہندی کے مقابلے میں اس کی حمایت کرتا ہے اور اس کے فروغ اور ترقی کا دل سے خواہاں ہے۔

یہ خطبے ۳ر دسمبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوئے اور ۶ر دسمبر ۱۸۶۹ء تک باستثنا ۱۸۵۸ء کے جسے ۱۸۵۷ء کی شورش کا نتیجہ سمجھنا چاہیے برابر جاری رہے۔ یہ انیس سال کی مسلسل کاوش کا نتیجہ ہیں۔

گارسین دتاسی . . . [illegible]

وقع ہے کہ وہ ہماری زبان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا . . . . .

" ان خطبات میں جہاں جہاں فاضل مصنف سے کوئی لغزش یا فروگزاشت ہوگئی تھی اس کی تصحیح و تکمیل میں نے حاشیے میں کردی ہے . . . . . شیخ چاند صاحب نے متن کے بعض مقامات پر جو میری نظر سے رہ گئے تھے مفید حاشیوں کا . . . . اضافہ کیا ۔"

عبدالحق

ماخوذ مقدمہ "خطبات گارسیں دتاسی"۔ اردو ترجمہ ۔

لیکن اس کے باوجود بعض مقامات پر چند ایک فروگزاشتیں موجود ہیں ۔ ذیل میں ضروری تصحیحات کے ساتھ، ان کی نشان دہی کی گئی ہے ۔

منتخبات اردو

قولہ " . . . . ایک اور دوسری کتاب کے متعلق میں پچھلے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں ۔ ایچ اسٹورٹ ریڈ نے مجھے اس کا ایک نسخہ بھیجا ہے ۔ اس کتاب کا نام "منتخبات اردو" ہے یہ انتخاب کریم الدین نے کیا ہے ۔ موصوف وہی ہیں جنھوں نے میری کتاب "تاریخ ادب اردو" کا ترجمہ کیا ہے ۔ منتخبات اردو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے لکھی گئی ہے ۔ اس میں الف لیلہ میں سے سندباد جہازی کا دلچسپ قصہ بھی لیا گیا ہے ۔ اگرچہ الف لیلہ کے سب نسخوں میں یہ قصہ موجود نہیں ہے ۔ تحفہ اخوان الصفا کے بعض حصے بھی طبع ہوئے ہیں . . . . فرانس کے شاہ نامے کا اسی بحر میں اردو ترجمہ کیا گیا ہے اور اس ترجمے کے ۷۰ صفحے ہیں ۔ دردؔ کی غزلوں کے اقتباسات ہیں دردؔ اردو زبان کے بہترین شاعروں میں سے ہوا ہے ۔ گلستان اور اخلاقِ جلالی کے بھی اقتباسات ہیں ۔ ان کے علاوہ PAZ RU YIRH کی خود نوشت سوانح کے بعض حصے شائع ہوئے ہیں . . . "

(خطبات گارسیں دتاسی، ص ۲۲۳-۲۲۴)

موصوف نے "منتخبات اردو" کی جو کتابیاتی تفصیلات حاشیے (خطبات، ص ۲۲۳) پر دی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں ۔

" مطبوعہ لکھنؤ۔ ۱۸۶۱ء ۔ پہلی جلد میں ۱۶۲ صفحے ہیں اور ہر صفحے پر ۱۵ سطریں ہیں ۔ دوسرا حصہ مجھے اب تک نہیں ملا ۔"

" منتخبات اردو" مولوی کریم الدین کی تالیف نہیں بلکہ مولوی محمد کریم بخش کی تالیف ہے ۔ گارسیں دتاسی نے غلطی سے محمد کریم بخش کی بجائے اسے مولوی کریم الدین کی تالیف قرار دیا ہے اس غلطی کا اعادہ امداد صابری[1] اور شیخ محمد اسماعیل[2]

---

[1] امداد صابری ۔ "تاریخ صحافت اردو"۔ جلد اول ۔ ۱۹۵۳ء ۔ ص ۱۸۵

[2] شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۔ رسالہ "نقوش" (آپ بیتی نمبر) ۔ ص ۴۵۲ ۔ ۴۵۵

انی پتی نے بھی کیا ہے ۔ امداد صابری اپنی کتاب "تاریخ صحافت اردو" میں کریم الدین کی مصنفات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

غدر کے بعد مولوی کریم الدین صاحب آگرہ کالج میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے . . . . . اسی زمانے میں یعنی ۱۸۶۱ء میں دوسری کتاب "منتخبات اردو" کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے لکھی ۔"

اسی طرح شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں ۔

" ۱۸۴۷ء تک جو کتابیں مولوی کریم الدین نے لکھیں ان کا بیان انھوں نے خود کر دیا ہے ۔ اس کے بعد جو کتابیں الیف کیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں ۔ تاریخ آگرہ ، منتخبات اردو (نصاب کلکتہ یونیورسٹی) ، تسہیل القواعد ، نشاء اردو ، پند سود مند ، دیوانِ سعدی مع سوانح عمری ، انتخاب دیوان حافظ ، حذ ما صفا ، خط تقدیر اور مفتاح الارض ، واقعات ہند وغیرہ ۔"

"منتخباتِ اردو" کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے ۔ اس کے سرورق پر مؤلف کا نام مولوی کریم الدین کی بجائے مولوی کریم بخش مندرج ہے ۔ سرورق کی عبارت مندرجہ ذیل ہے ۔

منتخبات اردو
کلکتہ یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان کے واسطے کلکتہ یونیورسٹی
کے جناب وائس چانسلر صاحب بہادر اور صاحبان سنڈیکیٹ
کے ارشاد کے مطابق بہدایت اور اعانت جناب ہنری اسٹوارٹ
ریڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی کے مولوی
محمد کریم بخش میر منشی ۔

محکمۂ مذکور نے تالیف کی
مطبع منشی نول کشور مقام لکھنؤ واقع مکان مہاراجہ مانسنگہ میں چھپی

۱۸۶۱ء

پہلی مرتبہ ایک ہزار ۔ قیمت فی جلد ۲ عہ

کتاب کے مندرجات حسب ذیل ہیں ۔

۱ ۔ انتخاب الف لیلہ ۔ ص ۱ ۔ ۳۳

سندباد جہازی کا قصہ ۔ یہ اقتباس سندباد جہازی کے پہلے ، دوسرے اور تیسرے سفر پر مشتمل ہے ۔

۲ ۔ انتخاب اخوان الصفا ۔ ص ۳۴ ۔ ۵۰

یہ انتخاب دوسرے تیسرے اور چوتھے قاصد کے بیان پر مشتمل ہے

۳ ۔ حکیم برزویہ کا مختصر حال ۔ ص ۵۱ ۔ ۶۰

فارس کے مشہور و معروف طبیب کی خود نوشت

۴ ۔ انتخاب شاہنامہ ۔ ص ۶۱ ۔ ۱۳۱

۔ طویل انتخاب مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے ۔

ذکر سلطنت کیومرث ، ذکر سلطنت ہوشنگ ، حال سلطنت طہمورث ، حال سلطنت جمشید ، حال ضحاک تازی حال سلطنت فریدون ، فریدون کا ملک تقسیم کرنا . . . ، حال منوچہر ، حال سلطنت کیقباد ۔ حال سلطنت کیکاوس حال کیخسرو ، کیخسرو اور افراسیاب کی جنگ . . . . رستم کی شادی اور سہراب کی پیدائش . . . . سہراب اور کیکاوس کی لڑائی ، رستم اور سہراب کی لڑائی . . . ، کاوس کی موت ، کیخسرو کی تخت نشینی اور پادشاہی ترک کرنا . . . ، حال سلطنت لہراسپ حال سلطنت گشتاسپ ، زردشت کی گشتاسپ کے حضور میں حاضری . . . ، رستم کی سرکشی اور اسفندیار کا رستم کو گرفتار کرنا رستم کو گرفتار کرنے کے لئے اسفندیار کی سیستان کی طرف روانگی . . . . ، اسفندیار کی موت رستم کے ہاتھوں . . . ،

۵ انتخاب دیوانِ درد ۔ ص ۱۳۲ ۔ ۱۴۸

یہ انتخاب درد کی غزلیات ، قطعات اور مخمس پر مشتمل ہے ۔ غزلیں مکمل نہیں دی گئیں بلکہ ان میں سے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے ۔

۶ ۔ انتخاب باب ہفتم گلستان ۔ ص ۱۳۹ ۔ ۱۴۴

یہ انتخاب حکایت ۲/۳/۶/۷/۸/۱۵/۱۶ اور ۱۷ پر مشتمل ہے

۷ ۔ باب ہشتم در آداب صحبت ۔ (انتخاب) ص ۱۴۵ ۔ ۱۵۵

۸ ۔ انتخاب اخلاق جلالی ۔ ص ۱۵۶ ۔ ۱۶۲

۱ ۔ سمت روکی در دعایای افلاطون ۔

۲ ۔ " دوم " " ارسطاطالیس ۔

مولوی محمد کریم بخش : ۔ مولوی محمد کریم بخش کے حالات زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے ۔ موصوف مدرسہ دہلی کے نامور اساتذہ میں تھے ۔ مولوی عبدالحق[1] نے مرحوم دہلی کالج کے دیسی اساتذہ میں ان کا ذکر نہیں کیا ۔ آپ

---

[1] مولوی عبدالحق ۔ " مرحوم دہلی کالج ۔ " اورنگ آباد (دکن) ، انجمن ترقی اردو ، ۱۹۳۳ء ۔

کا نام ہمیں سب سے پہلے سی، ایف، اینڈریوز[1] کی کتاب " ذکاء اللہ آف دہلی " میں ملتا ہے جہاں وہ مولوی ذکاء اللہ کے احباب کا ذکر کرتے ہیں ۔ ضمنی طور پر محض نام گنوائے ہیں ۔ لکھتے ہیں ۔

TO RETURN TO THE PRE-MUTINY DAYS. ZAKA ULLAHS COLLEGE FRIENDS OF THIS TIME WERE NAZIR AHMED, MOULVI KARIM BEKHS PIYARE LAL, CHAUNDU LAL KANHYA LAL, MIR BABER ALI AND ZIA-UD-DIN. EACH OF THESE HAS BEEN IN SOME DEGREE FAMOUS IN HIS OWN WAY. NEARLY ALL OF THEM PASSED AWAY BEFORE ZAKA ULLAH HIMSELF.' P. 62.

محمد عتیق صدیقی[2] کی کتاب " صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء " سے ہمیں صرف پتا چلتا ہے کہ قرآن السعدین کے ۱۸۵۲ء میں ایڈیٹر تھے ۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے ہم دو نتیجے اخذ کرتے ہیں کہ

۱۔ مولوی کریم بخش، مولوی ذکاء اللہ سے پہلے وفات پا چکے تھے ۔
۲۔ ۱۸۵۲ء میں مدرسہ دہلی سے وابستہ تھے ۔

مولوی صاحب مدرسہ دہلی ہی کے تعلیم یافتہ تھے ۔ ذیل میں ان کی اپنی کتاب کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس سے ہم ان کے زمانۂ طالب علمی کا تعین کر سکیں گے ۔ یہ کتاب " جبر و مقابلہ " مطبع نور الابصار آگرہ کی طرف سے ۱۸۶۱ء میں شائع کی گئی ۔ مولوی صاحب دیباچے کی ابتدائی سطور میں لکھتے ہیں ۔

> " اس سے پہلے ایک جبر و مقابلہ مؤلفہ استادی مخدومی مکرمی جناب ماسٹر رامچندر صاحب کا چھپا تھا ۔ چونکہ اس میں مطالب مفید اور دلچسپ تھے اس سبب سے لوگوں کو اس کے پڑھنے سے اس فن کی طرف بہت رغبت ہوئی ۔ اور جس قدر نسخے جبر و مقابلے کے چھپے تھے سب بک گئے ۔ اکثر آدمی اس کے مشتاق تھے اس واسطے جناب ماسٹر صاحب نے مجھ کمترین کو کہ نام میرا کریم بخش ہے اور میں ادنیٰ ترین ان کے شاگردوں میں سے ہوں، ارشاد فرمایا کہ ایک جبر و مقابلہ مرتب کرنا چاہیئے جس میں جمیع مطالب پہلے جبر و مقابلہ کے بھی

---

[1] سی، ایف، اینڈریوز ۔ ذکاء اللہ آف دہلی (انگریزی) ۔ کیمبرج، ڈبلیو ہیفر اینڈ سنز

[2] محمد عتیق صدیقی ۔ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء ۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۶۲ء ۔ ص ۱۱۱

> ہوں اور مثالیں ہر قاعدہ کی بہت بہت لکھی جائیں اور بعض مطالب مفید بھی اس میں زیادہ کئے جائیں۔ اس واسطے اس کمترین نے یہ جبر و مقابلہ مرتب کیا اور جو مطالب مفید تھے جناب ماسٹر صاحب کی اصلاح سے اس میں داخل کئے۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی صاحب ماسٹر رامچندر کے شاگرد رہے ہیں۔ ماسٹر رامچندر ۱۸۳۱ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ ۲۸ فروری ۱۸۴۴ء میں کالج کے شعبہ مشرقی میں پچاس روپے مشاہرہ پر یورپین سائنس کے مدرس ہو گئے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ

۳ ۔ مولوی صاحب کا زمانہ طالب علمی ۱۸۴۴ء ۱۸۵۲ء کے درمیان ہے ۱۸۵۲ء میں مولوی صاحب قرآن السعدین جیسے مؤقر جریدے کے مدیر نظر آتے ہیں۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ آپ کے تقرر کے بعد فوراً ہی آپ کو مدیر مقرر کر دیا گیا ہو۔ اس لئے ہم اس زمانے کو اور بھی مختصر کر سکتے ہیں اور قیاساً ۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۷ء زمانۂ طالب علمی قرار دے سکتے ہیں۔

قولہ "محمد اعظم[۱] کی تاریخ کشمیر کا ترجمہ شرافت نے کیا ہے جو کئی بار چھپ چکا ہے" ۔ ص ۱۴۷

۴۔ تاریخ کشمیر: تاریخ کشمیر کا ترجمہ شرافت نے نہیں بلکہ منشی اشرف علی نے ۱۸۴۶ء میں کیا تھا۔ موصوف مدرسۂ دہلی کے اساتذہ میں سے تھے۔ تاریخ کشمیر کے ترجمہ کے علاوہ آپ نے "بریف سروے آف ہسٹری" کے اردو ترجمے کی درستی کی اور "رسالہ اصول حساب" کی تالیف میں بابو ہر دیو سنگھ[۲] کو مدد دی۔ علاوہ ازیں مدرسہ کے رسالہ "قرآن السعدین[۳]" کے ۱۸۵۰ء میں مدیر رہے۔ ترجمہ کا آغاز ۱۳ اگست ۱۸۴۶ء کو ہوا اور تکمیل ۱۱ نومبر ۱۸۴۶ء کو ہوئی۔

---

[۱] خواجہ محمد اعظم ڈومری (د ۔ ۱۰ محرم ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء)۔ خیر الزمان کشمیری مجددی کے فرزند تھے۔ "تاریخ اعظمی" معروف "تواریخ ڈومری" کشمیر کے شہنشاہوں، شعرا اور مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کا تاریخی نام "واقعات کشمیر" ہے اس کا آغاز ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں ہوا، اور تکمیل ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں ہوئی۔ "$\underset{\text{۱۱۷۹ھ}}{\underline{\text{ضعف گردہ}}}$" مادہ تاریخ ہے۔ گردہ کا درد موت کا باعث ہوا۔ مزید حالات اور دیگر تصانیف و تالیف کے لئے دیکھیے: حدائق الحنفیہ (ص ۴۵۰)، خزینۃ الاصفیا ۲: ۶۸۲)، مورخین ہند (ص ۸۳ ۔ ۸۴)، تذکرۂ علمائے ہند (ص ۱۱۶) اور کشمیر (انگریزی) مؤلفہ جی ایم ڈی صوفی (ج ۔ ۲، ص ۳۷۳ ۔ ۳۷۴)

[۲] مولوی عبدالحق ۔ مرحوم دہلی کالج ۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۔ ۱۹۳۳ء (ص ۱۵۲)

[۳] محمد عتیق صدیقی ۔ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء ۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۔ ۱۹۶۲ء ۔ ص ۱۱۱

طبع اوّل کے "دو نسخے کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب" میں موجود ہیں ۔ سرورق کی عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

MOHAMMAD AZEEM'S HISTORY OF KASHMIR TRANSLATED FROM THE PERSIAN INTO URDU BY MUNSHI ASHRAF ALI OF THE DEHLI COLLEGE.

تاریخ کشمیر مؤلفہ محمد اعظم کا ترجمہ زبان فارسی سے زبان اردو میں منشی اشرف علی مدرسہ دہلی نے ۱۸۴۶ء میں کیا ۔ بہ اہتمام پنڈت دھرم نراین کے مطبع العلوم مدرسہ دہلی میں چھپا "

علاوہ ان کے چند سیاحت نامے اور چند تاریخیں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں سے ایک ٹیپو سلطان کے باپ حیدر علی **کارنامہ حیدری**[1]، کی تاریخ ہے جو شاہ میسور کے ایک بیٹے نے لکھی ہے" خطبات ص ۵ ۔ ۶

اصل تصنیف کا نام کارنامہ حیدری ہے ۔ یہ ٹیپو سلطان کے لڑکے کی تصنیف نہیں بلکہ عبدالرحیم[2] گورکھپوری کی فارسی تالیف ہے تاریخی نام "تواریخ گزیدہ" ہے ۹۸۸ صفحات کی یہ ضخیم تالیف مطبع مشن پریس دارالامارہ کلکتہ سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی ۔ سرورق پر مؤلف کا نام نہ ہونے کی وجہ سے اور مزید شاہزادہ محمد سلطان (عرف غلام محمد) ابن ٹیپو سلطان کی طرف سے سر ٹامس ہربرٹ ماڈک بہادر کے نام معنون کرنے کی وجہ سے پروفیسر موصوف کو غلط فہمی ہوئی ۔ شاہزادہ محمد سلطان (عرف غلام محمد) کے ایما پر یہ کتاب قلم بند ہوئی ۔ چنانچہ مؤلف مقدمہ میں لکھتے

> ".... بنابراں شاہزادہ عالی فطرت بلند ہمت ستودہ خوی حقجوی مومنین دل مومن جناں
> محمد سلطان ابن طیپو سلطان جبرت خیراتہ، وسرت مبراتہ، بہ مؤلف ایں اوراق اشارات

---

[1] کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) کے فہرست ساز نے اسے عبدالرحیم صفی پوری کی تالیف قرار دیا ہے جو کہ غلط ہے ۔ دیکھو، "فہرست کتب عربی، فارسی و اردو" مخزونہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی، جلد نمبر ۱ ۔ حیدرآباد (دکن)، مطبع اختر دکن ۱۳۳۲ھ ۔ ص ۲۴۸ ۔ ۲۴۹ ۔

[2] عبدالرحیم کے والد کا نام مصاحب علی تھا ۔ گورکھپور کے رہنے والے تھے، دلی میں شاہ عبدالعزیز اور ان کے نامور بھائیوں سے تعلیم حاصل کی اور علوم عقلیہ میں توغل کیا ۔ کلکتہ کے سفر میں انگریزی زبان کی تحصیل کی ۔ الحاد و زندقہ کی عام شہرت تھی ۔ تصنیفات میں کارنامہ حیدری ہے جو سلطان ٹیپو اور ان کے والد حیدر علی کے حالات پر مشتمل ہے ۔ عربی اور فارسی زبان کے مقابلہ پر بھی ایک کتاب لکھی جس میں فارسی کو عربی پر فضیلت دی ہے ۔ آفتاب کے سکون پر بھی ایک رسالہ ہے ۔ ایک کتاب (الانوار المشرقیہ فی الاسرار المنطقیہ اور التالیفات التمثیلیہ الی رسالۃ الاسرار المنطقیہ بھی ان کی تصنیفات میں سے ہے ۔ نزہۃ الخواطر ۔ مؤلفہ عبدالحیٔ ۔ جلد ۷ ۔ بحوالہ سیرت سید احمد شہید ۔ مؤلفہ ابوالحسن علی ندوی ۔ حصہ اول ۔ حاشیہ صفحہ ۲۹۵ ۔

فرمودتا احوال حیدر علی خاں و ٹیپو سلطان را از رسالہ موسومہ بہ تذکرہ حیدر علی خان و ٹیپو سلطان کہ میجر چارلس اسطوارط مدرس السنۂ خاور زمیں در مدرسۂ شرقی ہندوستانی کمپنی کہ در قصبہ ہرطفورڈ از قصبات انگلستان واقع است از چندیں کتب التقاط نمودہ جزوی از آں صحیفہ لطیفہ اش گردانیدہ کہ آنرا بنام ڈسکرپٹیو کطالاگ آف اُرینٹل لیبرری آف ٹیپو سلطان (یعنی تفسیری فہرست) کہ متکفل اجمالی بیان مقاصد کتب با ضمیمہ ذکر تحتی ہر کتاب و نحو خط و اسمای مصنفان آں باشد) شرقی کتب خانہ ٹیپو سلطان نامیدہ، در پارسی زبان ترجمہ کند، . . . . . . کارنامہ حیدری : ص ۱۴

(باقی)

مخطوطات انجمن ترقی اردو

فارسی ۔ عربی

انجمن میں فارسی اور عربی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ ان مخطوطات کی اجمالی فہرست سیّد سرفراز رضوی، مہتمم کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو نے مرتب کی ہے جس میں ہر مخطوطے کے بارے میں ضروری اور بنیادی معلومات جمع کر دی گئی ہیں متعدد مخطوطات کے عکس بھی شائع کئے گئے ہیں طباعت آفسٹ کے ذریعے ۔

قیمت :۔ تین روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو ۔ بابائے اردو روڈ کراچی ۱

دیوان بیدل (اردو)

(من تصنیف علامہ قادر بخش بیدل روہڑی)

لطف اللہ بدوی مرحوم

ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ جناب لطف اللہ بدوی گزشتہ ماہ انتقال کر گئے۔ مرحوم اردو اور سندھی زبانوں کے ممتاز ادیب تھے، ان کے مقالات ملک کے تمام علمی جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ فکر اقبال کو اہل سندھ سے متعارف کرانے میں انھوں نے خاص کارنامہ انجام دیا ہے۔ اقبال کی تصانیف کے جو سندھی تراجم انھوں نے کیے ہیں وہ ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ "قومی زبان" کے وہ مستقل مضمون نگار تھے، یہ مقالہ انھوں نے وفات سے چند روز قبل ارسال فرمایا تھا جو ان کا آخری مقالہ ہے۔ افسوس کہ ہم مرحوم کے قلمی تعاون سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔

(ادارہ)

علامہ قادر بخش بیدل رحمۃ اللہ علیہ، سندھ کے ان تین عظیم شعراء میں سے ہیں، جن کا اسم گرامی، زندہ جاوید رہے گا، باقی دو حضرات ہیں، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سرمست سچلؒ، یہ دونوں بیدلؒ کے پیش رو ہیں۔ لیکن بیدلؒ کی شخصیت ایک انفرادی حیثیت کا مقام رکھتی ہے۔ وہ ایک متبحر عالم اور متفکر صوفی تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شاہ بھٹائیؒ اور سرمست سچلؒ کے خوشہ چیں اور مداح تھے۔ لیکن جو تصنیفات ان سے یادگار ہیں، وہ تصوف کی دنیا میں نقش آخر ہیں۔ چونکہ ان کی تصنیفات اب تک دستخط حالت میں موجود ہیں، (سوائے سندھی کلام کے) اس لیے عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عوام اور خواص ان کی صحیح منزل اور مرتبے سے واقف نہ ہو سکے۔

علامہ قادر بخش بیدلؒ کی پیدائش سنہ ۱۲۳۰ھ مطابق سنہ ۱۸۱۴ء میں روہڑی میں ہوئی۔ آپ کے والد کا اسم گرامی محمد محسن تھا، یہ بزرگ قریش خاندان میں سے تھے، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان، اسلامی حکومت کے دور اولین میں، مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے، سندھ میں آیا، لیکن یہ اب معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ شروع میں کس جگہ سکونت پذیر ہوئے

اور روہڑی میں کب آئے ۔

بیدلؒ کے آباد اجداد، روہڑی کے ایک سرمست بزرگ حضرت جان اللہ شاہؒ کے ارادت مندوں میں داخل تھے ۔ حضرت جان اللہ شاہؒ، سندھ کے غیرفانی صوفی عنایت اللہ شہیدؒ میران پوری کے مریدوں میں سے تھے ۔ حضرت جان اللہ شاہؒ فارسی زبان کے ایک بلند شاعر گزرے ہیں ۔ 'سر' تخلص تھا اور ایک دیوان یادگار ہے ۔ 'بیدل' کی ولادت کے وقت حضرت جان اللہ شاہؒ کے پوتے، سید جان اللہ شاہ ثانیؒ مسند فقر پر متمکن تھے ۔ بیدلؒ کے والد بزرگوار فقیر محمد محسنؒ ان کے مرید تھے، اور حضرت جان اللہ شاہؒ کے خلفا میں شمار ہوتے تھے، فقیر محمد محسنؒ ظاہر میں ابریشم فروش تھے، لیکن آپ کی زندگی کے بیشتر اوقات مرشد کی خدمت میں بسر ہوتے تھے ۔ ایک فقر آشنا باپ کی گود میں بیدلؒ نے آنکھ کھولی، جب تعلیم اور تربیت کے سن کو پہنچے، باپ نے مکتب میں بٹھا دیا، فقیر بیدلؒ بڑے تیز ذہن کے مالک تھے، تھوڑے عرصے میں علوم متداولہ میں کمال حاصل کر لیا ۔ ایک روایت کے مطابق آپ تیرہ سال میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے ۔ حدیث، تفسیر، علم الکلام، منطق، فلسفہ ادب اور دینیات کے ماہر بن گئے تھے، ظاہری علوم سے فراغت پا کر سیر و سفر میں مشغول ہو گئے ۔ جہاں جہاں کسی اہل کمال کا ذکر سنا، وہاں پہنچ گئے اور استفادہ کر لیا ۔ اس زمانے میں سکھر میں ایک عالم دین مولوی عبدالرحمان رہتے تھے ۔ فقیر بیدل نے جب ان کی علمی عظمت کی شہرت سنی تو وہاں پہنچ گئے ۔ اور مثنوی رومی کو سبقاً سبقاً ان سے پڑھا اور تصوف کے اسرار سے واقف ہوئے ۔ مثنوی کے مطالعے کے بعد، بیدلؒ میں عجیب تبدیلی آ گئی ۔ اکثر و بیشتر استغراق اور سکوت میں رہتے تھے ۔ باپ کی فقیرانہ زندگی نے زیادہ جلا دی ۔ ایک دن کسی خیال کے ماتحت، دوستوں اور گھر والوں کو الوداع کہے بغیر شہباز قلندر قدس سرہ العزیز کے مزار کی زیارت کے لیے ۔ سیوہن چل پڑے ۔ قلندر شہبازؒ کے مزار پر پہنچ کر آپ کی حالت غیر ہو گئی اور کئی دن آپ بے خود اور بے ہوش رہے ۔ جب کچھ افاقہ ہوا اور آنکھ کھلی تو آپ ایک عالم دین کے بجائے محض مجذوب رہ گئے تھے ۔ اصلی حالت میں آنے کے لیے آپ کو زیادہ عرصہ لگا ۔ چند مہینوں کے بعد آپ سیوہن سے رخصت ہو کر پیر گوٹھ (ضلع سکھر) میں حضرت محمد راشدؒ کے مزار پر معتکف ہو گئے اور وہاں کے سجادہ نشین حضرت صبغت اللہ شاہ علیہ الرحمۃ کے فیض سے بہرہ اندوز ہوتے رہے ۔ وہاں سے آپ روہڑی لوٹ آئے اور بقیہ عمر وہاں گزار دی، ابتدائے عمر میں درس دیتے تھے اور ابریشم کا کاروبار کرتے تھے ۔ لیکن آخیر عمر میں تارک بن گئے تھے اور اکثر تصنیف میں مشغول رہتے تھے ۔ بیدلؒ کی تصنیفات کا اندازہ بہت زیادہ ہے اور یہاں ان کی یادداشت بطور یادگار دی جاتی ہے :-

نثر

(۱) ۔ پنج گنج	فارسی
(۲) فوایدالمعنوی	"
(۳) تقویت القلوب فی تذکرۃ المحبوب	"

(۴) فی بطن احادیث	〃
(۵) سندالموحدین	〃
نظم	
(۶) ریاض الفقر (مثنوی)	〃
(۷) نہرالبحر 〃	〃
(۸) قرۃ العینین فی مناقب السبطین	〃
(۹) قصیدہ ہیرورانجو	〃
(۱۰) وحدت نامہ (مثنوی)	〃
(۱۱) دیوان سلوک الطالبین	فارسی
(۱۲) دیوان منہاج الحقیقۃ	〃
(۱۳) دیوان مصباح الطریقۃ	〃
(۱۴) دیوان بیدل	اردو
(۱۵) سندھی وسرایکی کلام؛ سرودنامہ	سندھی وسرایکی

ان تصنیفات کے علاوہ کئی ترجیع بند اور ترکیب بند آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنا ضخیم کلام فارسی زبان میں سندھ کے کسی شاعر کی تصنیفات میں نظر نہیں آتا، اور یہ بیدلؒ کا طرۂ امتیاز ہے کہ عربی، فارسی، سندھی، اردو، ہندی اور سرایکی زبانوں میں یکساں طور پر اُن کا کلام موجود ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صحیح طور پر شاعرِ ہفت زبان ہیں، تو اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ چونکہ آپ کا کلام سندھی اور سرایکی کے سوا اب تک منصۂ شہود پر نہیں آیا، اس لیے آپ کی صحیح قدروقیمت سے بیرونی دنیا تو خیر، سندھ والے بھی اب تک پورے طور پر آشنا نہیں ہیں۔ اس بے قدری پر جس قدر افسوس کیا جائے وہ کم ہے۔ یہ عظیم اور رفیع الشان شاعر اور مفکر، ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۸۹ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر، جنت میں جا بسے۔ آپ کی تربت روہڑی کے ریلوے اسٹیشن کے قریب زیارت گاہ عام وخاص ہے۔

اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش تو نہیں ہے کہ آپ کے مکمل کلام پر تبصرہ کیا جائے، یہاں فقط آپ کے 'اردو دیوان' پر ہی تبصرہ کیا جائے گا۔ 'اردو شاعری' سندھ میں بیدلؒ سے بہت پہلے رائج ہو چکی تھی، سرمست سچلؒ کا کلام سب سے زیادہ سندھ میں اردو شاعری کی نشان دہی کرتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بیدلؒ، اردو شاعری کے معاملے میں سرمستؒ سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ آپ کا مکمل دیوان، سندھ کی اردو شاعری میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو شاعری کے دل دادگان میں

کو پہنچ نہیں سکتے، اکثر سندھی نقادوں کی رائے ہے کہ آپ نے اپنی شاعری کی ابتدا، حضرت شہباز قلندرؒ سیوہانی کی روحانی امداد سے کی تھی، اور آپ کے پہلے ابتدائی اشعار، اردو زبان میں ہی موزوں ہوئے تھے۔ جہاں تک روحانی تربیت کا سوال ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اس حقیقت کے ماننے میں تامل ہو سکتا ہے کہ جب کہ آپ اپنی زبان میں آسانی سے شعر کہہ سکتے تھے، تو غیر زبان سے ابتدا کیوں کی یہ ایک محض اور موہوم تصور ہو سکتا ہے۔ یہ ہم بہتر طور پر جانتے ہیں کہ بیدلؒ علوم معقول اور منقول میں غیر معمولی دست گاہ رکھتے تھے، اور اس وقت کے علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ فارسی اور عربی کو تو آپ نے درس میں پڑھا تھا، سندھی اور سرائیکی آپ کے وطن کی زبانیں تھیں، لیکن اردو پر آپ نے بعد میں قبضہ حاصل کیا ہوگا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے کلام میں کہیں کہیں 'دکھنی اردو' کا اثر نظر آتا ہے۔ اس سے ہم یہ اثر لیتے ہیں کہ اردو کی طرف آپ نے اپنی توجہ بعد میں دی ہوگی۔ آپ کے زمانے میں لکھنوی اور دہلوی زبانیں باقاعدہ ملک کے ہر حصے میں پھیل چکی تھیں اور ان کا اثر پنجاب سے بھی آگے بڑھ چکا تھا ایسی حالت میں آپ کی اردو زبان پر دکھن کا اثر ہو، یہ فقط دکھنی اردو کتابوں کے مطالعے کا کرشمہ ہوگا۔ یہ محض غلط ہے کہ سندھ کے نقادوں کی اس روایت کو ترجیح دی جائے کہ آپ نے اپنی ہمہ گیر شاعری کی ابتدا اردو سے کی تھی۔

اُردو دیوان کی تشکیل اور ترتیب

میرے ہاں جو اردو دیوان بیدل کا مسودہ ہے، اس کو فقیر غلام علی سرور مغفور شکارپوری نے ۱۹۲۲ء میں کسی دوسرے مسودے سے نقل کیا تھا، فقیر موصوف نے اصل مسودے کی تاریخ اور سال، سندھی عبارت کے ساتھ حاشیہ پر اس طرح تحریر کی ہے:

> "اصل مسودہ حضرت مرشدنا علامہ قادر بخش بیدل کی زندگی میں سال ۱۲۵۰ ہجری میں آپ کے محبوب ارادت مند جناب غلام محمد مرحوم نے تحریر کیا تھا جس سے اس فقیر نے نقل کیا ہے۔"

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ 'بیدل' نے اپنے دیوان کو سال ۱۲۵۰ ہجری سے پہلے مکمل کر لیا تھا، غالباً اردو دیوان کا یہ سب سے قدیم نسخہ ہے۔ بیدل جس زمانے میں اردو زبان میں طبع آزمائی کر رہے تھے، دہلی میں غالب اور لکھنؤ میں ناسخ جیسے شعرا موجود تھے، اور اردو شاعری کمال پر پہنچ گئی تھی،

بیدل کے اردو دیوان میں ۵۱ غزلیں دو مناقب اور ایک مدحیہ مسدس موجود ہے۔ یہ کلام اتنا ضخیم تو نہیں لیکن سندھ کی سرزمین سے اتنا بھی کافی سے زیادہ ہے، آپ کے دیوان کی ابتدا اس غزل سے ہوتی ہے۔

دلِ وحدت طلب فارغ زقیدِ جسم و جاں ہوگا[1]
کہ بیٹھک عاشقاں دایم، بملکِ لامکاں ہوگا

---

[1] کلام بیدل میں بعض اشعار ساقط الوزن ہیں اور بعض الفاظ کا تلفظ بھی خلاف قاعدہ ہے۔ مضمون نگار نے تمام اشعار مخطوطے سے من و عن نقل کر دیے ہیں ان کی قیاسی تصحیح نہیں کی۔ (ادارہ)

[redacted]

بڑھے جا چھوڑ کر قفسِ بدن گر تو صفا چاہے
کہ بالا عرشِ اعظم سے تمھارا آشیاں ہوگا
اُٹھا سر فرشِ خاکی سے قدم کو رکھ فلک اوپر
کہ سات آکاش ہمت کے لیے اک نردباں ہوگا
بھروسا جسم کا مت رکھو نہ ذکرِ اسم کر ظاہر
صفت کو چھوڑ آگے چل کہ بیچوں بے نشاں ہوگا
طلب، مطلوب و طالب کو تو جانے ایک وحدت میں
کہ بحرِ ذات بیرنگی محیطِ بے کراں ہوگا
وہی اوّل وہی آخر وہی باطن وہی ظاہر
خودی کے ترک سے تم پر وہ مخفی سر عیاں ہوگا
دوئی کے وہم سے بیدل، ترا دل گر ہوا فارغ
ظہورِ ذاتِ مطلق کا، جہاں چاہیں وہاں ہوگا

دیوان کا خاتمہ اس غزل پر ہوتا ہے :-

بڑھایا زلف کا جب سے ہے زنجیر پری نے
مُو مُو سے کیا سو سو نخچیر پری نے
صورت گرِ چین ہوا دیکھ کے حیراں
بھیجی ہے جب سے اپنی تصویر پری نے
یہ خال نہیں صورتِ داغِ دلِ عشاق
گلبرگ پہ کی مشک سے تحریر پری نے
خونِ دل بہنے لگا آنکھوں سے ہمارا
پلکوں سے جب مارا مجھے تیر پری نے
دل میں یہ تھا کہ اُس کو یہ حال کہوں گا
افسوس کہ بھلا دی ہے میری تدبیر پری نے
رکھتا ہے کمال ابروئے تیرِ مژہ بیدل
سکا ہے کوئی میرے قتل میں تاخیر پری نے

یہ ہے دیوان بیدلؔ "اردو" کی تشکیل اور ترتیب ۔

دیوان پر تبصرہ :-

چونکہ بیدل کا مشرب صوفیانہ تھا، اس لیے، اس کی شاعری میں تصوف کا عنصر غالب ہے۔ اردو دیوان میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے، آپ نے مسائل تصوف اور حقایق امور کو اپنی غزلوں میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیدل کو سندھ کے صوفیائے کرام میں اعلیٰ مقام حاصل ہے اور آپ نے تصوف پر جو تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، اُس سے معلوم ہوتا ہے آپ شریعت اور طریقت کے سنگم سے اچھے طور پر واقف تھے ۔ ابتدائی زندگی میں جب آپ کا مشغلہ درس اور تدریس تھا، آپ مانے ہوئے فقیہ تھے ۔ بعد میں جب آپ نے تصوف کی طرف رجوع کی، تو ایک بے مثل صوفی بن گئے ۔ حضرت امام مالکؒ کا قول ہے کہ :-

> "جو صوفی بنا اور فقیہ نہ ہو سکا وہ زندیق ہے، اور جو کوئی فقیہ بنا
> اور تصوف نہ سیکھا، وہ بلاشبہ زاہد خشک ہے، اور جس نے دونوں
> (فقہ اور تصوف) کو حاصل کیا وہ بلاشک محقق ہے ۔"

اس قول کے مطابق بیدل، ایک محقق صوفی تھے ۔ آپ کے اردو کلام میں جا بجا وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی تشریح موجود ہے ۔ انسانی تخلیق کے مقصد کو، بیدل، وحدۃ الوجود کے رنگ میں جس طرح پیش کرتے ہیں، اُس سے آپ کے استعداد فکر کی پختگی معلوم ہوتی ہے، فرماتے ہیں ؎

آئینہ وہ بنایا، پانی مٹی ملا کر
جلوہ دیا اسی کو صیقل عجب لگا کر
دیدار کے لیے تھی خواہش یہ تا کہ دیکھے
حسن و جمال اپنا، صورت بشر میں آکر
آدم نہیں یہ اللہ، صورت کا بھیس پہنے
آیا ہے اس جگت میں خود کو مگر چھپا کر
ہوشیار رہ تو بیدلؔ ہمہ اوست کا ہو قائل
نظارہ نور حق کا، مظہر میں جا بجا کر

وحدت الوجود کی اس سے زیادہ تشریح و توضیح نہیں ہو سکتی، حقیقت کی شناوری کی تو یہ حالت ہے، لیکن مجاز میں بھی

تیری فرقت میں صنم ہر روز حالم ہے بتر
تجھ کو لازم دم بدم بخشش میرے احوال پر

جب تم چلے گلزار سے اے رشکِ خوبانِ چمن
بلبل کہا تب سوز سوں اب کچھ تو ہو بیدادگر

محبِ بے پروا کے آگے ہے عبث اب التجا
ہے گزرنا جان سے یہ شیوۂ عاشق مگر

تصویر کی حاجت نہیں دل کے نگارستان میں
یہ بزمِ دل آزاد ہے از غلغلِ نفع و ضرر

عشق کی تعریف میں ارشاد ہوتا ہے ؎

طنبور چرخ کا نہ بنایا حکیم قدر
جب تک نہ بزمِ راز میں چھیڑا رباب عشق

بیدلؒ کے اشعار میں ہمیں فکر کی فراوانی، زبان کی روانی اور شستگی جا بجا نظر آتی ہے۔ سندھ کے قدیم اردو شعرا میں کوئی بھی آپ کے پایہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمست سچلؒ کا اردو کلام، اور شعرا کے مقابلے میں کثیر مقدار میں موجود ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کے اشعار میں زبان کی صحت پر کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ سندھ میں اردو کو اتنا فروغ حاصل نہ تھا، جتنا فارسی کو، یہ ابتدائی مدارج تھے۔ جو شعرائے اردو شاعری میں طے کر رہے تھے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ زبان کی صحت اور صفائی کو اتنی اہمیت نہ دیتے ہوں اگرچہ بیدلؒ بھی کم و بیش اسی دور کی پیداوار تھے، لیکن آپ کی اردو زبان صاف ستھری اور نکھری ہوئی ہے۔ قدیم اردو کے الفاظ 'ہمن'، 'سوں'، کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، سندھ میں آپ جدید اردو کے رہنما تھے 'ہمن'، 'سوں' وغیرہ کا استعمال، آپ پر اپنے پیش رو شعرا کے کلام کا اثر تھا، ورنہ ان اشعار کے کہنے والے کو ہم جدید اردو کا واقف نہ کہیں تو کیا کہیں ؎

دیکھو مستی، پروانہ کی شعلہ کے حضور
شمع کے بھینٹ سر اپنے کو جلا دیتے ہیں

تیرے حسن کی دیکھ تجلی اے رشکِ حور
سورج کہوں کہ چاند کہ نورِ خدا کہوں

بلبل صفت اے گلبدن، اس باغ میں ہر صبح دم
تیرے بہارستان کا دیوانہ ہوں، دیوانہ ہوں
تشبیہ وہ جام ہے، تمثیل چشم پُر خمار
تصویر اس کی دیکھ کر پیمانہ ہوں پیمانہ ہوں
گرچہ ظاہر دور ہوں، اس حسن کے سلطان سے
لیکن بزم معنوی، ہمخانہ ہوں ہمخانہ ہوں

جہاں اردو کی ابتدائی منزلوں کو طے کرنے کے لیے سندھ کے اردو شعرا نے کافی وقت لیتے ہوئے بھی، زبان کی صحت اور صفائی پر پہنچ نہ سکے تھے۔ وہاں بیدل ایک جست میں یہ منزلیں طے کر کے اس مقام پر پہنچ گئے تھے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے وہ کم ہے۔

اردو میں لکھنے والے سندھی شعرا کا کلام اگرچہ ہمارے یہاں موجود ہے، لیکن انفرادی طور پر، ان کا کلام اتنا تو مختصر اور کم ہے کہ وہ اردو شعرا کے زمرے میں داخل ہی نہیں ہو سکتے۔ ہم البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان شعرا کے طفیل سندھ کی زمین اردو سے ایک ڈیڑھ صدی پہلے ضرور آشنا تھی۔ کسی زبان کی ابتدائی منزلوں میں تو یہ چیز بطور سند پیش ہو سکتی ہے، لیکن جب ان میں کوئی داخلی تبدیلی نظر نہیں آتی تو ان کی ارتقائی منزلوں کا کیا بیان ہو سکتا ہے۔ یہ فقط خوش فہمی ہی ہو سکتی ہے۔ سرمست سچل کے علاوہ روحل اور مراد نے بھی کچھ بھجن اور چوپائے ہندی زبان میں لکھے ہیں، لیکن ان کو اردو زبان کا شاہکار سمجھنا، میرے خیال میں فاش غلطی ہے۔ میراں، ملک محمد جائسی، اور سور داس کو کبھی اردو شاعری کی نمائندگی نہیں ملی۔ جب کہ روحل اور مراد کے بھجن، خود ہندی زبان کی فصاحت کے دعویدار نہیں بن سکتے۔ یہ ایک بحث طلب چیز ہے اور اس پر کافی بحث کی گنجائش ہے۔ بہرحال ہم دیوان بیدل اردو کو اردو کی ایک مستقل تصنیف ہی کہہ سکتے ہیں اور بس، اس سے میری مراد یہ ہے کہ بیدل نے ہی اردو شاعری کی سندھ میں باقاعدہ ترتیب اور ترویج کی۔

بیدل کی شاعری میں ہمیں جو متاثر کرنے والی چیز نظر آتی ہے وہ غزل کی مسلسل ترتیب ہے۔ فارسی شاعری کی طرح آپ کی اردو غزل میں بھی اکثر یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چونکہ آپ کی غزل کے مضمون کا غالب عنصر تصوف ہے، اس لیے ایک مسلسل غزل لکھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، مسلسل غزل کی امتیازی نسبت کے متعلق مولانا حالی کی یہ رائے بڑا وزن رکھتی ہے:[لہ]

> "بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں، جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے۔ بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اوّل سے آخر تک ایک ہے ...... الغرض غزل کو باعتبار زمین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو، وسعت دینی چاہیے۔"

ں وسعت ہمیں بیدل کی اردو شاعری میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں اس غزل کی وسعت کو باعتبار زمین اور
بال دیکھنا چاہیئے ؎

دو جگ کا بادشہ ہے مستِ شراب عشق
عالی ہے ہر حباب سے لاشک حباب عشق
شبہ پر صفت نہ ہو، تو ہو سکے حجاب میں
باہر نکل کے دیکھ رخ آفتاب عشق
زہاد پر نہیں سرِ وحدت کا منکشف
گر فتح باب چاہیں تو مت چھوڑ باب عشق
تابع ہیں عاشقاں کے چہ ابر و چہ آفتاب
دوزخ بہشت جانتا ہے آب و تاب عشق
جو آ کے پوچھتا ہے تصویر عشق کیا ہے
کہتا ہوں یہ ہے بیدل بندہ جواب عشق

بیدل کے کلام میں جہاں فارسی تشبیہات افراط سے نظر آتی ہیں، وہاں ہندی کے الفاظ کو بھی آزادانہ استعمال کیا لیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو ہندی زبان پر بھی اچھی خاصی دسترس حاصل تھی۔ مثلاً

میں ہوں الکھ اروپ، اجنم اکال ایک
بیچوں بیچگوں، تبارک تعال ایک

یہ ہندی، فارسی اور عربی کا امتزاج نہایت دل کش معلوم ہوتا ہے۔

وہ اروپ سروپ ہو آیا، عشق کا کھیل کھلایا
دونوں یہ القاب عجب ساجن سر دھرا بارے

یہ ہے مختصر تبصرہ بیدل کی اعجاز نما شاعری پر، جس نے اردو شاعری کو سندھ میں، آج سے ایک صدی پہلے کمال پر پہنچا دیا تھا۔ قدیم شعرا میں آپ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ جب آپ کا دیوان شایع ہو کر منظرِ عام پر آئے گا، تو معلوم ہوگا

کہ وہ کس کمال کے شاعر تھے۔

آخر میں، میں مخدومی حاجی امام بخش خادم کی تحریر پیش کرتا ہوں، جس میں انھوں نے، اس زندہ جاوید شاعر کے کمال کا اعتراف کیا ہے[1] اور یہ مختصر تعارف میری تائید کے لیے کافی ہے :-

> "اسم آں سرقافلۂ موزوں طبعاں، سحربیاں قادربخش است، از ہمعصران او شنیدہ ام کہ پدرش، نامش عبدالقادر نہادہ بود، لیکن قادربخش چوں در جوانی رسیدہ نام خودرا از عبدالقادر بہ قادربخش تبدیل نمود، چونکہ خود در طریقۂ قادری بیعت بود، بایں باعث از ادب نام خویش را عبدالقادر نہادن، طریقۂ بے ادبی پنداشت۔
>
> طبع رنگین و فکرے متین دارد، ہمہ دیوان فصاحت عنوانش حاوی انواع سخنان از قصائد، غزل، رباعی، ترجیع بند وغیرآں پیش نظر است۔ اکثر نظم اشعار آبدار توجہ میگماشت، چند مثنوی ہا نیز دارد، ہمچو مولانائے روم ایں ہمہ مثنوی ہایش بر مضمون تصوف محیط اند، فیض یافتۂ درگاہ قلندر شہبازؒ است بہ ریاضات کاملہ و عبادات فاضلہ سرآمد ارباب تصفیۂ باطن و تجلّۂ قلب گردید در زبان اردو (ہندی) یک دیوان و در زبان سندھی کافی ابیات از شمار بیشتر دارد۔ تصنیفات او در نظم خواہ نثر حلاوت تصوف دارند من از مقام آں شاعر معجز بیان چہ گویم او سرخیل شعرائے ہم عصر بود۔"

دیوان کے آخر میں چند قصاید مخدوم شہبازؒ قلندر سیوانی قدس سرہ العزیز کے مدح میں موجود ہیں جن میں سے آپ کی اس حضرتؒ کے ساتھ عقیدت روز روشن کی طرح ظاہر ہوتی ہے، یہاں ایک قصیدے کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے :-

انتخاب قصیدہ

قلندر بادشاہِ بحر و بر ہے　　قلندر بے کسوں کا راہبر ہے
قلندر برزخِ ناسوت و ملکوت　　قلندر جامع صحو و سکر ہے
قلندر جاذبِ جانہائے جبروت　　صدف ہاہوت کا والا گہر ہے

---

[1] حاجی امام بخش خادم۔ شکارپور کے رہنے والے تھے، اردو، فارسی، عربی اور سندھی زبانوں پر عبور کامل رکھتے تھے (متوفی ۱۹۱۸ء)

قلندر مسند لاہوت کا شہ سپہر لاتعین کا قمر ہے
لقب جس کو ملا حضرت حسینی اوسی کے طالبوں کو کیا خطر ہے

پڑا رہ اُس کے در بیدل ہمیشہ
کہ خاکش کحل ہر روشن بصر ہے

میرا مضمون ختم ہو رہا ہے۔ اور خاتمے پر یہ لازم نظر آتا ہے کہ آپ کے تین وسیع فارسی دیوانوں میں سے فقط ایک غزل یہاں نقل کرکے پیش کروں، تاکہ آپ ان کی فارسی شاعری کے رتبے سے بھی آگاہ ہو جائیں۔

گفتم بعشق روی تو گشتیم متہم
گفتا کہ من رفیق تو باشم مدار غم

گفتم کہ دین و دل ہمہ کردم فدائے تو
گفتا خوش آں کسی کہ کند جان نثار ہم

گفتم اساس جسم چرا نیست پائدار
گفتا بنائے ہستی را ساز منہدم

گفتم کہ ہزار شکر وصلت نصیب ماست
گفتا کہ عشرت است پے عبرت و الم

گفتم کہ سرِ خفیہ مکشوف کے شود
گفتا چو بنگری بتامل بجامِ جم

بیدل ز جیب فکر مکش سر کہ عاقبت
در سلکِ سالکانت نمایند منتظم

بیدل کا یہ ہے فارسی سحرِ حلال! خدا کرے کہ آپ کا کلام غبار گمنامی سے باہر آکر، ہماری آنکھوں کو اپنے جمال اور جلال سے منور کرے۔

اردو کا قاعدہ
آسان قاعدہ جس سے بچے بہت جلد الفاظ و جملوں کا لکھنا اور پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ قیمت: ۔ پچیس ۲۵ پیسے
انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

مرزا غالب کی صد سالہ برسی پر

سہ ماہی

اُردو

۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو غالب نمبر پیش کر رہا ہے

چند لکھنے والے

قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، مولانا غلام رسول مہرؔ
ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی عبدالرحمان چغتائی،
ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی سید محمد تقی،
نادم سیتاپوری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
پروفیسر ممتاز حسین۔ اور بہت سے دوسرے۔

انجمن ترقیِ اردو پاکستان - بابائے اردو روڈ - کراچی ۱

راز یزدانی

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

احمد ولی خاں راز یزدانی ۱۱ر اگست ۱۹۰۸ء کو بریلی کی تحصیل بہیڑی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد کا نام عنایت رسول خاں تھا جو بہیڑی کے ایک اعلیٰ پٹھان خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ راز یزدانی کی ولادت سے قبل آپ کے دادا مرحوم نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ انھیں ایک بچہ دیکر کہہ رہے ہیں کہ اس کا نام احمد ولی رکھنا اس لئے آپ کا نام احمد ولی رکھا گیا ورنہ آپکے دو بھائی ہیں جن کے نام ہدایت رسول خاں اور محبت رسول خاں ہیں۔ آپ کی تعلیم انٹر تک تھی فارسی آپ نے اپنے شوق سے مولانا تاباںؔ بریلوی سے پڑھی اور عربی آپ نے شمس العلما حضرت مولانا شاداںؔ بلگرامی سے شروع کی تھی اور مجانی الادب تک ہی پہنچے تھے کہ ان کی رحلت ہوگئی پھر کوئی ایسا شفیق استاد نہیں ملا اور عربی کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔

آپ کے شعر کہنے کی ابتدا ۱۹۲۳ء میں ہوئی جب آپ عظیم الدین میموریل ہائی اسکول رام پور میں تعلیم پاتے تھے۔ مولانا ضیاالاسلام صاحب عیاںؔ میرٹھی شاگرد بیاںؔ یزدانی میرٹھی اسی اسکول میں سکنڈ ماسٹر تھے ان سے ہی رازؔ یزدانی نے مشورۂ سخن شروع کردیا لیکن جلد ہی عیاںؔ میرٹھی نے میرٹھ جاکر پریکٹس شروع کردی اس لئے آپ مولوی سید اولاد حسین شاعرؔ لکھنوی کے شاگرد ہو گئے اور فن شعر بھی ان ہی سے پڑھا۔ آپ کی شاعری کو تین دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

پہلا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک

دوسرا دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۴ء تک

تیسرا دور جون ۱۹۵۶ سے ۱۹۶۲ء تک

نومبر ۱۹۴۴ء سے جون ۱۹۵۶ء تک ساڑھے گیارہ برس میں شعر کہنے سے آپ پورے طور پر مجتنب تو نہیں رہے لیکن غالباً دو تین نظمیں اور پانچ چھ غزلوں تک نوبت رہی کیونکہ ترک شعر کا سبب بعض شدید خاندانی مصائب تھے۔ زندگی آپ کے نزدیک لطف حاصل کرنے کی نہیں بلکہ جیے جانے کی چیز ہے جیسا کہ آپ نے کہا ہے۔ ؎

زندگی کی تلخیوں سے کارزار آساں نہیں   کارزار آساں بھی ہو لیکن فرار آساں نہیں

دو سال سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے اور اس مرض میں ۶۵ سال کی عمر میں ۱۲ جنوری ۱۹۶۳ء کو شنبہ کے دن ۹ بجے صبح بیرز یا ملا ظریف رام پور میں اُن کا چراغِ زندگی گل ہو گیا۔

رازؔ یزدانی کی تصانیف کی فہرست ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) "حرب و غرب" رازؔ یزدانی کا سب سے پہلا مجموعہ کلام "حرب و غرب" کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی نظموں میں پختگی شگفتگی اور رعنائی نہیں پائی جاتی ہے کیونکہ رازؔ مرحوم اس مجموعۂ کلام پر نظر ثانی نہیں کر سکے تھے ان کا یہ مجموعہ بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدارؔ شاعر کی گہری سیاسی بصیرت کے ساتھ اس کی خانگی زندگی کی تلخی اور معاش کی طرف سے بے اطمینانی جگہ جگہ نمایاں ہے"

(۲) انتخاب کلام راز یزدانی" ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۲ء تک کے کلام کا انتخاب عابد رضا بیدار نے ۱۹۵۴ء میں مرتب کر کے شائع کرایا تھا لیکن یہ انتخاب بھی اب نایاب سا ہو گیا ہے۔

(۳) رام پور کا ماحول شعر و سخن" اس کتاب کے زیادہ تر مضامین نگار" لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب رامپور کے ماحول اور شعر و سخن پر اُردو میں پہلی کتاب ہے لیکن اب تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔

(۴) اُردو کی داستانیں" داستان پر آپ کے تنقیدی مضامین رسالہ نگار" نیا دور لکھنؤ اور رسالہ آجکل دہلی میں شائع ہو چکے ہیں رازؔ صاحب نے اس کتاب کو مرتب کر دیا تھا یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب داستان پہ اُردو ادب میں ایک کامیاب اضافہ ہے مگر اب تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔

(۵) نظام رامپوری کی حیات اور شاعری پر یہ کتاب اُردو ادب میں ایک یادگار کارنامہ ثابت ہوگی لیکن یہ کتاب اب تک منظرِ عام پر نہیں آ سکی ہے۔

ان قابلِ ذکر کتابوں کے علاوہ رازؔ یزدانی کی تین کتابیں موسوم بہ مشترکہ زبان" ہمارے تاریخی مجرم" اور" انسان نہیں" بھی شائع ہو چکی ہیں لیکن میری نظر سے نہیں گذریں۔

رازؔ یزدانی کا شمار رامپور کے اساتذہ سخن میں ہوتا ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے لیکن فطرتاً غزل گو شاعر کی حیثیت سے رامپور کے غزل گو شعرا میں ان کا مرتبہ آثر رامپوری اور رشاد عارفی سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ ان کی غزلوں میں بڑی شیرینی نرمی سادگی اور خیال آفرینی پائی جاتی ہے داغ کی سی عریانیت اور امیر مینائی کی سی پر تکلف عمومیت کا ایک شعر بھی اُن کے یہاں نہیں ملے گا۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

وہ سامنے سرِ منزل چراغ جلتے ہیں   جواب پاؤں نہ دیتے تو میں کہاں ہوتا
محسوس ہو رہا ہے کہ گم ہو رہا ہوں میں   کس سمت آ گیا ہوں انھیں ڈھونڈتا ہوا
ان کی نگاہ شوق کو رسوا نہ کر سکا   ماتم بھی میں تباہیٔ دل کا نہ کر سکا
غم زندگی میں تو نے نہ دیا کوئی سہارا   ترے واسطے کیا تھا غم زندگی گوارا

حوادث چار تنکوں کا کریں گے امتحاں کب تک
چلیں گی آندھیاں کب تک گریں گی بجلیاں کب تک

لالہ و گل کے حسن پر دیکھ نہ اے بہار پھول
فطرت باغباں میں ہیں ایسے ابھی ہزار پھول

عقل بھی دل سے دب گئی آخر
بے نتیجہ رہے تمام علوم

مجھے قفس میں تردد نہ آشیانے میں !
کہیں غم کو رہے تو دو زمانے میں !

غنچے چٹک رہے ہیں۔ گل مسکرا رہے ہیں
دل کی زباں میں دل کو پیغام آ رہے ہیں

اب تو جیسے ہماری قسمت کی !!
ٹھوکریں بھی نہیں زمانے میں !!

سجدوں سے تھا بلند بہت نقش پائے دوست
مجھ سے بڑا قصور ہوا اضطراب میں

جیسے اک میرے زندہ رہنے سے
موت آ جائے گی زمانے کو

تری جفا نے بڑا آسرا دیا ہے مجھے !
سمجھ رہا ہوں کہ تو نے مٹا دیا ہے مجھے !

کس سے کہیے کہ گلستاں میں جب آتی ہے بہار
پھول تو پھول ہیں کانٹا بھی حسیں ہوتا ہے

گلشن کو بدلنا پڑتا ہے صحرا کو بدلنا پڑتا ہے
اک دل کو بدلنے سے پہلے دنیا کو بدلنا پڑتا ہے

اس دن کے بعد کیا ہے نگاہوں کا انتظام
جس دن یہ پھول میری نظر میں سما گئے

ابھی تو دور ہے دنیائے بیخودی یعنی !!
ابھی خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں مجھ کو

عشق کی بیکسی ارے توبہ !!
حسن درد آشنا نہ ہو جائے !!

یہ جستجو کہ مجھے خانماں خراب کرے
جمال دوست خدا تجھ کو کامیاب کرے

جب دور تھا منزل سے تھی حد نظر منزل
اب اور بھی آگے کو اک راہ نکل آئی !

منزل عشق میں کب وقت قیام آتا ہے
جو قدم اٹھتا ہے سجدے کا مقام آتا ہے

ٹھہرائے دل کہ یہ قانون ہے شہر محبت کا
جو دل غم سے تڑپ اٹھے اسے پھر دل نہیں کہتے

رازؔ یزدانی شاعر ہونے کے علاوہ صف اوّل کے محقق بھی تھے آپ کے تحقیقی مضامین دنیا کی دوسری زبانوں کے تحقیقی مضامین کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ "بوستانِ خیال" "طلسم ہوش ربا" "خان آرزو" "شاہ حاتم" وغیرہ پر جو آپ نے مقالے لکھے تھے وہ اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری کی طرح ان کی تحقیقی خدمات کو اگر کوئی اردو ادب کا طالب علم فراموش کرنا چاہے گا تو یہ ایک ادبی جرم ہوگا۔

کامیابی کے لئے ضروری ہے

کہ آپ جو الفاظ استعمال کریں ان کے معنی سے آپ پوری طرح واقف ہوں

اس سلسلے میں

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

آپ کی بہترین معاون ہوسکتی ہے

آپ گھر میں ہوں
دفتر میں ہوں
یا سفر میں
ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی رفیق ہوگی۔

طلبہ، اساتذہ، وکلا، اطبا، مترجمین اور سرکاری کارکنوں کے لیے

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری بہترین تحفہ ہے

خوبصورت طباعت اعلا درجے کا بائبل پیپر

ڈیڑھ ہزار صفحات، مضبوط جلد۔ قیمت صرف ۲۱ روپے

[illegible]

شوق قدوائی

(۳)

فریدہ نقوی

حضرت شوق قدوائی کی شاعری کا عروج اس وقت ہوا جب دبستان لکھنؤ ختم ہو چکا تھا اور تمام شاعر خواہ وہ لکھنوی ہو یا دہلوی، تلاش معاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے اور اس افراتفری کے دور میں ہر دو دبستانوں سے جو خصوصیات وابستہ کی جاتی تھیں ختم ہونے لگیں، اس پراگندگی اور افراتفری کے زمانے میں داغ کی غزلوں نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ داغ کا مخصوص رنگ اُن کی شوخیٔ زبان کا لطف، نرمی اور سرمستی نے ان کو ایک انفرادی حیثیت بخش دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے امیر مینائی جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ داغ ہی کے انداز کو اپنانے لگے۔ داغ کی شاعری میں خالص دنیاوی مسائل ملتے ہیں۔ شراب، شباب، لذت، بوالہوسی اور خالص کاروباری عشق و عاشقی پر مشتمل صدہا ایسے اشعار ہیں جو داغ کی ٹکسالی زبان میں ایسے دلکش نظر آتے ہیں کہ اگرچہ معنوی حیثیت سے ان میں کوئی بھی گہرائی اور گیرائی نہیں ہوتی پھر بھی زبان سے آفریں نکل جاتی ہے۔ زاہد، مسجد، خدا اور مذہب سے متعلق مضامین میں جابجا داغ کے ہاں شوخی اور گمراہ شرارت کا سا انداز ملتا ہے۔ داغ کا یہ مخصوص رنگ اُس زمانے کے تمام شعرا کو متاثر کر رہا ہے اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ یہ تقلید یا پیروی نہیں ہے بلکہ شوق قدوائی نے فطری طور پر داغ ہی جیسی طبیعت پائی تھی ان کا ماحول بھی داغ سے مختلف نہ تھا اور یقیناً ان کی عریانی اور اس میں ان کا ایک مخصوص رنگ واضح طور پر نظر آتا ہے ؎

اپنی مسجد لے اے شیخ اب موسم گل ہے آنے کو
اپنا قلاشیرا لے کر میں تو چلا مے خانے کو

دیکھنا ہو کچھ تو زاہد میرے بت خانے کو چل
تیری مسجد میں تو بس اللہ ہی اللہ ہے

کبھی شراب کی خواہش نہ تھی نہ ہے مجھ کو
ہر اک کرشمہ تری آنکھ کا ہے مے مجھ کو

الٰہی ہو کسی زاہد کے ساتھ حشر اس کا
جسے حسین سے خلوت میں اجتناب رہے

ہے روز حشر شوقؔ اک اور جھگڑے زندگی بھر کے
خدا بیٹھا رہے گا کیا تمہاری قصہ خوانی تک

جو بلا آتی ہے گرتی ہے وہ میرے سر پر
کیا کروں قصر فلک سے مرا گھر نیچا ہے

چین سب کو درد مجھ کو اس پہ غصہ ہے بہت
تو خدا ٹھیرا تو چپ ہوں اے خدا اب کیا کروں

حضرت شوقؔ قدوائی کا مرتبہ لکھنؤ میں ایک مسلم الثبوت استاد فن اور زبردست محقق زبان کا تھا۔ اسی لحاظ سے مرحوم کے کلام سے لغت نویسی میں بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال وغیرہ جس کثرت سے ان کے دیوان میں ہیں کسی دوسرے شاعر کے دیوان میں نہیں ملتے ان کی کہنہ مشقی، قادر الکلامی ایک ایک شعر سے ٹپکتی ہے۔ ان کی غزلیں اپنے اختصار نئی طرحوں، مختلف النوع بحروں کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ کلام کی دلکشی، لذت اور جدت بے مثال ہے۔

اگرچہ شوقؔ کی شہرت کا دار و مدار ان کی مثنوی گوئی پر ہے تاہم انھوں نے کافی عرصے تک غزل سرائی کی اور غزلوں پر مشتمل ایک ضخیم دیوان مرتب کیا۔ شوقؔ کا کلام دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی کلام اور آخری دور کا کلام نسبتاً صاف ہے اس میں عورتوں کی گفتگو کا پورا حسن نظر آتا ہے جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے شاعری میں محاورات و اسلوب کا ایک مخصوص رنگ اختیار کیا ہے جو انھی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ انکی غزلوں میں کہیں کہیں تصنع کے آثار پائے جاتے ہیں جو اودھ کے ماحول کی نشان دہی کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہندی ماحول اور جذبات کے سچے کامیاب نقشے انھوں نے کھینچے ہیں وہ انھی کا حصہ ہیں۔ انکے دیوان عام کا رنگ امیرؔ کے دیوان "مراۃ الغیب" سے ملتا جلتا ہے جس میں قدیم رنگ کی جھلک نظر آتی ہے

لیکن بعد میں آخری عمر کا کلام صاف ہوگیا ہے۔ ابتدائی زمانے کی غزلیات ملاحظہ ہوں جن پر امانت کے مخصوص رنگ کا اثر پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لکھنؤ کے ادبی ماحول میں امانت کا جو رنگ تھا۔ اس طرز میں شوق کو غزل کہنا کس حد تک آسان تھا اور وہ اپنے دور کے اساتذہ کی ادبی میدان میں برابری کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتے تھے۔

سیہ بختی بھی رنگ حسن لاتی ہے حسینوں میں
بڑھے تو سر پہ کاکل ہے گھٹے تو گال کا تل ہے
ہمارے وصل کا وعدہ پڑا ہے سخت مشکل میں
جوانی کہتی ہے آساں حیا کہتی ہے مشکل ہے
ادھر شرم سے چپ ہیں ادھر ہیں خوف سے چپ ہوں
یہ صورت ہے کہ آئینے سے آئینہ مقابل ہے
زمیں نے ہم کو پیدا کر کے کیا اے شوق پھل پایا
کہ اس کے منہ کو ہم سے ایک مشتِ خاک حاصل ہے
وہ کہتا ہے کہ توڑ دوں گا میں کہتا ہوں کہ جوڑ اس کو
وہ کہتا ہے کھلونا ہے میں کہتا ہوں مرا دل ہے

یہ کلام اس زمانے کا ہے جب امانت، اسیر اور داغ کا طوطی بول رہا تھا اور ان اساتذہ کے آگے دوسروں کا رنگ جمنا ذرا مشکل ہی نظر آتا تھا۔ عوام بھی امیر و داغ کے کلام سے مانوس ہو چکے تھے اور ان کے آگے کسی دوسرے کو داد نہ دیتے تھے مگر شوق کے یہ اشعار اس زمانے میں بھی اور اس وقت بھی ایک ایسی دلکشی اور لطف رکھتے تھے کہ زبان تعریف کئے بغیر نہیں رہتی۔ قریب قریب اسی زمانے کے کلام کا نمونہ یہ بھی ہے ؎

ہمیشہ حسن جبیں میں تو رخ میں تاب رہے
تمام عمر الٰہی ترا شباب رہے
[1] شگفتگی بھی ہے چہرے کا حسن غصہ بھی!
وہ چاہے پھول رہے چاہے آفتاب رہے

---

[1] یہ غزل (غالباً غیر مطبوعہ) منجملہ اس حصۂ کلام کے ہے جسے مصنف نے تلف کرنے کی کوشش کی تھی مگر انکے شاگرد مولوی حسین صاحب محوی لکھنوی نے اس کو محفوظ کر لیا تھا۔ (ماخوذ مقدمہ دیوان شوق)

چلا ہوں میں ترے ناتے میں میں آج پینے کو　　حرام مجھ پہ تو اے شیخ اب شراب نہیں
نہ جس میں آہ نہ دیوانہ پن نہ دامن چاک　　وہ زندگی کے لئے ننگ ہے شباب نہیں
اذاں حرم میں ہوئی ہے خدا خدا کر کے　　چلو وہ چیز پیئیں اب نماز ادا کر کے!
ہوئی ہے اس سے محبت میں تازگی پیدا　　مناؤں گا تمھیں سو بار میں خفا کر کے
گرفت اس نے بڑھا دی سمجھ کے کم اجرت　　خطا ہوئی کہ میں نادم ہوا خطا کر کے
جواب شکوہ بے جا سے لطف اٹھتا شوقؔ　　خجل کیا ہے اسے کیوں شکوۂ بجا کر کے

شوقؔ کے دیوان میں تقریباً بیس سال کا کلام موجود ہے اور یہ ان کے آخری زمانے کا کلام ہے جس میں جدید طرز کی نظمیں بھی شامل ہیں، غزلیات انھوں نے عموماً شاگردوں کے لئے نہیں کہیں بلکہ صرف دیوان مرتب کرنے کے لئے کہی تھیں دیوان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ محاورات، اصطلاحات، ضرب الامثال اور الفاظ کی صحت کا بڑا خیال رکھا گیا ہے۔ جس سے یہ دیوان زبان اردو کی ایک غیر مرتب لغت معلوم ہوتا ہے۔ صحت زبان اور الفاظ کی تحقیق کو اس حد تک ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ بعض جگہ شعر کی شعریت زائل ہو گئی ہے اور جا بجا فصاحت کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ مثلاً اس شعر کو لیجیے ؎

گیسو کو تم خوب چھپاؤ میں اک سانپ اب پالوں گا
ہر وقت اس کو دیکھوں گا اور سمجھوں گا یہ گیسو ہے

یہاں گیسو کی تکرار نامناسب ہے مگر شوقؔ صاحب نے گیسو کو چوٹی کے معنی میں واحد استعمال کرنا جائز رکھا ہے اس لئے مفید ہے۔

شعرا اپنے ہر مطلع کو سنوارنے کی کوشش کرتے اور مطلع دیوان کے لئے تو خاص اہتمام مد نظر رکھتے ہیں۔ حضرت شوقؔ اپنے دیوان کے مطلع میں کیا خصوصیت ملحوظ رکھتے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

مرا حق مان کر بن تو! مرا حاجت روا ہونا
کہ میں مانے ہوئے ہوں اے خدا تیرا خدا ہونا

آخری زمانے میں انھوں نے میرؔ کی تقلید کی بہت کوشش کی ہے اور قدیم استادان فن سے عقیدت کا اظہار کیا ہے ؎

خدا بخشے بہت ہی شوقؔ ہم کو یاد آتا ہے
وہ دل والا تھا اور اس میں جناب میرؔ کا سا تھا

میں دل سے کانوں کے بدلے سنوں اسے شوق
اگر سخن کسی شاعر کا ہو حسن کا سا!

سودا ہوں کہ آتش ہوں کہ معروف ہوں اے شوق
ہم نظم میں منت کش انداز سلف ہیں!

اس آخری شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوق نے کن کن شاعروں کی تقلید کی ہے اور کن کا تتبع کیا ہے۔ اسی طرح ان کے دیوان میں بہت سے ایسے اشعار ملیں گے۔ جو قدما کی پیروی کا قابل قدر نتیجہ سمجھے جائیں گے لیکن شوق مرحوم کا ایک خاص اپنا رنگ ہے جو دوسروں کے کلام سے ان کو الگ کئے ہوئے ہے اور پہچانا جا سکتا ہے ان کے کلام میں پختگی کی شان جھلکتی ہے اس کے علاوہ آزادگی طبع اور خلوص اتنا بے ساختہ ہے کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی مثلاً ؎

بگاڑ میں بھی ادا سے لبھائے جاتا ہے!
وہ لڑ رہا ہے مگر مسکرائے جاتا ہے

دل کے بہلانے کو چھوڑ دوں ڈاک میں
اس کی جانب سے خط اپنے نام کے!

کسی معشوق کے کوچے میں نہ جمنے پائے
عمر بھر سر سے نہ اترا کبھی بستر اپنے

شوق کی شاعری میں مجموعی حیثیت سے صنف غزل میں کیفیات ملتی ہیں ان میں عشقیہ جذبات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں ایک آفاقیت پوشیدہ ہے یہی وجہ ہے کہ جو جذبات ولی۔ میر۔ درد کے ہاں موجود ہیں وہ آج بھی ہیں اپنے جذبات و کیفیات کی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان تصویروں میں جذبے کے اشتراک کے سبب یکسانیت و ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے یا جو کچھ ولی یا میر نے کہا ہے آج کے غزل گو شعرا اسی کی تکرار کر رہے ہیں بلکہ جذبے کی آفاقیت کے باوجود اس کی ترجمانی میں کہیں بھی یکسانی و یک رنگی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غزل گو

ہے۔ غزل کے ہر دور بلکہ ایک ہی دور کے مختلف غزل گو شعرا میں اظہار رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میر کے ہاں عشق و ناکامی نامرادی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ درد کے ہاں اسی نے حقیقت و معرفت کا روپ دھار لیا ہے۔ جرات کے ہاں اسکی تان ہوس ناکی پر ٹوٹتی ہے۔ مومن کے ہاں اس نے لذت پرستی، رندی اور سرمستی کی شکل اختیار کی ہے۔ غالب اور اقبال کے ہاں اس میں فکری گہرائی اور فلسفیانہ رموز و نکات کی آمیزش و آویزش نظر آتی ہے۔ مختصر یہ کہ مختلف ادوار میں ایک ہی زمانے کے مختلف شعرا نے اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق عشق کے جذبے کی عکاسی کی ہے۔

دوسرے شعرا سے قطع نظر جب ہم حضرت شوق قدوائی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انکی شہرت کا دارومدار مثنوی گوئی پر ہے۔ تاہم انھوں نے غزل گوئی کافی عرصے تک کی۔ دنیائے ادب میں ان کا شمار اگلے اور پچھلے لوگوں کے درمیان ایک کڑی ہے۔ انھوں نے لکھنؤ میں امانت اور وزیر کے رنگ کی انتہا دیکھی۔ رام پور میں امیر اور داغ کا عروج دیکھا اور جب جدید شاعری کی صبح نمودار ہو رہی تھی تو انھوں نے پیام اجل کو لبیک کہا۔ وہ ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع، ان کی معلومات وافر اور تجربہ بڑھا ہوا تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ انھوں نے قدیم صحبتوں اور روایتی دائروں سے باہر نکل کر اخلاقی جسارت کے ساتھ جدت طرازی کی دنیا میں قدم رکھا اگرچہ قدامت پسندوں کی طرف سے ان پر اعتراضات بھی ہوئے مگر جدت پسندوں کی باتیں کچھ ایسی زرین فطرت اور رنگتی ہوئی تھیں کہ باوجود ان خامیوں اور لغزشوں کے دلوں میں گھر کرنے لگیں اور جب یہ راہ کھل گئی تو بزم سخن کی نیرنگیاں عجب لطف دکھانے لگیں۔

اس اعتبار سے ہم اکبر اور اقبال کے مداح ہیں، اسی بنا پر حالی اور شبلی کو مجددین اردو میں شمار کرتے ہیں یہ بات اور ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا مذاق سخن، معیار خوبی، طرز ادا وغیرہ جداگانہ تھا۔ اگر ایک کا انداز مزاحیہ تو دوسرے کا رنگ حکیمانہ تھا۔ اگر ایک مورخ کی بے تکلفانہ شان رکھتا تھا تو دوسرا مصور یا محرم راز کی۔ یہ انفرادی تعریفیں ہیں اور عجب نہیں کہ یہ شعرا ایک دوسرے کے ہم پلہ بھی ہوں مگر ان چار ہستیوں میں خدمت علم اور حسن نیت کے لحاظ سے جو جوہر مشترک تھا وہ یہی کہ انھوں نے روایتی شاعری کو بت بنا کر نہیں پوجا تھا بلکہ اپنا قبلہ الگ بنایا جس کی طرف اب ساری دنیائے اردو کا سر نیاز جھکتا ہے۔ (جاری)

نصرتی
(بابائے اردو)
یہ کتاب ملک الشعرائے بیجاپور مُلّا نصرتی کے حالات زندگی اور جائزہ کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں بابائے اردو نے بڑی تحقیق و جستجو سے نصرتی کے حالات جمع کئے ہیں نیز نصرتی کے غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب مع شرح و حواشی شامل کیا ہے۔
قیمت پانچ روپے
انجمن ترقئ اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی

ملک الشعرا، غواصی کا نام

سخاوت مرزا

ہمارے مکرم جمال شریف صاحب جنھوں نے اب جامعہ علیگڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کرلی ہے میرے ایک مضمون "نصاب الاحتساب کا کاتب غواصی" پر جو اورینٹل کالج میگزین ۱۹۵۶ء لاہور میں شائع ہوا تھا بعض اعتراضات سب رس جنوری ۶۸ء میں زیب قلم فرمائے ہیں، اور جناب مدیر سب رس نے اداریہ میں موصوف کے اعتراضات پر "برہان قاطع" ہونے کی مہر بھی ثبت فرما دی ہے۔

میں نے تو غواصی کے نام سے متعلق ایک انکشاف کیا تھا جس سے ہمارے مشہور ادبائے حیدرآباد قاصر رہے ہیں۔ مگر محققین ادب اردو ہند و پاکستان کی کوئی تنقید نظر نہیں آتی۔

پاکستان کے مشہور رسالے "ماہِ نو" میں تنقید سے متعلق ایک عنوان ہوتا ہے "ما و شما" "یا آپس کی باتیں" جس میں مضمون نگار کے متعلق غیر سنجیدہ الفاظ استعمال نہیں ہوتے اور بقول الانسان مرکب من الخطاء و النسیان غرض تنقید کا یہ ایک اچھا طریقہ ہے، مکرمی جمال شریف نے جو الفاظ میرے متعلق استعمال فرمائے ہیں اُس سے میں متاثر نہیں ہوں اور بقول جوابت بگویم کہ آید پسند کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔

نصاب الاحتساب کے کاتب نے ترقیمے میں اپنا نام اور لقب اس طرح لکھا ہے:-

"شیخ حسین بہاؤ الدین الملقب بغواصی" پھر یہ بھی لکھا ہے کہ نام کی ترکیب سے ایرانی ذہن ظاہر ہوتا ہے (سب رس ص۱۳) کاتب مولانا شاید عرب تھا شاید
ں نے ایران میں سکونت اختیار کر لی ہو۔"

یہ کچھ عجیب استدلال ہیں تو کیا ہندوستانی علماء کے نام اور ترکیب ایسی نہیں ہوتی؟ فاضل نقاد نے (سب رس ص ۹) تخلص اور لقب میں فرق ضرور
۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ "لقب" کن کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کے متعلق فاضل ناقد نے جستجو نہیں فرمائی۔ میں نے اس کے معنی مجازاً "معروف" بھی
ہ کئے تھے۔ میں نے بعض اہل علم سے استمزاج کیا اور بعض لغات فارسی و انگریزی بھی پیش نظر رہیں۔ لغات سعیدی، مؤلفہ محمد سعید انصاری رفیق دارالمصنفین
لوی عبدالعزیز، حضرت شمس بریلوی۔

جس کے ماخذ یہ ہیں:- صراح، منتخب، المنجد، فرہنگ ناصری، کشف اللغات، بہار عجم، برہان قاطع وغیرہ۔ غرض اس میں لفظ "ملقب" معنی یہ لکھے ہیں۔ بامعنی وصفی نام رکھا گیا "معروف"۔

By Name: Nickname - پلاٹ، ڈکشنری: لقب
Titles of honours, epithets - لقب F. Steingass Persian, English
Appellations, styles - Surnames, forms of Address

جس سے پتہ چلتا ہے کہ لقب سے مراد عرفیت بھی آتی ہے لہٰذا الملقب بہ غواصی سے مراد المعروف بہ غواصی ہے۔ اور بقول نقاد، شعرا اپنی عرفیت اور تخلص سے زیادہ مشہور ہوتے ہیں۔

دوسری بحث اور اعتراض یہ ہے کہ "ایک غواصی یزدی بھی تھا" (ص ۵۰ سب رس)، مگر یہ غواصی، غواصی گولکنڈوی سے سو سال قبل گزرا ہے اس کا سنہ وفات سنہ ۹۵۰ھ ہے اور غواصی یزدی شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور ہمارا غواصی زیر بحث کس مذہب کا پیرو تھا اس نے تو صحابۂ کرام رض اور حضرت خواجہ گیسو دراز قدس سرہ حضرت غوث اعظم رض کی منقبت میں قصاید کہے ہیں۔ تو پھر نصاب الاحتساب کا کاتب غواصی یزدی، یا اس کی اولاد میں عزیز الدین کیسے ہوسکتا ہے؛ فاضل مرتب فہرست مخطوطات جلد ۲ ص ۹۵ نے غواصی کے بعض قصاید کا نمونہ درج کیا ہے جس میں صحابہ کرام پر طعن و تشنیع اور سب و شتم سب کچھ ہے اور اس کو غواصی گولکنڈوی سے منسوب فرمایا ہے، مگر یہ تو غواصی یزدی ہی معلوم ہوتا ہے، فاضل نقاد کو اس پر بھی تو تنقیدی نظر ڈالنی چاہیے تھی۔ غرض غواصی گولکنڈوی کا سنی المذہب ہونا یقینی ہے اور نصاب الاحتساب، فقہ حنفی سے متعلق ہے۔

کیا عزیز الدین غواصی یزدی یا اس کی اولاد میں بہاؤ الدین محولہ معترض کیا گولکنڈہ بھی آیا تھا۔ اور کیا "غواصی" خاندانی لقب ہی ہوگیا تھا؟

حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے اپنے رسالے عمادیہ نمبر میں بہت سے علمائے گولکنڈہ وغیرہ کے نام گنوائے ہیں مگر کسی اور غواصی کا نام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ سید علی غواص ترمذی خلیفہ مولانا نظام الدین تھانیسری محولہ فاضل نقاد ص سنہ ۱۰۴۲ھ میں وفات پاچکے تھے اور نصاب کی کتابت سنہ ۱۰۹ھ ہے بیان ہے کہ بقول ڈاکٹر زور، وغیرہ قیاس ہے کہ غواصی ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷-۹۸۸ھ) کے زمانے میں پیدا ہوا۔ عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵/۱۰۸۳ھ کے زمانے میں فوت ہوا (ص ۱)، وجہی نے اپنی مثنوی پھول بن (۱۰۱۸ھ) میں اس پر چوٹ کی ہے" مگر غواصی کی پہلی تصنیف سیف الملوک ۱۰۲۵ھ کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ غواصی سنہ ۱۰۱۸ھ میں ایسا مشہور نہ تھا کہ وجہی اس پر چوٹ کرے۔

کیا غواصی عربی جانتا تھا؛ اس کے کلیات میں عربی فارسی ترکیبیں ملتی ہیں۔ غواصی کے ساتھ ملا کا لفظ اس کی عالمیت پر دال ہے۔

فاضل معترض کا خیال ہے کہ عام طور پر شد بد پڑھے لکھے غیر عربی داں بھی عربی الفاظ، ترکیبیں اور ترجمے اپنی تحریروں اور تقاریر میں استعمال کر ہیں، جو روزمرہ مشاہدہ ہے" (ص ۶ بیاض)، یہ استدلال کہاں تک درست ہے، اگر ایسے مصنف یا مقرر سے کوئی پوچھ بیٹھے کہ اس کے کیا معنی ہیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگیگا۔

اعتراض یہ ہے کہ اس جملے سے کہ "قد بلغ المقابلۃ بحسب الطاقۃ البشریۃ" سے ضعیف العمری ثابت نہیں ہوتی۔" (ص ۹)، تو کیا کسی کتاب مقابلے کے لئے بڑی قوت اور طاقت کی ضرورت ہے۔ معترض فرماتے ہیں کہ "غواصی نے طوطی نامہ کے آخر میں تارک الدنیا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ آخری ز گمنام ہے۔"

[illegible]

کے زمانے میں مذہبی زندگی اور علوم سے بہتر کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ سلطان عبداللہ کی وفات سنہ ۱۰۸۳ھ اور نصاب الاحتساب کی کتابت سنہ ۱۰۸۵ھ میں چند ہی سال کا تو فرق ہے۔ اپنے اپنے قویٰ پر موقوف ہے، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اس زمانے کے لوگوں کے قویٰ مضبوط ہوتے تھے جو ظاہر بین عقل سے۔

معترض کا بیان ہے کہ "کتب خانۂ آصفیہ کے ایک مخطوطے میں ایک مرثیہ ہے جس کی سرخی ہے "مرثیہ امام حسین از مولانا غواصی است" (مکتوبہ سنہ ۱۱۵۲ھ) چونکہ یہ ملا غواصی کے قریب ترین زمانے کی تحریر ہے اس لئے حسین غواصی یا مولانا غواصی سے بالکل الگ شخصیت قرار پاتی ہے" (ص ۷) مگر الفاظ "ملا" اور "مولانا" فاضل اشخاص کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے، اگر کسی نے بجائے "ملا" کے مولانا لکھ دیا تو کیا شخصیت بدل جائیگی۔ اس زمانے کے علماء اور فضلا کو "ملا" ہی کے لفظ سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ اور یہ اشخاص اکثر خطاط بھی ہوا کرتے تھے۔ اپنے اس تبصرے کے دوران میں فاضل نقاد نے ایک نیا انکشاف فرمایا ہے کہ "غواصی کا نام ابو محمد تھا، جو دیوان غواصی میں ایک رباعی کے عنوان پر لکھا ہوا ہے۔ (ص ۱۱) تو کیا ابو محمد کنیت ہے یا اصل نام ہے۔ میں نے دیوان غواصی کا مطالعہ کیا ہے میری نظر سے نہیں گزرا۔ خیر اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ کسی "ابو محمد" شاعر کی رباعی، دیوان غواصی میں مخلوط ہو گئی ہو۔ محمد بن عمر صاحب مرتب دیوان غواصی مطبوعہ ادارہ ادبیات اُردو نے تو بہت سی غزلیں جو بیان کیا جاتا ہے کہ دوسرے شاعروں کی مخلوط تھیں حذف کر دی ہیں مگر تعجب ہے کہ فاضل مرتب دیوان نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا کہ کس شاعر کی مخلوط ہو گئی ہیں۔ تو پھر یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ "ابو محمد" غواصی کا نام ہے اور جناب فاضل نقاد کا یہ نیا انکشاف ہے۔ البتہ ابو محمد نامی ایک بزرگ گولکنڈہ میں ضرور گزرے ہیں، جن کا ذکر کسی کتاب میں میری نظر سے گزرا تھا۔

غرض جب تک کوئی قطعی ثبوت نہ ہو کہ شیخ حسین ملقب بہ غواصی ملک الشعرا ملا غواصی سے علیحدہ شخص ہے ہم کو ناقد کے بیان سے اتفاق نہیں۔

مرحوم دہلی کالج
بابائے اردو
مرحوم دہلی کالج کا شمار ہند و پاکستان کے ان علمی اداروں
میں ہوتا ہے جنھوں نے اس برصغیر میں اشاعت علم کی
خدمت صحیح معنوں میں انجام دی۔ دہلی کالج میں تمام تعلیم
اردو کے ذریعے ہوتی تھی۔ بابائے اردو نے اس کالج کی تاریخ
اس کتاب میں بیان کی ہے۔ قیمت:۔ پانچ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

ایک عظیم الشان علمی کارنامہ

قاموس الکتب

کتابوں سے متعلق یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلی جلد جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے شایع ہو چکی ہے۔ یہ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مکمل فہرست ہے جس میں تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق بنیادی معلومات دی گئی ہیں۔

یہ کتاب $\frac{۲۰\times۳۰}{۸}$ تقطیع کے چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

قیمت :- چالیس ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ، کراچی

شاعرِ بزمِ دلبراں - مجاز

ناظر انصاری جلگانوی

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں

نام :- اسرار الحق - تخلص :- مجاز
تاریخ ولادت :- اکتوبر ۱۹۱۱ء
مقام ولادت :- ردولی ضلع بارہ بنکی (اترپردیش)
تاریخ وفات :- ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء
مقام وفات :- لکھنؤ
ابتدائی تعلیم :- ردولی کے ایک مکتب میں
ثانوی تعلیم :- امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ
اعلا تعلیم :- ایف اے سنٹ جانسن کالج آگرہ،
بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،
ایم اے نامکمل۔
کالج میں - حضرت معین احسن جذبی کی رفاقت
آگرے میں - ہم سائیگی حضرت فانی بدایونی مرحوم
رفاقت حضرت میکش اکبرآبادی
تصانیف :- آہنگ، پہلا ایڈیشن لکھنؤ ۱۹۳۸ء
(۱) آہنگ - (باضافہ، دوسرا ایڈیشن) دہلی ۱۹۴۵ء

شاعری کا آغاز :- سنہ ۱۹۳۱ء - بمقام آگرہ

اوّلین غزل سے

حسن کو بے حجاب ہونا تھا
شوق کو کامیاب ہونا تھا

علی گڑھ سے اوّلین تعارف - ۱۹۳۲ء میں سالانہ مشاعرہ انجمن حدیقۃ الشعرا دسمبر ۱۹۳۲ء

عنوان نظم : صبح بہار

انتساب آہنگ :- فیض اور جذبی کے نام
جو میرے دل و جگر ہیں
سردار اور مخدوم کے نام
جو میرے دست و بازو ہیں

انتسابِ شب تاب

عصمت کے نام —— مجاز

مارچ سنہ ۱۹۴۵ء یوم پاکستان دہلی

ادارت

(۱) مدیر "آواز" دہلی
آل انڈیا ریڈیو کا رسالہ سنہ ۳۶-۱۹۳۷ء

(۲) رکن ادارہ - "نیا ادب" لکھنؤ
ترقی پسند مصنفین کا ترجمان سنہ ۱۹۳۹ء

(۳) رکن ادارہ - "ادیب" دہلی
ادبی ماہنامہ سنہ ۴۲-۱۹۴۳ء

(۴) رکن ادارہ - "پرچم" رائے بریلی
پندرہ روزہ ادبی جریدہ سنہ ۱۹۵۲ء

(۵) اسسٹنٹ لائبریرین - ہارڈنگ لائبریری دہلی سنہ ۱۹۴۲ء

(۶) معاون افسرانِ اطلاعات :۔ محکمۂ اطلاعات حکومت بمبئی ۱۹۴۵ء

مجاز فلمی دنیا میں :۔

(۱) فلم "شکایت" کے چند نغمے قلم بند کیے۔
(۲) فلم "غلامی" میں مشہور نظم "آوارہ" کے چند بند فلمائے گئے۔
(۳) فلم "ٹھوکر" میں "آوارہ" کے چند اور بند اندازِ نو سے پیش کیے گئے۔

اتفاقات ہیں زمانے کے

ماہنامہ "آواز" دہلی کا نام مجاز مرحوم نے تجویز کیا تھا۔
ماہنامہ "آہنگ" کراچی کا نام مجاز مرحوم کے مجموعۂ کلام کے نام پر رکھا گیا۔

مجاز مرحوم نے جس دَور میں شاعری شروع کی وہ غلامی، معاشی بدحالی، تعلیمی پستی، سیاسی پسماندگی کے لحاظ سے تاریخ ہند کا بڑا ہی بحرانی دَور تھا۔ مجاز نے جن ادبی روایات کے سائے میں آنکھ کھولی اُن کا ادبی جائزہ اس طرح لیا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبال نئے عالم کی تسخیر و تعمیر میں مصروف تھے۔ اور ملک و ملت کو بیدار کرنے کے لیے نئے ترانے گا رہے تھے۔ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی عروسِ انقلاب کی رونمائی کے لیے بے تاب و بے قرار تھے۔ فانی کی غزل گوئی گلستانِ تغزل میں بہار آفرینیاں پیش کر رہی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُن فلسفۂ تغزل زندگی اور موت کے محور پر گھوم رہا تھا۔ اصغر مرحوم خانقاہِ ادب میں تصوف کے مسائل چھیڑ رہے تھے۔ فردوسئ ہند حضرت حفیظ جالندھری شاہنامۂ اسلام کے ذریعے قرونِ اولیٰ کی اسلامی زندگی اور سیرت کی عکاسی کر رہے تھے۔ اختر شیرانی تغزل اور رومانی عناصر کو اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔

سیاسی اور سماجی حالات کے لحاظ سے بھی یہ بڑا پُرآشوب زمانہ تھا۔ جب مجاز نے فنی بصیرت کے زیرِ اثر باقاعدہ مشقِ سخن کا آغاز کیا۔ اُس وقت ہندوستان کی سیاسی سماجی اور ادبی زندگی نہایت تیز رفتاری سے انقلاب کی شاہراہ پر گام زن تھی۔ انقلابِ نو کے اثرات صفحۂ عالم پر مرتسم ہو رہے تھے۔ پُرانے اثرات سے گریز کیا جا رہا تھا انھیں مٹایا جا رہا تھا۔ سیاسی اور قومی بیداری معاشی کشمکش کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ اگرچہ ہر اچھے شاعر نے (وؔلی سے لے کر اقباؔل تک) زندگی سے متاثر ہوکر ادب کی تخلیق کی ہے۔ لیکن ہر شاعر اپنے دور سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ مجاز نے بھی ادب برائے

زندگی کے نظریے کو اپنایا ۔ اس زمانے میں فیضؔ اور مجازؔ دو ایسے فنکار پیدا ہوئے جن کی شاعری کو ہر مکتبۂ خیال اور ہر مدرسۂ فکر و نظر کے اربابِ بصیرت نے قدر شناسی کی میزان پر تول کر انھیں پرکھا اور جانچا ۔ اور ان کے فکر و فن اور شخصیت کی مختلف اقدار اور پہلوؤں کو سراہا ہے ۔

بہرکیف چونکہ شعرا شعوری طور پر اس دور کے خیالات و اثرات سے متاثر ہو رہے تھے ۔ پھر مجازؔ جو ایک حساس شاعر واقع ہوئے تھے انقلابِ وقت کے اس آہنگ سے کیونکر متاثر نہ ہوتے ۔ انھوں نے انسانی ہمدردی اور قومی فلاح و بہبود کے لیے تڑپنے والا دل پایا تھا ۔ فیضؔ نے اپنے خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو لی تھیں ۔ اور مجازؔ نے اپنے خونِ جگر میں قلم ڈبو لیا تھا ۔ آزادیٔ ہند کی تحریک اپنے شباب پر پہنچی تو مجازؔ کا شاعرانہ شعور بھی شباب تند رو کی منزل میں قدم رکھ چکا تھا ۔

مجازؔ نے شروع شروع میں رومانیت ہی کو جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا ۔ آہستہ آہستہ وہ انقلاب کی شاہراہ پر چل پڑے مسلسل فکر سخن اور شعوری صلابت نے انھیں فنکارانہ قدرت عطا کی ۔ فنی بصیرت ، تقاضائے وقت اور ذہنی صلاحیت نے مل کر انھیں انفرادیت کے مدارج بخشے ۔

رومان سے انقلاب تک اردو کے اس جواں فکر و جواں سال ہونہار شاعر کے ذہن رسا اور فکر بلند نے نظم و غزل کے جس قدر جواہر تراشے ہیں وہ اس قدر آبدار اور روشن ہیں کہ ان کی آب و تاب صدیوں تک اردو شاعری کو منور و تاباں کرتی رہے گی ۔

ان کی نظموں میں فنی شعور کی گہرائی اور نظریاتی پختگی بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ انھوں نے رومانیت کے رنگین و دلآویز نغمے فضاؤں میں منتشر کیے ۔ اور بغاوت کے پُرجوش و پُروقار ترانے بھی گائے ہیں ۔ لیکن اردو شاعری کے عام مزاج کو ہر دم پیش نظر رکھا ہے ۔ معاصرین کی مانند تجربات میں وقت ضائع نہیں کیا ۔

وہ اپنی زندگی کا نظریہ یوں بیان کرتے ہیں ؎

سچ تو یہ ہے مجازؔ کی دنیا
حسن اور عشق کے سوا کیا ہے

اور اپنا تعارف یوں کرا رہے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے دنیا میری   فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
اہل دنیا کے لیے ننگ سہی   رونقِ انجمن یار ہوں میں
رشکِ صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں

[redacted]

بعض ترقی پسند ادیب و شاعر ماضی کے ادبی و شعری سرمائے کو حقیر و لایعنی خیال کرتے ہوئے اس سے بے نیاز رہتے ہیں اور عملی طور پر اس سے بیزاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ماضی کا ادبی سرمایہ ایک دفتر پارینہ ادرجہ رکھتا ہے جس سے وہ کوئی استفادہ نہیں کر سکتے۔ اور نہ کسی قسم کا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا سابقہ ادبی سرمایہ نہایت بلند مرتبہ ہے اور عظمت نشان کارناموں پر مشتمل ہے، ہماری موجودہ نسل کے لیے ایک شاہراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان اور فن کا حصول خاص طور پر پچھلے ادبی سرمائے کا رہین منت ہے۔

اِس سلسلے میں جناب فراقؔ گورکھپوری نے اپنے نظریے کی وضاحت اس طرح کی ہے: ۔

> ترقی پسند ادب کے بہت سے ادیب قدیم ادب سے بہت ناکافی استفادہ کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ تہذیب و ادب انقلابوں کے باوجود اپنے سلسلوں اور سرچشموں سے اگر بے نیاز ہو گئے تو سخت گھاٹے میں رہیں گے۔ دنیا کی سب سے پرانی دستیاب رگ وید سے لے کر ٹینی سن سوئن برن، ٹالسٹائی، ٹیگور، اقبالؔ، غالبؔ اور انیسؔ تک ادب میں دوسروں کو متاثر کرنے کے جو طریقے اور فنی معجزے ہمیں ملتے ہیں اگر ہم نے انھیں حاصل نہیں کیا تو محض ترقی پسند مقاصد ہم سے بڑے ادب کی تخلیق نہیں کرا سکتے۔

شاہراہ فروری ۱۹۵۶ء۔

مجازؔ کے کلام میں پیش رو اساتذہ کا اسلوبِ اظہار نمایاں ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے وہ وضع قدیم کو اپنائے وئے ہیں، وہ ہمیں جدید طرز ادا سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ پروفیسر مجنوںؔ گورکھپوری نے اس خیال کو یوں ظاہر کیا ہے۔ جو مجازؔ کی شاعری کے جوہر کو پرکھنے کے لیے عمدہ کسوٹی ہے۔

> "مجازؔ کی شاعری میں روایاتِ قدیم کا بہترین زندہ ترکہ موجود ہے اور اُس کے ساتھ نئی زندگی کی دھڑکنیں بھی واضح طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ یہ اجزا اُن کی شاعری میں اس طرح ایک مزاج بنے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا"

مجازؔ کے کلام میں ہمیں غنائیت اور فن کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اس کے بیشتر اجزا میں غم جاناں اور غم دوراں طرح خود ان کا اپنا غم بھی سمویا ہوا ہے۔ ان کی زندگی کی عکاسی ہمیں ان کے کلام کے بیشتر حصے میں نظر آتی ہے رچونکہ یہ حدیث جاں گداز حقائق سے لبریز ہے اس لیے دل میں گھر کر جاتی ہے۔

مجاز نے جن اصنافِ سخن پر قدرت حاصل کی اُن میں زبان کی لطیف ترکیبوں کے جواہر پارے بکھر دیے ہیں اُن کے کلام میں زبان و بیان کے اسقام نہیں ملتے ۔

وہ اپنے جذبات کو نہایت والہانہ انداز میں برجستگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔ مشاہدے کی صحت اور الفاظ کا مناسب رکھ رکھاؤ ، یہ وہ اوصاف ہیں جو اُن کی نظموں میں جان ڈال دیتے ہیں اور وہ قبول عام عطا کرتے ہیں جو اُن کے ہم عصروں میں دوسرے شعرا کو بہت کم نصیب ہوا ہے ۔ لفظی تصویر کشی کے فن پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے ۔

مجاز کی نظموں نے ترقی پسند ادب کے چہرے پر فکر و دانش اور مقصدِ فن کا ایسا رنگ و روغن چڑھایا ہے جس سے ترقی پسند ادب کی جبیں منوّر ہو گئی ۔

شاعرِ وقت کا نقیب ہوتا ہے ۔ وہ اپنے دور کی مفید تحریکات کی ہم نوائی میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے اردو زبان کو ہندوستان میں یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ اس کے شاعروں نے ہمیشہ وطنی اور ملّی تحریکات کا ساتھ دیا ہے اور عوامی جذبات کو اپنے فن میں سمویا ہے ۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جدید اردو شاعری کے امام مولانا الطاف حسین حالؔی تھے ۔ اس شاہراہ میں وہ ایک روشن منارے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اُردو تنقید کی داغ بیل بھی مولانائے موصوف ہی نے ڈالی ہے ۔ اس مد میں اُنھیں اوّلیت کا شرف حاصل ہے انھوں نے اردو ادب کو گراں قدر جواہر سے مالا مال کر دیا ہے نئے احساسات سے آشنا کیا ہے ۔ رخشِ تخیل کی عناں نئے میدان اور نئی اصناف کی طرف موڑی ہے پھر اکبر الہ آبادی اور اقبال نے اپنی جدت پسندی کی عمارت کھڑی کی ۔ ازاں بعد جوؔش اور مجاؔز نے سیاست اور اشتراکیت کی تخم ریزی اپنی شاعری کے ذریعے کی ۔ اس طرح جدید شاعری کے بعد ترقی پسند شاعری کا آغاز ہوا ۔ ترقی پسند شعرا کا مقصد شاعری زیادہ تر سیاسی اور اشتراکی رہا ہے ۔ اسی لیے ترقی پسند شاعری کو وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو در اصل ہونی چاہیے تھی ۔ اس کی توجیہہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے نہایت واضح الفاظ میں یوں کی ہے :-

> " ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بنیادی آزادی اور عام انسانی ہمدردی کا تصور اردو میں نیا نہ تھا ۔ اقباؔل نے بڑی خوبی ، خوب صورتی اور خلوص کے ساتھ ان باتوں کو ہمارے دلوں میں اتار دیا تھا ۔ اُردو شاعری اس رنگ و آہنگ سے پورے طور پر آراستہ و استوار ہو چکی تھی ۔ اقباؔل نے جس روح کو بیدار کر دیا تھا اس کے مقابلے میں اس طرح کے انقلاب کے لیے زیادہ گنجائش نہیں رہ گئی تھی ۔ جو ترقی پسند پیش کر رہے تھے "

تاہم ترقی پسندوں میں مجازؔ، فیضؔ، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، مجروحؔ سلطان پوری، احمد ندیم قاسمی اور مخدوم محی الدین کے انقلابی نغموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مجازؔ ان سب کے پیش رو تھے۔ انھوں نے سماجی شعور کو داخلی آہنگ عطا کیا ہے۔

شدتِ تاثر کے باعث مجازؔ کی تخلیقات اپنے قارئین سے خراجِ تحسین و آفریں وصول کرلیتی ہیں۔ قارئین کو آفریں باد کہنا ہی پڑتا ہے۔ یہ اُن کے فنّی معجزے کا پختہ ثبوت ہے۔ اُن کا تدریجی ارتقا ہمیں بتاتا ہے کہ شاعر کا ذہن بیدار ہے، اُس کا شعور بیدار ہے، اُس کی شاعری میں جذبۂ تیقن کارفرما ہے۔ مجازؔ کے جان دار استعارے، متحرک تشبیہیں، مترنم اندازِ کلام، نرم و شیریں اور خوش آہنگ لہجہ انھیں دوسرے ترقی پسند شعرا میں فیضؔ کا سا ممتاز درجہ عطا کرکے اُن کی انفرادیت اجاگر کرتا ہے۔

. ابتدائی دَور میں بھی انھوں نے ریل کے مشاہدے سے بیش قیمت فلسفیانہ نکات کو بطرزِ احسن بیان کیا ہے۔ گویا ابتدائی دَور میں مجازؔ کے تصوّر میں حرکت اور ارتقا بسے ہوئے تھے۔ اور یہ ترقی پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی ایک امتیازی علامت تھی۔ ریل سے ارتقائے زندگی کا راز اور شباب تندرو کی امنگوں کو اخذ کرلینا مجازؔ ہی کے ترقی پسند ذہن کا ادبی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نظم نویسی کا فن سہل و آسان نہیں ہے۔ اس میں بڑے فنکارانہ حسن کی ضرورت ہے۔ یہ ہر پختہ نظم گو فنکار جانتا ہے۔ خیالات لحظہ بہ لحظہ اور منزل بہ منزل بساطِ نظم پر پھیلتے جاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ پوری نظم کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ مجازؔ کی نظموں میں یہ فنکارانہ حسن بخوبی پایا جاتا ہے۔ "رات اور ریل" جو اُن کی ابتدائی مگر امتیازی منظومات میں سے ایک شاہکار نظم ہے۔ اسے اکثر محاسن کی بنا پر بیانیہ نظم بھی کہہ سکتے ہیں یہی نظم شاعر کے پختہ اور مستحکم قوتِ پرواز کی شاہدِ عادل بن گئی ہے نظم کا آغاز بڑے دل کش پیرائے میں ہوتا ہے ؎

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی   نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی جھومتی سیٹی بجاتی کھیلتی   وادیٔ کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دل نشیں   آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کا گیت   ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

وہ ریل کو ایک بانکی اور شوخ حسینہ کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اندازِ بیان کی شوخی ملاحظہ ہو ؎

ٹھوکریں کھاتی لچکتی گنگناتی جھومتی سرخوشی میں گھنگرؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم اک دلھن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی کانپتی پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہے اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

اس نظم میں مناظرِ فطرت کی دل کشی کا اظہار مجازؔ کے موقلم کا کمال ہے۔ ان مناظر میں وہ انقلاب کی آہٹیں محسوس کرتے ہیں۔ انقلاب کے ساتھ حرکت اور ارتقا کی تیز رفتاری بھی اُن کے تصور میں بسی ہوئی ہے ؎

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بہ دم رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی
ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
مرغ زاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

تشبیہات و استعارات کے ساتھ چند فلسفیانہ نکات بھی دیکھیے ؎

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
پل پہ دریا کے دمادم کوندتی للکارتی اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں ساحلوں پر ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی
دامنِ تاریکیٔ شب کی اُڑاتی دھجیاں قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی

ایک ایک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار   عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی

آخر میں یہ شاعرِ آتش نفس اس نتیجے پر پہنچا ہے ؎

الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

مجاز کی شاعری کا آغاز بڑا شاندار تھا - اور مُلک نے اُس کی قدر بھی کی۔ بڑے بڑے جید ادیبوں نے اُن کی نظم نویسی کے لہجے کی تازگی کو سراہا ہے - چناں چہ پروفیسر فراق گورکھپوری "رات اور ریل" پر رائے زنی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :-

> "سنہ ۱۹۳۷ء کا زمانہ تھا - اُس زمانے میں ایسی نظمیں بہت کم دیکھنے میں آتی تھیں - مصرعے دریا کی طرح جوش مارتے بڑھ رہے ہیں ، رات کے اندھیرے اور سناٹے کو ریل کی گھڑگھڑاہٹ چیرتی پھاڑتی جا رہی تھی -
>
> یہ نظم تھی مجاز کی جس کا نام میں نے اُس وقت تک نہیں سنا تھا - مجھے محسوس ہوا کہ ایک نئی آواز نے اردو میں جنم لیا ہے - یہ آواز سن کر ہزار ہا لوگوں کے جسموں میں دل کی دھڑکن اور خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی -
>
> یہ نظم جمود شکن تھی اور ترقی پسند شاعری کے اعلان نامے MANIFESTO کی حیثیت رکھتی تھی "

مجاز کی ابتدائی شاعری بھی رومانی دور کی مظہر ہے - اُس دور میں اُن کے لیے زندگی یکسر رومان تھی جس میں رومان کی شیرینی کے ساتھ کسی قدر حرماں نصیبی اور یاسیت کی تلخی کا جز شامل تھا " اُن کا جشنِ سالگرہ " اسی دور کی بہترین نظم جو سنہ ۱۹۳۵ء کی ایک شاہکار تخلیق ہے ، اس نظم میں وہ ایک ایسی زہرہ جبیں عورت کی تصویر کشی کرتے ہیں جو شباب و دوشیزگی کے شیریں خواب اور کرب و اضطراب سے واقف ہے - جس کی آنکھیں شرم و حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہیں - لیکن اُس خامشی محجوب میں بھی مفہوم و معانی کا ایک مواج سمندر جوش زن ہے - یہ عورت ایک مجسمۂ وفا ہے - مجاز اس منظر کی دل کشی اور سحر آفرینی اپنے قلم سے کئی درجے بڑھا دیتے ہیں ؎

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی   بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی

آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہر سانس میں احساسِ فراواں کی کہانی   خاموشیٔ مجوب میں ایک سیلِ معانی
جذبات کے طوفان میں ہے دوشیزہ جوانی

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے   میزانِ جوانی میں اُسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

اے تُو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی   ہو تجھ کو مبارک یہ تری نور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

اور پھر شاعر کے پُرخلوص جذبات دعاؤں میں ڈھل جاتے ہیں ؎

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ   مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

اور یہ مناظر دیکھئے ؎

چمک تاروں کی چشمِ سُرمگیں میں   جھلک چاندی کی جسمِ مرمریں پر
نشاطِ رنگ و بُو سے چور آنکھیں   شرابِ ناب سے لبریز ساغر
نفس کی آمد و شُد سے تلاطم   شبِ مہتاب میں جیسے سمندر

نور ہی نور ہے جس سمت اٹھاؤں آنکھیں   حُسن ہی حُسن ہے تا حدِّ نظر آج کی رات
اللہ اللہ وہ پیشانیٔ سیمیں کا جمال   رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
عارضِ گرم پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں   وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات
وہ تبسم ہی تبسم ہے جمالِ پیہم   وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات
نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

مجازؔ کی شاعری کا خمیر عشق و محبت کی چاشنی سے تیار ہوا ہے ۔ ان کا کلام بڑی حد تک پاک جذبات کا حامل ہے ۔ ایک مقام پر نرس کے متعلق یہ شعر ؎

ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لبِ لعل افشاں سے اک شے چُرا لی

نقاد کے لیے قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے ـــــ اس کے باوجود اُن کے ہاں حسن، ابتذال اور عریانیت سے محفوظ ہے "بتانِ حرم" میں اس حسنِ لطیف کے جلوے دکھاتے ہیں ؎

وہ حسیں پیشانیاں آئینۂ تمکین ناز وہ رسیلی مدھ بھری آنکھیں وہ مژگانِ دراز
نرم صوفے گود میں فردوسِ رعنائی لیے زلف کے خم مرمریں شانوں کی برنائی لیے

حسن کے لطیف جلوے طوفانِ رعنائی پر ختم ہوتے ہیں ؎

وہ سمٹنے کی ادا طوفان رعنائی لیے
ذوقِ خود بینی مذاقِ بزم آرائی لیے

مجاز کی شاعری کا آغاز رومانی عناصر کے زیرِ اثر ہوا۔ حسن و عشق کی چاشنی اور شباب و جمال کی سحر طرازی ان عناصر میں نمایاں تھی۔ اُن کی نظموں میں جذبات کی ٹیسیں بھی ہیں اور موسیقی کی نرم و شیریں لے بھی۔

مجاز نے سالہا سال کی غلامی اور زوال و انحطاط کے سسکتے اور کراہتے ہوئے انسانوں سے نہ صرف ہمدردی کا اظہار کیا، اشک افشانی کی بلکہ عملی جد و جہد میں بھی اُن کے شانہ بہ شانہ رہے، جہدِ حیات کے لیے اکسایا، اُن کی رومانی نظموں میں بھی سرکشی اور بغاوت کے شعلے نکل رہے تھے۔ گویا اُن کی شاعری شعلہ و شبنم کے اختلاطِ باہمی کا عجیب منظر پیش کرتی ہے۔

مشہور مقالہ نگار جناب اسلوب احمد انصاری نے رومانیت کے عناصر ترکیبی کی وضاحت یوں کی ہے۔

> "ماضی سے عقیدت، حسن کی تلاش، وفورِ جذبات، مرکزیت سے گریز، جذبے احساس اور وجدان پر بھروسا، تخیل کی خود کفالتی، مہم کی امنگ، زندگی کے ہیولے کو منقلب کرنے کا جذبہ، زبان میں صحت، صفائی اور وضاحت سے بڑھ کر ترنم، اشاریت اور مطالب کی تہوں کی وسعتوں پر زور، رومانیت کے عناصر ترکیبی قرار دیے جا سکتے ہیں"

(علی گڑھ اور رومانی نثر کے معمار صفحہ ۳۲)

زبان کی صحت و صفائی رومانیت کے اجزا نہیں ہیں۔ بلکہ کلاسیکی ادیب اس کا زیادہ لحاظ کرتا ہے رومانی ادیب جیسا کہ اسلوب احمد صاحب نے لکھا ہے زبان کی صحت و صفائی کے بجائے اس کے ترنم اور اس کی اشاریت و رمزیت کو اپنا مطمح نظر سمجھتا ہے۔ ذوق اور شاہ نصیر ہمارے ہاں کلاسیکی طرز کے اور غالب رومانی طرز کے نمائندے ہیں۔

مجاز کی شاعری میں ہمیں رومانیت کے جو عناصر ترکیبی ملتے ہیں، وہ یہ ہیں:-

"حسن کی تلاش، وفورِ جذبات، جذبۂ احساس اور وجدان پر ہجرو سا زندگی
کے ہیولے کو منقلب کرنے کا جذبہ"

چنانچہ "نذرِ دل" (۱۹۳۶ء) میں ان کی رومانیت کا رنگ دیکھیے۔ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے کیسی عجیب عجیب دلیلیں پیش کرتے ہیں "نذرِ دل" میں یہ دلیلیں نمایاں طور پر ملتی ہیں ؎

اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں   کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں
میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی   تم کو بزمِ ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں
تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لیے   گیت گا سکتا ہوں میں آنسو بہا سکتا ہوں میں
جذب ہے دل میں مرے دونوں جہاں کا سوز و ساز   بربطِ فطرت کا ہر نغمہ سنا سکتا ہوں میں
تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر   مجھ کو یہ دعوا کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

اور "کس سے محبت ہے" (۱۹۴۲ء) میں رومانیت کا رنگ کتنا گہرا ہو گیا ہے ؎

جبیں پر سایہ گستر پرتوِ قندیلِ رہبانی
عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سلیمانی
ازل سے منعقد ہے محفلِ نورانیاں اس کی

لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اس کی

عورت کے متعلق مجاز کا تصور بہت پاکیزہ ہے۔ ان کے ہاں رکیک اور خام جذبات نہیں ملتے۔ ہوس پرستی کا شائبہ تک نہیں۔ وہ ان جذبات سے صاف دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔ ان کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔ اس عورت میں نسائیت کے تمام تر جوہر موجود ہیں۔ اور وہ شان و دل کشی ہے جو نسائیت کے لیے مایۂ امتیاز و فخر ہے اس میں چاند سلطانہ اور رضیہ کی عفت و عظمت ہے۔ شرم و حیا اس کا جوہرِ زندگی ہے۔ اپنی محبوبہ کے خد و خال کی نشاندہی وہ اس طرح کرتے ہیں (تم کس سے محبت ہے ۱۹۴۳ء)

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اس کی

مجاز کی محبوبہ جو عورت کے روپ میں شاہکارِ فطرت اور تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے، وہ عصمت و تقدیس کے نغمے گاتی ہ - اور نکتہ داں بھی ہے ؎

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخییل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے

، کی محبوبہ زندگی کی جدّوجہد میں دور تک ان کا ساتھ نہ دے سکی - اور "شاعر دلبراں" کو شکستِ پیہم کا منہ یھنا پڑا — اس کے باوجود انھوں نے اپنی محبوبہ کو بے وفائی کا طعنہ نہیں دیا - بلکہ زمانے کے فرسودہ نظام رسماج کے زنگ آلودہ قوانین کو ملزم قرار دیا ؎

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوقِ رُسوا کی پزیرائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی
زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

مجاز کی شاعری مریضانہ جذبات سے پاک ہے - یہ بہت بڑا وصف ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس بیں "ادب لطیف" کے پردے میں ناقص اور گندے جذبات پیش کیے جاتے تھے تو مجاز کی شاعری کا مقام بھی بلند ہو جاتا ہے - اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت کمزور پہلوؤں سے خالی نہ تھی - لیکن ان کا شاعرانہ کردار سضبوط اور توانا تھا - انھوں نے محبت میں نامرادی کا منہ دیکھا تھا - زک اٹھائی تھی لیکن بایں ہمہ عورت کے رے متعلق کبھی اوچھے خیالات کا اظہار نہ کیا - اسے ہمیشہ عظمت و احترام اور پاکیزہ نظروں سے دیکھا - چناں چہ ن خاتون سے کہتے ہیں ؎

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا   خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا
تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے   تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

اور اس جذبۂ تیقّن کو دیکھیے جو صنفِ نازک کے حوصلے بڑھا رہا ہے ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز کو حسن سے ازلی محبت اور ابدی عشق ہے - اس عشق کو وہ ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے نشہ جاودانی کا درجہ دیتے ہیں - اس نوع سے اُن کی عشقیہ نظمیں بلند پایہ سہی لیکن ان نظموں میں نہیں وہ سوز اور درد نہیں ملتا جو میر کی غزلیہ شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے اور نہ جذب و تفکّر کی وہ گہرائی ہے جو غالب کو منفر بناتی ہے -

رومانیت کا مخصوص طرزِ فکر اور میلان مجاز کی ہر قسم کی شاعری پر حاوی ہے - وہ انقلابی نغموں سے بھی ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، انھوں نے انقلابی شاعری اس وقت تک جاری رکھی جب تک ملک میں مکمل طور پر انقلا نہ آگیا - وہ انقلاب کا نعرہ لگا کر نوجوانوں میں بیداریٔ انقلاب کی روح پھونکتے ہیں - چناں چہ اپنی نظم " نوجوا (۱۹۳۷ء) میں کہتے ہیں ؎

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر   اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں   ہر ایک گام پہ اک انقلاب پیدا کر
شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے   تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

سرمایہ داری کے متعلق اُن کا شاعرانہ نظریہ دیکھیے ؎

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے   بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ وہ آندھی ہے جس کی زد میں مفلس کا نشیمن ہے   یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
کہیں یہ خوں سے فردِ مال و زر تحریر کرتی ہے   کہیں یہ ہڈیاں چُن کر محل تعمیر کرتی ہے
غریبوں کا مقدّس خون پی پی کر بہکتی ہے   محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے   یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

وہ منتظر عشرتِ فردا کو کاوشِ تدبیر کی تلقین کس حسین پیرائے میں کرتے ہیں ؎

تقدیر کچھ ہو کاوشِ تدبیر بھی تو ہو　　تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہو
ظلمات کے لباس میں تنویر بھی تو ہو　　اے منتظرِ عشرتِ فردا ادھر بھی آ

اسی طرح نوجوانوں کو ہدایت کرتے ہیں ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ　　تو جو شمشیر اُٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

اپنی نظم "پیام" میں نوجوانانِ وطن کو للکارتے ہیں ؎

اے جوانانِ وطن روح جواں ہے تو اٹھو
خوفِ بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو
اُٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اُٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اُٹھ کر

اِن حقائق کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مجازؔ کی شاعری صحت مند و توانا عناصر حامل ہے۔ اُن کے شعر میں کیف و مستی ہے، بدحواسی و اُداسی نہیں۔ اولوالعزمی ہے۔ اُن کے انقلاب کی ڈگر روں سے الگ ہے اُن کا نعرۂ انقلاب دیگر شعرا سے مختلف ہے۔ وہ دلوں میں اترنے والے انقلابی نغمے گاتے یں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی مقبولیت اکثر ہم عصروں کے لیے قابلِ رشک ہے۔

اُن کی غنائیت نے انقلاب کے مختلف تصوّرات کو اپنا لیا ہے۔ اس لیے انھیں انقلاب کا مطرب و مغنّی ہنا بیجا نہ ہوگا۔ اُن کے فن میں خلوص اور تیقّن ہے۔ اپنی نظم "عشرتِ تنہائی" میں اپنے شاعرانہ مسلک کی وضاحت یں کرتے ہیں ؎

میں کہ میخانۂ الفت کا پرانا میخوار
محفلِ حسن کا اِک مطربِ شیریں گفتار
ماہ پاروں کا ہدف زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نوا سنج و غزل خواں ہوں میں

میرے افکار میں مہتاب کی طلعت غلطاں
میری گفتار میں ہے صبح کی نزہت غلطاں
میرے اشعار میں ہے پھولوں کی نکہت غلطاں
[illegible]

اپنے جذبات کو موزوں اور دل کش پیرائے میں ادا کرنا ہر کامیاب اور قادر الکلام سخنور کا فنکارانہ کمال ہے ۔ فنِ شعر کا یہ گراں مایہ جوہر مجازؔ کو بھی ممتاز بنا رہا ہے ۔ ان کے شاعرانہ فن اور عمل کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بڑی نادر تشبیہیں استعمال کرتے ہیں ۔ جو قاری کے ذہن میں تازگی و توانائی اور نگاہوں میں وسعت پیدا کرتی ہیں ۔ چناں چہ "مادام" (۱۹۴۳ء) میں تشبیہات کی نقش گری کو مجازؔ کے موقلم کا سحر و اعجاز تسلیم کرنا پڑتا ہے ؎

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لیے　　　لب پہ افسوں لیے آنکھوں میں مئے ناب لیے
سحر و اعجاز لیے جنبشِ مژگانِ دراز　　　خندۂ شوخ جمالِ درخوش آب لیے
ضوفگن روئے حسیں پر شبِ مہتاب شباب　　　چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لیے
نشۂ ناز جوانی میں شرابور ادا　　　جسم ذوقِ گہر و اطلس و کم خواب لیے
زلفِ شب رنگ لیے صندل و عود و عنبر　　　خمِ ابروئے حسیں دیر کی محراب لیے
لبِ گل رنگ و حسیں جسم گداز و سیمیں　　　شوخیٔ برق لیے لرزشِ سیماب لیے
ایک صیاد خوش اندام سوادِ مشرق　　　زلفِ بنگال لیے طلعتِ پنجاب لیے
نزہت و ناز کا اک پیکرِ شاداب و حسیں　　　نکہت و نور کا امڈا ہوا سیلاب لیے

میری وارفتگیٔ شوق مسلّم لیکن
کس کی آنکھیں ہیں زلیخا کا حسیں خواب لیے

اسی طرح "عیادت" میں ان کی تشبیہات مکمل فنکاری کا ثبوت پیش کرتی ہیں ؎

یہ کون آگیا رخِ خنداں لیے ہوئے　　　عارض پہ رنگ و نور کا طوفاں لیے ہوئے
رخسار پر لطیف سی اک موجِ سرخوشی　　　لب پہ ہنسی کا نرم سا طوفاں لیے ہوئے
پیشانیٔ جمیل پہ انوارِ تمکنت　　　تابندگیٔ صبح درخشاں لیے ہوئے
زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی　　　اک کاروانِ نکہتِ بستاں لیے ہوئے
آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز　　　ظلمت کدے میں شمعِ فروزاں لیے ہوئے
ملتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی　　　کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لیے ہوئے

یہ کون ہے مجازؔ سے سرگرمِ گفتگو
دونوں ہتھیلیوں پہ زنخداں لیے ہوئے

تشبیہات کے سلسلے میں مجازؔ کی مشہور نظم "آوارہ" کا ذکر ضروری ہے ۔ اس نظم میں انھوں نے

ہایت خوش نما اور نادر تشبیہات بے ساختگی سے استعمال کی ہیں۔ یہ ان کی دقیق النظری اور قدرتِ یان کی پختہ دلیل ہے۔ ’آوارہ‘ کے چند بند جن میں تشبیہات نے جواہر کلام کا کام کیا ہے رج ذیل ہیں ؎

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر تھی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصوّر جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون سمجھے کون جانے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر لگی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مجازؔ جو مطرب دلبراں تھے، حالاتِ بد نے انھیں بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ وہ ایک باغی شاعر کے روپ میں مغنیِ آتش نفس بن گئے۔ یہ بغاوت ان کے سماجی شعور کی برتری اور صحت مندی پر مبنی تھی۔ آوارہ ں وہ اپنے آپ کو ایک مفلس آوارہ نوجوان کے پیکر میں پیش کرتے ہیں۔ جو ملک کے لاکھوں بیکار و بے روزگار فلس اور آوارہ نوجوان کی نمایندگی کرتا ہے۔ پوری نظم ایسے ہی نوجوانوں کے جذبات کی عکاسی اور

غیرفانی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اور بلاشبہ اردو کی نمایندہ نظموں میں سے ایک ہے۔ اردو شاعری میں یہ ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ مجاز نے اس میں نہ صرف اپنے جذبات کی شدّت کو سمو دیا ہے بلکہ ہزاروں آوارہ مفلس نوجوانوں کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ اسی لیے اُس کے تاثّر میں شدّت اور صداقت کی شعلہ بدامانی بھی ہے۔ اور درد و غم کی جنوں خیز ٹیسیں بھی۔ اس میں درد و کرب کی شدّت بھی ہے اور طمانینت و تسکین کا سامان بھی۔ اس میں موجودہ انسان کی بلند حوصلگی، والہانہ عزم اور جرات آموزی بھی ہے۔ اور جذبۂ تیقّن کی پختگی بھی۔

اس نظم کا ہیرو "آوارہ" راستے میں دم لینے کا عادی نہیں۔ اُس کے نزدیک منزل رسی کے بغیر لوٹ جانا خلافِ فطرت ہے۔ اُس کے لیئے عہد و وفا ایک مصیبت ہی سہی لیکن وفا پیشگی اُس کی فطرتِ ثانی ہے۔ چاند تاروں پر کمند ڈالنے اور چنگیز و نادر کے تاج پر مزیّن جواہر خاک میں ملا دینے کا پختہ عزم اُس کے کردار کا طرّۂ امتیاز ہے۔ یہ ایک بے کار نوجوان کی زندگی کا مرقع ہے جو کسی بڑے تجارتی شہر میں بے روزگا پھر رہا ہے۔ آوارہ گشتی کر رہا ہے۔ پھر بھی اُس کے دل میں کام کرنے کا حوصلہ ہے۔ اُمنگ ہے جوش و ولولہ ہے۔ یہی جذبات اس نظم کی اثر آفرینی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

ہمارے نقادوں اور فنکاروں نے اس نظم کو بہت عجیب و غریب طریقے سے سراہا ہے حیات اللہ انصاری نے اس نظم کو دیوانِ غالب کے ہم پلّہ بتایا ہے۔ اُن کی اس رائے کو ہم مبالغہ نہیں بلکہ غلو کہہ سکتے ہیں — پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی رائے یہ ہے:-

> "میرا دعوا ہے کہ اگر وہ صرف نظم "آوارہ" اور وہ غزل کہہ کر مر جاتا جس کے دو شعر اس وقت مجھے یاد آ رہے ہیں ؎
>
> اے شوقِ نظارہ کیا کہیئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
> اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے
> سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
> سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے
>
> تو بھی اُس کا نام اردو شاعری میں زندہ رہتا"

مجاز نے اپنے دَور کے حالات کا جائزہ لیا تھا۔ اُس دَورِ نامسعود کو دُکھوں مصیبتوں اور آلائشوں سے بھرپور پایا تھا۔ اسی لیے اُن کی نظموں میں سوز و گداز اور جذب و اثر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ ۱۰۰

مشاہدات سے نادر تصورات کی تخلیق کرتے ہیں - اور نہایت مفید نتائج کے ساتھ انھیں بیان کرتے ہیں -

سماج اور سیاست کی نباضی مجاز کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی - اُن کی سیاسی اور انقلابی نظموں میں کئی مقامات پر بغاوت کی اُس آگ کے شعلے ملتے ہیں جن سے ہر انقلابی نوجوان کا دل دہکتا ہے - ۱۹۳۷ء میں انھوں نے " اندھیری رات کا مسافر" کے عنوان سے ایک جذبات انگیز نظم قلم بند کی تھی - جو اُن کی سیاسی اور سماجی نظموں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے -

اس نظم کے پس منظر میں ہمیں اُس دور نامسعود پر نظر ڈالنی چاہیے - جب کہ متحدہ ہندوستان میں معاشی حالات نہایت ابتر ہو چکے تھے ، بے روزگاری اور بے کاری عام تھی ، ہزاروں نوجوانوں کو زندگی گزارنا دشوار ہو چکا تھا - اس نظم میں شاعر کے باغیانہ جذبات شعلہ جوالہ بن کر ابھرتے ہیں - اس میں اولوالعزمی اور بے باکی کے صدہا درس موجود ہیں - جن سے نئے عزم کی تخلیق ہوتی ہے ؎

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نور ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے دہر میں محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اندھیری رات کا یہ مسافر اپنے جذبۂ تیقن کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی جانب رواں دواں ہے - ایک ہیبت ناک اندھیری رات کی شکل میں مختلف صعوبتیں، مصائب اور مظالم ذہنِ انسانی پر سایہ فگن تھے - اُس کے خیال میں مذاہب بے نیاز نورِ عرفاں ہو چکے تھے - اس کے باوجود وہ منزل کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا ؎

چراغِ دیر فانوسِ حرم قندیلِ رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نورِ عرفانی
نہ ناموسِ برہمن ہے نہ آہنگِ حُدیٰ خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

مجاز کے سیاسی شعور نے دوسری جنگِ عظیم کے خطرے کو بھانپ لیا تھا - آثار و قرائن بتا رہے تھے کہ دنیا کو ایک بار مصائب کے طوفان سے گزرنا ہے - دشواریوں کا سمندر پار کرنا ہے - گیر و دار کا مقابلہ کرنا ہے لیکن مجاز کا نوجوان جو " اندھیری رات کا مسافر" ہے نئے عزم و ولولے کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا - اُفق پر جنگ کا جو خونیں ستارہ جگمگا رہا تھا وہ اُس سے خائف نہ تھا ؎

افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلبِ گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

مجاز کی ایک معرکہ آرا نظم "انقلاب" ہے جو اُن کی فنکاری اور ذہنی ارتقا کی دلیل ہے ۔ اس میں ہمارے اس غنائی شاعر نے زندگی اور اس کی جدوجہد کے ارتباط کے لیے اپنے فن کو وقف کر دیا ہے ؎

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا اب وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر
بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمنِ ادراک پر

یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دلِ بیتاب میں
بہہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں

چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو
آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خونِ آرزو

اپنے اس مطرب دوست کو تلقین کرتے ہیں ؎

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب

اسی طرح نوجوانوں کا یہ نمائندہ شاعر انھیں چیلنج کر رہا ہے ؎

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

مجاز شراب و شاہد اور حسن و عشق کے ساتھ انقلاب کے نغمے بھی گاتے ہیں ۔ شمشیر خارا شگاف کا ذکر بھی کرتے ہیں ۔ عظمتِ وطن اپنے نغموں میں سمو دیتے ہیں ۔ نوجوان خاتون کو اپنے آنچل کا پرچم بنا لینے کی تلقین بھی کرتے

شاہکار دیکھیے ؎

خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

نظم آوارہ میں اپنے باغیانہ پیچ و تاب کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ دوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اِس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مجازؔ کا شاعرانہ لہجہ "خوابِ سحر" میں کسی قدر متوازن، اثر انگیز اور تخیل پرور ہو گیا ہے۔ وہ تعمیری انقلاب کے اسباب و علل اور آثار و قرائن کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس میں اجتماعی شعور کا اظہار نمایاں ہے۔ اس انقلاب کے نقوش غور و فکر سے دیکھنے کے بعد ہی نظر آتے ہیں ؎

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

یہ مسلسل آفتیں یہ یورشیں یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام

ذہنِ انسانی ہے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

غرضیکہ مجاز کی شاعرانہ روح عصر سے ہم آہنگ ہے اور عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

جناب جوش ملیح آبادی نے اپنی تنظیم "پندنامہ بنام مجاز!" میں شاعر بزم دلبراں کو خراج پیش کیا ہے۔ اور شاعرانہ اوصاف و محاسن بیان کیے ہیں ؎

اے مجاز اے ترانہ بار مجاز　　زندہ پیغمبر بہار مجاز
اے برورِ سمن دناں گل پوش　　اے بکوئے مغاں تمام خروش
اے پرستارِ مہر خاتِ جہاں　　اے کماں دارِ شاعرانِ جواں
تجھ سے تاباں جبینِ مستقبل　　اے مرے سینۂ امید کے دل
اے مجاز اے معبر خدو خال　　اے شعور جمال و شمع خیال
اے ثریا فریب و زہرہ نواز　　شاعر مست و رند شاہد باز

نافدِ عشوۂ شباب ہے تو
صبح فردا کا آفتاب ہے تو

مجاز کی بلانوشی نے انھیں ملالت سے دوچار کر دیا تھا۔ جوش نے انھیں مستی کے آداب سکھائے اور روز روشن کی عبادت و جشن شبانہ کے نکات سے آگاہ کیا ؎

غم کے مارے تو جی رہے ہیں ہزار　　نہیں بچتے ہیں عیش کے بیمار
آن میں دل کے پار ہوتی ہے　　پنکھڑی میں وہ دھار ہوتی ہے
ہاں سنبھل کر لطافتوں کو برت　　ٹوٹ جائے نہ دیکھ کوئی پرت
دیکھ کر شیشۂ نشاط اٹھا　　یہ ورق ہے ورق ہے سونے کا

تیغ مستی کو احتیاط سے چھو
ورنہ نکلے گا انگلیوں کا لہو

مجاز کی غزل گوئی

غزل کی صنف فارسی میں رودکی کے زمانے سے رائج ہے۔ جو حضرت امیر خسروؒ سے کوئی تین سو برس قبل فارسی کا کامیاب غزل گو شاعر ہوا ہے اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم:۔ "غزل کی قسم کی شاعری اگرچہ عربی میں موجود تھی لیکن غزل بطور ایک مستقل صنف کے فارسی میں ابھری۔ اور اس درجہ مقبول ہوئی کہ دورِ متوسط اور متاخر کی شاعری زیادہ تر غزل کی شاعری ہو گئی"

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اُردو کی پیش رَو زبان میں سب سے پہلے جس شاعر نے شعر کہا وہ حضرت امیر خسروؒ ہی تھے۔ اُردو شاعری کے خیاباں میں جب یہ غنچۂ نورس (مجازؔ) کھلا اُس وقت حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، فانیؔ، یگانہؔ، سیمابؔ اور فراقؔ کی غزل گوئی بہار آفرینی کی شان دکھا رہی تھی۔

ہر مبتدی شاعر کی طرح مجازؔ کی شاعری کا خمیر بھی تغزّل سے تیار ہوا۔ غزل گوئی ہی اُن کی شاعری کی مشق و مزاولت کا باعث بنی۔ غزل گوئی کا آغاز اس اوّلین غزل سے ہوا۔

حسن کو بے حجاب ہونا تھا شوق کو کامیاب ہونا تھا

اُس وقت وہ لکھنؤ میں تھے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد انھیں آگرے میں مسلّم الثبوت، پختہ فنکار اساتذہ اور جیّد سخنوروں کی قربت و مصاحبت حاصل ہوئی۔ خاص طور پر فانیؔ مرحوم کی ہم سائیگی کے باعث اکتسابِ فیض کا زرّیں موقع ملا۔

بقول پروفیسر آلِ احمد سرور:-

> "فانیؔ اور میکشؔ اکبرآبادی سے ۱۹۳۱ء میں اُن کا ربط ضبط بڑھا۔
> فانیؔ نے ان کی چند غزلوں پر اصلاح بھی دی تھی۔"

اس کے بعد انھوں نے اپنے ذوق ہی کو رہبر بنایا۔

اور بقول احتشام حسین صاحب:-

> "فانیؔ کا جادو اُن پر چل گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن شعوری
> ارتقا کے لحاظ سے وہ فانیؔ سے بہت مختلف تھے۔ اسی لیے فانیؔ سے اُن
> کا تعلق ذہنی نہیں فنّی رہا۔"

ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے بھی مجازؔ کی غزل گوئی ہی کو شاعری کی بنیاد قرار دیا ہے:-

> "اُن کی شاعری غزل گوئی سے اور غزل گوئی بھی فانیؔ بدایونی کے زیرِ اثر
> شروع ہوئی ہے۔"

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حضرتِ فانیؔ جیسے ماہرِ فن نادر الکلام اور مسلّم الثبوت غزل گو کے قرب اور ارتباط نے مجازؔ کی غزل گوئی کو جلا بخشی۔ کالج میں معین احسن جذبیؔ کی رفاقت اور حسرتؔ کے مطالعے نے اُن کے فن کو پختگی عطا کی۔ اس طرح مجازؔ کو غزل کا عرفان حاصل ہوگیا۔

مجازؔ نے لکھنوی اور روایتی غزل گوئی سے ہٹ کر اردو غزل کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ جس کا ثبوت اُن کے اشعار سے بخوبی مل سکتا ہے۔ اُن کی غزلیں تکلّف و تصنّع، دور از کار تشبیہات اور مبالغہ آرائی سے پاک ہیں۔ اُن میں نہ صرف خونِ جگر کی آمیزش ہے بلکہ تغزّل اور شعریت کی روح بھی جھلک رہی ہے۔

سادگیٔ بیان کے ساتھ ہی مجازؔ کی غزلوں میں غنائیت اور فنکاری مکمل طور پر موجود ہے ۔ ان کے ہاں بے معنی اشعار نہیں ملتے ۔ زبان اور بیان کی غلطی بھی کہیں نظر نہیں آتی ۔ غنائیت کے علاوہ مجازؔ کی غزلوں میں استعارے، تشبیہیں، رمز وکنایہ دل نشیں طرز ادا کے ساتھ موجود ہے ۔

اب ان کے گلستانِ تغزل کی بہار آفرینی ملاحظہ کیجیے اور نشاطِ تغزل سے محظوظ ہو لیجیے ؎

زندگی کی جمیل راہوں سے　　خود اجل اشکبار گزری ہے

روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے　　ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ
اٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے دل سے　　دیکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ
ٹپکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے　　دھڑکے گا دلِ خانہ خراب اور زیادہ
ہوگی مری باتوں سے انھیں اور بھی حیرت
آئے گا انھیں مجھ سے حجاب اور زیادہ

ہمدم یہی ہے رہ گزرِ یارِ خوش خرام　　گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم
کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھیے　　الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم
دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق　　لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم
بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جراتیں مجازؔ
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے　　مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے
مری بربادیوں کا ہم نشینو!　　تمھیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے
ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں　　ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

حسن کی بزمِ خاص میں جاکر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا ہوگا
درد کی اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

تسکین دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے
اس سعیٔ کرم کو کیا کہیئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا خود اپنا مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

سارا عالم گوش بر آواز ہے   آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب پر اُن کا نام آ ہی گیا

پھر کسی کے سامنے چشمِ تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگِ احترام آ ہی گیا

یہ بجلی چمکتی ہے کیوں دم بہ دم   چمن میں کوئی آشیانہ بھی ہے
مجھے آج ساحل پہ رونے بھی دو   کہ طوفان میں مسکرانا بھی ہے

عشق کا ذوقِ نظارہ مفت میں بدنام ہے   حُسن خود بے تاب ہے جلوہ دکھانے کے لیے
کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا   آپ نے خود بھی تو دامن نہ چھڑانا چاہا
کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں

سرشار کی ناول نگاری

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

رتن ناتھ سرشار اردو کے عظیم ناول نگار ہیں، انکی حیات اور کارناموں پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے ہیں اور وہ بھی نہایت تشنہ۔ ڈاکٹر ادیب نے بڑی محنت سے اس کتاب میں سرشار کے حالاتِ زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالی ہے اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو الٰہ آباد یونیورسٹی نے پی۔ ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی۔

قیمت :- چھ روپے پچاس پیسے

غالب۔ فکر و فن

ڈاکٹر شوکت سبزواری

مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی شخصیت اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں، وہ اس کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ مقالات حسب ذیل ہیں۔

ذال معجمہ فارسی میں	غالب محقق کی حیثیت سے
غالب اور میرٹھ	میر و غالب
غالب کی شخصیت	غالب کے اردو کلام کی اشاعت
قیمت :- پانچ روپے	غالب، خطوط کے آئینے میں

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

مراسلات

ڈاکٹر گیان چند کے نام

مکرمی ڈاکٹر گیان چند صاحب تسلیم۔

"نقوش" کے خطوط نمبر میں آپ کا مکتوب بنام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، میری نظر سے گزرا۔ اور اس کا وہ حصہ خاص طور سے میں نے غور سے پڑھا تھا جس میں آپ نے میرے مقالے (شائع شدہ نذر عرشی) پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ (دہمزرداری نے) سنسکرت یا ہندی کے انوسوار اور چندر بندو میں (بھی) غلط ملط کر دیا ہے لیکن چونکہ آپ نے یہ اعتراض ناخوشگوار انداز میں کیا تھا۔ اس لئے میں اپنی دیرینہ عادت کے مطابق خاموش رہا اور اس علمی مسئلے پر اظہار خیال مناسب نہ جانا۔ مجھے خیال گزرا کہ اگر میں نے آپ کے اعتراض کی وضاحت چاہی یا اس سلسلے میں کچھ لکھا تو آپ پہلے ہی کسی مسئلے پر جس کا تعلق میری کسی تحریر سے ہو، اظہار خیال کو "بھڑوں کے چھتے" میں کلوخ اندازی سے تعبیر کر چکے ہیں میرے لکھنے کے بعد آپ کے اس خیال کو تقویت پہنچے گی اور عجب نہیں کہ مزید ناخوشگواری ہو۔ اب جبکہ آپ نے اپنے مکتوب گرامی میں اس کا اعتراف کر لیا ہے کہ آپ نے یہ "عدم احتیاط" کی بنا پر کیا تھا۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں تو مجھ پر فرض ہو جاتا ہے کہ میں نے اگر آپ کے شائع شدہ خط کے انداز تحریر سے کوئی ناگواری محسوس کی تھی تو اب آپ کی معذرت کے بعد آپ کی شرافت، سلامت روی اور خلوص کا کھلے دل سے اعتراف کروں اور آپ کو یقین دلاؤں کہ حاشا وکلا میں علمی مسائل میں اختلاف رائے اور اس کے اظہار کو برا نہیں سمجھتا۔ آپ مجھے سنسکرت کا فاضل بتلاتے ہیں حالانکہ میں اس زبان کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس کی وضاحت فرمائیں کہ "سنسکرت یا ہندی کے انوسوار اور چندر بندو میں غلط ملط" سے آپ کی کیا مراد ہے۔ انوسوار ایک آواز ہے اور چندر بندو اس کی علامت۔ ان دونوں میں غلط ملط نہیں ہو سکتا۔ اور نہ میں نے غلط ملط کیا ہے۔ سنسکرت اور ہندی کے انوسوار البتہ غلط ملط کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے سنسکرت کے انوسوار اور ہندی کے انوسوار میں فرق نہیں کیا تو اس سے قطع نظر کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ لفظ "سنسکرت" کے بعد "یا" آجانے سے اس خیال کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ غلط ملط دو چیزوں میں ہوتا ہے۔ آپ "یا" لکھ کر اس کی نفی کر دیتے ہیں۔ آپ کو اس صورت میں یوں لکھنا چاہیے تھا "سنسکرت اور ہندی کے انوسوار میں غلط ملط کر دیا ہے"۔

بہر حال آپ اپنے اشکال کی وضاحت فرمائیں اور تائید میں میری عبارت کا وہ حصہ نقل کریں جس سے آپ نے مذکورہ نتیجہ نکالا۔

امید ہے آپ محض احقاق حق کے لئے یہ زحمت گوارا فرمائیں گے۔ - نیازمند شوکت سبزواری، مدیر لغت ترقی اردو بورڈ، جمشید روڈ کراچی ۵

فتح محمد جالندھری کے حالات زندگی

مجھے مشہور ماہر گرامر مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کے حالات زندگی کی ضرورت ہے۔ - مجھے ان کی تاریخ پیدائش و وفات، تصانیف کی فہرست اور خاندانی حالات مطلوب ہیں۔ - "اردو قومی زبان" کے قارئین سے اس سلسلے میں تعاون کی درخواست ہے۔ - (حمیرا - ۹۴ مصطفیٰ آباد لاہور نمبر ۱۵)

دھوبی یا دوبے

آپ کے موقر جریدے "اردو" بابت اپریل ۱۹۶۸ء شمارہ ۲۰ میں کشن چند اخلاص کے تذکرہ "ہمیشہ بہار" میں مرزا ابوطالب کلیم کاشانی کی مثنوی در تعریف اکبر آباد و گلزار خان آبجانے کے جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان میں صفحہ ۲۱۰ پر بعض تجارت پیشہ لوگوں کے "خوبان گل اندام" کی شاعر نے تعریف کی ہے۔ مثلاً مہاجن، عطار، صراف، تنبولی، جوہر فروش، خیاط، زرگر وغیرہ۔ - آگے چل کر صفحہ ۲۱۲ پر کلیم کہتا ہے:۔

زحسن شستۂ دو بے چہ گویم ÷ ازاں بے پردہ محبوبے چہ گویم
تر و تازہ شگفتہ آشنا روئے ÷ بسان سرو دائم بر لب جوئے

پچھلے مصرع میں لفظ "دوبے" جو آیا ہے ذیلی نوٹ میں اُس کی صراحت یوں کی گئی ہے

" دھوبی = دوبی ؟" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صراحت کرنے والے کے خیال میں فارسی میں شاید دھوبی کو "دوبی" لکھ دیا۔ میرے خیال میں یہاں "دوبے" کو دھوبی سے کوئی نسبت نہیں ہے بلکہ شاعر کا اشارہ برہمنوں کے اس فرقے کی طرف ہے جس کو "دوبے" (DUBEY) کہتے ہیں۔ - کیونکہ عام طور سے برہمنوں کی مختلف ذاتیں مثلاً پانڈے، چوبے (جو کھانے کے لئے بہت مشہور ہیں۔) دوبے دریا کے کنارے ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرانے کے لئے صبح سویرے سے موجود رہتے ہیں۔ - اور جو ہندو "مرد اور عورت" اشنان کرنے گھاٹ پر آتے ہیں ان کو سنسکرت کے مخصوص اشلوک پڑھ کر پوجا پاٹ کراتے ہیں۔ - اور ماتھے پر چندن لگا کر کچھ پیسے وصول کر لیتے ہیں۔ - میرے خیال میں یہاں "دوبے" میں برہمنوں کا یہی فرقہ مراد ہے۔ - اس لطیف منظر کے لئے بنارس کا راج گھاٹ خاص طور پر مشہور ہے۔

"دوبے" کے متعلق ایک دلچسپ مثل بھی ہمارے لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں مشہور ہے۔ - اور وہ یہ کہ چوبے چلے چھبے ہونے رہ گئے اور "دوبے" یعنی چوبے نے چاہا تھا کہ اس کے مذہبی تقدس اور ان گن میں اضافہ ہو مگر بجائے زیادتی کے کمی ہو گئی یعنی چوبے سے دوبے رہ گئے۔ اور بجائے فائدے کے خسارہ ہو گیا۔

برہمنوں کے یہ فرقے آریائی نسل کی بہترین ذاتیں مانی جاتی ہیں۔ - رنگت میں گورے اور صباحت و ملاحت میں مشہور ہیں۔ دوبے چونکہ یہ لوگ اکثر گھاٹوں ہی پر رہتے ہیں تاکہ کوئی پجاری بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس لئے شاعر دوسرے شعر میں کہتا ہے

تر و تازہ شگفتہ آشنا روئے ÷ بسان سرو دائم بر لب جوئے (مرزا [illegible])

گردوپیش

اردو، دفاتر کی زبان بنے گی

پنجاب یونی ورسٹی سنڈیکیٹ نے یونی ورسٹی کے دفاتر میں اردو کو سرکاری ز کے طور پر رائج کرنے کے لیے اعلا سطح کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے، جو متعلقہ مسائل کا جائزہ لینے کے بعد اردو کو جلد از جلد انگریزی کی جگہ رواج دینے کا منصوبہ مرتب کرے گی۔ پنجاب یونی ورسٹی کے وائس پروفیسر حمید احمد خاں کمیٹی کے سربراہ ہیں اور ارکان میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر ممتاز حسن اور جسٹس ایس اے رحمان وغیرہ شامل ہیں۔ یاد رہے کہ یونی ورسٹی میں جزوی طور پر اردو رائج ہو چکی ہے۔ اردو کو ایم اے تک تدریس و امتحان کا ذریعہ بنانے کی منظوری دی جا چکی ہے۔ اور یونی ورسٹی کی جاری کردہ اسناد پر اردو اور انگریزی دونوں عبارتیں درج ہوتی ہیں۔ تقسیم اسناد کے سالانہ جلسے اور دیگر تقریبات کی کارروائیاں اردو ہی میں ہوتی ہیں۔

اردو میں سائنس کی تدریس

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ جب تک اساتذہ اردو میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع نہیں کرتے ہیں اپنی قومی زبان اردو میں اچھی نصابی کتابیں میسر نہیں آ سکتیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں کسی تاخیر اور حیلے کے بغیر اردو کو سائنسی مضامین کی تدریس کا ذریعہ بنا دینا چاہیے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے فرمایا کہ اردو میں یہ صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اسے سائنس کا ذریعۂ تعلیم بنایا جا سکے۔

اُردو کسی دوسری زبان کی حریف نہیں

گوجرانوالا میں مجلسِ فکر و نظر کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی "شامِ فقیر" میں تقریر کرتے ہوئے وزارت اطلاعات و نشریات کے معتمد الطاف گوہر نے کہا کہ اردو زبان، دوسری علاقائی زبانوں کے میل جول، تہذیب و ثقافت اور یکجہتی و اتحاد کے بقا کی ضامن ہے۔ اردو کسی دوسری زبان سے کوئی مخاصمت نہیں رکھتی بلکہ میل جول کا ایک ایسا نظام مہیا

کرتی ہے جس سے ہماری ثقافت فروغ پاسکتی ہے۔

• مجلس فکر و نظر، کے عمومی معتمد ارشد میر نے پنجابی زبان و ادب کے سلسلے میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی خدمات کو سراہا اور اس موقع پہ آئے ہوئے ممتاز اہل علم کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔

علمی، ادبی، تعلیمی اور تہذیبی خبریں

ایشیا کے تہذیبی مسئلے

اقوام متحدہ کی ذیلی تنظیم یونسیکو کے زیر اہتمام وسط ایشیا کے ملکوں کے تہذیبی مسائل کا جائزہ لینے کے لیے ایک عالمی سائنس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پاکستان اور دوسرے ۱۰ ملکوں کے دو سو سے زیادہ ماہرین آثار قدیمہ، مورخین اور محققین نے شرکت کی۔

شعرا کو خراج تحسین

صوبائی وزیر آبپاشی و برقیات مخدوم حمید الدین نے خان پور کے ایک مشاعرے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ شعرا اپنے اشعار کے ذریعے قوم کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ طویل تقریریں، بسیط مضامین اور جامع مقالات انسانی ذہن پر وہ اثر نہیں چھوڑتے جو ایک برجستہ اور بے ساختہ شعر چھوڑ جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ شعرا نے اقوام کے انداز فکر بدلے ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی دفاعی جنگ کے دوران پاکستانی شعرا نے قوم کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

دس دن میں ایک نئی زبان

وفاقی جمہوریہ جرمنی میں اجنبی زبانیں سیکھنے کے لیے پہلی مرتبہ ایک نئے اور نہایت زود اثر طریقے کا کامیاب تجربہ کیا گیا جس کے ذریعے ایرلانگن نیورمبرگ یونیورسٹی کے طلبہ نے دس دن میں اتنی روسی سیکھ لی کہ وہ جرمن زبان میں فنی کتابیں ترجمہ کرنے یا کم سے کم سمجھ کر پڑھنے کے قابل بن گئے ہیں۔ یہ طریقہ وفاقی جمہوریہ جرمنی کی ایک ٹیکنیکل یونیورسٹی نے برقیاتی کمپیوٹروں کی مدد سے ذخیرۂ الفاظ کی چھان بین کرنے کے بعد دریافت کیا ہے۔

ثقافتی رشتے

ایران میں پاکستانی فنکاروں کا مظاہرہ دیکھنے کے بعد اصفہان کے گورنر ہمایوں فر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور ایران کے درمیان مستحکم ثقافتی رشتے موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پاکستانی مغنیہ لیلا ارجمند بانو نے جس انداز سے فارسی غزلیں گائی ہیں ان سے ہمارے پرانے مراسم کا ایک اور ثبوت مہیا ہوتا ہے۔

نئی ادبی تنظیم

لاہور میں "نئی ادبی تنظیم" کے نام سے ادیبوں کی ایک نئی انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد نئے انکشافات اور نئے علوم و فنون سے زندگی کے رابطے دریافت کرنا ہے۔ اس تنظیم میں اعجاز فاروقی، صابر لودھی، رحمان مذنب، صلاح الدین ندیم، اور غلام الثقلین نقوی وغیرہ شامل ہیں۔

زلیخا بائی رنگون والا ٹرسٹ

مشہور تاجر و صنعت کار محمد علی رنگون والا نے تیس لاکھ روپے کی رقم۔ زلیخا بائی رنگون والا ٹرسٹ کے قیام کا اعلان کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ٹرسٹ کے قیام کا مقصد تعلیم کو فروغ دینا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ٹرسٹ دوسری امدادی سرگرمیوں میں بھی اعانت کرتا رہے گا۔ ٹرسٹ کی طرف سے ایک ثانوی اسکول قائم کیا جا چکا ہے جس میں ایک ہزار ایک سو طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ نیز ایک پبلک ہال، تعلیم بالغاں کا مرکز اور ایک لائبریری اور دارالمطالعہ بھی قائم کیا جائے گا۔

اہم نسخوں کی حفاظت

انڈیا آفس لائبریری لندن کے نگراں جناب ایس سی سٹن نے اپنے طویل دورۂ پاکستان کے دوران فرمایا کہ انڈیا آفس لائبریری میں برصغیر کی تاریخ کا پورا تحقیقی مواد اور لٹریچر محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اہم نسخوں کی حفاظت کا کام بڑی توجہ اور سرپرستی چاہتا ہے، اور مسرت کا مقام ہے کہ پاکستان میں اس پر بھرپور توجہ دی جا رہی ہے۔

اقبال اور لیاقت علی خاں کی مسلیں

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب وحیدالدین نے علامہ اقبال اور پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خاں کی ذاتی مسلیں محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر ایف اے خان کو پیش کر دیں۔ یہ مسلیں اقبال اور لیاقت علی خاں کی ہائی کورٹ میں وکیل کی حیثیت سے شمولیت کے مسودات پر مشتمل ہیں۔ جن سے ان زعما کی ابتدائی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

علامہ اقبال کی مسل میں ان کی قدیم ترین تحریر ۶ رجون سنہ ۱۹ء کی ایک درخواست ہے جس میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے ریڈر کی حیثیت سے پنجاب چیف کورٹ کے رجسٹرار سے استدعا کی تھی کہ انھیں قانون کی کلاسوں میں شرکت سے مستثنا قرار دیا جائے۔ یہ درخواست نامنظور کر دی گئی تھی۔ علامہ اقبال کا دوسرا مسودہ ۱۹ راکتوبر سنہ ۱۹۰۸ء کا تحریر کردہ ہے جس میں انھوں نے چیف کورٹ کے ججوں کو لنکن کے بیرسٹروں کی سوسائٹی میں اپنی شمولیت سے مطلع کیا تھا اور لاہور میں پریکٹس شروع کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ علامہ اقبال نے چیف کورٹ کی رکنیت کے لیے اپنی درخواست پر پرنسپل سے دستخط کیے تھے۔ اس کی منظوری کے عدالتی کاغذات بھی مسل میں شامل ہیں۔ مسل کے ۲۲ ویں صفحے پر ۸ رمئی سنہ ۱۹۰۹ء کا لکھا ہوا محکمۂ تعلیم کے انڈر سیکریٹری جے، سی گوڈلے کا خط بھی موجود ہے۔ انھوں نے اس خط میں چیف کورٹ کے رجسٹرار کے نام پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر کی خواہش کے مطابق علامہ اقبال کو گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبۂ فلسفہ کے لیے پروفیسر مقرر کرنے کی پیش کش کی تھی جسے چیف کورٹ کی اجازت سے انھوں نے منظور کر لیا تھا، اس مسل کا آخری صفحہ یکم اپریل سنہ ۱۹۱۰ء کی ایک درخواست پر مشتمل ہے جو انھوں نے عدالت میں دوبارہ پریکٹس شروع کرنے کے سلسلے میں دی تھی۔

کتب خانوں کا فروغ

"پاکستان میں لائبریریوں اور افرادی قوت کے فروغ کی ضرورت" کے موضوع پر ایک دو روزہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے، افرادی قوت اور قومی تعلیمی کمیشن کے چیرمین جناب جی احمد نے کہا کہ قوموں کی زندگی میں لائبریریوں کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک اچھی کتاب بہترین دائمی رفیق ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ فنڈ کی کمی اور عوام میں مطالعے کی دلچسپی کے فقدان کی وجہ سے ملک میں لائبریریوں کو فروغ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

حکیم محمد سعید نے پبلک لائبریریوں کو جمہوریت کی ایک نہایت موثر اور اہم ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ معاشرتی اور معاشی مسائل کے دانش مندانہ تجزیے اور واقفیت اور قومی منصوبہ بندی کے حصول کی خاطر عوام میں مطالعے کے لیے رغبت پیدا کرنی ضروری ہے۔ اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ لائبریریوں کا قیام ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر اے سعید نے لائبریریوں کے لیے ایک کمیشن قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس تقریب میں لائبریریوں کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مضامین و مقالات پڑھے گئے۔

جرمن مصوری کی نمائش

کراچی میں جرمن مصوری کی ایک نمائش منعقد ہوئی جس کا افتتاح پاکستان جرمن فورم کے صدر ڈاکٹر ممتاز حسن نے کیا۔ اس نمائش میں موجودہ عہد کے ۲۱ جرمن مصوروں کی تصویریں رکھی گئی تھیں۔

دیدہ زیب کتابوں پر انعامات

پاکستان قومی کتاب مرکز کی طرف سے سنہ ۱۹۶۸ء کے دوران چھپنے والی کتابوں پر چار ہزار روپے کے انعامات دیے جائیں گے۔ یہ انعامات اردو اور بنگالی کی کتابوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اردو میں ناشروں کے لیے دیدہ زیب اور دل کش و پایدار کتابیں شائع کرنے پر پہلا انعام پانچ سو روپے کا اور دوسرا ڈھائی سو روپے کا ہے۔ اور ڈھائی ڈھائی سو روپے کے دو انعامات کتاب کے گرد وپیش اور اندرونی تصاویر پر مصوروں اور تزئین کاروں کو پیش کیے جائیں گے۔ یہ انعامات بچوں اور عام قارئین کے لیے چھاپی ہوئی کتابوں کے لیے ہوں گے۔ ہر کتاب کی دو جلدیں اس تصدیق نامے کے ساتھ کہ یہ کتاب یکم جنوری سنہ ۱۹۶۸ء تا ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۶۸ء کے درمیان چھپی ہیں، ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۶۹ء تک قومی کتاب مرکز (تھیوسوفیکل ہال بندر روڈ، کراچی) میں بھیجی جا سکتی ہیں۔

برماشیل کے تعلیمی وظائف

برماشیل نے اپنے ملازمین کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے پانچ بچوں کے لیے وظیفے کا اعلان کر دیا۔ اس بار ایک مقابلے میں کامیابی حاصل کر کے پانچوں وظیفے طالبات نے حاصل کیے۔ یہ پانچوں طالبات برماشیل کے وظیفوں سے مختلف کالجوں میں اپنی تعلیم جاری رکھیں گی۔

حلقۂ فکر نو

سکھر کے بعض ممتاز صاحبانِ علم کے جلسے میں "حلقۂ فکر نو" کے نام سے ایک ادبی و ثقافتی تنظیم کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس تنظیم کا مقصد نوجوانوں میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے۔

اس آئینہ خانے میں

دار الحدیث

ایک اخباری اطلاع کے مطابق جس طرح پنجاب پبلک لائبریری میں بیت القرآن قائم کیا گیا ہے اسی طرح داتا دربار لائبریری میں ایک نیا شعبۂ "دار الحدیث" قائم کیا جائے گا۔ جس میں حدیث کے قدیم و جدید اور نادر و نایاب نسخے محفوظ کیے جائیں گے۔

ڈاکٹر افضال حسین قادری کو اعزاز

پاکستان اکیڈمی آف سائنس نے جامعۂ کراچی کے امیر کلیۂ سائنس اور شعبۂ حیوانیات کے صدر ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری کو حیاتی علوم کا سب سے پہلا طلائی تمغہ انعام میں دینے کا اعلان کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ وہ امریکہ، کینیڈا، انگلستان، مغربی جرمنی اور ترکی کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دے چکے ہیں۔

شعلۂ آزادی

کیف بنارسی کی قومی و ملی نظموں کے مجموعے "شعلۂ آزادی" کی اشاعت کے موقع پر ادارۂ ارباب قلم کے اہتمام میں ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر جناب اختر حسین نے کی، صدارتی خطبے میں انھوں نے فرمایا کہ سر سید سے اقبال تک ادیبوں نے آزادی کی تحریک میں زبردست حصہ لیا ہے جس کا اعتراف ضروری ہے۔ اس تقریب میں "تحریک آزادی میں ادیبوں کا حصہ" کے عنوان سے ایک مذاکرہ بھی ہوا جس میں ڈاکٹر معین الحق، سید محمد تقی، ساقی جاوید اور شبنم رومانی وغیرہ نے شرکت کی۔

مصنفین اور صحافیوں کے لیے بونس

معلوم ہوا ہے کہ جو صحافی اور مصنفین کسی غیر ملکی اخبار، رسالے یا خبر رساں ایجنسیوں کے لیے کام کر رہے ہیں انھیں زرِ مبادلہ کی شکل میں چالیس فی صد بونس دیا جائے گا۔ اس سے قبل کسی بھی صنعتی ادارے یا غیر ممالک میں رہنے والے شخص کو اتنا بونس نہیں دیا گیا۔ اس فیصلے پر عمل درآمد ۱۲؍ اگست ۱۹۶۸ء سے کام کرنے والوں کے لیے ہوگا۔

پاکستانی ماہرِ طبیعیات کے لیے اعزاز

گلاسگو یونیورسٹی نے چار سائنس دانوں کو سمندر کے کھاری پانی قابل استعمال بنانے کے سلسلے میں ماسٹر آف انجینئرنگ کی ڈگری دی ہے۔ ان میں پاکستانی ماہرِ طبیعیات ڈاکٹر عصمت کمال بھی شامل ہیں، ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور فزیکل کیمسٹری میں امپیریل کالج لندن سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ اس سے قبل وہ پاکستان ایٹمی توانا[illegible] میں تھے۔ اب وہ کھاری پانی، قابل استعمال بنانے کے متعلق کیلی فورنیا یونیورسٹی میں مزید مطالعہ کریں گے۔

یادوں کے چراغ

ڈاکٹر زور

" ادارۂ ادبیات اردو" حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام ادارے کے بانی اور اردو کے ممتاز ادیب و محقق ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی چھٹی برسی عظیم الشان پیمانے پر منائی گئی۔ ۱۰ نومبر ۱۹۶۸ء کو آندھرا پردیش کے وزیر طبابت و صحت ابراہیم علی انصاری کی صدارت میں ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس میں شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور اردو دوستوں نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔ جلسے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، پدم شری حکیم عبدالحمید دہلوی متولی ہمدرد وقف دہلی، برہمانند ریڈی، وزیر اعلا آندھرا پردیش اور ویریندر پاٹل وزیر اعلا میسور کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ ان پیغامات میں ڈاکٹر زور کی علمی و تحقیقی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ ادارۂ ادبیات اردو کے صدر پروفیسر سید علی اکبر، ڈاکٹر جمال شریف، نجمہ صدیقہ، ناز حیدر، مرزا سرفراز علی، میر یاسین علی خاں، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر حسینی شاہد اور جناب وقار خلیل نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی حیات اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر زور کی یاد میں ۱۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو ایک بڑا مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی یادگاری ایوارڈ

اسٹوڈینٹس رائٹرز گلڈ کے پہلے بھٹائی یادگاری ایوارڈ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ سندھی میں جناح لا کالج کے امین مراد پٹھان اور سچل سرمست سائنس کالج کے غلام حسین کھوکھر کو بالترتیب اول اور دوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اردو میں جامعۂ ملیہ کالج کی آنسہ مبین فاطمہ اور اردو کالج کی آنسہ اختر جبیں اول و دوم آئی ہیں۔ نیز خصوصی انعام جامعۂ کراچی کے حسن اختر خاں نے جیتا ہے۔ منصفی کے فرائض جی الانا، علی نواز بھٹو اور عباس احمد عباسی نے انجام دیے۔

غالب

حلقۂ ادب لاڑکانہ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر " غالب خستہ تن" کے نام سے ایک کتاب شائع کرے گا۔ یہ کتاب حلقۂ ادب کے معتمد ریاض صدیقی نے مرتب کی ہے۔

ادارۂ یادگارِ غالب اور فلمی جریدہ نگاران کے نمائندوں کے ایک مشترک جلسے میں فیصلہ کیا گیا کہ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں رقص و موسیقی کے ایک ملے جلے پروگرام میں فلمی ستارے اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ اداکارہ ریشماں نے تجویز پیش کی کہ [illegible] کے پروگرام میں بڑے اداکار غالب کا لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا پیش کریں۔ سید سبط حسن نے کہا کہ غالب پر ۱۵ منٹ کی [illegible] فلم تیار کرے گے پاکستان کے تمام سینماؤں میں دکھائی جائے تاکہ [illegible]

فنڈ کی فراہمی کے سلسلے میں صفدر برلاس نے تجویز پیش کی کہ فلموں کے تقسیم کنندگان سے درخواست کی جائے کہ وہ کسی خاص ہفتے کی آمدنی غالب کی صدسالہ برسی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے عطیے کے طور پر دیں۔ مشہور ادیب ہاجرہ مسرور نے رائے دی کہ ادیبوں، صحافیوں اور فلمی ستاروں کا ایک وفد مشہور اداروں میں جائے اور ممتاز شخصیتوں سے ملاقات کرکے غالب پنسل فروخت کرے تاکہ اس کی آمدنی سے ادارۂ یادگارِ غالب صدسالہ برسی کے موقع پر کتابیں شائع کر سکے۔

پطرس ادارۂ مصنفین پاکستان کے ذیلی ادارے، رائٹرز کلب کراچی کے زیر اہتمام احمد شاہ بخاری پطرس کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت فیض احمد فیض نے فرمائی۔ اس جلسے میں غلام عباس، ذوالفقار علی بخاری جمیل اختر خاں، اور سرشار صدیقی وغیرہ نے پطرس کی زندگی اور تحریروں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

ماتم میں ہم شریک

ڈاکٹر خان اے رحمان مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے عمومی معتمد جناب ڈاکٹر سید عبداللہ نے ملک کے بلند پایہ سائنس داں ڈاکٹر خان اے رحمان کی وفات پر گہرے رنج کا اظہار کیا ہے۔ ایک بیان میں انھوں نے کہا کہ مرحوم قومی زبان اردو کے بڑے علمبردار اور پرزور حامی تھے۔ مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں پہلی مرتبہ پنجاب یونیورسٹی سینیٹ میں اردو کو ذریعۂ اظہار بنانے کی اجازت دلوائی تھی وہ قومی زبان کی ترقی خصوصاً سائنسی شعبوں میں اردو کے فروغ کے لیے مسلسل کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۰ء میں انھی کی تجویز پر پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے، ایم ایس سی کے امتحانوں کے لیے اردو کو متبادل ذریعۂ امتحان و تدریس بنایا گیا۔

فروغ علوی اردو کے ایک مصنف اور شاعر ڈاکٹر یونس حسن فروغ علوی کاکوروی ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم عثمانیہ کالج کے وائس پرنسپل رہ چکے تھے۔

اپٹن سنکلیر ۹۰ سالہ امریکی اہل قلم اپٹن سنکلیر ۲۶ نومبر ۱۹۶۸ء کو نیوجرسی میں انتقال کر گئے۔ انھوں نے ۱۴ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ کم و بیش ۹۰ کتابوں اور طویل مضامین و مقالات کے مصنف تھے ان کی ایک کتاب "جنگل" ان کے شاہکاروں میں سرفہرست شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز پر شکاگو کے حالات کا نقشہ کھینچا تھا۔ انھوں نے سوشلسٹ امیدوار کی حیثیت سے متعدد بار کیلی فورنیا کی گورنری اور امریکی کانگریس کی رکنیت کا انتخاب لڑا لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں انھیں ایک کتاب پر امریکہ کا پلٹزر انعام ملا تھا۔ اس کتاب کو برنارڈ شا نے نوبل انعام کا مستحق قرار دیا تھا۔ آئن سٹائن جیسے عظیم سائنس داں نے بھی اپٹن سنکلیر کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا۔

ڈاکٹر محمد نظام الدین

دائرۃ المعارف کے صدر، جامعۂ عثمانیہ میں فارسی شعبے کے سابق صدر اور مشہور محقق ڈاکٹر محمد نظام الدین ستر سال کی عمر میں حیدرآباد دکن میں انتقال فرما گئے۔

حکیم شنجر تہرانی

سیالکوٹ میں ۳ دسمبر ۱۹۶۸ء کو داغ کے ایک شاگرد حکیم شنجر تہرانی ایک سو دس سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے ہندوستان سے انگریزی سامراجیت ختم کرنے کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں، انگریزی حکومت کے زمانے میں ان کی سیاسی اور قومی نظموں کے پانچ مجموعے ضبط کیے گئے تھے۔ مرحوم سیالکوٹ کی اکثر ادبی تحریکوں کے بانی تھے۔

اظہار ملیح آبادی

کراچی میں اردو کے شاعر اور روزنامہ "حریت" کراچی کے رپورٹر اظہار ملیح آبادی ۲۴ سال کی عمر میں یکم دسمبر ۱۹۶۸ء کو وفات پا گئے۔ مرحوم حضرت جوش ملیح آبادی کے بھانجے تھے۔

آئینۂ ہند

اردو اور سیاست

کل ہند انجمن ترقی اردو کے نائب صدر پنڈت آنند نرائن مُلّا نے پٹنا میں تقریر کرتے ہوئے اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ بھارتی سیاست دانوں نے اردو کو ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا ہے انھوں نے کہا ہمارا فرض ہے کہ اب ہم سیاسی سطح ہی پر اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کی جدوجہد کریں۔ پنڈت جی نے فرمایا کہ اقوام متحدہ نے زبانوں کے متعلق جو اعداد و شمار جمع کیے ہیں، ان کے مطابق اردو دنیا کی پانچویں بڑی زبان ہے، بھارت میں یہ زبان وادئ کشمیر سے راس کماری تک اور فیروز پور سے ناگالینڈ تک ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پنڈت جی نے اردو کو دیوناگری رسم الخط میں منتقل کرنے کی سخت مخالفت کرتے ہوئے یاد دلایا کہ بھارت کے موجودہ صدر ڈاکٹر ذاکر حسین ایک زمانے میں اُس وقت کے بھارتی صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے پاس ایک وفد لے کر گئے تھے اور انھیں بیس لاکھ افراد کے دستخطوں سے ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں اردو کی حفاظت اور ترویج کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔

سہ لسانی فارمولا

آندھرا پردیش کے وزیر تعلیم نرسمہا راؤ نے ایک تقریر میں یقین دلایا کہ اردو کے متعلق حکومت آندھرا پردیش کی پالیسی وہی ہے جو آندھرا پردیش کے قیام کے بعد واضح کی گئی تھی، سہ لسانی فارمولے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس فارمولے کے نتیجے میں اردو والوں کو جو مشکلات درپیش ہیں، انھیں حل کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت کسی بھی ایسی عملی تجویز کا خیرمقدم کرے گی جس کی وجہ سے طلبہ پر سے چار زبانیں سیکھنے کا بوجھ کم ہو جائے۔

اتحاد کی علامت اردو

علی گڑھ میں جامعاتِ ہند کے اردو استادوں کی سہ روزہ سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے پروفیسر غلام السیدین نے کہا کہ اردو ادب اور اس سے

متاثر ہونے والی تہذیب نے ہمیشہ اتحاد کے رجحانات کی ترغیب دی ہے ۔ یہ زبان خود مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے اس لیے اس میں فصل کے بجائے وصل کے امکانات زیادہ ہیں ۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم ، پروفیسر احتشام حسین ، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ، پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ نے شرکت فرمائی ۔

جشنِ کرشن چندر

بمبئی میں کرشن چندر کی ۵۵ ویں سال گرہ کے موقع پر مہاراشٹر کے وزیرِ صحت ڈاکٹر رفیق زکریا کی صدارت میں جشنِ کرشن چندر منعقد ہوا جس میں بھارت کی وزیراعظم بیگم اندرا گاندھی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے ۔ انھوں نے کہا یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ زبان بھی جھگڑے کا سبب بن گئی ہے حالانکہ اردو اور ہندی دونوں ایک ہی ملک کی زبانیں ہیں ۔ اردو مغربی ایشیا ، وسطی ایشیا اور افریقہ میں رابطے کی زبان ہے ، اس کی اہمیت کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی ۔

وزیراعظم اندرا گاندھی نے جشنِ کرشن چندر کمیٹی کی جانب سے کرشن چندر کی خدمت میں ایک نقرئی کشتی پیش کی ۔

اس تقریب میں ہندوستان کے بہت سے مشاہیر نے کرشن چندر کو خراجِ تحسین پیش کیا ۔

زبانی جمع خرچ

صدر انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش ، جناب ایم باگا ریڈی نے ریاستی وزرا کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اردو کے متعلق محض زبانی جمع خرچ کی پالیسی ترک کر دیں اور آندھرا پردیش میں اس زبان کے تحفظ و ترویج کے سلسلے میں پوری سنجیدگی سے اقدامات کریں ۔

اردو ذریعۂ تعلیم

جامعۂ ملیہ کے جلسۂ تقسیمِ اسناد میں تقریر کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا کہ آزادی کے بعد اردو کے موقف میں جو بڑی تبدیلی ہوئی ہے ، اس کا اثر جامعۂ ملیہ جیسے اداروں پر خاص طور سے پڑا ہے ۔ جامعۂ عثمانیہ کے علاوہ جامعۂ ملیہ اعلا تعلیم کا وہ ادارہ تھا جہاں اردو ذریعۂ تعلیم کے طور پر رائج تھی ۔ یہاں اعلا نصاب کی تالیف اور تراجم کا کام کیا جا رہا تھا اور اساتذہ کی ایک نسل تیار کی جا چکی تھی جو مختلف علوم پر اردو میں درس دینے کی اہل تھی ۔ اس پس منظر میں جامعۂ ملیہ پر اردو اور اردو پر جامعۂ ملیہ کا جو حق ہے اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ۔ ہندوستان میں جو لوگ اردو زبان کے تعلیمی اداروں کے قیام اور ان کی توسیع و ترقی کے مخالف ہیں وہ اس ملک کے خیر اندیش ہرگز نہیں ہیں ۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی گولڈن جوبلی کی تقریب بڑی شان سے منائی گئی ۔ اردو کے ممتاز اہلِ قلم صدرِ جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس تقریب میں بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی ۔ یہ وہی جامعہ ہے جس میں اوّل سے آخر تک ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھی اور پچاس سال تک کامیابی سے اس کا تجربہ کیا جاتا رہا ۔ اس جامعہ نے اپنی بہتر کارکردگی کے سلسلے میں دنیا بھر کے ماہرینِ لسانیات سے خراجِ تحسین حاصل کیا ۔ اردو کے ماہروں نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ ہندوستان میں بھی اردو ایک ایسی زبان

ہے جس کے ذریعے تعلیم کے آخری مراحل تک اعلا تعلیم دی جاسکتی ہے ۔ مگر افسوس کہ آزادی کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کا وہ امتیاز ختم کر دیا گیا جو اُسے اردو ذریعۂ تعلیم کی وجہ سے حاصل تھا ۔

جناب چندر سری واستو نے گولڈن جوبلی کی تقریب میں جو مضمون پڑھا، اس کا عنوان تھا "جامعہ عثمانیہ کی گولڈن جوبلی جشنِ مسرت یا ماتم ؟" مضمون میں کہا گیا تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی اس الم ناک بات کا اشتہار ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم سے یونیورسٹی کا جو شان دار عہد وابستہ تھا، اس کے خاتمے کا اب باقاعدہ اعلان کیا جا رہا ہے ۔

انجمن کی ایک نئی کتاب

تاریخ سلطنت مسلمانانِ روس

از

مزمل یاسین

"روسی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں نے شروع سے آخر تک بغور پڑھی ۔ یہ بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور مطالب کا احاطہ پورے طور پر کیا گیا ہے ۔ یہ تاریخ روسی علاقے میں جو ترک آباد ہیں اُن کی سیاسی جدوجہد اور نشاۃ ثانیہ کے حالات پر مشتمل ہے ۔ انیسویں صدی سے لے کر سنہ ۱۹۱۷ء تک کے انقلاب کا نقشہ اس میں پیش کیا گیا ہے ۔ اندازِ بیان اِتنا دلچسپ ہے کہ کتاب پڑھتے وقت ذہن پر بوجھ ڈالنے کی بجائے ناول کی سی کشش پیدا کرتی ہے "

— سید حسام الدین راشدی

آفسٹ کی طباعت
متعدد تصاویر اور نقشے

سفید عمدہ کاغذ
قیمت دس روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱